فقہ الاسلام

اسلامی اصول و قوانین

مصنف ✿ ــــــــ حسن احمد الخطیب

مترجم ✿ ــــــــ سید رشید احمد ارشد ایم اے

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ ــــــــ کراچی (پاکستان)

قیمت اٹھارہ روپے مجلد

طبع اوّل ———————— نومبر ۱۹۶۱ء

طبع دوم ———————— مارچ ۱۹۶۷ء

مطبوعہ ———————— جاوید پریس۔ کراچی

فہرست عنوانات

فقہ الاسلام — اسلامی اصول و قوانین

باب ششم

فصل اوّل

اجتہاد

وقت کی اہم ضرورت

از محمد اقبال سلیم گاھندری

یہ کتاب مصر کے مشہور روشن خیال عالم حسن احمد الخطیب کی کتاب "فقہ الاسلام"
کا بامحاورہ ترجمہ ہے، اس کا اردو ترجمہ جناب حافظ سید رشید احمد ارشد ایم۔ اے نے کیا ہے
اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کے اصولوں اور اس کے فقہی قوانین کو
جدید انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس میں موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے
اس کتاب میں نہ صرف اسلام کے تمام ضروری اصول و قوانین کو بیان کیا گیا ہے بلکہ عہد رسالت سے
لے کر موجودہ زمانے تک اسلامی قوانین کی تدریجی نشو و نما اور اس کی وسعتوں کو واضح طریقے سے
بیان کیا گیا ہے سب سے پہلے قرآن کریم کے مجمل اور مفصل قوانین کی اہمیت بتائی گئی ہے
اس کے بعد تمام ضروری قرآنی احکام و قوانین کو آیات کے حوالے سے جمع کر دیا گیا ہے اس کے بعد
سنت نبوی کے ذریعے سے ان قوانین میں کیا اضافہ ہوا؟ ان سب کی تفصیل احادیث کے
حوالے سے بیان کی گئی ہے، اس کے بعد علماء و مجتہدین کے اصولوں کی افادی حیثیت بیان کرتے
ہوئے ان کی بے پناہ قانونی صلاحیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے (اسلامی قوانین کا جدید مغربی قوانین سے
مقابلہ کرتے ہوئے) اسلامی قوانین کی برتری ثابت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی قوانین
میں اس قدر لچک اور وسعت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے کے مختلف حالات اور ماحول کا مقابلہ
کرتے ہوئے ان کے جدید تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔

یہ کتاب اس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے کہ ہماری موجودہ اسلامی حکومتیں اپنے جدید قوانین
وضع کرنے میں اسلامی قوانین کے بیش بہا خزانہ سے فائدہ اٹھائیں بالخصوص پاکستان میں جہاں
اسلامی قوانین کے مطابق حکومت قائم کی جا رہی ہے یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے
اس کا ترجمہ سلیس، بامحاورہ اور معنی خیز ہے، یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں اس
موضوع پر جدید انداز کے مطابق کوئی کتاب اس سے بہتر موجود نہیں ،

دیباچۂ مُصنّف

حمد وثنا کے بعد گذارش ہے کہ شریعت اسلامیہ جس کے اصول واضح اور اس کے احکام مستحکم ہیں، تمام مذاہب سے بہتر ہے، اس کے اثرات عالمگیر ہیں، کیونکہ یہ شریعت اعلےٰ اصولوں، منصفانہ احکام اور عادلانہ سیاست پر قائم ہے۔ اس کی عمارت قرآن کریم کی بنیادوں پر کھڑی ہے اور محمد مصطفےٰ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے پیچیدہ احکام کی وضاحت کی اور مجمل بیانات کی تفصیل بیان کی بلکہ آپ ہی نے اجتہاد کے اصول بھی وضع فرمائے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس شریعت کی پابندی کریں کیوں کہ یہی شریعت قوموں کو عزت اور صالح زندگی عطا کرنے کی ضامن ہے، بلکہ تاریخ کے صفحات اس شریعت کی غیر معمولی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کی روشن دلیل ہیں کیونکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ شریعت اسلامیہ کو سب سے پہلے عرب بدوؤں نے اختیار کیا جو سخت اور غیر مہذب زندگی کے عادی تھے، اس کے بعد اس شریعت پر ان متمدن اور مہذب قوموں نے عمل کیا جن کے پاس پہلے سے قانونی نظام تھا۔ وہ تہذیب وتمدن میں عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن جب انھوں نے اپنے ملکی قوانین اور سماجی نظام کا اسلامی قوانین اور اسلامی نظام سے مقابلہ کیا تو وہ اپنے ترقی یافتہ نظام کے مقابلے میں اسلام کے عادلانہ نظام کے قائل ہو گئے بلکہ وہ اس اسلامی نظام کے اس قدر معتقد ہو گئے کہ انھی عجمی افراد میں اسلامی نظام کے ایسے زبردست مبلغ، قانون داں اور علماء پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اجتہادات سے اسلامی شریعت کی بنیادوں کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دیا۔

مگر آج یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اسی اسلامی شریعت کو ہم نے چاروناچار ہو کر ترک کر دیا ہے اور مغربی تمدن کی روشنی نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو یہ سب کچھ ہمارے جمود کا نتیجہ ہے کیونکہ ہم نے بہت عرصہ ہوا اسلامی شریعت کے اصولوں پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا، اور اسلامی اصولوں میں

اجتہاد کرکے اس کے ذریعے (حالات حاضرہ کے مطابق) جدید قوانین بنانے ترک کر دیئے تھے۔ اگر ہم اس وقت راہِ اعتدال اختیار کرتے اور اسلامی شریعت کے اصولوں پر وسیع النظری سے غور کرتے اور مجتہدین کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھتے، تو ہمارے علماء، ماہرین شریعت اور ہمارے قانون داں حضرات شریعت کے اصولوں پر غور کرکے ایسے اسلامی قوانین وضع کرتے جو سرزمین مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں جاری اور نافذ ہو سکتے تھے۔ اگر ایسے اسلامی قوانین وضع کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتے تو وہ مسلم حاکموں کو ان احکام کے ماننے اور اس کی اتباع کرانے پر مجبور کر سکتے تھے، مگر بدقسمتی سے ہمارے علماء کا قدم اس طرف نہیں بڑھ سکا، اس لئے ہمارے مسلم حکام یہ سمجھنے لگے کہ اب اسلامی شریعت زمانے کی ترقی اور اس کی جدید ضروریات کا ساتھ دینے کے قابل نہیں ہے اور وہ دور حاضر کی قوموں کی ضروریات، اور ان کی گوناگوں مشکلات و مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی، اس لئے انھوں نے مسلمانوں کے شخصی، ازدواجی اور عائلی قوانین کو چھوڑ کر باقی تمام قوانین مغربی اقوام اور بالخصوص فرانس سے اخذ کر لئے۔

لیکن اگر نظر عمیق سے دیکھا جائے تو دراصل اسلامی شریعت کا اس میں کوئی قصور نہ تھا، کیونکہ اس کے بنیادی اصولوں اور اس کے مسلمہ قوانین میں یہ گنجائش موجود ہے کہ وہ قوموں کی تمام ضروریات کی ہر زمانے میں کفیل بن سکتی ہے اور نہ صرف دور حاضر بلکہ مستقبل کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہم شرعی اجتہاد کی راہ کو ہموار کریں، اور اسلامی فقہ کا اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق مطالعہ کریں۔ اس کے بعد انہی اصولوں کے ذریعے جدید مسائل استنباط کریں،

جب میں نے فقہ اسلامی کی کتابوں کا کسی خاص رائے سے متاثر ہوئے بغیر مطالعہ کیا اور غیر جانب داری کے ساتھ انھیں پڑھا تو میں ان کے دقیق احکام، طریقۂ استنباط اور ان کے اصول و قواعد کا مطالعہ کرکے حیران رہ گیا جن پر انھوں نے روزمرہ کے تمام احکامات (جزئیات) کا دارومدار رکھا ہے بلکہ فقہی مسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اپنے علماء کی قوت استدلال بھی بہت پسند آئی۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ اسلامی قانون سازی اور فقہی اصول و مباحث میں کس قدر قوت، اور لچک ہے اور اس کے قوانین میں کس قدر وسعت ہے، اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا،

ہم علماء اور محققین پر کتنی زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے بیش قیمت موتیوں کو بے کار "صدف" میں چھوڑ رکھا ہے حالانکہ ماہر غوطہ خور اس میں سے گوہر آب دار نکال سکتے ہیں، بلکہ یہ قیمتی خزانے غفلت و فراموشی کے گوشوں میں ضائع ہو رہے ہیں، اور بہت کم لوگوں کو اس کا سراغ مل رہا ہے ہمارے تروتازہ پھول مہک رہے ہیں اور چونکہ ان کے اردگرد کانٹے ہیں اس اس لئے شوقین حضرات ان کی گل چینی نہیں کر سکتے "

شریعت اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اس کی دولت بے انتہا اور اس کا خزانہ لامتناہی ہے تاہم مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جامعہ ازہر کے علاوہ اور کسی ادارہ میں اس کی تعلیم و تدریس کا معقول انتظام نہیں ہے بلکہ ازھر کے علماء کے علاوہ اور کوئی طبقہ اس طرف متوجہ بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ مصر میں جتنی حکومتیں آئیں وہ سب کی سب قوانین وضع کرنے کے موقع پر مغربی قوانین سے مستفید ہونے کی کوشش کرتی رہیں، کبھی اسلامی شریعت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی البتہ جب شخصی یا عائلی قوانین بنتے ہیں تو اس وقت شریعت کی طرف رُخ کیا جاتا ہے، لہٰذا یوں کہنا چاہیئے کہ شخصی قوانین کے علاوہ دیگر امور میں شریعت اسلامیہ مردہ ہے، صرف نظری اور تاریخی حیثیت سے فقہ اسلامی کی تعلیم جامعہ ازہر میں ہوتی ہے، مگر اس جامعہ ازہر میں بھی جس کا تمام عالم اسلام سے تعلق ہے، اسلامی فقہ کی تعلیم اس طرح ہوتی ہے کہ طلبا کو چاروں اماموں کے مسائل سمجھا دیئے جاتے ہیں، اس کے بعد طلبا کا ہر گروہ اپنے مقررہ امام کے مسائل وخیالات کا تابع ہو جاتا ہے، حالانکہ (موجودہ حالات میں) علماء و محققین نیز مصر اور اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں کے طلباء کے لئے ضروری ہے کہ وہ فقہ اسلامی کا آزادانہ طریقے سے مطالعہ کریں تاکہ بزرگان سلف کا اجتہادی طریقہ زندہ ہو،

اس کے علاوہ ہمارے علماء کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مذہبی کتابوں کو نئے لباس میں اس طرح شائع کریں کہ طلبا اور جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلامی مسائل کو آسانی سے سمجھ سکیں، کیونکہ وہ قدیم فقہی کتابوں کے مطالعہ کرنے اور ان کے سمجھنے میں بہت دشواری محسوس کرتے ہیں، اس لئے وہ ایسی کتابوں کے مطالعہ سے گریز کرتے ہیں، ہمارے علما کو اس قسم کے کاموں میں بحالت موجودہ بہت مستعدی سے

حصہ لینا چاہیئے کیوں کہ اب زمانہ ان کے موافق ہوتا جارہا ہے اور حالات بھی سازگار ہوتے جارہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے بعض قانون داں اعلیٰ شخصیتوں میں اسلامی شریعت کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا ہے وہ اس کے اسرار و رموز سے واقف ہونا چاہتے ہیں، بلکہ مغرب کے بعض قانون داں حضرات نے بھی اسلامی شریعت کا مطالعہ کر کے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور اس کے اصولوں کو قیمتی جواہرات اور بیش بہا خزانہ قرار دیا ہے

اسی مقصد کے پیش نظر میں چاہتا ہوں کہ شریعت اسلامیہ کے محاسن کو ظاہر کروں نہ صرف اسلامی شریعت کے ضروری اصول و قواعد بیان کروں بلکہ اس کے فروع واحکام کو بھی ثابت کروں، اور یہ واضح کروں کہ اسلامی قوانین ہر زمانے میں تمام قوموں کے لئے سازگار ہیں، اس لئے جدید قوانین میں ان کا دخل ہونا چاہیئے بہر حال میں اس کتاب میں اسلامی قوانین کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے مشرق و مغرب میں علم و قانون کی اعلیٰ شخصیتوں کے خیالات بھی پیش کروں گا، تاکہ اہل ہمت اس طرف متوجہ ہو سکیں اور انھیں اسلامی شریعت سے دلچسپی پیدا ہو، میری یہ تمام تر کوششیں خدا کی خوشنودی کے لئے ہیں اگر میرا مقصد پورا ہوگیا تو یہ زبردست کامیابی ہے اور اگر میں کامیاب نہ ہو سکا تو میرے لئے یہی شرف بہت کافی ہے کہ میرا مقصد نیک ہے اور میں نے اصلاح کے لئے ہر امکانی کوشش صرف کی۔

حسن احمد الخطیب

مباحث کتاب

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں ابواب مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہیں :۔

پہلا باب :۔ اسلامی قوانین کے وہ اصول جن پر تمام علمار کا اتفاق ہے اور جن کے ذریعے تفصیلی احکام معلوم کئے جاتے ہیں

دوسرا باب :۔ وہ اصول اور شرعی دلائل جن کے بارے میں علمار کا اختلاف ہے

تیسرا باب :۔ شرعی احکام میں علمار کے اختلاف کے اسباب ۔

چوتھا باب :۔ اسلامی فقہی قواعد ۔

پانچواں باب :۔ اسلامی شریعت کی خوبیاں اور محاسن ۔

چھٹا باب :۔ اسلامی قوانین سازی میں اجتہاد کی آزادی ۔

ساتواں باب :۔ اسلامی شریعت کے بارے میں جدید بحث و تحقیقات اور اس کا مغربی قوانین سے مقابلہ ۔ اور جدید تقاضوں کے مطابق اسلامی شریعت کی صلاحیت

پہلا باب

اسلامی شریعت
کے
متفقہ اصول

اسلامی شریعت کے متفقہ اصول

اسلامی شریعت کے عملی اور فقہی قوانین کے متعدد بنیادی مآخذ اور اصول ہیں جن سے صحابہ کرامؓ تابعین اور دیگر علمار سلف نے استنباطِ مسائل و احکام کیا ہے۔ انھوں نے ان بنیادی مآخذ پر غور کر کے اپنے مسلک کے مطابق جو شرعی احکام مرتب کئے ہیں انھیں عرف عام میں اسلامی فقہ کہا جاتا ہے،

یہ مآخذ اور بنیادی اصول ایسے ہیں جن پر صحیح طریقے سے غور و خوض کیا گیا ہے اور اس کے بعد جو مسائل استنباط کئے گئے ہیں وہ یا تو یقینی علم پر مبنی ہیں یا ظن غالب پر ان کا دار و مدار ہے

بہر حال جمہور علمار کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شریعت کے ماخذ اور تفصیلی احکام کا سرچشمہ اور منبع چار چیزیں ہیں ——

(۱) اللہ کی کتاب قرآن کریم (۲) سُنّتِ نبویؐ (۳) اِجماع (۴) قیاس —— اور انہی چاروں اصولوں کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے :——

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو
اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی	اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو
الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ	اور تم میں سے جو صاحب حکم ہوں ان کی بھی
فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ	اتباع کرو۔ اگر تمھارا کسی معاملے میں اختلاف
اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ	ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ	بشرطیکہ تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو
اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ع (سورہ نسار پ۵)	یہ اچھا طریقہ ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے

بعض علمار نے ان چار بنیادی اصولوں کے علاوہ کچھ اور اصولوں کو بھی شرعی مآخذ قرار دے کر ان کی بنیادوں پر فقہی احکام کا استنباط کیا ہے مگر وہ اصول ایسے ہیں جن کو حجت اور قابل استدلال ماننے میں علمار کا باہمی اختلاف ہے نیز ان کے مفہوم کی تحدید اور ان کے دائرہ عمل کی توسیع میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، بہر حال ایسے اصولوں کو فقہا کی اصطلاح میں استدلال کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کے ماتحت یہ دلائل آتے ہیں

(۱) استحسان (۲) مصالح مرسلہ (۳) استصحاب،
(۴) اسلاف کے قوانین (۵) صحابی کا مسلک

ان چیزوں کی تشریح وتفصیل باب دوم میں مذکور ہے۔
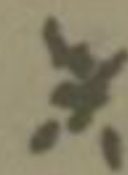
فصل اوّل

اسلامی قوانین کا سرچشمہ

قرآن کریم

اسلامی قوانین کا سرچشمہ یا پہلا بنیادی اصول قرآن کریم ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک مصاحف میں انہی الفاظ کے ساتھ مسلسل محفوظ ہو کر ہمارے پاس موجود ہے تاکہ سب انسانوں کے لئے دستور العمل کا کام دے سکے اور ہر ایک اپنے عقائد و اخلاق اور قوانین سازی میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکے، بلکہ اس کی تلاوت بھی کار ثواب ہے اور عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، یہی مرکز شریعت و رسالت ہے اسی سے عقلوں کو جلا ملتی ہے، دلوں کو اسی سے سرور اور بصیرت کو اسی سے نور حاصل ہوتا ہے بلکہ دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی کامرانی کا یہی ذریعہ ہے۔

اسلامی شریعت کا پہلا ماخذ

تمام علمائے اسلام کا اسی پر اتفاق ہے کہ قرآن ہی تمام احکام شریعت کا پہلا ماخذ ہے بلکہ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ صرف قرآن کریم ہی اصل ماخذ ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز شرعی احکام کا ماخذ اور سرچشمہ نہیں بن سکتی بلکہ دوسرے اصول صرف اس کی تشریح اور وضاحت کرتے ہیں، یا اس کے بنیادی اصول سے فروعی احکام کا استنباط کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ اپنا بنیادی تصور قرآن کریم ہی سے حاصل کرتے ہیں، لہٰذا اگر کسی کو کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو ایک عالم یا مجتہد کے لئے یہی ضروری ہے کہ وہ اس کا بنیادی اصول صرف قرآن کریم ہی میں تلاش کرے دوسرے ماخذوں کو ٹٹولنے کی کوشش نہ کرے، ان علماء کا یہ خیال ہے کہ سنت نبوی قیاس یا

معاملات عامہ کی بنیادوں پر جو صریح احکام پائے جاتے ہیں ان کے بنیادی اصول یا ان کی روح کی طرف قرآن کریم ضرور اشارہ کرتا ہے،

اسلامی قوانین کے لئے قرآن کریم کو اصل ماخذ قرار دینے کے لئے کسی مذہبی ثبوت یا دلیل کی حاجت نہیں ہے اور اس کی حجیت کو ثابت کرنے کے لئے عقلی اور نقلی دلائل لانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ جیسا کہ امام شاطبی نے اپنی کتاب موافقات میں تحریر کیا ہے تمام مسلمان اسے تسلیم کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے ان لوگوں جو قرآن کریم کو جھٹلاتے تھے یہ چیلنج دیا تھا کہ وہ قرآن کریم جیسی کوئی کتاب پیش کریں یا اس جیسی دس سورتیں ہی لائیں اس کے بعد انہیں یہ کہا گیا کہ وہ اس جیسی ایک صورت ہی لے آئیں مگر وہ سب کے سب اس چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز رہ گئے حالانکہ ان میں عربی زبان کے بہت بڑے ماہر بھی تھے جن کی عقلیں پختہ ہو چکی تھیں اور وہ اپنی فصاحت و بلاغت میں جواب نہیں رکھتے تھے بلکہ حکمت و دانائی اور تجربہ کاری میں بھی وہ بہت بڑھے ہوتے تھے، لہٰذا ایسے ایسے باکمال لوگوں کی ناکامی اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کی طرف سے اس طرح نازل ہوا ہے جس طرح مخبر صادق اور رسول نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اس کے بعد قرآن کریم ہمارے پاس اسی طرح مسلسل نقل ہو کر پہونچتا رہا کہ ہمیں یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ وہی قرآن کریم ہے جو عہد نبوی میں تھا اور یہ نہ صرف سینہ بہ سینہ محفوظ رہا بلکہ تحریری طور پر بھی یہ اسی طرح محفوظ رہا جس طرح یہ وحی کے ابتدائی زمانے میں تھا اور انشاء اللہ اسی طرح محفوظ رہے گا۔

قرآنی احکام کی پابندی

ہمارے لئے اس کا قابل حجت ہونا بالکل واضح ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی قانون سازی میں اس کی طرف رجوع کریں کیوں کہ یہ خدا کا کلام ہے لہٰذا نہ صرف اس کے احکام کو ماننا ہی ضروری ہے، بلکہ ان احکام کو نافذ کرانا بھی ضروری ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:-

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ — اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے

اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ○ (سورہ نساء پ۵)	تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو بشرطیکہ تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہی اچھا طریقہ ہے اور اس کا نتیجہ بھی بہتر ہے۔

احکام قرآن کی پابندی کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل قرآنی آیات کو ذہن نشین رکھیے:۔

(۱) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔ (سورہ آل عمران پ۴)	اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھو اور الگ الگ نہ ہو جاؤ۔
(۲) وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ○ (سورہ نساء پ۴)	جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدود سے آگے بڑھتا ہے اللہ اسے دوزخ میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیگا اور اسے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا
(۳) وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَمُھَیْمِنًا عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ـــــــ	ہم نے تمہاری طرف سچی کتاب نازل کی جو اس سے پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر حاوی ہے تم ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرو اور اس صداقت کی بنا پر جو تمہیں معلوم ہوئی ہے،
وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَھُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِھِمْ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ○ اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ	ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اللہ کی ہدایت کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے پرہیز کرو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کچھ خدائی احکام سے ہٹا لیں اگر وہ روگردانی کریں تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے انھیں مصیبت

يَبْغُونَ ۗ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ○

(سورۂ مائدہ پ۶)

ہیں مبتلا کر دے اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگ فاسق ہیں کیا وہ جاہلیت کے فیصلوں کے خواہاں ہیں اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہوں ان کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

(۴) أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ○

(سورۃ انعام پ۸)

کیا میں اللہ کے سوا اور کسی کو منصف بنانے کا خواہاں ہوں؟ حالانکہ وہی ذات الٰہی ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب بھیجی اور وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ صحیح طور پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں کی جماعت میں نہ شامل ہو جاؤ

(۵) وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو۔ دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اس راستہ سے الگ کر دیں گے خدا نے اس بارے میں ہمیں ہدایت کی ہے تاکہ تم بچتے رہو۔

(۶) وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ (سورہ انعام پ ۸)

یہ مبارک کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے اور اللہ سے ڈرو شاید تم پر رحم کیا جائے

(۷) الٓمٓصٓ ۞ كِتَابٌ أُنزِلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُن فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ○ اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ

یہ وہ کتاب ہے جو (اے پیغمبرؐ) تم پر نازل کی گئی ہے لہٰذا تمہارے سینے میں تنگی نہ ہونی چاہیئے کہ تم اس کے ذریعے (کافروں) کو ڈراؤ اور یہ مومنوں کے لئے نصیحت ہے

اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝	جو (کلام) تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی اتباع کرو۔ اور اس کے علاوہ اور لوگوں کی اتباع نہ کرو تم میں سے بہت کم لوگ نصیحت قبول کرتے ہیں

(پ ابتداء سورۃ اعراف)

قرآنی احکام کا نفاذ

جب آپ ان جیسی آیات کو تلاوت کریں گے اور ان کے مضامین پر غور کریں گے تو اس وقت آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ان سب آیات میں قرآن کریم کے احکام کو ماننا لازمی قرار دیا گیا ہے اور اس میں جو ہدایات اور شرعی احکام مذکور ہیں انہیں نافذ کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے، اگر ہم ایسا کام نہیں کرتے تو گویا ہم خدا سے جنگ کر رہے ہیں اور اس نے ہماری بھلائی اور کامیابی کے لئے نیز ہماری خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جو قوانین بنائے ہیں اس کی ہم مخالفت کر رہے ہیں، ایسی صورت میں خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہم پر صادق آئے گا جو سورہ مائدہ میں مذکور ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔	جس نے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ لوگ کافر ہیں

(پ سورہ مائدہ)

اس سے اگلی آیات میں ایسے لوگوں کو ظالم اور فاسق بھی کہا گیا ہے سورہ مجادلہ (پارہ نمبر ۲۸) میں ارشاد فرمایا گیا ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝	درحقیقت وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس طرح ذلیل ہوتے ہیں جس طرح کہ وہ لوگ ذلیل کئے گئے جو ان سے پہلے تھے درحقیقت ہم نے کھلی نشانیاں نازل کردی ہیں اور کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے

غیر اسلامی قوانین کا نتیجہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "تم میں سے کوئی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں بن سکتا جب تک

کہ اس کے رجحانات میرے لائے ہوئے احکام کے تابع نہ ہوں، بلکہ مندرجہ ذیل حدیث نبوی میں ان لوگوں کا انجام بھی بتایا گیا ہے جو خدائی فیصلوں کے خلاف عمل کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں :-

"ان پانچ چیزوں کا انجام پانچ طرح سے ہوتا ہے (۱) اگر کوئی قوم عہد شکنی کرتی ہے تو خدا ان پر ان کے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے (۲) وہ لوگ جو خدا کے نازل کردہ احکام کے خلاف فیصلے کرتے ہیں تو ان میں ضرور فقروفاقہ پھیل جاتا ہے (۳) جہاں فحش و بدکاری نمودار ہوتی ہے وہاں موت کی کثرت ہوتی ہے، (۴) وہ لوگ جو کم ناپتے اور تولتے ہیں ان سے رزق اور پیداوار روک لی جاتی ہے اور وہ قحط سالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں — (۵) جو لوگ زکوٰۃ روک لیتے ہیں (اور اسے ادا نہیں کرتے ہیں) ان سے بارش روک لی جاتی ہے [۱]

قرآنی اصول واحکام کی نوعیت

قرآنی شریعت میں کچھ احکام مفصل ہیں اور کچھ بنیادی اور عام اصول ہیں جن کے ذریعے شریعت کے بنیادی قوانین و مقاصد معلوم ہو سکتے ہیں قرآن کریم میں وہ تمام باتیں بیان کر دی گئی ہیں جن کی ضرورت ہر زمانے میں مختلف قوموں کو پیش آ سکتی ہے یہ اصول قوموں کے لئے امن وعزت کی زندگی کے ضامن ہیں اور انھیں عدل و مساوات کے ذرائع حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ یہ ان کی روحانی جسمانی مادی اور ذہنی خوش حالی کا لازمی حصہ ہیں یہ اصول اعتدال پر مبنی ہیں ان میں افراط و تفریط نہیں ہے کیونکہ وہ شریعت جو ہمیشہ باقی رہنے والی اور غیر فانی ہو اس کے اوصاف یہی ہونے چاہئیں؛ اور اس وجہ سے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شریعت ختم ہو گئی، لہذا یہ دین اسلام ایسا مکمل ترین مذہب ہے جو انسانیت کی تمام ضروریات کی تکمیل کر سکتا ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو تفاسیر بیضاوی و ابو المسعود در تفسیر سورۂ والمطففین۔

مفصّل احکام

یہی وجہ ہے کہ قرآنی شریعت ایسی ہے جو اقوام و ازمنہ کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتی نہیں ہے اس کے بعض احکام مفصل ہیں جیسے گھر اور خاندان کی اصلاح کے لئے مخصوص قوانین ہیں، نیز ان بڑے جرائم پر سزائیں مقرر ہیں جن کے بدترین اثرات معاشرہ پر نمودار ہو سکتے ہیں یعنی جن میں جان و مال اور آبرو پر ڈاکہ مارا جاتا ہے،

مجمل احکام

اسی طرح قرآن کریم میں عبادات یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بارے میں بھی احکام ہیں کیوں کہ یہ چیزیں زمانے کے اختلاف کے ساتھ ساتھ نہیں بدلتی ہیں اور نہ ان میں تبدیلی ہونی چاہیئے، تاہم ان کے بارے میں مفصّل احکامات قرآن شریف میں مذکور نہیں ہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونہ پر ان کی توضیح و تشریح چھوڑ دی گئی تھی لہذا آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ مذکورۂ بالا عبادات و فرائض کی خوب توضیح فرمائی کیوں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو توضیح قوانین اور قوانین سازی دونوں چیزوں کے اختیارات دے رکھے تھے جیسا کہ اس آیت قرآنی میں مذکور ہے :—

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ۔	ہم نے تم پر اے پیغمبر، قرآن نازل کیا تاکہ تم لوگوں پر جو احکام نازل کئے گئے ہیں انھیں کھول کر بیان کرو۔

اجمال کی اصل وجوہات

قرآن کریم میں ان عبادات کی تفصیل کیوں نہیں بیان کی گئی اور انھیں سنت نبوی پر کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس کی اصل وجہ اور حکمت و مصلحت یہ ہے کہ عبادات کی بہت سی باتیں تفصیل طلب ہیں کچھ فرائض ہیں اور کچھ سنن و مستحبات اور دیگر شرائط ہیں ان کے علاوہ ان عبادات کو ادا کرنے کے عملی طریقے بھی مقرر ہیں اور انھی طریقوں پر ان عبادات کو بجالانا صحیح اور مقبول سمجھا جاتا ہے؛ لہذا ان چیزوں کو زبانی بیان کر دینے سے ان کی مکمل اور عملی صورت لوگوں کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی اس لئے یہی مصلحت و حکمت رکھی گئی کہ انھیں اس طرح چھوڑ دیا جائے تاکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تفصیلات بیان فرمائیں اور لوگوں کو اپنے قول و عمل سے یہ باتیں اچھی طرح سکھائیں اس طرح لوگ آپ

کے عملی نمونہ کو دیکھ کر انھیں اچھی طرح ذہن نشین کرلیں وہ اس طریقے سے نہ صرف
ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے بلکہ انھیں مکمل طریقے سے انجام بھی دے سکیں گے
یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا ——

"تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو"

جب آپ نے حج کیا تو آپ نے فرمایا ——

"تم مجھ سے اپنے مراسم حج سیکھو"

بنیادی اصول

مذکورہ بالا احکام کے علاوہ دوسرے معاملات میں قرآن کریم کے احکام مجمل مگر کلیہ قواعد اور بنیادی اصولوں پر مبنی ہیں اس صورت میں قرآن کریم جزئی مسائل و واقعات سے تعرض نہیں کرتا ہے، بلکہ کلیہ قواعد، قانونی اصول اور مذہبی مبادیات کو پیش کرتا ہے تاکہ مجتہد علماء ہر زمانے اور ہر نسل میں ان بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کر سکیں اور ہر زمانے کے مناسب حالات کے مطابق ان سے مسائل کا استنباط کرسکیں، اس طرح شریعت اسلامیہ کے بنیادی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ہر نسل کے لئے ضروری احکام مہیا ہو سکیں

آیات احکام

اس بات کو ہم تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تشریعی آیات یا وہ آیات جنھیں فقہاء و مفسرین، آیاتِ احکام کہتے ہیں، قرآن کریم میں بہت زیادہ نہیں ہیں، قرآن کریم میں چھ ہزار (۶۰۰۰) آیات ہیں، مگر ان میں مذہبی، تمدنی، قانونی اور سیاسی معاملات کے عملی احکام کی آیات ان کا دسواں حصہ بھی نہیں ہیں، ان آیاتِ احکام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض علماء کی رائے ہے کہ ایسی آیات دو سو (۲۰۰) سے زیادہ نہیں ہیں اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ایسی آیات پانچ سو (۵۰۰) ہیں [۱]

---

[۱] امام سیوطی نے بھی اپنی کتاب اتقان میں پانچ سو دس (۵۱۰) کی تعداد بیان کی ہے نیز ملاحظہ ہو (۱) تاریخ التشریع الاسلامی عربی صفحہ ۵۴ نیز ملاحظہ ہو اس کا اردو ترجمہ تاریخ فقہ اسلامی - از مولانا عبدالسلام ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڈھ (مترجم) (۲) الوحی المحمدی عربی مصنفہ رشید رضا عربی صفحہ ۲۲ نیز ملاحظہ ہو اس کا اردو ترجمہ از رشید احمد ارشد مطبوعہ کتاب منزل لاہور ۱۹۶۰ء (مترجم)

بنیادی احکام

قرآن کریم کی آیات احکام میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں، عبادات۔یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر اقسام صدقہ، حج، جہاد، نذر کو پورا کرنا۔ اعتکاف، خاندانی قوانین، مثلاً شادی، طلاق، میراث فوجداری قوانین، یعنی قتل، زنا، سرقہ اور رہزنی کی سزاؤں کا بیان، بین الاقوامی معاملات مثلاً جنگ دیگر قوموں سے مسلم قوم کے تعلقات، معاہدات جنگ کا مال غنیمت نیز مدنی قوانین، مثلاً بیع، رہن وغیرہ

احکام قرآن کی کتب

تشریعی آیات کی اہمیت، ہمارے علما کے نزدیک اس قدر تھی کہ انھوں نے قرآن کریم کی ایسی آیات احکام کی تشریح کی اور مختلف مجتہدین نے ان سے جو مسائل استنباط کئے ہیں انھیں بھی بیان کیا گیا ہے بلکہ ان آیاتِ احکام کی تشریح اور استنباط میں ان کے اختلاف رائے کا بھی ذکر کیا گیا ہے، ان کی ان کوششوں کے نتائج بعض طویل کتب تفسیر میں مذکور ہیں مثلاً امام فخرالدین رازی کی تفسیر نیز قرطبی کی کتاب الجامع لاحکام القرآن اور علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی میں یہ مباحث مذکور ہیں۔

مقاتل بن سلیمان نے سب سے پہلے احکام کی آیات قرآنیہ کو ایک مستقل تصنیف میں الگ کر کے جمع کیا تھا اور ان کی تعداد پانچ سو آیات تھی[1] ان کے بعد دوسرے علمار نے بھی اس پر الگ الگ کتابیں لکھیں[2]۔ بالخصوص منذر بن سعید البلوطی نے جو قرطبہ کے قاضی تھے اور جن کا انتقال ۳۵۵ھ میں ہوا اس طرف بہت زیادہ توجہ کی، اس فن میں امام ابوبکر الجصاص احمد بن علی الرازی الحنفی، بہت زیادہ مشہور ہیں جن کی وفات ۳۷۰ھ میں ہوئی انھوں نے اپنی کتاب احکام القرآن لکھی، اس کتاب میں انھوں نے قرآن کریم کی آیاتِ احکام کے نہ صرف تمام معانی کی تفسیر بیان فرمائی ہے، بلکہ ائمہ اور مجتہدین نے ان سے

---

[1] رسائل الاصلاح جلد سوم از:۔ شیخ محمد الخضر حسین

[2] الاتقان از:۔ سیوطی

فقہ کے جس قدر اصول اور فروعی مسائل استنباط کئے ہیں، ان سب کو جمع کر دیا ہے، اس میں وہ مسائل بھی مذکور ہیں جن میں ان کا اختلاف رائے ہے اور ہر ایک نے اپنے مسلک کی تائید میں جو دلائل بیان کئے ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے،

ابوبکر الجصاص کے بعد احکام قرآن کے ماہر ابن العربی محمد بن عبد اللہ المالکی نے جن کا انتقال ۵۴۳ھ میں ہوا ایک کتاب لکھی جس کا نام احکام القرآن ہے،

احکامِ قرآنی کی تقسیم

قرآن کریم میں کئی قسم کے عملی احکام پائے جاتے ہیں جنھیں علمائے کرام احکامِ فقہیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور وہ اس طرح سے ہیں :-

۱۔ عبادات :- ان کے لئے نیت کرنا ضروری ہے۔ عبادات انسان کا تعلق اپنے خالق سے قائم رکھتی ہیں اس کی کئی قسمیں ہیں (۱) جسمانی اور روحانی عبادت جیسے نماز روزہ (۲) مالی اور سماجی عبادت جیسے زکوٰۃ اور تمام قسم کے صدقات (۳) وہ عبادت جو روحانی اور جسمانی ہونے کے ساتھ ساتھ مالی بھی ہو جیسے حج، جہاد، نذر کو پورا کرنا۔

۲:- معاملات جن کے لئے مختلف احکام لوگوں کے باہمی خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور ان کے ذریعے قوم کے افراد اور ان کی جماعت کے درمیان تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے ان تعلقات کی بنیاد عدل وانصاف، رحم، تعاون اور محبت پر ہوتی ہے تاکہ ایک دوسرے کو ظلم اور مضرت سے بچایا جا سکے اور ہر ایک کو نفع اور بھلائی پہونچے ان معاملات میں شہری اور مدنی معاملات بھی شامل ہیں جیسے بیع، اجارہ، رھن وغیرہ۔ اسی قسم میں وہ معاملات بھی شامل ہیں جو موجودہ اصطلاح میں "احوال شخصیہ" کہلائے جاتے ہیں، یہ وہ معاملات ہیں جن کا تعلق انسان کے ساتھ پیدائش سے لے کر وفات تک باقی رہتا ہے جیسے وارثوں میں ترکہ کی تقسیم شادی، طلاق، عدت، نسب کا ثبوت، رضاع (دودھ پلانا) نفقہ وصیت اور میراث،

۳- شرعی حدود جو جان ومال اور آبرو کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں یعنی جرائم کا ارتکاب کرنے پر مختلف قسم کی سزائیں شریعت میں مقرر ہیں، ان میں قتل سرقہ، رہزنی، زنا، تہمت لگانے پر مقررہ مختلف سزائیں مقرر ہیں انہیں قصاص

اور حدود کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،

۴:۔ کچھ احکام ایسے ہیں جو رعایا اور حکومت کے تعلقات کی حدیں مقرر کرتے ہیں اور رعایا پر حاکم کے حقوق اور حاکم پر رعایا کے حقوق کی وضاحت کرتے ہیں، ان میں شوریٰ، مساوات، عدل اور حاکم کی ضروری اطاعت کے احکام شامل ہیں آجکل یہ دستوری احکام کے نام سے مشہور ہیں۔

۵۔ کچھ ایسے احکام ہیں جو جہاد، نظامِ جنگ اور غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات قائم کرنے کی وضاحت کرتے ہیں ان میں قیدیوں اور مال غنیمت کے احکام بھی شامل ہیں، یہ احکام آج کل کے بین الاقوامی قوانین کے مشابہ ہیں

اگر ہم قرآنی احکام و قوانین کا جائزہ لیں اور اس کے تمام احکام کی چھان بین کریں کہ کون سے احکام مجمل ہیں اور کون سے مفصّل ہیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کی صرف چار قسمیں ہیں۔

قرآنی احکام کی قسم اوّل

قرآنی احکام کی قسم اوّل، وہ مجمل قوانین ہیں جن کے احوال وصفات کو بہت کم بیان کیا گیا ہے اس کی سب سے نمایاں مثال عبادات ہیں جیسے نماز، روزہ اور حج اس سلسلے میں قرآن کریم کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں صرف ان کے اصولوں کو بیان کیا جاتا ہے اور پھر یاد دہانی اور نصیحت کے طور پر ان کی بار بار تکرار کی جاتی ہے۔

نماز کی اہمیّت

قرآن کریم میں جس عبادت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ نماز ہے یہ اعلیٰ درجہ کی روحانی عبادت ہے اور سماجی زندگی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے جب اسے صحیح طریقے کے مطابق ادا کیا جائے تو نفس پر اس کے اثرات بہت نمایاں ہوتے ہیں یہ انسان کو خدا کے خوف اور مراقبہ کا عادی بناتی ہے، اس طرح وہ حرام کاموں سے بھی بچتا ہے اور اس کے نفس کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے لہٰذا جب اس پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ گھبراتا نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ — اس کتاب میں سے تم پر جو وحی نازل کی گئی

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ○ (پ۲۱ سورہ عنکبوت)	ہے وہ پڑھ کر سناؤ اور نماز کو قائم کرو کیوں کہ نماز فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے حقیقت میں اللہ کا ذکر سب بڑھ کر ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو، اسے جانتا ہے
(۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ○ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ○ وَّاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ○ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ○ الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (پ۲۹ سورۃ معارج)	بے شک انسان بے صبر پیدا ہوا ہے جب اسے برائی پہونچتی ہے تو وہ بہت گھبرانے لگتا ہے اور جب بھلائی حاصل ہوتی ہے تو کنجوسی کرتا ہے سوائے ان نمازیوں کے جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور سوائے ان لوگوں کے جن کے مال میں سائل اور محروم لوگوں کا معیّن حصہ ہوتا ہے

طہارت

اللہ تعالیٰ نے ہمیں نماز اور بعض دوسری عبادتوں کے لئے طہارت کا حکم دیا ہے، اور اس مقصد کے لئے وضو اور غُسل کو مقرّر کیا ہے اور جب پانی نہ ملے تو اس کے لئے تیمّم کا حکم ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ رپ۶، سورہ مائدہ میں (دوسری رکوع کے شروع میں) فرماتا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ	اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگو تو اپنے منہ اور بانہوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سر دن کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک (دھوؤ) اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاک وصاف ہوجاؤ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کے بعد آیا ہو یا تم نے عورتوں کو

أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ (پ سورۂ مائدہ)

چھوا ہو پھر اس کے بعد پانی کو نہ پاؤ تو پاکیزہ مٹی سے تیمم کرو۔ اور اس کے ذریعے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو اللہ تم پر تنگی کرنا نہیں چاہتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ وہ تمھیں خوب پاک وصاف کردے اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کرے شاید کہ تم شکر گزار ہو جاؤ

فلسفۂ زکوٰۃ

زکوٰۃ بھی بہت بڑی مالی اور سماجی عبادت ہے یہ مومن کو احسان کرنے کا عادی بناتی ہے اور اس کے دل میں رحم کے جذبہ کو قبول کرتی ہے اور اسے بُخل اور کنجوسی کی برائی سے پاک وصاف کرتی ہے، وہ مصیبت زدہ لوگوں کے دلوں سے خوشحال دولت مندوں کے خلاف بغض و کینہ کے جذبات کا ازالہ بھی کرتی ہے اس کی بدولت ان کے دلوں میں ان کی محبت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ ان دولت مندوں کے ساتھ برا سلوک کرنے سے باز آجاتے ہیں اس کے ذریعے قرضداروں کی پریشانیاں دور ہوتی ہیں، اور غریبوں اور تنگدستوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں،

اسلام کے نظامِ زکوٰۃ میں نہ دولت مندوں کے لئے تکلیف ہے اور نہ غریبوں کی حالت کو نظرانداز کیا جاتا ہے چنانچہ زکوٰۃ کا ادا کرنا سماج کی بہت سی بیماریوں اور خرابیوں کا خاتمہ کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا۔ (پ سورہ توبہ)

(اے پیغمبر) تم ان کے مال سے صدقہ لو تاکہ تم انھیں پاک وصاف اور پاکیزہ بنا سکو۔

كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ

جب درخت میں پھل نمودار ہوں تو اس

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ	کا پھل کھاؤ اور جب اس کے کٹنے کا دن آئے
(پ۸ سورہ انعام)	تو اس کا حق دو۔

روزہ روزہ کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرض کیا ہے کہ وہ مومن کے دل میں تقویٰ پیدا کرے اور خدا کے ڈر اور خوف سے اس میں صداقت، صبر، قناعت ضبط نفس اور محنت و مشقت کو برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو، اس کی قوت ارادی بڑھے اور اس کا احساس اور وجدان اس قدر لطیف ہو جائے کہ روزہ دار کمزوروں کے ساتھ ہمدردی کرے اور مالی محبت کے باوجود وہ رشتہ داروں، یتیموں اور غریبوں کی مالی امداد کرے شریعت کے بتائے ہوئے روزہ کی بدولت جس میں خلوصِ قلب ہو اور کھانا پینا چھوڑ دیا جائے ،نفس امارہ کو سکون ملتا ہے اس کی تیزی اور شدت دُور ہوتی ہے اور قلب کدورتوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے اس کے علاوہ اس کے ذریعے مناسب پرہیز اور علاج سے جسم تندرست رہتا ہے روزہ کے بارے میں قرآن کریم کے یہ احکام ہیں،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ	اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے شاید کہ تم تقویٰ اختیار کرو یہ چند مقررہ دن ہیں۔ لہذا تم میں سے جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کو شمار کر لیا جائے۔ اور جو روزہ کی طاقت نہ رکھیں تو ایک فقیر کو فدیہ (بدلہ میں) کھانا کھلائیں اور جو شوق سے نیکی کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے اگر تم اس کا (راز) جانتے ہو، رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ یہ لوگوں کے لئے رہنما ہے اور ہدایت کے لئے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

(پ۲ سورۃ بقرہ)

اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے لہذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں حاضر ہو تو وہ روزہ رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کو شمار کرے اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور دشواری نہیں چاہتا تاکہ تم تعداد پوری کرلو اور اس کی ہدایت کے مطابق اللہ کی تکبیریں کہو شاید کہ تم شکر گزار بن سکو۔

حج

خدا نے عمر میں ایک مرتبہ حج فرض کیا ہے اعمال حج سے مساوات کا شعور پیدا ہوتا ہے کیونکہ فریضۂ حج ادا کرتے وقت مسلمان دنیاوی زندگی کی زینتوں سے خالی ہوتے ہیں، مردوں کے بدن پر صرف تہمد اور چادر ہوتی ہے اور سب کے سب خداوند تعالیٰ کی عظمت وجلال کے ذکر میں خشوع وخضوع کے ساتھ مصروف رہتے ہیں اس وقت فقیرو حاکم اور امیر وغریب کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا، اس وقت ہر ایک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زندگی کی نمائشی چیزیں بیکار ہیں، اور زندگی کا مال ومتاع ہیچ اور فانی ہے، لہٰذا جاہ ومال پر غرور وتکبر نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ تمام انسان حضرت آدمؑ سے پیدا ہوئے اور حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے (حج کے ان فوائد کے علاوہ) دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہر سال دنیا کے مختلف حصوں سے مسلمان مکہ معظمہ حج ادا کرنے کے لئے آتے ہیں اس طرح حج کی وجہ سے دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس سے بہت بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے اثرات (مسلم قوم پر) بہت گہرے ہوتے ہیں، یہاں تبادلہ خیالات کرکے مسلمانوں کے عالمگیر معاملات پر غور وخوض کیا جا سکتا ہے اور اس موقع پر تمام مسلمانوں کی ترقی واصلاح کے لئے کام کیا جا سکتا ہے اور سب کی فلاح وبہبودی کے ذرائع معلوم کئے جا سکتے ہیں، لہٰذا حج کتنی جلیل القدر عبادت ہے اور اس کے مراسم کتنے شاندار ہیں وہ تزکیۂ نفس کرتے ہیں اور روح کو لطیف وپاکیزہ بناتے ہیں اس کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے اتحاد ومساوات باہمی ہمدردی وتعاون کی طاقت کا احساس ہوتا ہے اور

انھیں یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات کی اصلاحی تدابیر پر غور و خوض کر سکیں۔ حج کے احکام پر مندرجہ ذیل قرآنی آیات ہیں۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝

(پ۱۷ سورۃ حج)

اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے (حضرت) ابراہیم کے لئے کعبہ کی جگہ مقرر کر دی اور (حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور (نماز کے لئے) کھڑے رہنے والوں اور رکوع و سجود کرنیوالوں کے لئے پاک (صاف رکھو، اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو اس وقت وہ لوگ پاپیادہ اور دبلے پتلے اونٹوں پر سوار ہو کر دور دراز علاقے سے تمہارے پاس چلے آئیں گے تاکہ وہ اپنے فائدہ کے مقامات پر حاضر ہوں وہ مقررہ دنوں میں اللہ کے نام کا ذکر کریں (چوپایوں کو ذبح کرنے کے لئے) کیونکہ اس نے انھیں چوپائے عطا کئے ہیں پھر ان میں سے خود بھی کھاؤ اور محتاج فقیر کو بھی کھلاؤ پھر چاہیئے کہ وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور قدیم گھر (خانہ کعبہ) کا طواف کریں

(۲) وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا، وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (قولہ عزوجل)

اور (خانہ کعبہ) کا حج کرنا ان لوگوں میں سے اس پر اللہ کا فرض ہے جو وہاں پہونچنے کی طاقت رکھتا ہو، اور جو انکار کرے تو اللہ اہل عالم سے بے پرواہ ہے،

(۳) الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ

حج کے مہینے مقرر ہیں لہذا اگر کسی پر ان مہینوں میں حج فرض ہو جائے تو اس

وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا

کے لیے حج میں نہ تو عورتوں سے اختلاط جائز ہے نہ بدچلنی اور نہ لڑائی جھگڑا (مناسب) ہے، اور جو نیک کام تم کروگے اللہ کو اس کا علم ہے اور زادراہ لیا کرو کہ سب سے اچھا زادراہ پرہیزگاری ہے، اور اے دانش مندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو، تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم (حج میں) اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو (تجارت وغیرہ کے ذریعے) پھر جب تم عرفات سے پھرو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو، ور اسے اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں (اسے یاد کرنا سکھایا ہے اس سے پیشتر تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں اور خدا سے بخشش طلب کرو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے اور جب تم مراسم حج ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کو (تعظیم کے ساتھ) یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یاد کرو۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں" اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا ہی میں بھلائی دے" اس وقت انھیں آخرت کا کوئی حصہ نہیں ملے گا، ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں" اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○	دوزخ کے عذاب سے بچا" یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ	کاموں کا حصہ ملے گا اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ	اور اللہ کو مقررہ دنوں میں یاد کرو (حج کے دنوں میں تکبیریں
اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ	کہتے رہا کرو) پھر جس نے دو دن میں (خرچ کرنے میں) جلدی
فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ	کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی اس پر بھی
اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا	کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ اسے خدا کا خوف ہو اور اللہ سے
اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○	ڈرتے رہو اور جان لو کہ تمھیں اس کے پاس جمع ہونا ہے

یہ اسلام کی بڑی عبادات ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے اسی پر اکتفا کیا ہے کہ ان کی طرف لوگوں کو آمادہ کیا جائے اور اس کے بعض کاموں اور ان کے اسرار رموز اور فوائد کی طرف اشارہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کے روحانی، سماجی اور حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے کیا منافع ہیں مگر ان کے ادا کرنے کے طریقے اور دیگر تفصیلات کو بہت کم بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ سب باتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و عمل پر موقوف رکھی گئی ہیں تاکہ آپ کے قول و عمل سے ان کی تفصیلات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں مگر چونکہ ان عملی تفصیلات کے ذکر سے تزکیۂ نفس اور رہنمائی اور جذبے کو تقویت نہیں پہونچتی تھی (اس لئے قرآن کریم میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا)

قرآن کریم کے مجمل احکام میں تمدنی معاملات بھی شامل ہیں ان کا تعلق ان معاہدات سے ہے جن کی رو سے لوگ اپنے منافع اور کاروبار کا تبادلہ کرتے ہیں قرآنِ کریم میں ان چیزوں کو اجمالی طریقے سے پیش کیا گیا ہے اور اس کے لئے کلیہ قواعد وضع کئے ہیں مگر ان کی تفصیلات سنتِ نبویؐ اور مجتہدین کرام کے نتائج فکر کے لئے چھوڑ دی گئی ہیں البتہ مقررہ مدت کے قرضہ کے لین دین کی تحریر کا حکم دیا گیا ہے اس کا بیان قسم سوم کیا جائے گا

ایفائے عہد معاملات کے بارے میں بنیادی اصول یہ بیان کئے گئے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے معاملات کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی ابتدا کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ	اے ایمان والو! معاہدات کو پورا کرو۔

اس اصول میں تمام معاہدات اور معاملات شامل ہیں

دوسرا اصول یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو مباح قرار دیا ہے اور ناحق لوگوں کا مال کھانے سے منع فرمایا ہے جیساکہ سورہ نساء میں ارشاد فرمایا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ۚ (پ۵ سورہ نساء)

اے ایمان والو! تم آپس میں اپنا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ تمھاری رضامندی سے تجارت کے طور پر ہو

سود خوری کی مخالفت

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے عمومی طور پر بیع اور سود خوری کا ذکر کیا ہے اس نے خرید و فروخت کو تو جائز قرار دیا ہے، مگر سود کو حرام کہا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں وہ اسی طرح کھڑے ہیں جس طرح وہ آدمی کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود کی مانند ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو تو باقی ماندہ سود کو بھی چھوڑ دو اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کر لی ہے تو تمھارا اصل مال (رقم) تمھارے لئے ہے نہ تم کسی پر ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا اگر (قرض دار) مشکل میں ہو تو فراخی اور آسانی کی (حالت تک)

مَیْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (پ۳ سورہ بقرہ)	مہلت دی جائے اور اگر تم (یہ رقم) صدقہ کردو تو یہ تمھارے لئے بہتر ہے بشرطیکہ تم صحیح علم رکھو۔

احکام قرآنی کی قسم دوم

صلح وجنگ کے احکام

احکامِ قرآنی کی دوسری قسم وہ ہے جس میں احکام کے کچھ حصّہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو اور باقی حصّہ کی تفصیلات کو سنت اور علماءِ امت اور با اقتدار حضرات کے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہو، اس قسم میں وہ قرآنی احکام بھی شامل ہیں جو جہاد، نظامِ جنگ، قیدی، مالِ غنیمت اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کو واضح اور برقرار کرنے کے بارے میں نازل ہوئے تھے، اس طرح قرآن کریم کے احکام اور اس کی تعلیمات، نظامِ جنگ کی اصلاح کے ضامن ہیں اور انھوں نے جنگ کی خرابیوں کو دور کیا۔ قرآن کریم نے جنگ کو صرف ظلم وتعدی دور کرنے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس بات کی صراحت کردی گئی کہ مومنوں کو صرف ان دو وجوہات کی بنا پر جنگ کی اجازت دی گئی ہے (۱) ظلم وتعدی کے موقع پر جان کی حفاظت کرنا۔ (۲) جب کوئی کسی مومن کی راہ میں حائل ہو کر فتنہ وفساد برپا کرے یا لوگوں کو اسلام لانے یا اسلام کی تبلیغ کرنے سے روکے تو اس موقع پر بھی جہاد کا حکم دیا گیا ہے بہرحال ان احکام جہاد کے ساتھ اس بات کی قطعی ممانعت کردی گئی ہے کہ ظلم وتعدی کے لئے جنگ نہ کی جائے بلکہ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ صلح کے ساتھ رہنا لوگوں کا پیدائشی حق ہے لہٰذا اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو جائے اور اسے پسند کرے تو ہمیں چاہیئے کہ ہم صلح کو جنگ پر ترجیح دیں اس سلسلہ میں خدا نے ہمیں معاہدات اور صلح ناموں کی پابندی کرنے کا حکم دیا ہے اور اس میں خیانت کرنا حرام قرار دیا ہے صلح وجنگ، اور ان سے متعلق احکام کے بارے میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات قابل غور ہیں،

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا	ان لوگوں کو جن سے دوسرے لوگ جنگ کررہے ہوں (جنگ کی) اجازت دے دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ خدا ان کی مدد کرنے کی بہت بڑی قدرت

اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

(پ ۱۷ سورۃ الحج)

رکھتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے اپنے گھروں سے نکالے گئے (ان کا قصور یہ تھا) کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعے نہ ٹالتا تو خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور وہ مساجد جہاں اللہ کے نام کا بہت ذکر ہوتا ہے وہ سب کی سب گرادی جاتیں اور جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ ضرور اس کی مدد کرتا ہے درحقیقت اللہ بہت طاقتور اور غالب ہے،

(۲) وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (پ ۵ سورہ نساء)

تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان کمزور مرد، عورتوں اور بچوں کے لئے جنگ نہیں کرتے ہو جو یہ کہتے ہیں " اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال، جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے ایک ولی نعمت مقرر فرما اور ہمارے لئے اپنی طرف سے ایک مددگار بھی مقرر فرما۔

(۳) وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ

وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہوں ان سے اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور زیادتی نہ کرو، کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے انھیں قتل کرو، جہاں تم انھیں پاؤ اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم بھی انھیں نکالو اور فتنہ و فساد قتل سے زیادہ سنگین ہوتا ہے اور تم ان

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى
يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ
فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ
الْكٰفِرِيْنَ ○ فَاِنِ انْتَهَوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ
فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى
الظّٰلِمِيْنَ ○
فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا
عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (پ سورہ بقرہ)

(۴) وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاِنْ
يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ
حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ
بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ
اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ
اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ
اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(پ سورۃ انفال)

سے خانہ کعبہ کے قریب جنگ نہ کرو جب تک
کہ وہ تم سے وہاں جنگ نہ کریں ، اگر وہ تم
سے جنگ کریں تو تم انھیں قتل کرو اسی طرح
کافروں کا بدلہ ہے ، اگر وہ رک جائیں تو اللہ
بہت بخشنے والا مہربان ہے ، اگر وہ باز آجائیں
تو اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے اور ان سے
جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ وفساد باقی نہ
رہے اور دین و مذہب خالص اللہ کا ہوجائے
اگر وہ باز آجائیں تو سوائے ظالموں کے اور کسی
پر زیادتی نہ ہو۔ پھر جس نے تم پر زیادتی کی
ہو تو تم بھی اس کی تعدی کے مطابق جواب
دو۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ
پرہیزگاروں کے ساتھ ہے ،

(صلح کے بارے میں سورہ انفال میں ہے) اگر وہ
صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم صلح کی طرف
مائل ہو جاؤ۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو کیونکہ
وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اگر وہ چاہیں
کہ وہ تمھیں دھوکہ دیں تو اللہ تمھارے
لئے کافی ہے یہ وہ ذات ہے جس نے اپنی
مدد سے تمھاری اور مومنوں کی تائید کی ہے
اور ان کے دلوں میں الفت پیدا کی اگر تم تمام
روئے زمین کی چیزیں صرف کردو تو تم ان
کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے یہ اللہ ہی ہے
جس نے ان کے درمیان ان کے دلوں کو جوڑا
ہے کیونکہ وہ غالب اور حکمت والا ہے

(۵) وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ

(ایفاء عہد) اللہ کے وعدے کو پورا کرو جب تم عہد کرو اور تاکیدی قسمیں کھانے کے بعد انھیں مت توڑو جب کہ تم نے اللہ کو اپنے اوپر ذمہ دار قرار دیا ہو بے شک اللہ جو تم کرتے ہو اسے جانتا ہے اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے مضبوط سوت تیار کرنے کے بعد توڑ دیا ہو۔ تم اپنی قسموں کو اس بات کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔

(۶) فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (پ سورہ محمد)

جب تم ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کی خونریزی سے فارغ ہو جاؤ تو انھیں بیڑیوں میں جکڑ لو اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لو یہاں تک کہ جنگ اپنا بوجھ اتار دے (اس میں جنگی قیدیوں کا حکم بتایا گیا ہے کہ جب تم دشمن پر اچھی طرح غالب آجاؤ اور ان کے خطرے سے محفوظ ہو جاؤ تو جنگی قیدیوں کو چھوڑنے کی دو صورتیں ہیں یا تو قیدیوں کو مفت چھوڑ دو یا ان سے مالی معاوضہ لو۔)

(۷) لَا يَنْهٰكُمْ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ

وہ لوگ جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہ کی ہو اور تمھیں تمھارے اپنے گھروں سے نہ نکالا ہو ان کے بارے میں اللہ اس بات

تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

(پ ۲۸ سورۃ ممتحنہ)

سے منع نہیں کرتا ہے کہ تم ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اور وہ لوگ جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہو اور تمھارے اپنے گھروں سے تمھیں نکالا ہو اور تمھارے نکالنے پر ایک دوسرے کی مدد کی ہو تو ان کے بارے میں اللہ اس بات سے منع کرتا ہے کہ تم ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھو اور جو ان سے دوستی رکھتے ہیں وہ (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے ہیں۔ (غیر قوموں کے ساتھ اس قسم کی ہدایت قرآن کریم کی اعلیٰ تعلیم کا نمونہ ہے)

(۸) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

(۸) (مال غنیمت کا حکم) تم جان لو جو تم نے مال غنیمت حاصل کیا ہو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں اور مسافروں کے لئے ہے،

(۹) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ

(بغیر جنگ مال غنیمت حاصل کرنے کا حکم) اللہ تعالیٰ نے ان بستیوں کے لوگوں کا جو مالِ غنیمت عطا فرمایا ہے وہ اللہ، رسول رشتہ داروں یتیموں، غریبوں اور مسافروں کا (حصہ) ہے تاکہ یہ (محض) تمھارے دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرے،

(۱۰) وَلَا تؤتوا السفهاء اموالكم التى جعل الله لكم قياما وارزقوهم فيها واكسوهم وقولوا لهم قولا معروفا

(نادان یتیموں کے مال کی حفاظت) ان نا سمجھ (یتیموں) کو تم اپنا وہ مال نہ دو جس کا اللہ تعالیٰ نے تمھیں محافظ قرار دیا ہے اور انھیں کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے اچھی بات کہو ـــ

وَابتلوا الیتمیٰ حتیٰ اِذا
بَلَغُوا النکاح فَاِن آنستم
مِنھُم رُشداً فَادفعُوا
اِلیھم اموالھم ولا
تاکلوھا اسرافاً وبداراً
اَن یکبروا ومن کانَ
غنیاً فلیستعفف۔ وَمَن
کانَ فقیراً۔ فلیاکل
بالمعروف فاذا دفعتم
اِلیھم اموالھم فاشھدوا
علیھم وکفیٰ باللہ حسیبا۵
وَلیخش الذین لو ترکوا
من خلفھم ذریۃً ضعافا
خافوا علیھم فلیتقوا اللہ
وَلیقولوا قولاً سدیدا۵
اِنَّ الَّذِینَ یاکُلُونَ اموال
الیتمیٰ ظلماً اِنَّما یاکُلُونَ
فی بطونھم ناراً وسیصلَونَ
سَعیراً ۵ (سورۃ النساء پ)

یتیموں کو تم اس وقت تک آزماتے رہو،
جب تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہونچ جائیں
اس کے بعد اگر تم ان میں ہوشیاری دیکھو
تو انھیں ان کا مال دے دو۔ اور یہ مال
فضول خرچی کے ساتھ اور اس جلدی سے
نہ کھا جاؤ کہ وہ کہیں بڑے نہ ہو جائیں
اور جو دولت مند ہو تو اسے پرہیز کرنا
کرنا چاہیے، اور جو غریب ہو تو وہ مناسب
طریقے سے کھائے اور جب تم انھیں ان
کا مال سپرد کرو تو ان پر گواہ بنالو اور
اللہ حساب کرنے والا کافی ہے ان لوگوں
کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ بھی اپنے پیچھے
کمزور اولاد چھوڑ جائیں تو انھیں ان کے
بارے میں اندیشہ رہے گا، لہذا وہ اللہ
سے ڈریں اور صحیح بات کہیں۔ بے شک
وہ لوگ جو ظلم کے طور پر یتیموں کے مال
کو کھاتے ہیں وہ اپنے شکم میں آگ
کھاتے ہیں، اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی
آگ میں مبتلا ہوں گے،

قرآنی احکام کی قسم سوم

مفصّل قوانین اس قسم میں وہ قوانین شامل ہیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور اور سنت نبویؐ کے بیان اور مجتہدین کے اجتہاد کے لئے اس میں بہت کم گنجائش رکھی گئی ہے کیونکہ ان کا ان احکام سے تعلق ہے جن کے ذریعے قومی خرابیوں اور گناہوں کا سدباب کیا جاتا ہے اور قومی بھلائی اور سماجی مفاد کو ملحوظ رکھا

جاتا ہے۔ ان قوانین کے ذریعے افراد وجماعت کی اس طرح تشکیل کی گئی ہے کہ ان سب کو عزت و سکون، امن، تعاون وترقی کے اسباب مہیا ہو سکیں یہ وہ قوانین ہیں جو بدلتے نہیں ہیں اور نہ زمانے اور قوموں کی تبدیلی سے ان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے ایسے مفصل احکام حسب ذیل ہیں:۔

شرعی حدود

دنیاوی سزائیں جنہیں قصاص اور حدود کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ عقوبات اور سزائیں ایسی سخت ہیں جو سماجی اور انفرادی جرائم پر مقرر کی گئی ہیں، جن کے نقصانات متعدی ہیں اور ان کی خرابیاں اس قدر پھیلتی ہیں کہ وہ کسی حد پر ختم نہیں ہوتی ہیں لہذا اگر ایسی خرابیاں کسی قوم میں بڑھ جائیں تو اس کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اس طرح فتنہ وفساد اور بدنظمی عام ہو جاتی ہے اور بے چینی پھیل جاتی ہے ان جرائم میں سب سے بڑھ کر تین جرائم ہیں، پہلا جرم جانوں کی ہلاکت ہے، دوسرا جرم لوگوں کی عزت وآبرو پر حملہ کرنا ہے، اور تیسرا جرم لوگوں کے مال پر دست درازی کرنا ہے، ان کے علاوہ ظلم وتعدی کی جو دوسری صورتیں ہیں وہ مذکورہ بالا جرائم سے کم تر ہیں چونکہ قرآن کریم کے قوانین دینی فطرت کے مطابق ہیں اس لئے اس نے یہ نہیں چاہا کہ ایسے کمتر جرائم کے لئے مسلمان قوم کے لئے مقررہ اور خصوصی سزائیں مقرر کی جائیں بلکہ زمانے کے بدلتے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے ان کے لئے سزائیں مقرر کرنے کا فیصلہ ارباب حل وعقد اور مجتہدین پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ حالات اور زمانے کے مطابق وہ جیسی چاہیں سزائیں مقرر کریں اس قسم کی سزاؤں کو اسلامی شریعت میں تعزیرات کہتے ہیں، ان کا میدان بہت وسیع ہے اور اس معاملے میں منصف حکام اور ائمہ مجتہدین اور ارباب حل وعقد کے لئے بہت گنجائش رکھی گئی ہے۔

بہرحال وہ جرائم جن کے احکام قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ قتل عمد

اس کی سزا قصاص ہے سوائے اس صورت کے کہ مقتول کا وارث خون معاف کر دے یا لینے پر رضامند ہو جائے[1] جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے

---

[1] قتل عمد کے بارے میں مقتول کے وارث کو اختیار ہے کہ یا تو وہ قصاص لے یا دیت دے قاتل اس بات پر رضامند ہو یا نہ ہو۔ یہ امام شافعی، امام احمد اور اشہب کی روایت کے مطابق امام مالک کی رائے ہے لیکن ان کے دوسرے شاگرد ابن القاسم نے امام مالک سے یہ روایت بیان کی ہے کہ وارث مقتول کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قصاص لے یا قاتل کو معاف کر دے وہ دیت صرف اسی صورت میں لے سکتا ہے (باقی صفحہ

يا ايها الذين امنوا كتب
عليكم القصاص في القتلى
الحر بالحر والعبد بالعبد
والانثى بالانثى فمن
عفي له من اخيه شيء
فاتباع بالمعروف واداء
اليه باحسان ذلك
تخفيف من ربكم ورحمة
فمن اعتدى بعد ذلك
فله عذاب اليم ۝ ولكم
في القصاص حيوة يا اولي
الالباب لعلكم تتقون ۝

(پ۲ سورہ بقرہ)

اے ایمان والو! مقتول کا قصاص لینا تم
پر فرض کیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد
ہے، غلام کے بدلے غلام ہے اور عورت
کے بدلے عورت ہے، اگر اس کے بھائی
کی طرف سے اس کو معاف کر دیا جائے
تو مناسب طریقے کی پیروی کی جائے اور
احسان کے ساتھ (دیت) ادا کی جائے
یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف
اور رحمت ہے، اس کے بعد جو کوئی
زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک
عذاب ہے، اے عقل مندو! قصاص میں
تمہارے لئے زندگی ہے شاید کہ تم تقویٰ
اختیار کر سکو۔

ولا تقتلوا النفس التي
حرم الله الا بالحق ومن
قتل مظلوما فقد جعلنا
لوليه سلطانا فلا يسرف
في القتل انه كان منصورا

(پ۱۵ سورہ بنی اسرائیل)

اس جان کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار
دیا ہو ناحق قتل نہ کرو، اور جو مقتول
مظلوم ہو اس کے سرپرست کو ہم نے
اختیار دیا ہے لہذا وہ قتل کرنے میں زیادتی
نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی جاتی ہے

(بقیہ صفحہ ۴۹) جبکہ قاتل دیت دینے کے لئے رضامند ہو جائے فقہائے حنفیہ کے نزدیک ولی کو قصاص
لینے یا مال پر صلح کرنے یا بالکل معاف کر دینے کا اختیار حاصل ہے، امام مالک کے نزدیک وہ سرپرست
جنہیں قصاص لینے اور معاف کر دینے کا اختیار حاصل ہو عصبہ کہلاتے ہیں، مگر دوسرے ائمہ
کے نزدیک ایسا ہر شخص وارث ہو سکتا ہے ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد، تفسیر بیضاوی
کشاف اور دیگر کتب فقہ،

علامہ جار اللہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں مذکورہ بالا پہلی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ـــــــ "اس آیت میں مقتول کے والی اور قاتل دونوں کو اچھی نصیحت کی گئی ہے یعنی مقتول کے ولی کو یہ چاہیئے کہ وہ قاتل کے ساتھ سختی نہ کرے اور اس کے سامنے معقول مطالبہ پیش کرے اس طرح قاتل کو بھی یہ چاہیئے کہ وہ خون بہا پیش کرنے میں معقولیت کا ثبوت پیش کرے اور اس مطالبہ کو پورا کرنے میں ٹال مٹول یا حق تلفی سے کام نہ لے نیز معافی اور دیت کی جو رعایت دی گئی ہے وہ خدا کی طرف سے تخفیف و رحمت ہے کیونکہ اہل تورات پر صرف قصاص فرض کیا گیا تھا اور وہ معاف کرنے یا دیت لینے سے محروم کر دئے گئے تھے اور اہل انجیل کے لئے صرف معافی کا حکم تھا، مگر مسلمان قوم کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرے یا تو وہ قصاص لے یا دیت لے کر چھوڑ دے یا معاف کر دے، اس طرح ان کے لئے نہایت سہولت رکھی گئی ہے

قصاص و دیت

حدیث شریف میں مذکور ہے ـــــــ "جس کا کوئی آدمی مقتول ہو تو وہ دو باتوں میں سے کسی ایک بہتر بات پر غور کرے یا تو فدیہ لے یا قصاص لے ـــ" تمام کتب حدیث میں یہی روایت ہے مگر صحیح ترمذی کے الفاظ یہ ہیں ـــــــ "یا معاف کر دے یا قتل کرے"

حضرت ابو شریح الخزاعی فرماتے ہیں ـــــــ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے 'جو کوئی خون یا زخم کے مقدمے میں مبتلا ہو تو اُسے تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا اختیار حاصل ہے یا تو وہ قصاص لے یا دیت وصول کرے یا بالکل معاف کر دے، اگر وہ چوتھی چیز کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو"

شرعی مصلحت

ان احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت نے مقتول کے ولی کو قصاص کا حق دیا ہے اور معاف کر دینے کا حق بھی دیا ہے جس سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے خواہ یہ معافی مفت میں ہو اور کوئی دیت نہ لی جائے یا دیت کے بدلے میں ہو یا مال کی مقررہ رقم پر صلح کر کے معاف کر دیا جائے یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے اس بات کی تصریح کی ہے [۲] کہ قصاص کے حق میں خدا اور بندے

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب نیل الاوطار ساتواں حصہ

[۲] ملاحظہ ہو کتاب الدر المختار بر علامہ ابن عابدین کے حاشیے کا چوتھا حصہ

دونوں کا حق شامل ہے تاہم بندے کا حق غالب ہے ۔ چونکہ اسلامی شریعت عقل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسانوں کے نہ صرف مفادات کا لحاظ رکھتی ہے بلکہ ان کی خواہشوں کو بھی دور کرتی ہے اس لئے وہ مقتول کے سرپرستوں سے معافی کے حق کو چھین نہیں سکتی یا قصاص کا حق ان کے علاوہ دوسروں کے سپرد بھی نہیں کر سکتی ہے کیونکہ اس جرم کی زد میں سب سے پہلے براہ راست اس کے سرپرست آتے ہیں وہاں سے آگے بڑھ کر پورے معاشرے پر اس کا اثر پڑتا ہے لہذا معاشرے میں سب سے پہلے انہی لوگوں پر ان کے اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں اور انہی کو براہ راست نقصان اٹھانا پڑتا ہے لہٰذا یہ ظنِ غالب ہے کہ وہ اپنی فطری رجحانات کے مطابق قصاص اور انتقام لینے پر اصرار کریں کیونکہ انھیں اس کا سب سے زیادہ رنج پہونچتا ہے اور اس کے قتل کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں ، ایسی صورت میں اگر وہ اپنی خوشی اور مرضی سے قاتل کو معاف کرنے پر آمادہ ہوں یا قصاص سے دست بردار ہو کر مال لے کر یا مفت میں اسے معاف کر دیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ قصاص کے بجائے چند اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کام کر رہے ہیں یا ان کے لئے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ وہ قصاص سے دست بردار ہو کر معاف کر دینے کو عین مصلحت سمجھتے ہیں وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے طبعی اور فطری خواہشوں کے خلاف اسی وقت کوئی کام کرتا ہے جبکہ وہ کام اس کے حالات کے لحاظ سے اہم اور مفید نہ ہو اور اسی وجہ سے وہ ایسے کام کو اپنی فطری خواہشوں پر ترجیح دیتا ہے تاہم میری رائے میں ان مصلحتوں اور رجحانات کے باوجود پولیس اور حکومت کو مقتولوں کے سرپرستوں کی حمایت کرنی چاہیے بلکہ جرم کو ثابت کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن مدد کرنی ضروری ہے ۔

مخصوص حالات

بعض دفعہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی بناء پر عام مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ معافی کے حق کو مقید کر دیا جائے یا مقتول کے سرپرست کو اس سے محروم کر دیا جائے ، ایسے ہی حالات بعض ایسے جرائم میں بھی پیش آتے ہیں جبکہ ایسے لوگوں پر جرم کا ارتکاب کیا جائے جو قانون اور عام نظام کے ماتحت اپنے فرائض منصبی کو ادا کر رہے ہوں نیز یہ صورت ایسے مقدمات میں بھی پیش آسکتی ہے جن میں یہ ثبوت مل جائے کہ مقتول کے سرپرست کا قاتل کو معافی دے دینا خود مقتول سے

انتقام لینے کی خواہش کا اظہار کرتا ہو۔ لیکن اگر قاتل جرم کا عادی ہو چکا ہو اور معافی کے بعد دوبارہ قتل کے جرم کا ارتکاب کرے اور عام لوگوں کے جان و مال کے لئے خطرہ بن گیا ہو یا مقتول کے سرپرست نے معاف کردینے یا دیت وصول کرنے کے بعد قاتل کو قتل کردیا ہو۔[1] یہ حالات ایسے ہیں کہ انھیں مفتیان کرام اور مجتہد علماء کے سامنے پیش کیا جائے اور ان کی تائید حاصل کرنے کے بعد ایسے مخصوص حالات کے لئے ایک خاص قانون بنایا جائے جس کی رو سے معافی کے اختیار مقتول کے سرپرست سے چھین لئے جائیں اور ایک مستقل قانون بنایا جائے۔

قتل خطا غلطی سے قتل کردینے کا حکم سورہ نساء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ (پ۵ سورہ نساء)	جس نے کسی مومن کو خطا اور غلطی سے قتل کیا ہو تو ایک مومن غلام کو آزاد کیا جائے اور پوری دیت مقتول کے وارثوں کو ادا کی جائے، بجز اس کے کہ وہ معاف کریں اگر مقتول کا تعلق تمھارے دشمن کی طرف سے ہو اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کردیا جائے اور اگر اس کا تعلق ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمھارے معاہدات ہوں تو اس کے گھر والوں کو پوری دیت ادا کی جائے اور ایک مومن غلام کو آزاد کیا جائے جس کے لئے یہ صورت ممکن نہ ہو تو اللہ سے توبہ کرکے لگاتار دو مہینوں کے روزے رکھے اور اللہ بہت علم و حکمت والا ہے۔

[1] اس آخری صورت کا ذکر علامہ بیضاوی نے احتمالی صورت کی حیثیت سے مذکورہ بالا آیت فمن اعتدیٰ بعد ذٰلک فلہ عذاب الیم کی تفسیر میں کیا ہے۔

دیت کا نظام سنت نبویؐ نے بیان کیا ہے اس لئے اس کا تذکرہ تشریع نبویؐ کے باب میں آئے گا

(ب) چوری

چوری کی سزا اللہ تعالےٰ نے سورہ مائدہ (پ ۶) میں اس طرح بیان فرمائی ہے :-

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ ان کے فعل کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے یہ عذاب ہے اور اللہ بہت عزت و حکمت والا ہے جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ کر کے اصلاح کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے ،

اکثر علماء کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ توبہ کرنے سے جس کی طرف مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے، چوری کی حد شرعی دنیا میں ساقط نہیں ہو گی البتہ آخرت کا عذاب ساقط ہو سکتا ہے بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ چوری وغیرہ میں توبہ کرنے سے شرعی حدود ساقط ہو سکتے ہیں بشرطیکہ مجرم حدود شرعی قائم کرنے والے حاکم کے پاس بغیر بلائے آئے اور اپنی توبہ کا اظہار کرلے ،

امام ابن تیمیہ نے ان دونوں کے درمیانی مسلک کو اختیار کیا ہے آپ فرماتے ہیں :- اگر اس قسم کا کوئی مجرم توبہ کر کے امام (حاکم وقت) کے پاس آئے تو اسے اختیار ہے کہ اسے چھوڑ دے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حد شرعی کے مجرم کو جس نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا تھا یہ فرماتے ہوئے چھوڑ دیا تھا " جاؤ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے"

اسی طرح حاکم وقت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ مجرم پر حد شرعی جاری کرے جس طرح آپ نے ماعز اور غامدیہ پر حد شرعی جاری کی تھی جبکہ ان دونوں نے زنا کا اقرار کیا تھا اور وہ دونوں اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ انھیں پاک و صاف کرنے کے لئے ان پر حد شرعی جاری کی جائے [1]

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی اور کتاب القیاس فی الشرع الاسلامی " صفحات ۱۲۶ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ مطبع سلفیہ مصر ۱۳۴۶ھ

(ج) قتل وغارت اور رہزنی

اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ میں قتل وغارت اور رہزنی کی سزا بھی اس طرح بیان فرمائی ہے،

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝	بے شک ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرتے رہتے ہوں اور زمین میں فتنہ وفساد کی کوشش کرتے ہوں یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انھیں زمین سے جلاوطن کر دیا جائے، یہ ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے سخت عذاب ہوگا۔ سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے اس سے پہلے کہ تم ان کا فیصلہ کرو، توبہ کر لی ہو، جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،

(د) زنا

زنا کی سزا قرآن کریم میں تفصیل کے بغیر سو کوڑے بیان کی گئی ہے جیسا کہ سورۂ نور میں فرمایا ہے:-

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝	زناکار مرد وعورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین کے بارے میں تمھیں ان پر رحم نہیں آنا چاہیئے، بشرطیکہ تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور مومنوں کی ایک جماعت کو ان کی سزا کے موقع پر حاضر ہونا چاہیئے

لیکن حدیث نبویؐ میں یہ آیا ہے کہ اگر زانی آزاد بالغ ہوش مند اور شادی شدہ

ہو (جسے شریعت کی اصطلاح میں محصن کہا جاتا ہے) تو اسے سنگسار کیا جائے[۱]

چنانچہ صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے — "ابو اسحاق الشیبانی نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے دریافت کیا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار (رجم) کیا؟ انھوں نے فرمایا — "ہاں" انھوں نے پوچھا — "کیا سورۂ نور کے نازل ہونے کے بعد سنگسار (رجم) کیا یا اس سے پہلے کیا" انھوں نے فرمایا — "میں نہیں جانتا"[۲]

(۵) پاکدامن عورتوں کو بدکاری کا الزام لگانا[۳]

قرآن کریم نے تہمت لگانے والے پر اسّی کوڑے کی سزا مقرر فرمائی ہے جیساکہ اللہ تعالیٰ سورۂ نور (پ۱۸) میں فرماتا ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

اور وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں پھر چار گواہ لے کر نہیں آتے ہیں تو انھیں اسّی کوڑے کی سزا دو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو یہ لوگ بدکار ہیں، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر کے اصلاح کر لی ہو تو خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،

---

[۱] ایسی صورت میں مذکورہ بالا آیت میں کوڑے کی سزا غیر محصن کے لئے مخصوص ہوگی محصن سے مراد آزاد، بالغ، عقل مند اور جائز طور پر شادی شدہ ہونا مراد ہے، حنفیہ نے اس کے ساتھ مسلمان ہونے کی قید کا بھی اضافہ کیا ہے،

[۲] ملاحظہ ہو تاریخ التشریع الاسلامی از خضری چوتھا ایڈیشن صفحہ ۱۴۳ نیز اردو ترجمہ تاریخ فقہ اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی (مترجم)

[۳] اسی طرح (محصن) پاک دامن مردوں پر بدکاری کی تہمت لگانے کی بھی سزا یہی ہے اگر غیر محصن اشخاص پر (خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں) بدکاری کا الزام لگایا گیا ہے یا بدکاری کے علاوہ (باقی صفحہ ۵۷)

مگر قرآن کریم نے ان شوہروں کے لئے جو اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہوں اور ان کے پاس اپنی ذات کے علاوہ اور کوئی گواہ نہ ہو ایک خاص نظام مقرر فرمایا ہے جو لعان کے نام سے مشہور ہے چنانچہ مذکورہ آیات کے فوراً بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ
وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ
اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ
اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ
بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔
وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ
عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔
وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ
تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ
بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ
عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ

وہ لوگ جو اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہوں اور ان کے پاس اپنی ذات کے علاوہ اور گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ہر ایک چار مرتبہ شہادت دے کہ خدا کی قسم وہ ضرور سچا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو، اگر عورت یہ الفاظ کہے تو اس کی سزا دور ہو سکتی ہے اگر چار مرتبہ وہ یہ کہے کہ وہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو اس پر خدا کا غضب نازل ہو۔

ان آیات سے پیشتر تہمت لگانے پر حد شرعی جاری ہو جاتی تھی خواہ عورت پر بدکاری کا الزام اس کا شوہر لگائے یا کوئی اجنبی مرد لگائے جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد وہ واقعہ رونما ہوا جس کی بنا پر تہمت کے احکام کی تفصیل میں مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اس کی صورت یہ ہوئی کہ مرد اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود اپنی ذات کے علاوہ اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسی صورت میں لعان[1] یا ملاعنہ کی صورت پیدا

(بقیہ صفحہ ۵۶) اور کسی بات کا الزام لگایا جائے تو اس موقع پر حد شرعی جاری نہیں ہوگی بلکہ تعزیر ہوگی جس کی سزا کا تعین حاکم وقت کے فیصلہ پر موقوف ہوتا ہے یہاں محصن سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص آزاد، بالغ، عقل مند اور پاک دامن ہو، ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی و دیگر کتب فقہ۔

[1] لعان کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ قسم کھا کر مذکورہ بالا قرآنی طریقے کے مطابق (باقی صفحہ ۵۸)

ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کا شان نزول اس طرح بیان فرمایا ہے ـــــ ہم جمعہ کی رات مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک انصاری داخل ہوا اور کہنے لگا ـــــ "یا رسول اللہ! اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک مرد کو پایا، اگر وہ اس مرد کو قتل کر دے تو آپ لوگ اس شوہر کو قتل کر دیں گے اگر وہ اس بارے میں گفتگو کرے تو آپ (حد قذف میں) کوڑے ماریں گے اور اگر وہ خاموش رہے تو غیظ و غضب پر خاموش رہے گا۔" اس کے بعد اس نے کہا ـــــ "اے خدا! (یہ بات) کھول دے" اس پر لعان کی آیت نازل ہوئی۔

شراب نوشی شراب نوشی کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ نجاست ہے مگر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی اور نہ اس کے لئے اس طرح حد شرعی مقرر کی جس طرح مذکورہ بالا جرائم کے لئے حد شرعی مقرر ہے تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم پر ہاتھوں، جوتوں، کپڑوں اور کھجور کی شاخوں کے کوڑے بنا کر مارا ہے اور چالیس کوڑوں کی سزا دی گئی ہے، مگر جب لوگوں نے اس سزا کو بہت کم سمجھا اور اس جرم کا لگاتار ارتکاب کرتے رہے تو خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر بن الخطابؓ نے شراب نوشی کے لئے اسّی کوڑوں کی سزا مقرر کی اور اس جرم پر لوگوں کو جلاوطن بھی کیا اور ان کا سر بھی منڈایا۔ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں یہ قانون سنّت کے مطابق ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوش کو چوتھی مرتبہ اس جرم کا ارتکاب کرنے پر قتل کا حکم دیا ہے اور اسے منسوخ نہیں فرمایا اور اس کے لئے ضروری حد مقرر نہیں فرمائی یہ ایسی سزا ہے جس کا تعین حاکمِ وقت کی مصلحت اور اجتہاد پر موقوف ہے لہٰذا (حضرت عمرؓ کا) چالیس کوڑوں پر اضافہ کرنا جلاوطنی اور سر منڈانا قتل سے زیادہ سہل ہے۔

حدود و تعزیر خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ شارع کی طرف سے مختلف جرائم پر جو سزائیں مقرر ہیں انھیں حدود کہا جاتا ہے جیسا کہ وہ سزائیں جو قرآن کریم

(بقیہ صفحہ ۵۷) شہادت دی جائے اور پانچویں مرتبہ مرد لعنت کا لفظ استعمال کرے اور عورت خدا کے غضب کا لفظ استعمال کرے ملاحظہ ہو آیت لعان دیگر مسائل کتب فقہ میں مذکور ہیں

نے زنا، تہمت، چوری اور رہزنی کے بارے میں مقرر فرمائی ہیں، مگر جن جرائم پر سزائیں مقرر نہیں ہیں ان کا تعین ائمہ کرام کے اجتہاد کے مطابق مختلف مصالح کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ان کا اندازہ حالات، اشخاص اور زمانوں کے اختلاف کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے انھیں تعزیرات کہتے ہیں، ان کا معاملہ مجتہدین کرام اور ارباب حل وعقد کے فیصلوں پر موقوف ہوتا ہے اور وہ موقع ومحل کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے گناہوں کی تین قسمیں کی گئی ہیں، پہلی قسم وہ ہے جس میں حد شرعی ہے اور کوئی کفارہ نہیں ہے جیسے چوری، زنا اور بدکاری کی تہمت لگانے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں کفارہ ہے اور حد شرعی نہیں ہے جیسے کہ ایک روزہ دار رمضان شریف کے دن اپنی بیوی کے ساتھ مقاربت کرے، تیسری قسم وہ ہے جس میں نہ حد شرعی ہے اور نہ کفارہ ہے، جیسے اجنبی عورت سے تنہائی میں ملنا اور حمام میں ننگے نہانا وغیرہ اس قسم کی برائیوں پر حاکم کی طرف سے تعزیر مقرر ہوتی ہے

قرض اور مالی امور کے قوانین

قرآن کریم نے قرض کے لین دین کی آیات میں ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ ہم قرض وغیرہ کے معاملات کو تحریر اور گواہی کے ذریعے یا کوئی چیز رہن رکھ کر باقاعدہ معاہدات کی شکل میں مستحکم کیا کریں۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لئے بتایا گیا ہے جو احتیاط کے خواہاں ہوں اور معاملات میں ایک دوسرے کے حقوق برقرار رہنے کی ضمانت اور کفالت چاہتے ہوں، ان معاملات کی تفصیل سورۃ بقرہ (پ۳) کی مندرجہ ذیل (طویل) آیات میں اس طرح آئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي	اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت کے لئے ادھار لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو تم میں سے جو لکھنے والا ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا، جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے لکھنے سے انکار نہ کرے (بلکہ) اسے لکھنا چاہیئے اور

عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ
رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا
فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا
اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ
هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ
مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى وَلَا
يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا
وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ
صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ
ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ
وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى
اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ
تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَاَشْهِدُوْٓا
اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ
وَّلَا شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا
فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ

جس پر حق (قرضہ) ہو وہ (معاملہ
کو لکھوائے (لکھواتے وقت) اسے
اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے، ڈرنا
چاہیے، وہ اس (رقم) میں سے کچھ
بھی کم نہ کرے (لیکن) اگر وہ شخص
جس کے ذمے قرض ہے۔ نادان یا
ناتوان ہو یا خود نہ لکھوا سکتا ہو تو
اس کا سرپرست ٹھیک ٹھیک لکھوائے
اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ
مقرر کرلو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک
مرد اور دو عورتیں ایسی ہوں جن کو
تم گواہوں میں سے پسند کرو تاکہ اگر
ان میں ایک بھول جائے تو دوسری اسے
یاد دلا دے اور جب گواہ طلب کئے
جائیں تو انہیں (حاضر ہونے سے)
انکار نہیں کرنا چاہیے (کوئی معاملہ) چھوٹا
ہو یا بڑا۔ اسے مقررہ مدت تک لکھنے
میں سستی نہ کرو یہ اللہ کے نزدیک بڑے
انصاف کی بات ہے اور اس سے شہادت
قوی رہتی ہے اور اس طرح تم تقریباً شک
شبہ نہیں کرسکتے لیکن اگر دست بدست
تجارتی معاملے کو گردش میں لا رہے ہو
اور تم ایسے معاملہ کو نہ لکھو تو اس میں کوئی
حرج نہیں ہے: اور جب تم خرید و فروخت
کرو تو گواہ مقرر کر لیا کرو تا ہم

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

لکھنے والے اور گواہ کو تکلیف نہ دی جائے، اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے اللہ سے ڈرتے رہا کرو کہ وہی تمہیں سکھاتا ہے اور وہی ہر چیز سے بخوبی واقف ہے اور اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں لکھنے والا نہ ملتا ہو تو (قرضخواہ کے) قبضے میں کوئی چیز رہن رکھدی جائے اور اگر تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے پاس کوئی چیز امانت رکھے تو وہ شخص جس کے پاس امانت رکھی گئی ہو، (وقت پر) امانت کو واپس کردے (ایسی صورت میں) اسے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتے رہنا چاہیے، تم گواہی کو مت چھپایا کرو۔ جو کوئی شہادت کو ظاہر نہیں کرتا ہے اس کا دل گناہ گار ہے، اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔

حلال وحرام

قرآن کریم نے کئی آیات کریمہ میں حلال وحرام کھانوں کی تفصیلات بیان فرمائی ہے (جن میں سے چند مندرجہ ذیل آیات ہیں)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۖ فَمَنِ

اے ایمان والو! ہم نے تمہیں جو رزق عطا کیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اگر تم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکریہ ادا کرو اس نے تم پر مردار (بغیر ذبح کیا ہوا جانور) خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جن پر اللہ کے سوا اور کسی کا نام

اِضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔

پکارا جائے حرام کیا ہے اور جو کوئی ایسی حالت میں مجبور ہو جائے کہ اس کا ارادہ نافرمانی کا نہ ہو اور نہ زیادتی کرنا چاہتا ہو۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بے شک اللہ بخشنے والا ہے ؛

(۲) حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ وَالْمُنْخَنِقَۃُ وَالْمَوْقُوْذَۃُ وَالْمُتَرَدِّیَۃُ وَالنَّطِیْحَۃُ وَمَا اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ ، وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ ۔

تم پر (یہ چیزیں) حرام کی گئی ہیں (۱) مردار (جو بغیر ذبح کے مرگیا ہو) (۲) خون (۳) سؤر کا گوشت (۴) اور وہ جانور جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کے سوا اور کسی کا نام پکارا جائے ، (۵) گلا گھونٹا ہوا جانور۔ (۶) لاٹھی اور پتھر سے مرا ہوا جانور ۔ (۷) بلندی سے یا کنوئیں میں گر کر مرا ہوا جانور (۸) سینگ مارنے سے مرا ہوا ۔ (۹) جسے درندہ پھاڑ کھائے ، مگر جو تم نے ذبح کر لیا (مرنے سے پہلے ذبح کیا ہو) تم پر حلال ہے ؛ (۱۰) اور وہ جانور جو استھانوں (قربان گاہوں) پر ذبح کیا گیا ہو ، (۱۱) وہ جانور جو تم پانسے ڈال کر ذبح کرو ...... اور جو کوئی بھوک سے

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ، اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۔ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ

مجبور ہو جائے ایسی صورت میں کہ وہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے وہ تم سے دریافت کرتے ہیں ان کے لئے کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں ۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور (شکاری) تمہارے ان

أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ۔	سدھائے ہوئے جانوروں کا جنھیں تم اسی طرح شکار کرنا سکھاتے ہو جس طرح اللہ نے تمہیں سکھایا ہے، لہٰذا تمھارے لئے جو (شکار) وہ پکڑ کر لائیں وہ کھالیا کرو اور اس پر اللہ کا نام لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے، آج تمھارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہل کتاب (یہودی و عیسائی) کا کھانا تمھارے لئے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لئے حلال ہے
(۳) أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ۔	تمھارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے تاکہ تمھیں اور مسافروں کو فائدہ پہنچے،
(۴) فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ـــــ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ۔	جس پر اللہ کا نام لیا جائے اسے کھاؤ اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو اور جس پر اللہ کے نام کا ذکر نہ کیا جائے اسے مت کھاؤ یہ بہت بڑا گناہ ہے،
(۵) قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ،	(اے رسول) کہہ دیجئے جو وحی مجھ پر نازل ہے اس میں میں کوئی چیز کھانے والے کے لئے حرام نہیں پاتا ہوں سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہنے والا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کیونکہ یہ ناپاک ہے یا وہ چیز ہو جس پر اللہ کے سوا اور کسی کا نام پکارا جائے جو بہت بڑا گناہ ہے مگر جو

فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

مجبور ہو جائے اور اس کی نیت سرکشی اور زیادتی کی نہ ہو تو تمہارا پروردگار (اسے) بہت بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے

(۱۴) وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبَاتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبَائِثَ

(رسول اللہؐ کی تعریف میں اس طرح فرمایا گیا ہے) وہ رسولؐ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال فرماتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام فرماتا ہے،

شراب کی حرمت

قرآن کریم میں شراب بھی حرام کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ

اے ایمان والو! شراب، جوا، بت، اور پانسے شیطان کے عمل میں سے گندے کام ہیں ان سے پرہیز کرو۔ شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوے کے ذریعے تم میں دشمنی اور بغض پیدا کرے، اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے۔ کیا تم باز آنے والے ہو؟

قسمیں کھانا اور ان کا کفارہ

قرآن کریم نے قسموں کی اقسام اور ان کے کفارہ کا حال اس طرح بیان کیا ہے:۔

(۱) وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔

اور اللہ کو اپنی قسموں میں آڑ نہ بناؤ (کہ اس بہانہ سے) تم نیکی پرہیزگاری اور لوگوں کی اصلاح نہ کرو۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے،

(۲) لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ لَّا یُؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ	اللہ تمہاری لغو قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا ہے لیکن وہ تمہاری ان قسموں پر ضرور مواخذہ کرتا ہے جو تم سنجیدگی کے ساتھ پختہ قسمیں کھاتے ہو، اللہ بخشنے والا بردبار ہے،
(۳) لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ لَّا یُؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ فَکَفَّارَتُہٗ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَھْلِیْکُمْ اَوْ کِسْوَتُھُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ ۔ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ ۔ ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْا اَیْمَانَکُمْ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ آیَاتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۔	اللہ تمہاری لغو قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا ہے لیکن تمہاری (سنجیدہ) قسموں پر مواخذہ کرتا ہے اس کا کفارہ یہ ہے کہ تم دس مسکینوں کو ایسا متوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے گھر والوں کو کھانا کھلاتے ہو یا (اتنی تعداد کو) لباس پہناؤ یا ایک غلام کو آزاد کرو (مگر) جسے یہ بھی میسر نہ ہو، وہ تین دن کے روزے رکھے ۔ یہ تمہاری ان قسموں کا کفارہ ہے جو تم کھا بیٹھتے ہو (اور پورا نہیں کرتے ہو) تم اپنے قسموں کی حفاظت کرو اس طرح تمہیں اللہ اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے شاید تم احسان مانو [1]

حدیث شریف میں مذکور ہے کہ صرف اللہ کی قسم کھانی چاہیے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن الخطاب کو اپنے باپ کی قسم

---

[1] امام شافعی کے نزدیک لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو عربوں میں بلا قصد و نیت محاورہ اور تکیہ کلام کے طور پر مستعمل تھیں ۔ امام ابو حنیفہ کی یہ رائے کہ اس سے مراد کسی ایسی گذشتہ یا موجودہ بات پر قسم کھانا ہے جس کے بارے میں قائل کا یہ خیال ہو کہ ایسا ہی ہوا ہے حالانکہ اصل حقیقت اس کے برخلاف ہو،

کھاتے ہوتے سُنا تو آپ نے فرمایا ـــــــ اللہ نے منع فرمایا ہے کہ تم اپنے باپ دادا کی قسمیں کھاؤ جو کوئی قسم کھانا چاہے تو وہ اللہ کی قسم کھائے یا وہ خاموش ہو جائے،

ازدواجی احکام

قرآن کریم نے خاندانی زندگی کی طرف بہت توجہ مبذول کی ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے ایسا نظام اور ایسے قوانین مقرر کئے ہیں، جن کی بدولت خاندان کا اتحاد، اس کی پاکیزہ زندگی اور مستحکم تعلقات برقرار رہ سکیں، بلکہ ان قوانین کی بنیادیں محبت، رحم، انصاف اور احسان پر قائم ہیں۔

ترغیب ازدواج

قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کی حوصلہ افزائی کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (پ ۱۸ سورہ نور)

تم میں جو (عورت یا مرد) غیر شادی شدہ ہو اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو نیک ہوں۔ ان سب کا نکاح کرا دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے انھیں تونگر کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور خبردار ہے اور جن کو نکاح میسر نہ ہو تو وہ پاک دامنی اختیار کریں تا آنکہ اللہ اپنے فضل سے انھیں خوشحال کر دے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کی حکمت اس طرح بتا کر اسے اپنی ایک بڑی نعمت قرار دیا ہے

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (پ ۲۱ سورہ روم)

خدا کی یہ زبردست نشانی ہے کہ اس نے تمہارے اندر سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے مانوس رہو، اور پھر تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی کے تعلقات قائم کئے اس میں بھی ان لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہوں

نکاح کا مہر

نکاح کے مہر کا اس طرح ذکر فرمایا ہے :-

(۱۳) وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (پ سورہ نساء) — عورتوں کو ان کا مہر عطیہ کے طور پر دے دو

(۱۴) وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ (پ نساء) — (ان محرمات) کے علاوہ تمہارے لئے جائز قرار دیا گیا ہے کہ تم اپنے مال کے ذریعے پاکدامن عورتیں جو بدکار نہ ہوں تلاش کرو۔

محرمات

قرآن کریم نے ان عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو نسبی رشتے یا رضاعی رشتے یا سمدھیانے رشتے کی رو سے حرام ہیں چنانچہ سورۃ نساء (پ) میں اس اس طرح تفصیل ہے :-

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۧ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا

اور تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو البتہ جو ہو چکا (وہ معاف ہے) کیونکہ یہ بیحیائی اور (خدا کی) ناراضگی کا کام ہے اور برا طریقہ ہے۔ تم پر تمہاری مائیں، بیٹیاں بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں حرام ہیں نیز تمہاری وہ رضاعی مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری ساسیں اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو اور وہ تمہاری پرورش میں ہوں (وہ بھی حرام ہیں) پھر اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہیں کی ہو تو ان لڑکیوں کے

دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً

(۵ پ ۴ سورہ نساء)

ساتھ نکاح کرتے ہیں) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، نیز تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں (بہوئیں) (بھی حرام ہیں) (نیز یہ بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (ازدواجی رشتے میں) جمع کرو۔ مگر جو ہو چکا وہ معاف ہے بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور شادی شدہ عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) سوائے (ان لونڈیوں کے) جن کے تم مالک ہو (یہ باتیں) اللہ نے تم پر لکھ دی ہیں ان کے علاوہ اور سب (عورتیں) تم پر حلال ہیں (بشرطیکہ) تم اپنے مال کے ذریعے (انہیں) پاکدامنی حاصل کرنے کے لئے تلاش کرو اور بدکاری اور نفسانی خواہش کی تکمیل اس کا مقصد نہ ہو لہذا ان میں سے جس سے تم فائدہ اٹھاؤ تو انھیں ان کا مقررہ حق مہر ادا کرو۔

اہل کتاب خواتین سے نکاح

اہل کتاب کی خواتین سے قرآن کریم نے نکاح اس طرح حلال قرار دیا ہے،

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ

آج کے دن تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں، اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے پاکدامن مومن عورتیں اور اہل کتاب کی پارسا عورتیں بھی تم پر حلال ہیں بشرطیکہ تم انھیں ان کا حق مہر ادا کرو اور محض نفسانی خواہش کی تکمیل کرنا اور (انھیں) پوشیدہ آشنا

مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيٓ اَخْدَانٍ ؕ (پ سورہ مائدہ رکوع ۱)

بنانا تمہارا مقصد نہ ہو۔

مشرکہ اور غیر مسلم مرد سے نکاح

ان آیات میں مسلمان مرد کا مشرک عورت سے اور مسلمان خاتون کا غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے

(۱) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ

(پ بقرہ)

تم مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں یقیناً ایک مومن لونڈی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند آئے اور (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو کیونکہ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنا ہی پسند آئے، یہ لوگ دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے بہشت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنی آیات لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ وہ نصیحت قبول کر سکیں

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کو آزماؤ اللہ ان کے ایمان سے بخوبی واقف ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن عورتیں ہیں تو انہیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ نہ وہ ان مردوں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ مرد ان عورتوں کے لئے حلال ہیں

تعدد ازدواج کی حکمت

یہاں یہ بات واضح کرنی ضروری ہے کہ قرآن کریم نے ایک مرد کے لئے چار تک شادی کرنا جائز قرار دیا ہے، ایام جاہلیت میں عربوں کے ہاں تعدد ازدواج بالعموم رائج تھا اور اس کی کوئی حد مقرر نہ تھی یہاں تک کہ عام طور پر ایک مرد کی دس تک بیویاں ہوا کرتی تھیں اس طرح یہودیوں میں بھی اسیری سے پیشتر تعدد ازدواج کی رسم جاری تھی اور ان کے بادشاہ اور پیغمبر بھی اس پر عمل کرتے تھے، اس طرح دوسری قوموں میں بھی قانونی یا عملی طور پر اس کا عام رواج تھا۔ موجودہ دور میں اہل یورپ نے تعدد ازدواج پر قانونی پابندی لگادی ہے تاہم ان کے اکثر افراد بدکاری کرتے ہیں اور داشتہ رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا معاشرہ گناہ آلود اور گندہ ہو گیا ہے۔

اسلامی حل

اس مشکل کا اسلام اور قرآن کریم کیا حل پیش کرتا ہے؟ اس نے مرد کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ تعداد چار سے آگے نہ بڑھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ نساء میں فرماتا ہے:۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ

(پ۴ سورۃ نساء)

تمہیں جو عورتیں اچھی معلوم ہوں ان میں سے دو دو، تین تین اور چار چار سے نکاح کرلو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہ کرسکو گے تو تم ایک ہی پر یا جو تمہارے ہاتھ کا مال (لونڈی) ہو اسی پر اکتفا کرو، اس میں تمہیں ایک طرف نہ جھکنے کا خوب موقع ہے

اصلاحی قدم

یہ طریقہ اس زمانے کا پسندیدہ فعل تھا جس کو نہ تو کوئی برا سمجھتا تھا اور نہ انکار کرتا تھا اس لئے اس زمانے میں مسلمانوں نے اس کی اصل حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور اسلام اور قرآن کریم نے جو اصلاحی قدم اٹھایا تھا اسے وہ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے اسلام سے پیشتر تعدد ازدواج کی کوئی حد مقرر نہیں تھی بلکہ ایام جاہلیت میں تو مرد کے لئے کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں تھی نہ تو اس کا ضمیر اور نہ سماج اسے اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف کرے اس لئے وہ ایک بیوی کے

ساتھ دوسری بیوی کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کرتا تھا اور اس سلوک کی بدولت بعض بیویاں ہمیشہ بدبختی کی زندگی بسر کرتی تھیں کیونکہ اسلام سے پیشتر انھیں یہ حق بھی حاصل نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ان کے مرد اچھی طرح زندگی گزاریں بلکہ نہ ان کے لئے نان ونفقہ مقرر تھا اور نہ ان کے ساتھ باری مقرر کرنے میں انصاف کیا جاتا تھا۔

اسلامی پابندیاں

جب اسلام آیا تو اس نے تعدد ازدواج کو قطعی طور پر حرام نہیں کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ مردوں کو یہ اختیار بھی نہیں دیا کہ وہ لاتعداد شادیاں کریں اور عورتوں پر ظلم کرتے رہیں اس سلسلے میں قرآن کریم نے دو طرح کی پابندیاں لگائیں ۔ پہلی پابندی یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد چار سے زیادہ نہ ہو دوسری پابندی یہ ہے کہ ظلم و ناانصافی کا اندیشہ بھی نہ ہو اگر کسی کو یہ اندیشہ ہو جائے کہ وہ ایک بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح دیئے بغیر نہیں رہ سکے گا یا اسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ صرف ایک بیوی ہی کا خرچ برداشت کر سکتا ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اسے یقین ہو جائے کہ وہ ظلم و ناانصافی سے محفوظ نہیں رہ سکتا تو ایسی صورت میں اس کے لئے تعدد ازدواج جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک بیوی پر قناعت کرے جیسا کہ آیت مذکورہ کے آخر میں واضح طور پر یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تمھیں بے انصافی کا اندیشہ ہو تو ایک بیوی یا مملوکہ لونڈی کافی ہے، اس طرح (ایک بیوی پر قناعت کرکے تم اس ظلم و ناانصافی سے محفوظ رہو گے جس کا تعدد ازدواج کی صورت میں قوی امکان تھا)

تعدد ازدواج کے اسلامی اصول

تعدد ازدواج کی صورت میں اسلام نے یہ ضروری اصول مقرر کئے ہیں :۔

(۱) سب بیویوں کے ساتھ اچھی طرح سلوک کیا جائے (۲) حصہ بانٹنے میں ان کے ساتھ انصاف کیا جائے (۳) نان نفقہ شب باشی حسن سلوک اور تمام ازدواجی معاملات میں سب کے ساتھ مساوات اختیار کی جائے البتہ محبت اور دلی رجحانات قابل معافی ہیں کیونکہ یہ طبعی اور بشری رجحانات ہیں جن پر قابو نہیں پایا جا سکتا، تاہم اسلام نے ایسے لوگوں کو بالکل ایک طرف جھک جانے سے بھی منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد قرآنی ہے :۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔	تم عورتوں کے درمیان ہرگز انصاف نہیں کر سکو گے خواہ تم کتنا ہی چاہو، لہٰذا تم (کسی ایک کی طرف) بالکل نہ جھک جاؤ اور دوسری کو لٹکتی ہوئی حالت میں نہ چھوڑ دو، اگر تم اصلاح و تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،

(پ ۵ سورۃ النساء)

اسی اصول کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے درمیان منصفانہ تقسیم کرتے تھے آپ انصاف کرنے کے بعد یہ فرماتے تھے:۔

اے خدا جن چیزوں پر میرا اختیار ہے ان میں اس طرح (منصفانہ) تقسیم کرتا ہوں لہٰذا تو ان چیزوں پر جو میرے بس میں نہیں ہیں بلکہ ان کا تو ہی مالک ہے مجھ سے باز پرس نہ کر"

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

"جو چیز میرے بس میں نہیں ہے اسے تو خوب جانتا ہے"

اس حدیث میں حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ انتہائی محبت کرنے کی طرف اشارہ ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابو السعود)

اس سلسلے میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ چونکہ اسلام عالمگیر اصلاح کے لئے آیا ہے اس لئے تعدد ازدواج کا بالکل خاتمہ کرنا چاہیے تھا اور جس طرح اس نے جاہلیت کی دوسری رسموں کو حرام قرار دیا تھا اسی طرح اس رسم کو بھی حرام قرار دیتا اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں:۔

نکاح ثانی کی ضرورت

جس مذہب نے آکر تمام الہامی مذاہب کا خاتمہ کر دیا ہو اور جو ہر زمانے اور ہر مقام کے لئے قابل عمل بننے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ تعدد ازدواج کا دروازہ بند کر دیتا اور ہر حالت میں اسے ممنوع قرار دیتا۔ کیونکہ ہر زمانے میں کئی صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جس کی وجہ سے تعدد ازدواج ضروری ہو جاتا ہے مثلاً کسی کی بیوی بانجھ ہو یا حمل کی وجہ

ہے ناقابل تولید ہو اور مرد دوسری عورتوں کے ذریعے نسل کشی کے قابل ہو یا عورت کو
ایسا مرض لگ جائے جس کی بدولت وہ زوجیت کے فرائض کے ناقابل ہو لہٰذا مرد کا ایسی
صورت میں پاک دامن رہنا ممکن نہ ہو مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑنا
بھی نہیں چاہتا ہو یا مرد کو یہ محسوس ہو کہ صرف ایک عورت اس کی عفت و عصمت
برقرار رکھنے کے لئے ناکافی ہے یعنی اس کی مردانگی شدّت پر ہو اور اس کی بیوی کمزور
حالت میں ہو، ان تمام صورتوں میں مرد یا تو نکاح ثانی پر مجبور ہوتا ہے یا زناکاری میں
مبتلا ہو جاتا ہے جس سے نہ صرف دینداری کا خون ہوتا ہے بلکہ اس کی صحت اور مال و دولت
بھی تباہ ہوتی ہے، علاوہ ازیں بدکاری کی صورت نکاح ثانی سے بدتر ہے کیونکہ دوسری شادی
کے لئے اسلام نے ایسے شرائط رکھے ہیں کہ اگر ان کا لحاظ رکھا جائے تو اس سے کوئی نقصان
نہیں ہوتا ہے)

قومی ضرورت کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ جنگ یا وبائی امراض کی وجہ سے کسی قوم
میں مردوں کی قلت ہو جاتی ہے اس وقت عورتیں زیادہ ہو جاتی ہیں ایسی
صورت میں قومی مفاد کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ زیادہ عورتوں سے شادی کر کے نسل بڑھائی
جائے لہٰذا ایسے حالات میں کون سا اصلاح پسند رہنما اور قانون دان قومی ضرورتوں کو نظرانداز
کر کے تعدد ازدواج کی مخالفت کر سکتا ہے؟ اسلام نے بھی ایسے ہی حالات کے لئے ان کی
اجازت دی ہے اور اس پر بھی یہ پابندی لگا دی ہے کہ ظلم اور ناانصافی نہ ہو اور ان شرائط
کے باوجود تعدد ازدواج کو محض جائز قرار دیا ہے، واجب نہیں رکھا گیا ہے،

عورتوں کے اختیارات اسلام نے عورتوں کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ وہ شادی شدہ مرد
سے نکاح کریں یا نہ کریں بلکہ شریعت نے یہ بھی اجازت دی
ہے کہ نکاح کرتے وقت وہ یہ شرط مقرر کر سکتی ہیں کہ انھیں اختیار حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں
اپنے آپ کو طلاق دے دیں، جیسا کہ بعض ائمہ فقہ کا مسلک ہے کہ اگر کوئی شرط کتاب و سنت
کے صریح احکام کے خلاف نہ ہو اور اس کو جانبین منظور کر لیں تو وہ نافذ ہو جاتی ہے بالخصوص
نکاح کے شرائط تو ضرور قابل عمل سمجھے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی عورت شادی شدہ مرد سے نکاح
کرے اور نکاح کے وقت اس نے مذکورہ بالا حق طلاق کی شرط تسلیم نہ کرائی ہو اور اس شرط کے
بغیر اس کا نکاح ہو گیا ہو، تو ایسی صورت میں بھی عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر شادی

کے بعد اس کے شوہر کی طرف سے اسے کوئی تکلیف پہونچے اور تقسیم میں اس کی بے انصافی ثابت ہو اور اس کا اس طرح کا ظلم وستم بھی ثابت ہوجائے کہ اس کے بعد بیوی کا شوہر کے ساتھ حسن سلوک سے نباہ کرنا ناممکن ہوجائے تو وہ قاضی کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے اور قاضی ان کے رشتۂ زوجیت کو توڑ سکتا ہے۔

تفریق کا حق

اگر شوہر نان نفقہ دینے سے رک جائے یا غائب ہوجائے اور بظاہر اس کی کوئی مالی رقم اس کی بیوی کے پاس موجود نہ جس سے وہ گذارہ کر سکے یا اس کا دیوالیہ پن اور اس کی مفلسی ثابت ہوجائے تو ایسی صورت میں بعض ائمہ نے بیوی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قاضی کے پاس جاکر شوہر سے الگ ہونے کے حق کا مطالبہ کرے چنانچہ مصر کی مذہبی عدالتوں میں اس پر عمل ہو رہا ہے [۱]

تعدد ازدواج کے معاملہ میں مغربی علماء اور فلسفیوں نے بھی اسلام کے عدل وانصاف اور اس کے ترقی یافتہ قوانین کا اعتراف کیا ہے لہٰذا جو کوئی اسلام میں تعدد ازدواج کے جواز پر اعتراض کرتا ہے وہ اس مسئلے میں اسلامی اصول وشرائط سے ناواقف معلوم ہوتا ہے، اور غالباً بعض ان مسلمانوں کے طرز عمل سے استدلال کرتا ہے جنہوں نے اس معاملے میں اسلامی روح اور اس کے حکیمانہ اصولوں کی پابندی نہیں کی ہے اس اعتراض کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ معترض اہل یورپ کا اندھا مقلد ہو اور وہ غیر منصف مغربی مصنفوں کے خیالات سے متاثر ہو۔ [۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو ۱۹۲۰ء کے قوانین نمبر ۲۵ کی دفعات ۴، ۵ اور ۱۹۲۹ء کے قانون نمبر ۲۵ کی دفعہ ۶۔

[۲] جو کوئی اس معاملے میں مزید مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو وہ فاضل محقق سید رشید رضا کی دونوں کتابوں الوحی المحمدی (اردو ترجمہ از رشید احمد ارشد مطبوعہ کتاب منزل لاہور) اور "اسلام میں حقوق نسواں" کا مطالعہ کرے نیز جناب ابراہیم علی کی کتاب اسرار الشریعۃ الاسلامیہ بھی قابل مطالعہ ہے)

مجلۃ الرسالۃ کے شمارہ ۶۶۵ مورخہ یکم اپریل ۱۹۴۶ء میں مذکور ہے کہ "براعظم امریکہ کے علاقہ اوٹاوہ میں ایک قبیلہ مارصوت کے نام سے موجود ہے جو تعدد ازدواج پر عمل پیرا ہے ان کے بارے میں ایک مصنف کا قول ہے "بلاشک وشبہ ان کا یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے مگر ہمیں (باقی صفحہ ۷۵)

قرآن کریم نے ازدواجی زندگی میں یہ زبردست انقلاب پیدا کیا ہے کہ اس نے خواتین کا درجہ بلند کر دیا ہے اس نے شوہر، بیوی دونوں کی شخصیت کو سماج کے لئے مفید اور کار آمد فرد بنایا ہے اور ہر ایک کو مخصوص فرائض کا ذمہ دار قرار دیا ہے اسلامی دور میں بیوی کی پہلی سی حالت باقی نہیں رہی جبکہ وہ مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور اس کی لونڈی بنی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا ہے:-

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۔

ان عورتوں کے بھی ایسے حقوق ہیں جیسے ان مردوں کے حقوق ہیں عورتوں پر دستور کے مطابق ہیں اور مردوں کو ان عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے

یہ اعلان کر کے قرآن کریم نے ان تمام دعووں اور قدیم رسم و رواج کی بنیادیں منہدم کر دی ہیں جن کی بنا پر طاقتور مرد مطلق العنان بنے ہوئے تھے اور کمزور عورتوں کی جان و مال کے خلاف اپنی طاقت کا بے جا استعمال کرتے تھے مگر اب ایک ایسا اعلیٰ قانون بنا دیا گیا جس کے ذریعے یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ خواتین حقوق و فرائض میں مردوں کے برابر ہیں۔

فرائض کی تقسیم

چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے مرد اور عورتوں کی قدرتی صلاحیتوں اور رجحانات کا لحاظ رکھتے ہوئے مرد اور عورتوں کے فرائض الگ الگ مقرر کر دیئے گئے ہیں، مرد کے فرائض یہ ہیں کہ وہ بیوی کے نان نفقہ کا کفیل ہے اور اپنے کنبے کا بالخصوص اور اپنی قوم و سلطنت کا بالعموم محافظ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد عام طور پر عورتوں کی بہ نسبت زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اور ان میں روزی کمانے کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے، وہ زیادہ عقل مند بھی ہوتا ہے اور اس میں علوم و فنون کو حاصل کرنے اور محنت و مشقت کے مختلف کاموں کو سرانجام دینے کی زیادہ قابلیت ہوتی ہے،

مرد کی قیادت

خواتین کے فرائض یہ ہیں کہ وہ بچوں کی پرورش کریں انھیں دودھ پلائیں، ماں کے فرائض انجام دیں اور گھر کے کاموں کا انتظام کریں ازدواجی زندگی بھی سماجی زندگی کی ایک قسم ہے اور ہر سوسائٹی کا ایک سربراہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ جماعت کے افراد میں کبھی خیالات و رائے کا اختلاف ہو جاتا ہے اسی صورت میں ان کے نظام اور ان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے ایک سردار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان کے جھگڑوں

(بقیہ صفحہ ۷۴) اس بات کا علم نہیں ہے کہ انھوں نے تعدد ازدواج کا کیا نظام قائم کر رکھا ہے۔

کا فیصلہ کر کے اتحاد قائم رکھ سکے، لہٰذا خاندانی زندگی کا سردار ایک مرد ہی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ گھریلو مفادات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اور اپنی طاقت، مال، بصیرت اور قوت ارادی کی بدولت اپنے فیصلوں کو قابل عمل بنا سکتا ہے اس میں محنت و مشقت کو برداشت کرنے اور صبر کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے یہ وہ درجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں عطا کیا ہے (جس کا ذکر قرآن کریم کی آنے والی آیت میں ہے) یہ ان کی قیادت اور حفاظت کا درجہ ہے جو انھیں دو وجوہات کی بنا پر ملا ہے، پہلی وجہ فطری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں قوت اور حسن تدبیر کا ملکہ عطا فرمایا ہے اس لئے قدرتی صلاحیتوں کے فرق سے ان کی ذمہ داریوں میں بھی فرق آگیا ہے دوسری وجہ ان کی ذاتی قابلیت اور کوشش پر مبنی ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ عورتوں کو ان کا مہر ادا کرتے ہیں اور ان کے اخراجات کے کفیل ہیں تاہم ان کی قیادت اور حکومت مطلق العنان نہیں ہے، بلکہ باہمی صلاح و مشورہ سے انجام پذیر ہوتی ہے اور اسلامی شریعت کے احکام و ہدایات کی پابند ہے بلکہ وہ معاشرہ کے دستور و قواعد کی پابند بھی ہے اس کے مطابق مردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کی عزت و احترام کو برقرار رکھیں، جیسا کہ خداوند تعالیٰ سورۂ نساء (پ۴) میں فرماتا ہے:-

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۔	ان کے ساتھ دستور کے مطابق زندگی بسر کرو، اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو بہت ممکن ہے کہ اللہ اس میں بہت بھلائی عطا کرے۔

یہ وہ قیادت ہے جس کا مقصد خاندان کے نظام کو برقرار رکھنا ہے مگر یہ قیادت اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لاتی ہے وہ یہ ہیں کہ مرد اپنے خاندان کی حفاظت کرے، اور ان سے برائی اور تکالیف کو دور کرے اور بیوی بچوں کے نان نفقہ کا کفیل بنے اور ان کی خبر گیری کرے، بیوی خواہ مالدار کیوں نہ ہو نان نفقہ کی کفالت نہیں کرے گی اس کے مقابلے میں بیوی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اچھے کاموں میں مرد کی اطاعت کرے اس کے مال کی حفاظت کرے اور اپنی عزت و عصمت کو محفوظ رکھے اور بچوں کی پرورش کرے، بیوی کے اکثر فرائض ایسے ہیں جن کا فائدہ اس کی ذات کو پہلے پہونچتا ہے اور مرد کو بعد میں پہونچتا ہے اللہ تعالیٰ نے مرد کا یہ مرتبہ اور نیک و سرکش عورتوں کی صفات اس آیت کریمہ

میں بیان فرمائی ہیں :-

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۔ (پ۵ سورہ نساء)	مرد عورتوں کے محافظ[1] ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور وہ (ان پر) اپنا مال بھی خرچ کرتے ہیں لہٰذا نیک عورتیں فرماں بردار ہوتی ہیں اور (خاوند) کے پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں (ان کی جان ومال) کی حفاظت کرتی ہیں۔ ان عورتوں کو جن کے بارے میں تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو تم نصیحت کرو اور خواب گاہوں میں ان سے جدا ہو جاؤ اور انھیں مارو۔ اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو تم ان کے لئے (الزام کی) راہ نہ تلاش کرو بے شک اللہ اعلیٰ اور بڑا ہے۔

طلاق

قرآن کریم نے جس طرح میاں بیوی میں اتحاد و اتفاق کا عمدہ نظام مقرر کیا ہے اس طرح اس نے میاں بیوی میں تفریق کرنے اور طلاق دینے کا نظام بھی مقرر کیا ہے مگر اس نے یہ حکم بیکار نہیں دیا ہے اور نہ اس کی اجازت دی ہے کہ اس فعل میں ظلم و سرکشی اختیار کی جائے یا کسی مصلحت کے بغیر بلاسبب طلاق دے دی جائے کیونکہ قرآن کریم کے صاف احکام اور بنیادی اصول ظلم کو حرام قرار دیتے ہیں اور کسی کو نقصان یا اذیت پہونچانے کی ممانعت

---

[1] تفسیر بیضاوی میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کی تفسیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "مرد عورتوں کے اسی طرح نگہبان ہیں جس طرح حکام رعایا کی نگہبانی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو اسی لئے فضیلت دی ہے کہ ان میں کام کرنے اور طاعت و عبادت کی طاقت زیادہ ہوتی ہے اور ان کی عقل بھی بڑھی ہوئی ہے اس وجہ سے مرد پیغمبر، ولی اور امام بنائے جاتے ہیں بلکہ وہی اسلامی معاشرے کو بھی قائم کرتے ہیں نیز جہاد اور نماز جمعہ وغیرہ کا انتظام بھی انہی کے سپرد ہوتا ہے علاوہ ازیں مرد کی میراث میں عصبہ بنتے ہیں اور انھیں میراث کا حصہ بھی زیادہ ملتا ہے (باقی صفحہ ۷۸)

کرتے ہیں نہ صرف قرآن کریم سے اس کا ثبوت ملتا ہے بلکہ احادیث میں بھی صاف طور پر یہ الفاظ آتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال کی ہیں ان میں سے طلاق سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہیں ہے"

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے :-

"جو عورت بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق مانگتی ہے تو اس پر بہشت کی خوشبو حرام ہے"

ایک دوسری حدیث ہے :-

"خلع کرنے والی عورتیں منافق ہوتی ہیں"

اعتدال کا طریقہ

ایسی صورت میں اسلام نے طلاق کا حکم کیوں نافذ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم بھی اس کے ایک قابل قدر اصول پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ افراط و تفریط کو چھوڑ کر راہ اعتدال کو اختیار کیا جائے نکاح کے بارے میں نہ تو اسلام نے افراط کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر حالت میں رشتہ زوجیت کو ساری عمر کے لئے مستحکم رکھا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بعض دفعہ ایسے واقعات رونما ہو جائیں جو جدائی کا باعث بن جائیں اور ان کی وجہ سے رشتۂ زوجیت کو برقرار رکھنا وبال جان ہو جائے اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بدخلق ہو یا اس کی تربیت خراب ہو یا ان دونوں کی طبیعتوں میں اختلاف ہو اور ان کے مقاصد و رجحانات میں بھی تضاد ہو۔ ان حالات میں وہ ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ خدائی احکام کی پابندی کر سکتے ہیں بلکہ ایسی صورتوں میں ان کے لئے نباہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور ان کا جھگڑا بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ہمیشہ بدبختی کی زندگی گزارتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۸۶) طلاق دینے کا حق بھی انہی کو حاصل ہے یہاں عورت کی سرکشی سے مراد یہ ہے کہ وہ شوہر کی نافرمانی کرے اور اطاعت کرنے سے ناک بھوں چڑھائے علامہ بیضاوی فرماتے ہیں "وعظ و نصیحت، جدائی اور ضرب تدریجی امور ہیں اور انہیں یکے بعد دیگرے انجام دینا چاہیے اگر عورت باز نہ آئے تو معاملہ ختم کر دیا جائے

طلاق کے معاملے میں اسی طرح تفریط سے بھی کام نہیں لیا گیا ہے کہ طلاق کو بدنظمی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے، بلکہ رشتہ زوجیت کو چاروں طرف سے محفوظ کر دیا گیا ہے کہ اس پر عارضی چیزیں اثر انداز نہیں ہو سکتیں جو غصہ دور ہونے پر ختم ہو جاتی ہیں، چنانچہ جب انسان ہوش میں آتا ہے تو وہ ٹھنڈے دل سے تمام باتوں پر غور و خوض کرتا ہے۔

اس معاملے میں قرآن کریم کی معتدل روش اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب میں پہلے طلاق قطعاً حرام تھی اور صرف زناکاری کی صورت میں طلاق کی اجازت تھی، اس کے بعد جب طلاق کا قانون بنا تو طلاقوں کی بھرمار ہونے لگی یہاں تک کہ اب طلاق مرد و زن کا پیدائشی حق بن گیا بالخصوص امریکہ میں اس کی بہت کثرت ہو گئی ہے چنانچہ اس کے خطرناک نتائج صاف نمایاں ہو رہے ہیں۔

اہل کتاب کی طلاق

تورات میں طلاق کا شرعی حکم موجود تھا بلکہ یہودیوں کی شریعت میں یہ قانون بنا دیا گیا تھا اور اس پر عمل بھی جاری رہا کہ کسی عذر کے بغیر طلاق دینا جائز ہے مثلاً اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے زیادہ خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہے تو وہ طلاق دے سکتا ہے مگر بہتر یہی سمجھا جاتا تھا کہ کسی معقول عذر پر طلاق دی جائے، ان کے ہاں عذر کی کئی صورتیں تھیں مثلاً جسمانی یا اخلاقی عیب — زناکاری ان کے نزدیک سب سے بڑا عذر تھا اس مقصد کے لئے صرف بدکاری کی تہمت کا پھیل جانا ہی کافی تھا۔ خواہ وہ الزام ثابت نہ ہو سکے، حضرت مسیح علیہ السلام نے آکر طلاق صرف زناکاری کی صورت میں جائز قرار دی، مگر یہ سب رعایتیں صرف مردوں کے لئے تھیں ان کے ہاں عورت طلاق کا مطالبہ کسی صورت میں نہیں کر سکتی تھی خواہ اس کے شوہر میں کتنے ہی عیوب کیوں نہ ہوں۔

جاہلیت کی طلاق

یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ بت پرستوں اور عربوں میں بھی طلاق کا رواج تھا مگر اس کی کوئی حد مقرر نہ تھی اور نہ اس کا کوئی مخصوص نظام تھا اس طرح عورتوں پر بہت مظالم برپا ہوتے تھے عربوں کا ایام جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ وہ طلاق دیتے تھے اور عدت میں رجوع بھی کر لیتے تھے مگر ان کے ہاں طلاق کی کوئی حد اور تعداد مقرر نہ تھی اگر عارضی طور پر ناراضگی ہو گئی ہو تو شوہر رجوع کر کے بیوی کے ساتھ اپنے

تعلقات استوار کرلیتا تھا، اور اگر بیوی کو تکلیف دینی مقصود ہوتی تھی تو مرد عدت گذرنے سے پہلے رجوع کرلیتا تھا اور اس کے بعد از سر نو طلاق دیتا تھا اسی طرح بار بار تکلیف پہونچانے کے لئے یہی طریقہ اختیار کرتا تھا یعنی عورت مرد کے ہاتھوں کھلونا بنی رہتی تھی اور مرد اس کو نقصان پہونچانے کے لئے جب چاہتا تھا طلاق دیا کرتا تھا۔

اسلامی طلاق

اسلام نے آکر جس طرح دیگر سماجی کاموں کی اصلاح کی، اسی طرح طلاق کا بھی ایک اصلاحی طریقہ مقرر کیا، اسلام نے عربوں میں طلاق کے تکلیف دہ طریقوں کا خاتمہ کردیا اور یہ حکم دیا کہ طلاق کی تعداد صرف دو ۲ ہے اگر تیسری دفعہ طلاق دی جائے تو عورت طلاق دینے والے پر اس وقت تک حرام ہوجاتی ہے جب تک کہ وہ دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اس کے بعد طلاق کے خاص احکام مقرر کرکے اس کا ایسا نظام قائم کیا گیا کہ اگر اس پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو طلاق صرف جائز ضرورت ہی پر دی جاسکتی ہے اور وہ ضرورت ایسی ہوگی جو تمام سماج کے لئے مفید ہوسکے اور اس سے معاشرہ کی خرابیاں دور ہوسکیں۔

احکام طلاق

طلاق کے احکام اور اصولی قوانین مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) **مصالحت**:۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نفرت کے جذبے پر مرد کے ضمیر اور وجدان پر شک کا اظہار کیا ہے چنانچہ سورہ نساء میں ارشاد فرمایا ہے:۔

ان عورتوں کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرو، اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو مگر خدا اس کے ذریعے تمھارا بھلا کرے"

حدیث شریف میں مذکور ہے:۔

کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے دشمنی نہ رکھے اگر اسے کوئی اس کی عادت لپسند نہ آئے تو دوسری عادت ضرور لپسند آئے گی"

اسی طرح قرآن کریم نے عورت کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ صلح کرنے کی کوشش کرے چنانچہ ارشاد ہے:۔

"اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے سرکشی یا روگردانی کا اندیشہ ہو تو ان دونوں کے

لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ آپس میں صلح کرائیں، صلح بہتر ہوتی ہے۔"

(۲) ثالث بنانا:۔ جھگڑے کے موقع پر ثالث اور پنچ بنانے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

"اور اگر تمھیں ان دونوں کے درمیان جھگڑے کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے عزیزوں میں سے اور ایک پنچ عورت کے عزیزوں میں سے بنا کر بھیجو اگر وہ دونوں اصلاح چاہتے ہوں تو اللہ ان دونوں میں موافقت پیدا کرے گا بے شک اللہ تعالیٰ علم و آگاہی والا ہے۔"

(۳) طلاق کی محدود تعداد:۔ قرآن کریم نے طلاق کی اس تعداد کو جس میں رجوع کیا جا سکتا ہو، دو تک محدود کیا ہے، اس سے پہلے عربوں کے ہاں طلاق کی تعداد محدود نہ تھی چنانچہ (پ۲) سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے

"طلاق دو مرتبہ ہوتی ہے پھر یا تو عورت کو معقول طریقے سے رکھا جائے۔ یا خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چھوڑ دیا جائے۔"

اس کے بعد اگر تیسری مرتبہ طلاق دی جائے تو وہ اس پر حرام ہو جاتی ہے جیسا کہ آگے فرمایا گیا ہے:۔

"اگر اس نے اس عورت کو (تین) مرتبہ طلاقیں دیں تو وہ اس کے بعد اس کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی۔ جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔"

(۴) نقصان نہ پہونچانا:۔ عورت کو نقصان پہونچانے کے لئے روکے رکھنا اور بار بار طلاق دے کر رجوع کرنا حرام ہے اللہ تعالیٰ (پ۲) سورۃ بقرہ میں فرماتا ہے

"جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہونچ جائیں تو یا تو شریفانہ طریقے سے) دستور کے مطابق انھیں اپنے پاس رکھو یا قاعدہ کے مطابق انھیں چھوڑ دو۔ انھیں نقصان پہونچانے اور ان پر زیادتی کرنے کے لئے انھیں روکے نہ رکھو، جو کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔"

(۵) عورت کے سرپرستوں کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ عدت گزرنے کے بعد عورت کو نکاح ثانی کرنے یا پہلے شوہر کے ساتھ از سر نو نکاح کرنے سے نہ روکیں بشرطیکہ

وہ شریفانہ طور پر نباہ کرنے پر رضامند ہو جائیں جیسا کہ اسی سورہ بقرہ میں آگے چل کر اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

"جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ عدت پوری کر لیں تو انھیں اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ دستور کے مطابق باہم رضامند ہو جائیں۔ اس بات کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، یہ بات تمھارے لئے زیادہ مفید اور پاکیزہ تر ہے، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو"

(۴) قرآن کریم نے طلاق دینے والے اور خلع قبول کرنے والے مرد کو اس بات سے روکا ہے کہ وہ عورت سے اپنا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس لے بشرطیکہ دشمنی، سرکشی اور بدسلوکی مرد کی جانب سے ہو اور وہ اس عورت کے بجائے دوسری بیوی تبدیل کرنا چاہتا ہو جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:۔

اگر تم ایک بیوی کے بجائے دوسری بیوی لانا چاہو اور تم نے پہلی بیوی کو بہت مال دے دیا ہو تو اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لو کیا تم اسے بہتان باندھ کر اور کھلم کھلا گناہ کے مرتکب ہو کر لینا چاہتے ہو۔ تم (یہ مال) کیسے لے سکتے ہو جبکہ تم میں ازدواجی تعلقات قائم رہ چکے تھے اور انھوں نے تم سے "پیمان محکم" لے رکھا تھا"

خُلع

قرآن کریم نے طلاق اور خلع کے موقع پر عورت سے مالی معاوضہ اور فدیہ لینا جائز قرار دیا ہے جب کہ میاں بیوی کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کے قوانین کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے، کہ وہ عورت اپنے شوہر سے بغض رکھتی ہو، یا بد خلق ہو یا دونوں طرف سے سرکشی اور نافرمانی سرزد ہوتی ہو اور انھیں یہ اندیشہ لاحق ہو کہ خدا نے جانبین کو حسن سلوک کا جو حکم دیا ہے وہ اس کو سرانجام نہیں دے سکیں گے اور نکاح کے جو حقوق خدا کی طرف سے مقرر ہیں انھیں پورا نہیں کر سکیں گے یہی وہ مسائل ہیں جن کی طرف (پ۲) سورہ بقرہ میں وضاحت کی گئی ہے:۔

"تمھارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے ان عورتوں کو دے رکھا ہو اس میں سے کچھ لو سوائے اس صورت کے کہ دونوں (میاں بیوی) کو یہ اندیشہ

لاحق ہو کہ وہ اللہ کے قوانین کی پابندی نہیں کرسکیں گے، اگر تمھیں اس بات کا خوف ہو کہ وہ اللہ کے قوانین کی پابندی نہیں کرسکیں گے تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے اگر عورت فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑا لے) یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ ظالم ہے "

ان دونوں آیات میں تعارض نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے " اگر بیوی شوہر کے حقوق کی تحقیر کرتے ہوئے اور اپنی بدخلقی کی وجہ سے خدائی قوانین کی پابندی کرنی چھوڑ دے اور یہ کہے " میں تمھاری قسم نہیں پوری کرتی اور نہ تمھارے پاس آؤں گی اور نہ تمھارا حکم مانوں گی " تو یہ کہہ کر وہ فدیہ اور مالی معاوضہ دینے کی مستحق ہو گئی اور شوہر اس سے مالی معاوضہ لے سکتا ہے مگر وہ جتنا اسے دیا ہے اس سے زیادہ نہ لے اور پھر اسے آزاد کردے خواہ وہ بدسلوکی اس عورت کی جانب سے ہی کیوں نہ ہو۔"

حنفیہ یہ کہتے ہیں :-

- اگر عورت کی طرف سے سرکشی ہو تو مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی عطا کردہ چیزیں واپس لے لے اور اگر مرد کی جانب سے زیادتی ہو تو وہ کوئی چیز نہیں لے سکتا۔ لیکن اگر وہ لینا چاہے تو عدالت اسے اس کی اجازت دے سکتی ہے مگر یہ ناپسندیدہ فعل ہوگا۔"

اس کے برخلاف امام مالک کا یہ قول ان کے شاگرد وھب نے نقل کیا ہے :- کہ

- اگر مرد عورت کو طلاق دے یا کسی معاوضہ پر خلع قبول کرے اور پھر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے اسے نقصان پہونچایا ہے یا تنگ کیا ہے اور وہ اس پر ظلم کرتا رہا ہے تو عورت کے حق میں طلاق کا فیصلہ ہوگا اور مرد سے اس کا مال واپس لیا جائے گا۔" یہ رائے صحیح ہے۔

ابوبکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کیا خوب لکھا ہے :-

اللہ تعالیٰ نے خلع کے بارے چند آیات نازل فرمائی ہیں۔ ایک آیت میں عورتوں کو دیا ہوا مال واپس لینے سے منع کیا گیا ہے یہ اس صورت میں حکم ہے جب کہ زیادتی مرد کی طرف سے ہو۔ دوسری آیت میں (جو اوپر ذکر کی

گئی ہے) مالی معاوضہ لینا جائز قرار دیا ہے جبکہ انھیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ خدائی احکام کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہو اور اس کی طرف سے بدسلوکی ہو یا دونوں بدسلوکی کے ذمہ دار ہوں اس صورت میں مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی دی ہوئی چیزیں واپس لے لے اور اس سے زیادہ مال نہ لے "

بعض علماء نے ان حالات میں اس سے زائد مالی لینے کو بھی جائز قرار دیا ہے[1]

(۷) **طلاق کا مسنون طریقہ**:- جب طلاق دینا ضروری ہو جائے تو اس موقع پر اسلامی مسنون طریقہ یہ ہے کہ مرد عورت کو اس وقت طلاق دے جب کہ عورت ایام ماہواری سے فارغ ہو جائے اس کے بعد وہ اس کے پاس نہ جائے تاکہ عدت کا زمانہ دراز نہ ہو جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۂ طلاق (ع۱ پ۲۸) میں فرمایا ہے :-

" اے پیغمبر! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں عدت کے زمانے میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو "

(۸) سورۂ طلاق (ع۱ پ۲۸) میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بیوی عدت کے زمانے میں شوہر کے گھر میں اس وقت تک رہے جب تک کہ کوئی ایسی بات رونما نہ ہو جائے جس کی وجہ سے اس کا گھر سے نکلنا ضروری ہو جائے جیسا کہ ارشاد ہے :-

انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں مگر یہ کہ وہ علانیہ بے حیائی کی مرتکب ہوں، یہ اللہ کے حدود ہیں اور جو کوئی اللہ کی حد سے باہر نکلتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، تم نہیں جانتے ہو کہ شاید اللہ اس کے بعد اور کوئی نئی بات پیدا کر دے "

اس آیت میں گھر بیٹھنے کی حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۹) اگر عورت طلاق کی عدت میں ہو تو قرآن کریم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا شوہر اس کا زیادہ حقدار ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ (ع۲۸ پ۲) میں ہے۔

" اگر ان کا مقصد اصلاح ہو تو ان کے شوہر انھیں اپنے پاس واپس بلانے

---

[1] ملاحظہ ہو "احکام القرآن" حصہ اول ؛ الہدایۃ، فتح القدیر بحث خلع۔

کا زیادہ حق رکھتے ہیں "

(۱۰) قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ عورت کو خوش کرنے کے لئے اسے کچھ نہ کچھ خرچ دیا جائے، تاکہ اس کی بدگمانی دور ہو جائے کہ مرد اسے حقیر سمجھتا ہے یا اس کے بارے میں شک وشبہ رکھتا ہے جیساکہ سورۃ بقرہ (پ۲) میں فرمایا گیا ہے :-

(۱) انھیں خرچ دو خوش حال اپنی حیثیت کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق دے یہ صرف رواج اور دستور کے مطابق نیک لوگوں کے لئے ضروری ہے "

(۲) مطلقہ عورتوں کو حسب دستور خرچ دینا پرہیزگاروں کے لئے ضروری ہے "

(۱۱) طلاق دینے کا حق :- اسلام نے طلاق کا حق عورت کے ہاتھ میں نہیں رکھا ہے بلکہ اسے مرد کے اختیار میں دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد اپنی عقلمندی اور فطری صلاحیت کی بدولت تکالیف کو زیادہ برداشت کرسکتا ہے اور تمام معاملات میں وہ زیادہ ثابت قدم رہتا ہے بلکہ وہ عورت کی بہ نسبت زیادہ دور اندیش بھی ہوتا ہے اس لئے غصہ کے موقع پر اور بلا وجہ طلاق دینے میں جلدی نہیں کرتا ہے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ اسے زوجیت کے تعلقات قائم رکھنے میں بہت زیادہ مال صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ زوجیت کے رشتے کو برقرار رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرتا ہے کیونکہ اگر وہ نکاح ثانی کرے تو اسے مزید مالی مصارف برداشت کرنے ہوں گے بلکہ اسے طلاق کی مالی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرنا ہے اسے مہر دینا ہے اور طلاق و عدت کے تمام اخراجات اس کے ذمہ ہیں۔

مگر یہ تمام باتیں عورت میں نہیں پائی جاتی ہیں وہ جلد غضب ناک ہو جاتی ہے اور اس کی قوت برداشت بھی کم ہوتی ہے اور اس پر طلاق کی وہ مالی ذمہ داریاں نہیں عائد ہوتی ہیں جن کا مرد ذمہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر طلاق کا اختیار عورت کو دیا جاتا تو ازدواجی رشتہ معمولی معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹوٹ جاتا جس کا انجام بہت برا ہوتا جیسا کہ آج کل یورپ و امریکہ کے ان ممالک میں مشاہدہ کیا جا رہا ہے جہاں طلاق کے مطالبہ میں مرد و عورت دونوں کو مساوات دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ وہاں مسلمانوں کے ہاں سے کئی گنا زیادہ طلاق کے واقعات رونما ہو رہے ہیں [1]

[1] ملاحظہ ہو (۱) نداء الجنس اللطیف او حقوق النساء فی الاسلام - از سید رشید رضا - رباقی صفحہ ۸۱)

عدّت کے احکام

جب میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اس موقع پر قرآن کریم نے یہ حکم دیا ہے کہ عورت عدت میں رہے، عدت ایک مقررہ مدت ہے جو اس مقصد کے لئے رکھی گئی ہے کہ نکاح کے باقی ماندہ اثرات کو ختم کیا جائے لہٰذا عورت دوسرے مرد سے اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کی عدت نہ ختم ہو جائے اور اگر دو طلاقیں دی جائیں اور وہ طلاق رجعی ہو تو مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ نئے نکاح اور مہر کے بغیر عدت کے زمانے میں اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کر لے۔ مگر یہ عدت پوری کرنا اس وقت ضروری ہے جبکہ بیوی کے پاس جانے کے بعد جدائی ہو جائے لیکن اگر شوہر کے مرنے پر عدت پوری کی جائے تو عدت ہر حالت میں ضروری ہے وفات کے موقع پر مطلقہ کی عدت کو مندرجہ ذیل آیت کریمہ ثابت کرتی ہے،

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ	اور وہ لوگ جو تم میں سے وفات پا
وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ	جائیں اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ چار
بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ	مہینے دس دن تک انتظار کریں اور
وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ	جب وہ عدت پوری کر لیں تو تم پر کوئی
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ	حرج نہیں ہے اگر وہ عورتیں دستور کے
فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ	مطابق اپنے لئے کوئی کام کریں اور جو کچھ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (پ سورہ بقرہ)	تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

مطلقہ اور اس کی مشابہ عورتوں کے لئے عدت اسی وقت ضروری ہوتی ہے جب کہ مرد بیوی کے پاس جائے جیسا کہ سورہ احزاب (پ۲۲) کی یہ آیت ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا	اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں
نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ	سے نکاح کرو پھر انھیں چھوڑنے
طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن	سے پہلے طلاق دے دو تو ان پر
تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ	تمہارے لئے عدت جنہیں تم شمار کرو
عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا	(ضروری) نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ دے

(بقیہ صفحہ ۵۵) (۸) اسرار الشریعۃ الاسلامیہ از ابراہیم علی

فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۔ (پ ۲۲ سورہ احزاب) — کو اچھی طرح سے رخصت کر دو۔

عدت کا فلسفہ

عدت کے قانون میں بہت سے اسرار و رموز اور پوشیدہ ہیں دراصل اس عورت پر عدت نہیں ہے جس کے پاس مرد نہ گیا ہو لیکن اس بنیادی سبب کے علاوہ شریعت نے اور بہت سے مصالح اس میں پوشیدہ رکھے ہیں ان میں سے ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے نکاح کی شان ظاہر ہو جائے اور لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ رشتۂ نکاح ایک مقررہ مدت کے ختم ہوئے بغیر نہیں ٹوٹتا ہے، اور لوگوں کو رشتۂ نکاح کے ٹوٹنے کا اس طرح علم ہو جائے جس طرح ابتداء میں ان گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا ہے جو نکاح کے وقت موجود ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے تمام لوگوں میں نکاح کی شہرت ہو جاتی ہے) عدت مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ طلاق رجعی سے ہے تو شوہر کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے اور ممکن ہے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور اسے ہوش آجائے، اور وہ عدت گذرنے سے پہلے رجوع کر کے اپنی غلطیوں کی تلافی کر لے وفات کی عدت میں مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ ایک دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ عدت شوہر پر سوگواری کا اظہار کرتی ہے اور اس سے اظہار وفاداری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ عدت ہر عورت کے لئے ضروری ہے خواہ مرد اس کے پاس نہ گیا ہو۔

عدت کی اقسام

عدت قرآنی فیصلہ کے مطابق چار طرح کی ہوتی ہے:۔

(۱) ایام حیض والی عورتوں کی عدت ایام ماہواری کی ابتداء یا فراغت سے مقرر ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ — مطلقہ عورتیں تین حیض کی ابتداء یا فراغت کا انتظار کریں (قروء کے مفہوم میں اختلاف ہے اس سے حیض یا اس سے فراغت مراد لیا جاتا ہے)

(۲) تین مہینے کی عدت عمر رسیدہ عورتوں کے لئے اور ان عورتوں کے لئے مقرر ہے

جنھیں حیض نہیں آتا ہے جیسا کہ سورۂ طلاق میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (پ ۲۸ سورہ طلاق)

اور وہ تمھاری عورتیں جو حیض سے مایوس ہو جائیں اور جنھیں حیض نہ آتا ہو ان کے بارے میں اگر تمھیں شک و شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے

(۳) جن عورتوں کے شوہر مر گئے ہوں ان کے لئے چار مہینے دس دن کی عدت مقرر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا

اور تم میں سے وہ لوگ جو وفات پا جائیں اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ خود چار مہینے دس دن تک انتظار کریں۔

(۴) وضع حمل پر عدت کا تقرر حاملہ عورتوں کے لئے ہے خواہ جدائی شوہر کی وفات کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ اس بارے میں یہ ارشاد ہے :۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ (پ ۲۸ سورہ طلاق)

حمل والی عورتوں کی عدت (اس وقت ختم ہو جاتی) ہے جبکہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔

جمہور علماء نے مذکورہ بالا دونوں آیات سے اس کا یہی مفہوم سمجھا ہے جو بیان کیا گیا ہے ان کا استدلال بھی اسی طریقہ سے ہے جس طرح عبداللہ بن مسعودؓ نے استدلال پیش کیا تھا کہ وضع حمل کی آیات وفات والی آیت کے بعد نازل ہوئی ہے اس لئے یہ تخصیص ہو جائے گی کہ اگر عورت حاملہ نہ ہو اور اس کا شوہر مر جائے تو اس وقت غیر حاملہ عورت کے لئے چار مہینے دس دن کی مدت ہے) اس حاملہ عورت کے بارے میں جس کا شوہر مر جائے حضرت علیؓ کی یہ رائے ہے کہ عورت دونوں مدتوں میں سے جو زیادہ طویل ہو اس کے مطابق عدت گزارے تاکہ دونوں آیتوں پر عمل ہو سکے حضرت ابن عباسؓ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔

اسلام کا نظامِ میراث

قرآن کریم نے میراث کا ایک مستحکم اور عادلانہ نظام قائم کیا اور اس طرح ان گوناگوں مظالم کا خاتمہ کیا جو عرب اور دیگر قوموں میں رائج تھے گذشتہ قوموں میں عورتوں اور بچوں کو میراث میں سے کچھ حصہ نہیں ملتا تھا[1] بلکہ بڑے فرزند ہی میراث کے مالک ہوتے تھے کیوں کہ وہی بازوئے شمشیر زن ہوتے تھے اور وہی اپنے خاندان اور قوم کی حفاظت کرتے تھے لہٰذا اسی خیال کے ماتحت آج تک بھی کچھ قومیں یہی مظالم برپا کر رہی ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس طرح بڑوں کو مال کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح چھوٹوں کو بھی اپنی تربیت، نشوونما اور مستقبل کو درست کرنے کے لئے مال کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ان کی ضرورتیں بڑوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور وہ بھی بشرط حیات بڑے ہو کر اپنے بڑوں کی طرح زندگی کی ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے۔ اسی طرح عورت کو بھی میراثی مال کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اگر اس کا خبر گیری کرنے والا کوئی نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو فقر و فاقہ اور بے عزتی سے محفوظ رکھ سکے۔ بلکہ زمانۂ صلح میں عورتوں کی جو سماجی ذمہ داریاں ہیں اور زمانۂ جنگ و جہاد میں جس طرح وہ مردوں کی مدد کرتی ہیں، وہ مردوں کے فرائض سے کسی طرح کمتر نہیں ہیں۔

اسلام نے وارث بنانے کے بنیادی اصول کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح اس نے بعض ایسے انتہا پسند اور تخریبی نظاموں کی تردید کی ہے جو میراث اور ملکیت کو منتقل کرنے کے خلاف ہیں مگر اسلام نے یہ اصول اس لئے رکھا ہے کہ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور اس کی مخالفت کرنا خلاف فطرت ہے کیوں کہ انسان اپنی زندگی میں دولت کمانے اور مال جمع کرنے کے لئے دوڑ دھوپ اس لئے کرتا ہے

---

[1] تفسیر بیضاوی

کہ وہ اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر صرف کر سکے بلکہ اس وقت فطری طور پر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ ہر امکانی کوشش اس بات پر صرف کرے کہ وہ اپنی اولاد کے لئے اپنے مرنے کے بعد کچھ مال کا ذخیرہ چھوڑ جائے اور چونکہ مرنے کے بعد اس کی ملکیت باقی نہیں رہے گی اس لئے قدرتی طور پر ہر انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں اس کے مال پر قابض ہونے کا کون حقدار ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد والدین اور دوسرے رشتہ دار ہی اس کے مال و دولت پر قابض ہو سکتے ہیں کیونکہ وہی اس کی مدد اور حمایت کرتے رہے ہیں اور وہی اس سے محبت رکھتے تھے اور وہی اس کا ہاتھ بٹاتے تھے اور مصائب و تکلیف میں وہی اس کے غم خوار ہوتے تھے اور وہی اس کے تاوان اور دیگر ذمہ داریوں کو برداشت کرتے تھے نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اس مال و دولت کو پیدا کرنے بڑھانے اور محفوظ رکھنے میں ان رشتہ داروں کا بہت بڑا ہاتھ ہو اس لئے وہ اس کے لینے کے زیادہ حقدار ہیں علاوہ ازیں میراث کے ذریعے ملکیت اور دولت کی منصفانہ تقسیم بھی ہو جاتی ہے

میراث کے احکام

(۱) قرآن کریم نے جاہلیت کے اس اصول کو باطل کیا کہ میراث کے حقدار صرف مرد ہیں بلکہ اس نے حکم دیا کہ عورتیں بھی میراث کی حقدار ہیں جیسا کہ اس نے سورۃ نساء پ۵ میں فرمایا ہے :-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔	والدین اور رشتہ داروں نے جو چھوڑا ہو مردوں کے لئے اس میں سے ایک حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی اس میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ کم ہو یا زیادہ یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے
(پ سورہ نساء)	

(۲) قرآن کریم نے میت کی اولاد کے حصے سورۃ نساء کی ان آیات دوسرے رکوع میں بیان فرمائے ہیں :-

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ج	اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ
(پ ۴ سورہ نساء)

کے برابر ہے اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ میں سے دو تہائی اور اگر ایک عورت ہے تو اس کے لئے نصف حصہ ہے

مرد و عورت کی میراث میں فرق

مرد کو عورت پر فضیلت دینے اور دو عورتوں کے برابر حصہ لینے میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ مرد کی مالی ذمہ داریاں عورت سے بڑھی ہوئی ہیں مرد نکاح کے وقت بیوی کو مہر ادا کرتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ رہنے کے لئے گھر کا بندوبست کرے اور وہ اہل وعیال کے نان نفقہ کا ذمہ دار بھی ہے خواہ بیوی غریب ہو یا دولت مند مگر اس پر اپنی ذات اور اپنی اولاد کے اخراجات کو برداشت کرنا ضروری نہیں ہے لہذا اگر مرد کا اس کی اس بہن سے مقابلہ کیا جائے جو اپنے بھائی کے آدھے حصے کے برابر میراث حاصل کرتی ہے تو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بہن کی جب شادی ہوگی تو وہ مہر کے خرچ سے بچے گی اور اس کا شوہر اس کے اور اس کی اولاد کے تمام مصارف کا کفیل ہوگا اور اس کی بہن کے لئے کچھ بھی صرف کرنا ضروری نہیں ہوگا بجز اس کے کہ وہ اپنی خوشی سے کچھ صرف کرے لہذا اس کی بہن کو میراث میں سے جو حصہ ملے گا وہ صرف ضرورت کے لئے جمع رہے گا اور اسی وقت کام آسکے گا جب اس کی شادی نہ ہو سکے یا اس کا شوہر مر جائے اور اس نے اپنی بیوی کے لئے کچھ پس انداز نہ کیا ہو (ایسی صورت میں اس کا یہ حصہ کام آسکتا ہے)

لہذا مرد کو عورت کی بہ نسبت مال کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ مرد عورتوں کے محافظ اور نگہبان ہوتے ہیں اور میت کی زندگی میں مرد اس کے لئے زیادہ کار آمد ثابت ہوتے ہیں اسی وجہ سے مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصے بیان کر کے اور مرد و عورت کے حصوں کا فرق جتا کر یہ ارشاد فرمایا ہے ا۔

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۔

تم نہیں جانتے ہو کہ تمہارے والدین اور تمہارے فرزندوں میں سے کون تمہارے لئے زیادہ کار آمد ہے یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حصہ ہے در حقیقت

لے (پ۴) سورہ نساء اللہ علم و حکمت والا ہے۔

دو بیٹیوں کا حصہ

مذکورہ بالا آیت دو بیٹیوں کے حصے کے بارے میں خاموش ہے لہذا حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ دو بیٹیوں کو بھی ایک بیٹی کی طرح حصہ ملے گا کیونکہ اللہ نے دو بیٹیوں سے زیادہ کے لئے دو تہائی کا حصہ مقرر فرمایا ہے مگر اکثر علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ دو بیٹیوں کو بھی دو تہائی حصہ ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوتا ہے اور اگر اس کے ساتھ ایک عورت ہے تو اسے دو تہائی حصہ ملتا ہے لہذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دو بیٹیوں کا حصہ بھی دو تہائی ہے۔ در اصل اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ تعداد کی زیادتی سے حصہ بڑھتا ہے لہذا یہ فرمایا کہ اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں گی تو اس صورت میں بھی ان کا حصہ دو تہائی رہے گا اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب ایک بیٹی اپنے بھائی کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ایک تہائی میراث کی حقدار ہوتی ہے تو اپنی جیسی بہن کے ساتھ مل کر کیسے ایک تہائی سے زیادہ حصے کی حقدار ہو سکتی ہے[۲] بہرحال دیگر ورثاء کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات مذکور ہیں (یہ سب آیات سورہ نساء کے دوسرے رکوع پارہ چہارم کی ہیں۔ مترجم)

والدین کی میراث

(۳) وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (سورہ نساء پ۴)

اگر میت کی اولاد ہو تو اس کے ترکہ میں سے والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین اس کے وارث ہوں تو اس کی والدہ کے لئے چھٹا حصہ ہے یہ سب کچھ وصیت[۳] یا قرضہ ادا کرنے کے بعد ہے۔

لے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب اعلام الموقعین از ابن قیم حصہ دوم صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ مطبع میریہ

۲ے تفسیر بیضاوی۔ ۳ے اس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت اور قرضہ ادا کرنے (باقی صفحہ ۹۳)

۴) وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ

زوجین کی میراث

اگر تمہاری بیویوں کی اولاد نہ ہو تو جو کچھ انھوں نے چھوڑا ہو اس میں سے تمہارے لئے آدھا حصہ ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو وصیت یا قرضہ ادا کرنے کے بعد جو کچھ انھوں نے چھوڑا ہو اس میں سے تمہارے لئے چوتھائی حصہ ہے اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو ان بیویوں کے لئے تمہارے چھوڑے ہوئے حصے میں سے چوتھائی حصہ ہے اور اگر تمہاری اولاد ہو تو وصیت یا قرضہ ادا کرنے کے بعد جو کچھ تم نے چھوڑا ہو اس میں سے ان (بیویوں) کے لئے آٹھواں حصہ ہے

۵) وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوْا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

اخیافی بھائی کی میراث

اگر مرد یا عورت جس کا ورثہ تقسیم ہو رہا ہو کلالہ[1] ہو اور اس کا بھائی یا بہن (اخیافی) ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو وصیت یا قرضہ ادا کرنے کے بعد جو بچے اس کے تہائی میں

(بقیہ صفحہ ۹۲) کے بعد جو کچھ بچے گا اس میں سے والدین اور بیٹوں وغیرہ کو حصے ملیں گے۔

[1] کلالہ اگر میت کی صفت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرنے والے نے نہ اولاد چھوڑی ہو اور نہ باپ چھوڑا ہو اور اگر یہ وارث کی صفت ہو تو اس سے ایسی رشتہ داری مراد ہے جو باپ [illegible] (باقی صفحہ ۹۴)

حَلِیۡمٌ ۔ وہ سب کے سب برابر کے شریک ہیں
اس میں کسی کو نقصان نہ پہونچایا جائے
یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور
اللہ جاننے والا اور بردبار ہے

آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس تقسیم میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رشتہ داری ماں کی وجہ سے ہے جو عورت ہے اس لئے ان سب کو مؤنث ہی کا درجہ دیا گیا ہے علاوہ ازیں اسی رشتے کے مردوں میں میت کی حمایت و امداد اور مدافعت کا جذبہ قوی نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ دوسرے خاندان کے افراد ہوتے ہیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مردوں کی رشتہ داری عصبہ ہونے کی حیثیت سے ہے (جو مستحکم رشتہ ہے) مگر اخیافی بھائی کی رشتہ داری ماں کی طرف سے ہوتی ہے جو عصبہ نہیں ہے علامہ ابن القیم الجوزیہ میراث میں ان لوگوں کے برابر ہونے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں :-

"وہ لوگ محض صلہ رحمی کی بدولت وارث بنتے ہیں کیونکہ وہ رشتہ جس کی بدولت وہ وارث بنتے ہیں مؤنث کا رشتہ ہے اور اس رشتہ میں مرد و عورت سب برابر ہیں اس لئے ایسی صورت میں مذکر کو مؤنث پر ترجیح دینے کی ضرورت نہیں ہے البتہ باپ کے رشتہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے [۳]

سگے بہن بھائی کی میراث

(۲) یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ اِنِ امْرُؤٌا ھَلَکَ لَیْسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَہٗ اُخْتٌ فَلَھَا نِصْفُ مَا تَرَکَ وَھُوَ

وہ لوگ (پیغمبر) تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ کلالہ کے بارے میں اللہ تمہیں یہ

(بقیہ صفحہ ۹۳) لڑکے کی طرف سے نہ ہو [۲] یہاں بھائی یا بہن سے مراد وہ ہیں جو ایک ماں سے ہوں کیونکہ حضرت اُبیؓ کی قرأت میں لِاُمٍّ کا لفظ آیا ہے اور اجماع امت بھی یہی ہے کہ اس سے مراد ماں جائی بھائی ہیں [۳] اعلام الموقعین حصہ دوم صفحہ ۱۱۳

يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا	حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد ہلاک ہو جائے
وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ	اور اس کی اولاد نہ ہو بلکہ ایک بہن ہو
فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ	تو اس کے لئے مال متروکہ میں سے نصف
وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّ	حصہ ہے اور اگر اس بہن کے اولاد نہ
نِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ	ہو تو بھائی اس کا وارث ہے اور اگر
الْأُنْثَيَيْنِ ۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ	دو (بہنیں) ہوں تو ان دونوں کے
أَنْ تَضِلُّوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ	لئے مال متروکہ میں سے دو تہائی حصہ
عَلِيْمٌ ۔	ہے اگر بہت سے بھائی ہوں تو مرد کے
	لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے ۔
	اللہ تمہیں (یہ باتیں) کھول کر بیان کرتا
	تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز
	سے بخوبی واقف ہے [1]

پردہ جب عورت گھر سے باہر نکلے تو اس موقع کے لئے بھی قرآن کریم نے کچھ احکام بیان فرمائے ہیں تاکہ عورت کی عزت و آبرو محفوظ ہو اور وہ لوگوں کی بدنامی، افواہوں اور شک و شبہ سے پاک رہے وہ حکم یہ ہے کہ عورت اپنے تمام بدن کو چھپانے کے بعد اپنی چادر کے ایک کونے سے اپنا سر اور سینہ ڈھک لے اس بارے میں سورہ احزاب (پ ۲۲) کی یہ آیت نازل ہوئی :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ	اے پیغمبر آپ ازواج (مطہرات) بیٹیوں
وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور مومنوں کی عورتوں سے فرما دیجئے
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ	کہ وہ اپنے اوپر چادریں اوڑھ لیا کریں اسی
ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ يُّعْرَفْنَ وَلَا	طرح وہ شناخت نہیں کی جائیں گی اور انہیں

[1] ان آیات میں میراث کا حصہ جن بہن بھائیوں کے لئے بیان کیا گیا ہے ان سے مراد بالاتفاق علماء، سگے بھائی بہن ہیں جن کے ماں باپ دونوں ایک ہوں یا ان کا باپ ایک ہو ماں سے سوتیلے بہن بھائیوں کا حصہ نمبر ۳ میں بیان کیا گیا ہے (مترجم)

يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔	کوئی تکلیف نہیں دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

آداب معاشرت

قرآن کریم نے مومن مرد اور عورتوں کو ایسے اعلیٰ آداب کی تعلیم دی ہے جن کی بدولت عورت اپنی قدر و منزلت کو برقرار رکھ سکتی ہے اور نہ صرف مردوں کا کھلونا بننے سے محفوظ رہ سکتی ہے بلکہ شک و شبہ اور شر و فساد سے بھی بچ سکتی ہے وہ آداب یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب وہ عورتوں کو دیکھیں تو نظریں نیچی رکھیں اور پاک دامنی اختیار کریں اس طرح مومن عورتوں کو بھی یہی حکم دیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان عورتوں کو یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے چند مخصوص رشتہ داروں کے علاوہ اور کسی مرد کے سامنے اپنی زیب و زینت کے اعضاء کو ظاہر نہ کریں ان اعضا میں سے صرف ان اعضا کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جن کا کھولنا دینی، دنیاوی اور جائز ضرورتوں کے لئے ناگزیر ہو، علماء کرام نے ایسے اعضاء سے مراد چہرہ[1] اور ہتھیلیاں لی ہیں اور ظاہری لباس مثلاً نقاب اور چادر کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور پ۱۸ میں مفصل آیات یہ ہیں:-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۗ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	(اے پیغمبر) مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور پاک دامنی اختیار کریں یہ بات ان کے لئے پاکیزہ تر ہے درحقیقت جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ ان سے واقف ہے اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور پاک دامنی اختیار کریں اور اپنے زیب و زینت (کے مقامات) کو نہ ظاہر کریں الجز ان

[1] اگر چہرہ کی طرف دیکھنے سے ایسے فتنہ کا اندیشہ ہو جس سے حرام کاری ہوتی ہو تو بعض علماء نے اس کا سد باب کرنے کے لئے چہرہ کی طرف دیکھنا بھی حرام قرار دیا ہے۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا
لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ
أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ
أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَا
نِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ
أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ
نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ
غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا
عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا
يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ
مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ ۚ
وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا
أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ

کے جو ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں
پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھا کریں[1]
اور اپنی زیب و زینت کو نہ ظاہر کریں
البتہ اپنے شوہروں یا اپنے باپ یا
سسروں، یا بیٹوں اور اپنے سوتیلے
بیٹوں یا بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں
یا اپنی عورتوں اور لونڈیوں یا ایسے
ماتحت (تابع) مردوں کے سامنے جنہیں
(عورتوں کی) ضرورت نہ ہو[2] ایسے بچوں
کے سامنے (اپنی زیب و زینت ظاہر کر
سکتی ہیں) جو عورتوں کے پوشیدہ مقامات
سے واقف نہ ہوں اور یہ عورتیں اپنے
پاؤں اس طرح نہ ماریں کہ جس سے ان
کی پوشیدہ زیب و زینت ظاہر ہو جائے
اور تم سب اے مسلمانو! اللہ کے
سامنے توبہ کرو شاید کہ تمہیں فلاح
حاصل ہو[3]

[1] یعنی اپنی اوڑھنیوں کو اپنی قمیصوں کے گریبانوں پر ڈالے رکھا کریں تاکہ ان کا سینہ اور چھاتی پوشیدہ رہے کیونکہ چہرہ کے علاوہ دیگر اعضاء کو اجنبی مردوں کے سامنے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

[2] اس سے مراد بوڑھے مرد اور وہ مخنث مراد ہیں جنہیں عورت کی خواہش نہ ہو۔

[3] ملاحظہ ہو علامہ رشید رضا کی کتاب نداء للجنس اللطیف و کتاب تفسیر الوحی المحمدی۔ (مترجم)

چوتھی قسم

اسلامی قانون سازی کے بنیادی اصول

اس حصہ میں ہم خدا کی غیر فانی کتاب قرآن کریم کے ان بنیادی اصولوں کا ذکر کریں گے جو روئے زمین کے تمام مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کے لئے دستور العمل بنائے گئے ہیں یہ وہ بنیادی اصول ہیں جو اسلامی قانون سازی کے لئے اسلامی حکام اور علمار کے لئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں اور انھیں بنیادوں پر ہر زمانے کے مجتھد علمار اپنے زمانے میں جدید حالات وضروریات کے مطابق ایسے احکام وقوانین مستنبط کرتے چلے آئے ہیں جن کے بارے میں قرآن وسنت میں صاف احکام موجود نہیں تھے کیونکہ ہر زمانے اور ہر ملک میں نئے نئے واقعات ومسائل اس قدر زیادہ رونما ہوتے ہیں کہ ان کا پہلے سے احاطہ نہیں کیا جاسکتا ایسے نئے نئے واقعات حد شمار سے باہر ہیں اور ہر وقت نئی نئی شکل وصورت میں پیش آتے رہتے ہیں بلکہ ماحول اور قوموں کے اختلاف کی وجہ سے ان کے احکام کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے:

لہٰذا انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے اور خدا کی طرف سے یہ بڑا احسان بھی ہے کہ اس نے بہت سے مسائل واحکام کو اس وقت کے مجتہدین کرام کے اجتہاد وتحقیق پر چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ قرآن کریم کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر وقتی حالات کے مطابق ایسے نئے نئے مسائل کا استنباط کرسکیں جن کی بنیاد قرآن وسنت کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔

ایسے اہم مقاصد جنہیں قرآن وسنت، اسلامی قانون سازی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہیں:۔

(۱) مکمل حق وانصاف کو تلاش کرنا۔

(۲) حقوق وفرائض اور احکام میں مساوات کو اختیار کرنا بجز اس صورت کے جب عام مصلحت، ضرورت یا فطرت عدم مساوات کا تقاضا کرے۔

(۳) ہر کام میں آسانی کو ملحوظ کیا جائے اور دقت کو دُور کیا جائے۔

(۴) عُرف کی اس کی شرط کے ساتھ پابندی کی جائے [۱]

(۵) ہر کام کی مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے اور اس خرابیوں کو دُور کیا جائے۔

(۶) نہ خود کسی کو نقصان پہونچے اور نہ دوسروں کو نقصان پہونچایا جائے۔

(۷) ضرورت ممنوعات کو جائز کر دیتی ہے۔

(۸) ضرورت کے موقع پر صرف ضرورت کی حد تک کام کیا جائے

(۹) شرعی حدود شک وشبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔

(۱۰) معاملات میں خوبیوں کو اختیار کیا جائے اور برائیوں سے پرہیز کیا جائے۔

اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ وہ قرآنی آیات پیش کریں جن سے یہ اصول وقواعد ثابت ہوتے ہیں مگر ایسی آیات اس کثرت سے ہیں کہ یہاں ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم مثال اور نمونے کے طور پر ہم بعض ایسی آیات تحریر کرتے ہیں جن سے ان اصول کا بھی پتہ چلتا ہے جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا ہے

عدل ومساوات

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان عدل ومساوات اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور فیصلہ کرنے یا گواہی دینے میں نفسانی خواہش کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے، خواہ اس سے کسی کا ذاتی نقصان کیوں نہ ہو، اس معاملہ میں دور ونزدیک، امیر وغریب، دوست ودشمن کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے چنانچہ مختلف آیات میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔	اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ	اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانت والوں کو ان کی امانتیں ادا کر دو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

---

[۱] اس کی تشریح تشریع اسلامی کے عام قواعد کی بحث میں آئے گی۔

(۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ ـ شُهَدَاءَ لِلَّهِ ، وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ـ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ـ

اے ایمان والو! انصاف کو اچھی طرح قائم کرنے والے بنو۔ صرف اللہ کے لئے شہادت دو خواہ وہ تمہاری اپنی ذات یا والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ دولتمند یا غریب ہو تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے لہٰذا انصاف سے بچنے کے لئے اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو اگر تم زبان کو دباؤ گے یا روگردانی کرو گے تو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے

(۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

اے ایمان والو! اللہ ہی کے لئے انصاف (شہادت) (کا نظام) اچھی طرح قائم کرو۔ تمہیں کسی قوم کی دشمنی بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف کرو کیونکہ انصاف پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے

دین میں آسانی

قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہے کہ ان احکام کا مقصد کسی کو تکلیف پہونچانا نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو سہولت بہم پہونچانا ہے اور تمام انسانوں کی بھلائی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:-

(۱) لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

اللہ ہر ایک کو اس کی طاقت کے مطابق حکم دیتا ہے۔

(۲) يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔

اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے مشکلات نہیں پیدا کرتا ہے۔

(۳) مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ

اللہ نہیں چاہتا ہے کہ وہ تمہارے لئے تنگی پیدا کرے۔

(۴) وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کے جہاد کا حق ہے اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے اور تمہارے لئے دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے،

مصلحت بینی قرآن کریم کے اس بنیادی اصول پر اکثر احکامِ شرعیہ کا دار ومدار ہے کہ ہر کام میں مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے اور خرابیوں کو دور کیا جائے اس میں یہ اصول بھی شامل ہے "نہ نقصان اٹھاؤ اور نقصان پہونچاؤ" اس سلسلے کی آیات یہ ہیں۔

(۱) وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

تم آپس میں مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ مال اس لئے حکام کے پاس پہونچاؤ کہ ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال کو کھا سکو۔ حالانکہ تم اسے بخوبی جانتے ہو۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔

اے ایمان والو! تم اپنا مال آپس میں نہ کھا جاؤ سوائے اس کے کہ وہ طریقہ تمہاری باہمی رضامندی کی تجارت کا ہو۔

(۳) اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

حرمت والا مہینہ (جس میں لڑائی بند ہو جاتی ہے) حرمت والے مہینے کے بدلے میں ہے اور حرمت کا بدلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جو تمہارے ساتھ زیادتی کرے۔ تو تم بھی اس کے ساتھ اس قدر زیادتی کرو جس قدر اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہو

(۴) وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور

التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۔

نیکی کرو کیونکہ نیکی کرنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے ۔

(۵) وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تعاونوا عَلَی الاثمِ والعدوَانِ

تم نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر تعاون نہ کرو

(۶) وَلْتَکُنْ مِنْکُمْ اُمَّۃٌ یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُولٰئِکَ المفلحون

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی طرف بلائے نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روکے اور یہی لوگ، فلاح پانے والے ہیں ۔

(۷) وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ وَاَوْفُوْا بِالْعَھْدِ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مسئُولًا ۔

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے کے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہونچ جائے اور عہد و پیمان کو پورا کرو کیونکہ عہد و پیمان کے بارے میں بازپرس ہوگی ۔

(۸) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا بالعقود ۔

اے ایمان والو! عہد و پیمان کو پورا کرو

(۹) لَا تُضَارَّ وَالِدَۃٌ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَہٗ بِوَلَدِہٖ

نہ تو والدہ کو اس کی اولاد کے ذریعے تکلیف پہونچائی جائے اور نہ اس کے باپ کو اس کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچے

(۱۰) وَلَا یُضَارَّ کَاتِبٌ وَلَا شَھِیْدٌ

لکھنے والے اور گواہ کو نقصان نہ پہونچایا جائے ۔

(۱۱) وَلَا تَکْتُمُوا الشَّھَادَۃَ وَمَنْ یَکْتُمْھَا فَاِنَّہٗ آثِمٌ قَلْبُہٗ ۔

گواہی کو مت چھپاؤ کیونکہ جو گواہی چھپاتا ہے اس کا دل گناہگار ہوتا ہے

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً الی عنقِکَ تَبْسُطْھَا کُلَّ

تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے طوق بنائے ہوئے نہ رکھو اور نہ اسے بالکل کھول دو۔

الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا

تم ملامت زدہ اور عاجز ہو کر بیٹھ رہو گے

(۱۳) وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا -

اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے ہیں اور نہ تنگ خرچ کرتے ہیں اور ان کا طریقہ ان کے درمیان اعتدال کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۱۴) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا

کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔

(۱۵) وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ - وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ -

اور اگر تم نے (سود اور اس کے جواز سے) توبہ کر لی ہے تو تمھارے لئے تمھارا سرمایہ (باقی) ہے نہ تو تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک کے لئے مہلت دو۔

مجبوری کے لئے رعایت

قرآن کریم نے ضرورت اور مجبوری کی صورت میں خاص رعایت دی ہے ایسے موقع پر اس نے ممنوعات کو بھی جائز قرار دیا ہے مگر اس کی اجازت صرف ضرورت اور مجبوری کی حد تک رکھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - (سورہ بقرہ)

جو کوئی مجبور ہو جائے ایسی حالت میں کہ وہ سرکشی کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

(۲) فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

جو کوئی بھوک میں مجبور ہو جائے اور وہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

دیگر آیات

مندرجہ ذیل آیات سے بھی اسلام کے دیگر بنیادی اصول و مقاصد مستنبط ہو سکتے ہیں:۔

(۱) وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ	اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو کر اللہ پر بھروسہ کرو کیونکہ وہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔
(۲) وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى	ہر ایک اپنے لئے کام کرتا ہے اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (ہر ایک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے)
(۳) وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔	برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے لہذا جو درگذر کرے تو اس کا اجر دینا اللہ پر ہے اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ہے جو کوئی اپنے اوپر ظلم ہونے پر انتقام لے تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے، الزام ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہوں اور زمین میں ناحق بغاوت برپا کرتے ہوں انہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے (ظلم کی مخالفت اور مذمت)
(۴) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا	جس چیز کا تمہیں کوئی علم نہ ہو تو اس کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ کان آنکھ اور دل ہیں سے ہر ایک چیز کے بارے میں باز پرس ہوگی۔
(۵) قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ	کہہ دیجئے کس نے اللہ کی وہ زیب و زینت کی چیزیں اور پاکیزہ رزق حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں؟ (تمام اچھی چیزیں مباح ہیں۔

(۶) فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا پیدا ہو جائے تو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو

(۷) وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔

جو کوئی ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد (کتاب وسنت کی) رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کے راستے کے برخلاف چلے تو ہم اس کا رُخ ادھر ہی پھیر دیں گے جس طرف وہ چلا ہو اور اسے دوزخ میں ڈال دیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے (سنت واجماع کا ثبوت)

(۸) هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللّٰهِ فَأَتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

یہ (خدا) وہی ذات ہے جس نے اہل کتاب کافروں (قبیلۂ بنو النضیر) کو ان کے گھروں سے نکال دیا یہ ان کی پہلی جلا وطنی تھی تمھیں یہ خیال نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور انھیں بھی یہ گمان تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گے مگر اللہ ان کے پاس اس جگہ سے آیا جہاں سے ان کا خیال و گمان بھی نہ تھا۔ اور اس نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو اجاڑنے لگے لہذا اے آنکھوں والو! اس سے عبرت پکڑو۔ [1]

قرآن کریم کی اہمیت

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں

[1] اس آیت سے بعض علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ قیاس بھی شرعی دلیل ہے۔

بعض احکام کا مفصل طریقے پر ذکر کیا گیا ہے اور بعض کا مجمل ذکر ہے اور بعض مسائل کے صرف بنیادی اصول وقواعد بیان کئے گئے ہیں اور ان کی تشریح سنتِ نبوی اور مجتہدین کرام کے اجتہاد پر موقوف رکھی گئی ہے اس بنا پر امام شافعی نے فرمایا ہے

" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام بتائے ہیں وہ سب قرآنی اصول کو سمجھ کر بیان کئے ہیں ۔"

آپ نے مزید فرمایا ہے :۔

"۔ دین کے سلسلے میں جو واقعہ کسی کے ساتھ رونما ہوتا ہے، کتاب اللہ میں اس کی رہنمائی کے لئے کوئی نہ کوئی اصول ضرور موجود ہوتا ہے "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

" جو شخص علم حاصل کرنا چاہے تو وہ قرآن کریم کی طرف توجہ کرے ۔ کیونکہ اس میں گذشتہ اور آئندہ کے بارے میں سب باتیں موجود ہیں " [۱]

لہذا قرآن کریم کے عجائبات بے شمار ہیں، اس میں ہر علم کے اصول ومبادیات کا ثبوت ملتا ہے یا اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا

" عنقریب بہت سے فتنے برپا ہوں گے " پوچھا گیا —— " اس سے نکلنے اور گریز کی صورت کیا ہوگی " —— آپ نے فرمایا —— " اس سے بچنے کا ذریعہ (صرف) اللہ کی کتاب ہے ، اس میں گذشتہ اور آئندہ لوگوں کی خبریں ہیں اور تمہارے باہمی معاملات کے بارے میں فیصلے (موجود) ہیں [۲]

---

[۱] امام بیہقی فرماتے ہیں اس سے مراد علم کے اصول ہیں ۔ ملاحظہ ہو اتقان از سیوطی

[۲] اتقان از علامہ سیوطی حصہ دوم

قرآنی احکام کی بنیادی خصوصیات

ہم نے گذشتہ باب میں قرآن کی قانون سازی کے عام اصول بیان کئے ہیں۔
ان چیزوں کی بنیاد چار چیزوں پر ہے [1]

(۱) قرآنی احکام میں آسانی رکھی گئی ہے اور مشکلات نہیں پیدا کی گئی ہیں اسی وجہ سے شرعی معاملات میں کئی باتوں کی اجازت دی گئی ہے جسے رخصت کہتے ہیں جیسے مسافر اور مریض کے لئے رمضان شریف میں روزہ نہ رکھنا اور پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرنا ہے، اور مجبوری کے موقع پر کوئی حرام چیزوں کو کھائے

(۲) قرآنی احکام ایسے ہیں جو آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں اور ان کے ادا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جاہل اور سیدھے سادھے بدو صحرا سے آپ کے پاس آتے تھے اور جب مسلمان ہوتے تھے تو آپ اللہ کے فرائض اور حرام باتیں سب ایک ہی مجلس میں انھیں سمجھا دیتے تھے۔ حدیث شریف میں مذکور ہے :-

"اللہ تعالیٰ نے چند فرائض مقرر کئے ہیں انھیں ضائع نہ کرو اور کچھ شرعی حدود مقرر کئے ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور چند چیزوں کو حرام کیا ہے ان سے بچو اور از راہ ہمدردی چند باتوں پر اس نے خاموشی اختیار کی ہے وہ انھیں بھول نہیں ہے لہٰذا تم انھیں تلاش نہ کرو"

تدریجی اصول

(۳) شرعی احکام کو بتدریج بنایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں چند عادات و رسوم راسخ ہو چکی تھیں جن کا فوراً چھوڑنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ اس لئے ابتدا میں انھیں حرام نہیں کیا گیا اس طرح عربوں پر فوراً تمام احکام و فرائض نافذ نہیں کئے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے حکیمانہ طریقے سے

[1] تاریخ التشریع الاسلامی از خضری چوتھا ایڈیشن صفحات ۸-۲۳ (عربی) نیز ملاحظہ ہو رباق ۱۲۸

انھیں بتدریج ہدایات دی تھیں پہلے اس نے ان کے دل و دماغ کو ان احکام و فرائض کے قبول کرنے کے قابل بنایا تاکہ انہیں کوئی گرانی اور دقت محسوس نہ ہو ہمارے اس دعوے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اسلامی عبادات ایک ہی سال میں فرض نہیں کی گئیں اور سب کی سب یکدم مسلمانوں پر نافذ نہیں کی گئیں چنانچہ ابتداء میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب اور جوئے بازی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے قرآن کریم کی زبان سے یوں جواب دیا:-

قل فیہما اثمٌ کبیرٌ وّمنافعُ للناس وَاِثمهما اکبرمن نفعهما (پ۲ سورہ بقرہ)	(اے پیغمبر) فرما دیجئے کہ ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ بھی ہے مگر ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں کھلم کھلا ممانعت نہیں کی گئی ہے مگر ایک عقل مند اور ماہر اسرار شریعت اس سے ممانعت کا مفہوم نکال سکتا ہے بعد ازاں نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے اس کو اس طرح منع کیا گیا ہے:-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حتّٰی تعلموا ما تقولون۔ (پ۵ نساء)	اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ جبکہ تم نشے میں ہو یہاں تک کہ ہوش میں آنے کے بعد تمھیں معلوم ہو جائے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

اس کے بعد کسی وقت بھی شراب پینے سے قطعی طور پر ممانعت کردی گئی چنانچہ فرمایا گیا:-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الخمر والمیسرُ والانصاب والازلام رجسٌ من عمل	اے ایمان والو! درحقیقت شراب جوئے بازی، بت اور پانسے شیطان کے گندے کام ہیں ان سے تم بچتے

(بقیہ صفحہ) اس کا ترجمہ تاریخ فقہ اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی — مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ (مترجم)

الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون | رہو شاید کہ تم فلاح پاؤ۔ (پ مائدہ)

اجمال و تفصیل

(۴) یہ اصول بھی پہلے اصول پر مبنی ہے جو کی اور مدنی احکام کے درمیان مقابلہ کرنے سے واضح ہو سکتا ہے کیونکہ کی قوانین مجمل ہیں اس دور میں بہت کم تفصیلی احکام بیان کئے گئے ہیں مگر مدنی دور میں وہ سب مفصل احکام بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے چنانچہ ہم نے قسم دوم و قسم سوم میں انھیں بیان کیا ہے، یہ مفصل احکام اکثر سورۃ بقرہ، سورہ نساء، سورۃ مائدہ، انفال، توبہ، حج، نور اور احزاب میں آئے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بنیادی اصول اور ان سے متعلقہ قرآنی آیات اور آیات احکام کا ذکر کیا ہے، اب ہم اجمالی طور پر اہم اصولوں کا خلاصہ بیان کرتے ہیں

(۱) قرآنی احکام عقل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں [1]

(۲) یہ احکام آسان ہیں ان کے ادا کرنے میں کوئی دقت اور دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

(۳) ان احکام کی دو قسمیں ہیں :— (۱) عزائم (۲) رخصت (ایسے احکام جن کے لئے کوئی مجبوری نہ ہو، ان کا ادا کرنا عزائم کہلاتا ہے اور جن احکام کو کسی مجبوری کی وجہ سے ادا نہ کیا جاسکے انھیں رخصت کہا جاتا ہے (مترجم)

لچکدار قوانین

قرآن کریم میں تفصیلی احکام صرف ان مسلّم الثبوت مسائل کے بیان کئے گئے ہیں جو زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے نہیں بدلتے ہیں مگر دیگر معاملات کے صرف بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں اس طرح تفصیلات کے لئے ہر قوم اور ہر زمانے کے مجتہد کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے تاکہ وہ اس وقت کے لوگوں کی ضروریات اور مفادات کے مطابق نئے قوانین بنا سکیں اور ان کے ذریعے اس وقت کی خرابیوں کو دور کر سکیں کیونکہ ہمیشہ ایسی لازوال شریعت

---

[1] اس کے ثبوت میں گذشتہ صفحات کی آیات و احکام پر غور و خوض کرنا کافی ہے۔

کے لئے جو ناقابل تنسیخ ہو، یہی طریقہ مناسب ہے تاکہ ہر زمانے میں اس کے اصول کارآمد ہوں کیوں کہ کوئی دوسری شریعت اس کے قائم مقام نہیں بن سکتی ہے،

حکیمانہ قوانین

(۵) قرآنی احکام کا مقصد انسانوں کی بھلائی ہے اس کے تمام احکام مصلحت کے ماتحت ہیں اور اس کے قوانین اعلیٰ حکمت اور مفید مقاصد پر مبنی ہیں اسی کے ساتھ ساتھ وہ عقل سلیم کے عین مطابق ہیں۔

اعلیٰ اخلاق پر مبنی

(۶) تمام قرآنی احکام خواہ وہ شخصی ہوں، یا تمدنی اسیاسی اور جنگی قوانین ہوں وہ سب کے سب حق و انصاف، صداقت امانت، ایفاءِ عہد، احسان و ہمدردی کی اعلیٰ قدروں پر مبنی ہیں اور وہ ظلم و غداری، عہد شکنی، جھوٹ، خیانت، دھوکے بازی، سنگ دلی، لوگوں کا مال ناحق کھانے یعنی رشوت ستانی اور سود خوری سے قطعی پاک و صاف ہیں

یہی وجہ ہے کہ قرآنی شریعت اور اسلامی احکام مذاہب عالم میں سب سے زیادہ منصفانہ اور اعلیٰ نمونہ پر ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ انھیں تسلیم کرکے ان کی پیروی کی جائے۔

مآخذ وکتب حوالہ جات

(۱) القرآن الکریم (۲) ارشاد الفحول :- از شوکانی
(۳) الموافقات :- از علامہ شاطبی (۴) تاریخ التشریع الاسلامی :- از علامہ خضری (اردو ترجمہ موسوم بہ تاریخ فقہ اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ (ہندوستان) (۵) الوحی المحمدی :- از سید رشید رضا (اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل لاہور)
(۶) نداء للجنس اللطیف :- از سید رشید رضا (۷) اسرار الشریعۃ اسلامیہ :- از استاذ ابراہیم علی - (۸) القیاس فی الشرع الاسلامی از علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم (۹) احکام القرآن :- از ابوبکر الرازی،
(۱۰) تفسیر البیضاوی - (۱۱) تفسیر ابو السعود (۱۲) فتح القدیر -
(۱۳) اعلام الموقعین از علامہ ابن القیم (۱۴) ہدایۃ المجتہد :- از ابن رشد
(۱۵) الاتقان فی علوم القرآن :- از علامہ سیوطی

فصل دوم

سُنّتِ نبویؐ

سنتِ نبویؐ بھی اسلامی قوانین کی بنیاد ہے اس میں سنت سے مباحث شامل ہیں جن میں سے اہم بحث اس کی تشریعی حیثیت ہے چونکہ یہ بھی اسلامی احکام کا ماخذ اور بنیاد ہے لہٰذا اس فصل میں ہم جو مباحث بیان کریں گے ان کی صورت یہ ہے:۔

(۱) سنت کے مفہوم کی وضاحت (۲) سنّت کی حجّیت (۳) سنت کے مخالفوں کے خیالات اور ان کی تردید۔ (۴) سنّت کا تشریعی درجہ (۵) قرآن کریم سے سنت کا تعلق۔ (۶) اسلامی احکام میں سنت کی حیثیت (۷) کتب احادیث اور احکام کی حدیثیں (۸) تشریعِ نبویؐ کا نمونہ۔

سنّت کا مفہوم لغت میں سنت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ راستہ جس پر لوگ چل چکے ہوں۔ علامہ کسائیؒ فرماتے ہیں:۔

"سنت کے معنی دوام کے ہیں جب عرب سنت کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے ایک محاورہ ہے "سنت الماء" ——— "تو لگاتار پانی گراتا رہا"

بعض لوگوں نے سنت کا مفہوم یہ بتایا ہے ——— "مانوس راستہ" خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ قابل تعریف ہو یا قابل مذمت، اس مفہوم کی تائید ذیل کی صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے آپ نے فرمایا:۔

"جس نے اچھی سنت جاری کی تو اسے نہ صرف اس کا اجر ملے گا بلکہ ان لوگوں کا ثواب بھی قیامت تک ملتا رہے گا۔ جو اس پر عمل کریں گے

اور جس نے بری سنت جاری کی تو اس پر نہ صرف اس کے گناہ کا بوجھ ہوگا بلکہ جو لوگ قیامت تک اس پر عمل کریں گے ان کا بارگراں بھی اس رکی گردن) پر رہے گا"

فقہاء کرام کی اصطلاح میں سنت کا اطلاق اس عمل پر ہوتا ہے جو واجب نہ ہو یعنی اگر کسی کام کو کرنا ضروری ہو تو وہ واجب ہے اور اگر یقینی طور پر کوئی کام کرنے کو نہ کہا جائے تو وہ سنت ہے، کبھی فقہاء سنت اُس فعل کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کیا ہو اور کبھی بلا عذر چھوڑ بھی دیا ہو۔

کبھی سنت کا اطلاق بدعت کے مقابلے میں بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ طلاق کی تقسیم میں ایک طلاق کو سنّی اور دوسری قسم کی طلاق کو بدعی کہا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے "فلاں شخص سنت پر چل رہا ہے"، یعنی اس کا عمل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہے اور فلاں شخص بدعت پر ہے، یعنی اس کا عمل رسولؐ کے عمل کے مخالف ہے۔

اصطلاحی مفہوم محدثین اور جمہور علماء کرام کی اصطلاح میں سنت ہر اُس کام کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قول یا فعل یا تائید کی صورت میں صادر ہوا ہو اور وہ اسلامی شریعت اور اس کے احکام کی دلیل بن سکے یہی وہ مفہوم ہے جس کے مطابق ہم آگے چل کر سنت پر بحث کریں گے۔

عمل صحابہؓ امام شاطبی فرماتے ہیں، سنت کا لفظ صحابہ کرامؓ کے عمل پر بھی بولا جاتا ہے خواہ وہ عمل کتاب و سنت میں پایا جائے یا نہیں۔ کیوں کہ عمل صحابہؓ بھی سنت کے اتباع پر مبنی ہوتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ وہ خود رسول اکرم کی ذات سے منقول ہو کر نہیں آتا ہے اس سنت میں صحابہ اور ان کے جانشینوں کے متفقہ فیصلے اور اجماعی اجتہادات بھی شامل ہیں اس مفہوم کے ماتحت مصالح مرسلہ اور استحسان کے تمام مسائل بھی سنت میں شامل ہو جائیں گے جیسا کہ صحابہؓ نے شراب کی سزا اور قرآن کریم کے جمع کرنے پر اتفاق رائے سے کام کیا تھا اسی طرح انھوں نے مسلمانوں

کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ قرآن کریم کے سات لہجوں میں سے صرف کسی ایک لہجے میں قرآن پڑھا کریں، نیز صحابہؓ اور خلفاء راشدین نے حساب کتاب کے لئے رجسٹر اور دفاتر قائم کئے، صحابہؓ کے عمل کی تائید میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے

"تم میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو جو قوم کے رہنما ہیں اختیار کرو"

لہٰذا اگر عمل صحابہؓ کو بھی سنت میں شامل کر لیا جائے تو علماء اصول کے قول کے مطابق سنت کی چار قسمیں بن جاتی ہیں (۱) رسول اکرمؐ کا قول (۲) آپ کا فعل (۳) آپ کا اقرار و تائید (۴) عمل خلفاء اور صحابہؓ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قول یا فعل یا اقرار و تائید منقول ہے وہ یا تو وحی الٰہی کے ذریعے حاصل ہوا ہے یا آپ کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہے کیونکہ آپ کے اجتہاد کو بھی شرعی حیثیت سے صحیح سمجھا گیا ہے [۱] علامہ شوکانی اپنی کتاب ارشاد الفحول میں فرماتے ہیں

"علماء کرام اسے پسند نہیں کرتے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت ابو بکرؓ یا حضرت عمرؓ کی سنت ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے اس کے جواب میں یہ حدیث صحیح پیش کی جاتی ہے،

"تم میری سنت اور ہدایت کرنے والے خلفاء راشدین کی سنت پر چلو اور اسے مضبوطی سے پکڑے رہو"

اس پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں سنت سے مراد طریقہ ہے

سنت نبوی کی حجیت

ایک معمولی جماعت کے علاوہ جو نا قابل اعتبار ہے، تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کے بعد سنت نبویؐ تشریعی احکام کی بنیادی مآخذ ہے، سنت نبوی یا تو احکام قرآنی کی تشریح کرتی ہے یا اس کے شرعی احکام کی تکمیل کرتی ہے لہٰذا اگر سنتِ نبویؐ کے ذریعے شرعی احکام ثابت

---

[۱] الموافقات مطبوعہ مطبع سلفیہ ۱۳۴۱ھ حصہ چہارم صفحہ ۳۲

[۲] ارشاد الفحول مطبوعہ مطبع صبیح ۱۳۴۹ھ صفحہ ۲۹

ہو جائیں اور ان کی روایت و نقل مکمل طور پر صحیح ہو تو ان احکام کو ماننا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے یہاں تک کہ امام شافعی نے فرمایا ہے۔

"میں نے کسی ایسے آدمی سے جو عالم مشہور ہو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کے احکام کو ماننا اور ان پر عمل کرنا فرض نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ یہی کہے گا کہ کتاب اللہ یا سنت نبویؐ کے اقوال کو تسلیم کرنا ضروری ہے ان کے علاوہ جو چیزیں ہیں وہ ان کے تابع ہیں"[1]

حجیت سنّت کے دلائل

سنت نبویؐ کو شرعی ماخذ ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل دلائل ہیں :۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے :۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

اے رسول! تمھارے پروردگار کی طرف سے جو تم پر نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کرو۔

اس آیت کی رو سے خداوند تعالیٰ نے آپ کو معلّم اور مبلغ مقرر کیا ہے۔ تا کہ آپ قرآن کریم کے شرعی احکام اور آسمانی قوانین کی تشریح و توضیح فرماتے رہا کریں اسی طرح یہ آیات بھی مذکور ہیں :۔

(۱) وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔

ہم نے تمھاری طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تا کہ لوگوں کی طرف جو کلام نازل کیا گیا ہے اسے تم کھول کر بیان کرو اور شاید وہ (اس پر) غور و فکر کریں۔

(۲) كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

جیسا کہ ہم نے تمھاری طرف تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمھیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمھیں پاکیزہ بناتا ہے اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے

[1] کتاب الام حصہ ہفتم کتاب جماع العلم از امام شافعی

بیان کرنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مجمل باتوں کی توضیح کی جائے اور مشتبہ کلام کا اصل مفہوم متعین کیا جائے یا عام بات کی تخصیص کی جائے اور مطلق کلام کو مقید کیا جائے۔ لہٰذا ان آیات کا واضح مفہوم یہی ہے کہ جب آپ احکام کی تشریح فرماتے ہیں یا ان کی تعلیم دیتے ہیں تو وہ تعلیم و توضیح خدا کے حکم کے مطابق ہوتی ہے اور خدا کی رہنمائی اور ہدایت کے مطابق آپ ان احکام کی توضیح و تشریح فرماتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کی اجازت اور اس کے حکم سے ہوتا ہے اس لئے ان احکام کی اطاعت اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدائی احکام کی اطاعت ضروری ہوتی ہے کیونکہ رسولؐ کی توضیح و تشریح کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر اس پر عمل کرنا ضروری نہ قرار دیا جائے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی بہت سی آیات میں رسولؐ کی اطاعت اور اس کے احکام کو بجالانا لازم قرار دیا ہے اور رسولؐ کی مخالفت سے منع فرمایا ہے بلکہ اس کے حکم کو ماننا واجب رکھا ہے اور اس کی نافرمانی کو کھلی گمراہی قرار دیا ہے لہٰذا ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تبلیغ و تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ اور اختیارات بھی دیئے ہیں یہ حکم نافذ کرنے اور قانون سازی کے اختیارات ہیں یہ بات مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتی ہے۔

(۱) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (سورہ نساء)

تمہارے پروردگار کی قسم! وہ ہرگز مومن نہیں سمجھے جائیں گے جب تک کہ وہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں (اے رسول) اپنا منصف نہ ٹھہرائیں۔ اور جو تم فیصلہ کرو اس کی وجہ سے وہ اپنے اندر کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس حکم کو بلاچون وچرا تسلیم کرلیں

(۲) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

جب اللہ اور اس کے رسولؐ فیصلہ کردیں تو کسی مومن مرد یا مومن عورت اپنے معاملے پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

کرتا ہے وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے۔ (پ۲۲ سورہ احزاب)

(۳) فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(پ۱۸ سورہ نور)

وہ لوگ جو اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس بات سے ڈریں کہ کہیں وہ فتنہ میں بتلا نہ ہو جائیں، یا ان پر کوئی دردناک عذاب نہ آجائے

(۴) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (پ۳ سورۂ آل عمران)

(اے پیغمبر) فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، کہہ دیجئے اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اگر وہ روگردانی کریں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا ہے

(۵) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (پ۵ نساء)

جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

اطاعت رسولؐ

مذکورہ بالا قسم کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں جن سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت کے ذریعے جو حکم صادر فرمائیں اس پر عمل کرنا ضروری ہے بلکہ قرآنی آیات میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ بار بار رسولؐ کی اطاعت کا ذکر آتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی احکام کے علاوہ ایسے احکام بھی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے مگر جو رسولؐ کریم کے بتائے ہوئے ہیں ان کا ماننا بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ قرآنی احکام کو تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ رسول کریمؐ کے احکام بھی در اصل اللہ کے احکام ہیں جن کا سرچشمہ یا تو الہام ہے یا وہ آپ کے ایسے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہوتے ہیں جسے تائید الٰہی حاصل ہے۔

(۳) قرآن کریم میں جو مجمل فرائض واحکام بیان کئے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پوری تفصیل بیان فرمائی ہے جیساکہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام، ان فرائض کو ادا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک سنت نبوی کی پیروی نہ کی جائے کیونکہ آپؐ ہی نے ان کے اوقات، طریقہ ادا ارکان اور شروط بیان فرمائے ہیں چنانچہ خود آپؐ کا ارشاد ہے:-

"جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھو اسی طرح تم بھی نماز پڑھو"

اسی طرح جب آپؐ نے حج کیا تو آپؐ نے فرمایا:-

"مجھ سے اپنے مراسم حج سیکھو"

لہٰذا قرآنی فرائض کو بجا لانے کے لئے سنت نبویؐ کی پیروی کرنا ضروری ہے جب ایسے موقع پر سنت نبویؐ کا اتباع ضروری ہو تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو شرعی حکم صادر ہو اس کو بھی تسلیم کرنا لازمی ہو جاتا ہے بشرطیکہ صحیح طریقے سے وہ احکام ہم تک پہنچے ہوں کیوں کہ وہ بھی رسولؐ کے احکام ہیں لہٰذا آپ کے بعض احکام کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

(۴) رسولؐ اکرم کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد تمام صحابہؓ کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کی سنت پر عمل کرنا واجب ہے بعض احکام کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہیں لیکن ان کے بارے میں آپؐ نے کچھ فیصلے کئے ہیں ان کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے بلکہ صحابہؓ کا عام طریقہ یہ تھا کہ جب انھیں کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ملتا تھا تو اس موقع پر وہ سنت نبویؐ کی طرف رجوع کرتے تھے اس کا ثبوت حضرت معاذؓ کی اس حدیث[1] سے بھی ملتا ہے جو قاضیوں قانون دانوں اور مجتہدین کے لئے دستور العمل بنی ہوئی ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کا طرز عمل کیا تھا جبکہ ان کے سامنے کوئی معاملہ پیش کیا جاتا تھا چنانچہ صحابہؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ جب وہؓ کتاب اللہ میں کسی مسئلہ کا حل نہیں پاتے تھے مگر کوئی سنت نبویؐ مل جاتی تھی تو وہ سختی

[1] اس حدیث کا ذکر "سنت کا تشریعی درجہ" کے باب میں آئے گا۔

کے ساتھ اس پر عمل کرتے تھے بلکہ سنت کے ہوتے ہوئے اس معاملے میں اپنے ذاتی اجتہاد یا بحث و مذاکرہ کو درمیان میں نہیں لاتے تھے [۱]

مخالفین سنّت کے خیالات

ہم نے گذشتہ صفحات میں سنت کی حجیت کے بارے میں مفصل دلائل پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ بھی احکام شرعیہ کی ایک ماخذ اور سرچشمہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسے دلیل شرعی ماننا مسلّم الثبوت اور متفقہ مسئلہ ہے البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ اسے کس طریقے سے ثابت کیا جائے اور سنت کو قبول کرنے کی شرائط کیا ہیں۔

تاہم ہمیں یہ معلوم ہے کہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صرف کتاب اللہ کو مانتا ہے اور سنت نبویؐ کے احکام کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ کتاب اللہ کی سنت کے برخلاف تاویل و تشریح کرتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہی حدیث قابل قبول ہے جو کتاب اللہ کے موافق ہو امام شاطبی نے اپنی کتاب الموافقات میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے، اور امام شوکانی نے ارشاد الفحول میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے یہ لوگ اپنے خیالات کو اس حدیث سے ثابت کرتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا ہے:۔

"میری طرف سے جو کلام تمھارے پاس آئے تو اُسے کتاب اللہ پر پیش کرو اگر وہ کتاب اللہ کے موافق ہو تو (سمجھو) کہ میں نے یہ بات کہی ہے، اور اگر وہ کتاب اللہ کے خلاف ہو تو وہ بات میں نے نہیں کی ہے میں کتاب اللہ کی کیسے مخالفت کر سکتا ہوں جبکہ اس کے ذریعے اللہ نے مجھے ہدایت فرمائی" [۲]

مگر یہ حدیث جو وہ اپنے ثبوت میں لاتے ہیں، قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ اہل بصیرت محدثین نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ موضوع ہے ــــــ یہاں تک کہ

---

[۱] اصول الفقہ۔ از جناب عبدالوہاب خلاف "بحث سنت"

[۲] یہ حدیث کم وبیش الفاظ اور مختلف عبارات کے ساتھ منقول ہے۔

عبدالرحمٰن بن مھدی نے یہ فرمایا ہے ــــــــــ " اس حدیث کو زندیقیوں اور خارجیوں نے گھڑا ہے ــ " جناب یحییٰ بن معین فرماتے ہیں ــــــــــ " یہ موضوع ہے " امام شافعی نے فرمایا ہے ــــــــــ " کسی معتبر راوی حدیث نے اسے کسی معمولی یا بڑی حدیث میں روایت نہیں کیا ہے " اسی طرح محدثین کا یہ قول ہے کہ ان اہل علم کے نزدیک جو احادیث کے صحیح اور کھوٹے کی پہچان رکھتے ہیں ان الفاظ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے [1]

اگر اس حدیث کو صحیح فرض بھی کر لیا جائے تو اس صورت میں بھی یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ سنت کے احکام قابلِ عمل نہیں ہیں اس لئے صرف قرآن کریم پر اکتفاء کیا جائے کیونکہ اس حدیث کو صحیح مان لینے کی صورت میں صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی حدیث قرآن کریم کے مخالف ہو اور ان دونوں کو متفق بنانے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو اس صورت میں حدیث پر عمل نہ کیا جائے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری صورتوں میں حدیث پر عمل نہ کیا جائے بلکہ ایسی حالت میں بھی مندرجہ ذیل صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

(۱) حدیث کھلم کھلا کتاب اللہ کے موافق ہو (۲) بظاہر کتاب اللہ کے مخالف ہو مگر درحقیقت اس کو موافق بنایا جا سکتا ہو۔ (۳) حدیث میں ایسا حکم بیان کیا گیا ہو جو کتاب اللہ میں موجود نہ ہو۔ ایسی صورت میں حدیث نہ موافق ہو گی اور نہ مخالف ہو گی (لہٰذا ان صورتوں میں مذکورہ بالا حدیث کے مطابق بھی عمل کیا جا سکتا ہے)

منکرین حدیث کے دو گروہ

امام شافعی نے اپنی کتاب الاُم کے ساتویں حصہ میں ایک خاص باب میں منکران حدیث کے اقوال نقل کئے ہیں اس وقت اس گروہ کی دو جماعتیں تھیں ایک جماعت کی رائے یہ تھی کہ اگر کسی معاملے میں حدیث کی قرآن کریم موافقت کرتا ہو تو وہ حدیث تسلیم کی جائے گی یعنی وہ حدیث اسی وقت قابل قبول ہو گی جبکہ قرآن کریم اس کی تائید و موافقت کرتا ہو اگر وہ مخالف ہو یا اس موضوع کے بارے میں وہ خاموش ہو تو

[1] الموافقات حصہ چہارم صفحہ ۸ ــ ۱۰

ایسی حدیث پر عمل نہیں ہو گا بظاہر یہ وہ جماعت ہے جس کی طرف امام شاطبی نے موافقات میں اشارہ کیا تھا اور اس کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس کی تردید بھی کر چکے: موافقات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ بعض زندیقیوں اور خارجیوں کی رائے ہے اور اسے اہلِ بدعت کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔

دوسری جماعت وہ ہے جو کسی ایسے مسئلے میں جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہو۔ کسی حدیث کو تسلیم نہیں کرتی ہے یہ جماعت اپنے خیالات میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ یہ کہنے لگی تھی کہ اگر کوئی وہ کام جس پر نماز یا زکوٰۃ کے لفظ کا کم از کم صورت میں اطلاق ہوتا ہو، انجام دے تو سمجھ لو کہ نماز اور زکوٰۃ ادا ہو گئی، اور جو چیز کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو تو وہ کسی پر فرض نہیں ہے "

امام شافعی نے ان دونوں جماعتوں کا ان کے مخصوص ناموں سے ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ان کے کسی لیڈر یا سرگروہ کا تذکرہ کیا ہے تاہم علامہ خضری نے اپنی کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" میں بیان کیا ہے کہ یہ جماعت بصرہ میں تھی اور وہ معتزلہ کے علماء کلام تھے[1] قدیم زمانے میں یہ گروہ قلیل تعداد میں تھا اور اس کے خیالات قابل اعتبار نہ تھے تاہم موجودہ زمانے میں بھی ان خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، چنانچہ مجلہ المنار کی نویں جلد کے ساتویں شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا موضوع یہ ہے "صرف قرآن اسلام ہے" اس مضمون میں مقالہ نگار نے چند ایسے اعتراضات پیش کئے ہیں جن سے سنت کی حجیت کی تردید ہوتی ہے تاہم اس مجلہ کے آئندہ شماروں میں چند ایسے مقالات بھی شائع ہوئے جن میں ان اعتراضات کی تردید کی گئی ہے

بہرحال ہم ذیل میں چند اہم اعتراضات کو پیش کرنے کے بعد اس کی تردید بھی پیش کر رہے ہیں:۔

احادیث پر اعتراضات

(۱) سب سے پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۱۹۷ چوتھا ایڈیشن ۱۳۵۳ھ

حکم سے لکھا گیا تھا مگر آپ کے زمانے میں احادیث نہیں لکھی گئیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لکھنے کا مشورہ دیا۔ اگر یہ احادیث بھی قرآن کریم کی طرح مسلمانوں کے لئے واجب العمل قوانین سمجھی جاتیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کے لکھنے کا حکم دیتے جیسا کہ آپ نے قرآن کریم کے لکھنے کا حکم دیا تھا اس صورت میں کتابت جاننے والے صحابہ قرآن کریم کی طرح احادیث کو بھی اسی طرح مدون کرتے جس طرح انھوں نے قرآن کریم کو مدون کیا تھا بلکہ اس کے برخلاف آپ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید الخدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"میری طرف سے کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن کے علاوہ اور کچھ میری طرف سے لکھا ہو تو وہ اُسے مٹا دے میری طرف سے احادیث کو (زبانی) بیان کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو مجھ پر قصداً جھوٹ بولے تو وہ آگ میں اپنا ٹھکانہ بنائے۔"[1]

احادیث نہ لکھنے کی حقیقت

یہ اعتراض بہت کمزور ہے کیونکہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احادیث نہیں لکھی گئیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اسلام کا عام قانون اور لازمی احکام کا ذریعہ نہیں بن سکتی ہیں اور تشریع اسلامی کا اہم ماخذ نہیں ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عربوں میں ناخواندگی عام تھی اور کتابت جاننے والوں کی بہت بڑی کمی تھی اس لئے جلیل القدر صحابیؓ آپؐ کی احادیث کو سن کر زبانی یاد رکھتے تھے اور انھیں لکھتے نہیں تھے[2] اس زمانے میں کاتب اتنے کم تھے کہ ان کے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ انھیں بیک وقت کتاب اللہ اور سنت نبویؐ دونوں چیزوں کو لکھنے پر مجبور کرتے لہٰذا کتاب اللہ کی کتابت کو مقدم

---

[1] فجر الاسلام۔ تاویل مختلف الحدیث نیز النھایۃ فی غریب الحدیث میں کتب کے لفظ ہیں اور دیگر کتب احادیث میں کم وبیش یہ حدیث مرکوز ہے،

[2] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۴۴۔ چوتھا ایڈیشن

سمجھا گیا اور اس کے لکھنے کی طرف توجہ دی گئی۔ تاہم لکھنے کے ساتھ ساتھ بہت سے صحابیوں نے قرآن کریم کو حفظ بھی کیا اور احادیث کو بھی یاد کرتے رہے اور اس کی روایت بھی کرتے رہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم کی مزید خصوصیت یہ تھی کہ اس کے الفاظ و معانی دونوں خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے اور قرآن کریم کی معجز بیانی کا تعلق اس کے الفاظ اور اور ان کی نظم و ترتیب سے بھی ہے اس لئے اس کے الفاظ اور نظم و ترتیب کو محفوظ رکھنا بھی بہت ضروری تھا۔ ورنہ الفاظ اور ان کی ترتیب کی معمولی تبدیلی سے قرآن کریم کی معجز بیانی میں فرق آسکتا تھا لہٰذا اس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول کریمؐ نے اس زمانے میں صرف قرآن کریم کی کتابت کا حکم دیا تاکہ ایک ناخواندہ قوم زیادہ مشقت میں مبتلا نہ ہو جائے اور قرآن کریم میں بھی کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ ہو۔

حضرت ابوسعید الخدری کی مذکورہ بالا حدیث میں احادیث لکھنے کی جو ممانعت کی گئی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حدیث شرعی احکام کا اصل ماخذ اور تشریع اسلامی کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ مذکورہ حدیث ہی آگے چل کر آپؐ نے یہ خود ارشاد فرمایا ہے

"میری احادیث بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ بولا تو اس نے اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لیا"

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے احادیث کی روایت کا حکم دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جھوٹی احادیث کو بیان کرنے سے منع بھی فرمایا ہے اس ممانعت کا فائدہ اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ احادیث پر عمل کیا جائے اور ان میں جو نصائح و احکام مذکور ہوں ان کی پابندی کی جائے ورنہ احادیث کی روایت کرنے اور اس میں صداقت کو ملحوظ رکھنے کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے؟

اب یہ بحث باقی رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت نبوی کو لکھنے سے منع کیوں فرمایا؟ اس کی توجیہہ میں علماء کا اختلاف ہے بعض علماء کا قول یہ ہے کہ منع کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ کتاب اللہ کی بذریعہ تحریر حفاظت کرنے کا مزید سامان مہیا کیا جائے، یہ ممانعت اس وقت کی گئی تھی جب کہ قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ قرآن کریم حدیث کے ساتھ

خلط ملط نہ ہو جائے[۱]

میرے نزدیک یہ توجیہہ زیادہ درست نہیں ہے کیونکہ اگر اس وقت احادیث لکھی جاتیں تو اس حیثیت سے لکھی جاتیں کہ وہ احادیث ہیں نہ یہ کہ وہ آیاتِ قرآنی ہیں ایسی صورت میں احادیث و قرآن کے خلط ملط ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، لہذا اس کا ظاہری سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو کتاب اللہ کی حفاظت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ اسی کی حفاظت ہی پر مبذول کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ابتدائی زمانے میں جبکہ قرآن کریم نازل ہو رہا ہو مسلمانوں کو احادیث کے لکھنے میں مشغول رکھیں اس زمانے میں قوم میں ناخواندگی عام تھی اور اچھے لکھنے والوں کی کمی تھی، اس لئے جس قدر افراد لکھنا جانتے تھے ان سب کو کتاب اللہ کی کتابت میں مشغول کر دیا گیا تاکہ اس اسلامی دستور کی حفاظت ہو سکے بلکہ بعض صحابہؓ نے اس قدر احتیاط مدنظر رکھی کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کتاب اللہ کے مقابلے میں اور کوئی چیز خواہ وہ سنت نبوی ہی کیوں نہ ہو، تحریری شکل میں موجود رہے، کیونکہ اس کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کتاب اللہ سے ہٹ سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ کا فیصلہ

یہ روایت مذکور ہے[۲] کہ ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارادہ ہوا کہ احادیث کو لکھوایا جائے لہٰذا انھوں نے جلیل القدر صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا سب نے ان کے لکھوانے کا مشورہ دیا اس پر وہ ایک مہینے تک اللہ سے استخارہ کرتے رہے کیونکہ انہیں اس معاملہ کے درست ہونے میں شک و شبہ تھا۔ اس کے بعد ایک دن صبح کے وقت وہ اٹھے تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آپؓ کا ارادہ پختہ کر دیا تھا چنانچہ آپؓ صحابہؓ سے فرمانے لگے

"تمھیں معلوم ہے کہ میں نے تم سے احادیث کو لکھوانے کا تذکرہ کیا تھا اس کے بعد مجھے یاد آیا کہ تم سے پہلے اہل کتاب علماء نے بھی کتاب اللہ

---

[۱] فجر الاسلام از احمد امین

[۲] تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک و تاریخ التشریع الاسلامی از خضری صفحہ ۱۲۳

کے ساتھ اور کئی کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ لہٰذا خدا کی قسم! اس بناپر میں کتاب اللہ کے ساتھ اور کسی چیز کو شامل نہیں کروں گا"
یہ کہہ کر انھوں نے سنت نبویؐ کو لکھوانے کا خیال ترک کردیا طبقات ابن سعد میں بھی یہی بات اسی طرح بیان کی گئی ہے،

"حضرت عمرؓ نے سنت نبوی کو لکھوانے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لئے ایک مہینے تک اللہ سے استخارہ فرماتے رہے بعد ازاں ایک دن صبح کے وقت فرمانے لگے ——— "مجھے وہ لوگ یاد آگئے جنھوں نے ایک کتاب لکھی اور اس کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ انھوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا"

ہمارا رجحان غالب یہ ہے کہ حضرت ابوسعید الخدری کی مذکورہ بالا روایت میں جو ممانعت آئی ہے وہ عارضی طور پر تھی اور خاص حالت کے پیش نظر تھی ورنہ اگر یہ قطعی اور ہر حالت میں ممانعت ہوتی تو حضرت عمرؓ کے دل میں احادیث کو لکھوانے کا خیال نہ پیدا ہوتا۔ اور تمام صحابیؓ اس کا مشورہ نہ دیتے۔ ہمارے اس خیال کو اس واقعے سے بھی تقویت پہونچتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی تھی چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے[1] کہ وہ فرماتے ہیں

"میں جو چیز رسول اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا تاکہ میں انھیں یاد رکھ سکوں۔ اس پر قریش نے مجھے منع کیا وہ کہنے لگے "ہر وہ چیز جو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے ہو، لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ بھی بشر ہیں، وہ غصے اور رضامندی دونوں حالتوں میں بولتے ہیں" اس پر میں نے لکھنا چھوڑ دیا اس کے بعد میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا ——— تم لکھا کرو

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۴۸

کیوں کہ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میرے مُنہ سے حق و صداقت کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا ہے"

ابن قتیبہ الدینوری کی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں سنت نبویؐ کو لکھنے کی ممانعت اور حضرت عبداللہ بن عمرو کو لکھنے کی اجازت دینے میں مطابقت پیدا کرنے کے سلسلے میں دو صورتیں بیان کی ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی زمانے میں احادیث لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی اس کے بعد جب آپ کو معلوم ہوا کہ احادیث کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے کہ صرف حافظہ میں سما نہیں سکتیں تو آپ نے احادیث کو لکھنے اور انھیں قلم بند کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو خاص طور پر اس کی اجازت دی تھی کیونکہ وہ سریانی اور عربی دونوں زبانوں کا رسم الخط جانتے تھے اور پہلی کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اسی لئے ان کے بارے میں آپ کو یہ بھروسہ تھا کہ وہ لکھنے میں غلطی نہیں کریں گے اور اسی بنا پر انھیں اجازت دے دی مگر دوسرے لوگوں سے غلط سے لکھنے کا اندیشہ تھا اس لئے آپ نے انھیں منع کر دیا کیونکہ اس زمانے ایک طرف جہالت و ناخواندگی عام تھی تو دوسری طرف اچھے اور صحیح طریقے سے لکھنے والوں کا فقدان تھا۔

بہر حال سب سے معقول وجہ یہی ہے کہ احادیث کو لکھنے کی ممانعت عارضی طور پر تھی اور مذکورہ بالا خاص اسباب کی بنا پر تھی اس لئے وہ دائمی ممانعت نہ تھی یہی وجہ ہے کہ آپ نے بعد میں کتابت کی اجازت دے دی تھی اور تمام امّت کا اس جواز پر اجماع بھی ہے، چنانچہ علّامہ ابن الاثیر نے اپنی کتاب "النہایۃ فی غریب الحدیث" میں "کَتَبَ" کے لفظ کے ماتحت ان احادیث میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے لکھا ہے

"کتابت کی اجازت دینے کی حدیث، ممانعت کی حدیث کے لئے ناسخ ہے اور ان کے جواز پر اجماع امّت بھی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دراصل ممانعت اس بات کی ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ ایک ہی

صفحے میں حدیث کو بھی لکھا جائے۔ لیکن اصل وجہ پہلا قول ہے "[۱]

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہر چیز بیان کردی ہے اور اس میں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی لہذا احکام شرعیہ میں سب سے مقدم یہ ہے کہ انھیں کھول کر بیان کیا جائے اور اس کی تفصیل بیان کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کی جائے کیونکہ یہ وہ احکام ہیں جن پر خدا ہم سے عمل کرانا چاہتا ہے لہذا جب صورت حال یہ ہو تو ہمیں قرآن کریم کے علاوہ اور کسی کتاب یا بنیادی ماخذ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ	ہم نے تم پر (اے پیغمبر) کتاب نازل کی
تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى	جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے
وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ	اور مسلمانوں کے لئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

مگر یہ اعتراض بھی باطل ہے کیونکہ اگر ہم قرآن کریم میں صاف اور کھلے شرعی احکام کو تلاش کریں تو وہ ہمیں بہت کم ملیں گے اور ہمیں ایسے معاملات بہت ملیں گے جن کے بارے میں قرآن کریم میں صریح احکام نہیں ہیں ان کے بارے میں صریح احکام یا تو سنت نبوی میں ملتے ہیں یا ائمہ کرام کے استنباط کردہ اجتہادات میں ان کا پتہ چلتا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ قرآن کریم سے مختلف طریقے پر ہوتے ہیں کیونکہ واقعات اور معاملات ہر وقت نئے نئے رونما ہوتے رہتے ہیں اور ان کی نوعیت اور تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا احاطہ اور شمار نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ زمانے اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور اقوام عالم کے حالات کی تبدیلی کی بنا پر وہ بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

قرآنی احکام کی تین قسمیں

چونکہ قرآن کریم مکمل دستور اور ازلی و ابدی ایسا آسمانی قانون ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا اس لئے اس میں ایسے معاملات اور اس کی تمام جزئیات کے لئے قوانین مذکور

[۱] النہایۃ حصہ چہارم صفحہ ۷ مطبوعہ ۱۳۱۱ھ

نہیں ہو سکتے جو ہر زمانے میں مختلف حالات کے ماتحت بدلتے رہتے ہوں لہذا قرآن کی قانون سازی کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) کچھ مفصل احکام ہیں جن کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جو ہمیشہ یکساں رہتے ہیں اور ہر زمانے اور ہر مقام میں صحیح طریقے سے کام دیتے ہیں، ان میں وہ احکام شامل ہیں جو شادی بیاہ کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور جن میں بتایا گیا ہے کہ کن عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے اور کن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح طلاق، عدت میراث اور سود کی ممانعت کے قوانین ہیں نیز بعض جرائم کی سزا میں بھی تفصیلی قوانین مقرر کئے گئے ہیں جیسے چوری، رہزنی، زنا، تہمت اور قتل کے بارے میں احکام ہیں اسی طرح حلال وحرام کھانوں کا بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری قسم کا ان مجمل احکام سے تعلق ہے جنہیں سنت نبوی نے بیان کیا ہے، جیسے عبادات، ان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج شامل ہیں۔

(۳) تیسری قسم میں وہ بنیادی اصول و قواعد شامل ہیں جو عدل وانصاف اور اصلاح انسانی کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں ہم ان کی تفصیل قرآنی احکام میں بیان کر چکے ہیں۔

بہرحال قرآن کے کچھ احکام مجمل ہیں اور کچھ مفصل ہیں اور باقی بنیادی اصول و قوانین ہیں جن کے ذریعے نامعلوم اور غیر مذکور احکام معلوم کرنے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں انہی بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں اور آپ کی سنت کی طرف رجوع کریں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شریعت اسلامیہ کی توضیح وتشریح اور اس کی قانون سازی دونوں چیزوں کے اختیارات تفویض فرمائے ہیں لہٰذا ہمارے لئے ان دونوں معاملات میں آپ کی اطاعت فرض ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

"ہم نے تمہاری طرف (اے رسول) ذکر (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو وہ باتیں جو نازل کی گئی ہیں کھول کر بیان کرو"۔

مزید ارشاد فرمایا گیا ہے

"رسول جو کچھ تمہیں دے، وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز آؤ"

یہ بھی ارشاد ہے :۔

"جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی ہے "

تیسرا اعتراض ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اکثر احادیث کا ثبوت ظن غالب پر مبنی ہے کیونکہ ان کی روایت ہم تک اس طرح نہیں پہونچی ہے کہ ہم یقینی طور پر کہہ سکیں کہ یہ سب احادیث صحیح ہیں بلکہ احادیث ایسے مختلف راویوں کی طرف سے روایت کی گئی ہیں جن کے بارے میں بھول چوک یا جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے اسی بنا پر منکرین حدیث کہتے ہیں :۔

"چونکہ احادیث میں شک وشبہ کا احتمال ہے اس لئے ہم انھیں نہیں تسلیم کرتے بلکہ ہم صرف قرآن کریم کو مانتے ہیں جس کے کسی حرف میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، اسی طرح قرآن کریم کی صریح اور یقینی عبارت کی تشریح حدیث کی غیر یقینی عبارت سے نہیں کی جاسکتی"

ظن غالب پر عمل اس اعتراض کے جواب کے دو پہلو ہیں، پہلا جواب یہ ہے کہ صرف وہی حدیث قابل عمل اور دلیل شرعی سمجھی جاتی ہے جس کی روایت معتبر طریقے سے پہونچی ہو اور کم از کم ہمارا ظن غالب یہ ہو کہ یہ حدیث صحیح طریقے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہم تک پہونچی ہے ایسی احادیث قابل عمل ہونے میں یقینی احکام کے برابر ہیں کیونکہ لوگوں کے اکثر معاملات وعبادات کا دارومدار ظن غالب ہی پر ہوتا ہے اور قطعی علم ویقین پر نہیں ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی نمازی سفر میں ہو اور اسے قبلہ کا یقینی علم نہ ہو تو وہ صحیح سمت معلوم کرنے کے لئے غور وفکر اور کوشش کرتا ہے اس کے بعد جس طرف اس کا ظن غالب رہنمائی کرتا ہے اسی رُخ پر وہ نماز پڑھ لیتا ہے اس کی یہ کوشش صرف ظن غالب پر مبنی ہوتی ہے۔

اسی طرح قتل کے مقدمہ میں قاضی صرف چند گواہوں کی شہادت پر قاتل کو موت کی سزا دیتا ہے حالانکہ یہ گواہی بھی ظن غالب پر مبنی ہوتی ہے اسی طرح جان ومال کی حرمت اور حفاظت کے معاملات جو یقینی دلائل سے ثابت ہوتے ہیں اگران کے

کے برخلاف ظنی ثبوت مل جائے تو ان کا یقینی ثبوت زائل ہو جاتا ہے بلکہ قرآن کریم میں جس کا ثبوت قطعی اور یقینی ہے بعض آیات ایسی ہیں جن کے مفہوم کا ظن غالب سے پتہ چلتا ہے لیکن اس کے باوجود اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ہم صرف یقینی معاملات پر بھروسہ کریں اور یہ ضروری قرار دیں کہ ہم صرف یقینی چیزوں پر عمل کریں گے تو لوگ سخت تکلیف میں مبتلا ہو جائیں۔ اور ان کے تمام کام معطل ہو کر رہ جائیں بلکہ بہت سی آیات قرآنی بھی جن کا مفہوم یقینی نہ ہو نا قابل عمل بن جائیں گی۔

قرآن کی تشریح

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی قطعی الثبوت آیات کی تاویل و تشریح احادیث کے ظنی الثبوت الفاظ سے کی جا سکتی ہے جبکہ قرآن کریم کی آیات کے ظاہری الفاظ سے دوسرا مفہوم نکلتا ہو ایسا عمل اس وقت بھی ہوتا ہے جبکہ کچھ آیات کا مفہوم مطلق ہو اور اس کے مقید ہونے کا احتمال ہو یا اس کا عام مفہوم ہو اور اسے خاص بنایا جا سکتا ہو جیسے کہ قرآن کریم میں آیا ہے :-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ — تم پر مردار چیز حرام کی گئی ہے،

مگر رسول کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا ہے :-

" سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کی مردار چیز حلال ہے "

(اس حدیث میں سمندر کی مردار چیزیں اس قانون سے مستثنیٰ کر دی گئی ہیں) چوں کہ آیت مذکورہ میں اس مفہوم کی گنجائش تھی اس لئے سنت نبویؐ نے آکر اس کی تشریح کر دی لہٰذا ایسے موقع پر سنت نبویؐ کے اتباع سے قرآن کریم کے مفہوم کی تبدیلی یا مخالفت نہیں ہوئی کیونکہ آیت کے مفہوم میں شک و شبہ کا احتمال تھا اور حدیث نے اس شک و شبہ کو دور کر دیا [1]

بہر حال اس قسم کے دلائل سے منکرین حدیث کے مسلک کی گمراہی واضح ہو گئی اور محدثین کے مسلک کی تقویت سے ایسے لوگ معرض زوال میں آکر ختم ہو گئے اور

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب اصول الفقہ از استاذ عبدالوہاب خلاف بک۔

سنت نبوی کو قرآن کریم کے بعد اسلامی شریعت کا دوسرا ماٰخذ سمجھا جانے لگا کیونکہ بعض احادیث کے مشتبہ یا موضوع ہونے کی وجہ سے متواتر اور مشہور احادیث ناقابل عمل نہیں ٹھہرائی جاسکتیں کیونکہ انہی احادیث کی چھان بین کے لئے ہمارے مخلص علماء اور محدثین نے اپنی تمام عمریں وقف کردی تھیں اور صحیح اور موضوع حدیث کو معلوم کرنے اور کھوٹے کھرے کو پہچاننے میں انھوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور خون پسینہ ایک کر کے صحیح احادیث کو جمع کیا اس لئے ہم اس عظیم موروثی ذخیرے کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں جبکہ اس میں ایسے نفیس جواہرات اور دُرِ بے بہا موجود ہیں، جن کی قدر وقیمت کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا لہٰذا اگر یہ جواہرات خاک آلودہ ہوگئے ہوں یا ان میں کچھ کانٹے بھی لگے ہوں تو ہم محض ان کی وجہ سے ان جواہرات سے دست بردار نہیں ہوسکتے بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان پر سے گرد وغبار کو جھاڑیں اور کانٹوں کو ان سے علیحدہ کریں تاکہ یہ بے نظیر جواہرات روئے زمین پر صاف وشفاف صورت میں نمودار ہوں اور وہ انسانیت کی عالمگیر اصلاح، ادب واخلاق اور ان کے لئے مکمل قوانین کا اہم ذریعہ بن سکیں۔

سُنّت کا تشریعی درجہ

سنّت نبویؐ شرعی احکام کے استنباط کے لئے دوسرا درجہ رکھتی ہے کیونکہ جب کسی مجتہد کو نئے معاملے میں شرعی حکم کی ضرورت پیش آتی ہے تو سب سے پہلے وہ قرآن کریم کی طرف رجوع کرتا ہے اگر اسے اس میں وہ حکم نہیں ملتا ہے تو وہ دین اسلام کے دوسرے سرچشمہ حدیث کا قصد کرتا ہے اور اس مسئلے کے لئے مناسب صحیح حدیث کو تلاش کرتا ہے لیکن اگر اسے قرآن کریم میں کوئی نص قطعی ملتی ہے تو پھر وہ حدیث کا رُخ نہیں کرتا ہے بلکہ حدیث کی طرف وہ اس وقت رُخ کرتا ہے جب کہ قرآن کریم میں اسے وہ مسئلہ نہ مل سکے اس لحاظ سے حدیث کا درجہ قرآن کریم کے بعد ہے اس کے ثبوت میں یہ چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) چونکہ قرآن کریم کا ثبوت یقینی طریقے سے حاصل ہے اور جس حالت میں وہ ہم تک پہونچا ہے اس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یعنی وہ مسلسل اور

متواتر طریقے سے ہم تک پہونچا ہے اس لئے اس کا درجہ مقدم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر احادیث کا ثبوت ظن غالب پر ہے، متواتر روایت سے جو احادیث ہم تک پہونچی ہیں وہ بہت کم ہیں لہذا غیر متواتر احادیث خواہ ان کی سند روایت کتنی ہی اعلیٰ درجے کی ہو، ظنی الثبوت ہیں، اس لئے وہ قرآن کریم کے یقینی درجے تک نہیں پہونچ سکتیں اور چونکہ قرآن کریم اپنے اجمال و تفصیل دونوں میں قطعی اور یقینی درجہ رکھتا ہے اس لئے وہ سنت نبویؐ پر مقدم ہے

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زندگی میں یہی عمل تھا کہ جب آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھا تو سب سے پہلے آپ وحیٔ قرآنی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور جب اس مسئلہ کے مطابق کوئی وحیٔ قرآنی نہیں ملتی تھی تو اس وقت آپ اپنے ذاتی اجتہاد کے مطابق عمل کرتے تھے اسی معمول کی تائید حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کا قاضی بنایا تو اس موقع پر آپؐ نے ان سے پوچھا ——— "جب کوئی معاملہ درپیش ہو تو تم کس طریقے سے فیصلہ کروگے؟" انھوں نے کہا ——— "کتاب اللہ کے مطابق" آپؐ نے فرمایا ہے ——— "اگر اس میں وہ بات نہ ملے" تو انھوں نے کہا ——— "رسول اللہ کی سنت کے مطابق" پھر فرمایا ——— اگر وہاں بھی نہ ملے" تو انھوں نے عرض کیا ——— "اس وقت میں اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق فیصلہ کردوں گا" یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے طریقے کی تائید کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صحابیؓ بھی اسی طریقے پر عمل کرتے رہے چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اپنے عہد خلافت میں یہ طریقہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی مقدمہ آتا تھا تو سب سے پہلے وہ کتاب اللہ کو پیش نظر رکھتے تھے اگر اس میں کوئی حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں ملتا تھا اور اس بارے میں انھیں کوئی حدیث معلوم ہوتی تھی تو اس کے مطابق عمل کرتے تھے اور جب کوئی حدیث نہیں معلوم ہوتی تھی تو آپؓ اپنے مقام سے اٹھ کر مسلمانوں سے اس کے بارے میں دریافت کرتے اور فرماتے

تھے ——— "میرے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کیا تمہیں اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی فیصلہ معلوم ہے"، ایسی صورت میں بعض اوقات ایک جماعت اٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتی تھی اس وقت حضرت ابوبکر فرماتے تھے ——— "خدا کا شکر ہے کہ اس نے ابھی تک ہمارے اندر ایسے لوگ باقی رکھے ہیں جو ہمارے پیغمبرؐ کی سنت کو محفوظ کئے ہوئے ہیں"

حضرت عمرؓ بھی خلافت ابوبکرؓ کے طریقے پر چلتے رہے چنانچہ ایک روایت میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے کوفہ کے قاضی شریح کو لکھ بھیجا ——— "جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ درپیش ہو تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو اگر کوئی معاملہ ایسا ہو جس کا ذکر کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق عمل کرو۔" ایک دوسری روایت میں مذکور ہے ——— "اگر تمہیں کتاب اللہ میں کوئی مسئلہ واضح طریقے پر معلوم ہو جائے تو پھر کسی سے کچھ نہ پوچھو اور جو مسئلہ کتاب اللہ میں واضح نہ ہو تو سنت نبویؐ کی پیروی کرو"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اس طرح فرمایا ہے ——— "تم میں جس کسی کے پاس کوئی مقدمہ آئے تو وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہ ہو تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے۔

اسی طرح دیگر صحابہؓ اور تابعین کے جو اقوال و افعال مذکور و منقول ہیں وہ سب باتفاق رائے یہی ثابت کرتے ہیں کہ شرعی احکام کا استنباط کرنے اور انہیں معلوم کرنے کے لئے سنت نبویؐ کتاب اللہ کے بعد شرعی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ سنت نبویؐ یا تو کتاب اللہ کی تشریح کرتی ہے یا اس میں اضافہ کرتی ہے اگر وہ تشریح و بیان کے لئے ہو تو اصل چیز اس پر مقدم ہے اور وہ اس کے تابع ہو گی اور اگر بیان و تشریح کے لئے نہ ہو تو کتاب اللہ کے بعد اس کی طرف رجوع کیا جائے گا جبکہ کوئی خاص حکم کتاب اللہ میں نہ مل سکے اس صورت میں بھی حدیث کا دوسرا درجہ ہے جیسا کہ ہم سابقہ دونوں دلیلوں میں

بیان کر چکے ہیں۔

قرآن وسنت کے روابط

سنت نبویؐ کا قرآن کریم کے ساتھ وہی تعلق ہے جو ایک شارح ومفسّر کا تعلق ہوتا ہے، سنت نبوی قرآنی آیات کی تفسیر کرتی ہے اور اس کے مجمل مفہوم کو واضح کرتی ہے اور اس کے اصل مقصد کو متعین کرتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے:۔

وَاَنزلنا الیك الذّكر لِتُبَیِّنَ للنّاس مانُزِّلَ اِلَیْهِم ولعلّهُمْ یتفکّرون۔	(اے پیغمبر) ہم نے تمہاری طرف ذکر (قرآن) کو نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو وہ باتیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں کھول کر بیان کرو۔ اور شاید وہ غور و فکر کر سکیں۔

سنت نبویؐ قرآنی احکام، ان کی روح اور بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہوتی ہے چنانچہ اس کی مزید وضاحت اگلی بحث میں کی جائیگی۔

بالعموم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی خواہ اس کا تعلق نص قرآنی سے ہو یا نہ ہو مندرجہ ذیل صورتیں ہیں[1]

(۱) آپؐ وحی نازل ہونے کے بعد اس کی تبلیغ فرماتے تھے اور پوشیدہ وحی کو زبان سے ظاہر کرتے تھے۔

(۲) آپ قرآنی آیات کی تفسیر وتاویل بیان فرماتے تھے اور اس کے معنی بیان کرتے تھے جیسا کہ آپ نے مندرجہ ذیل آیت میں ظلم کی تشریح شرک کے ساتھ کی تھی

وَلَمْ یَلْبِسوا ایمانهم بظُلْمٍ	اور انھوں نے اپنے ایمان کو ہرگز ظلم کے ساتھ نہیں ملایا۔

اسی طرح آپ نے ایک مقام پر حساب یسیر کا مفہوم یہ بتایا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن حساب پیش ہوگا اور ایک دوسرے مقام

[1] اعلام الموقعین حصہ دوم صفحہ ۲۳۸ مطبوعہ مطبع منیریہ

پر (قرآن کریم میں روزے کے ذکر میں رات کو کھانے پینے کی اجازت دی تھی اور یہ جو فرمایا گیا تھا کہ تم اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک سفید دھاگا کالے دھاگے سے ممتاز نہ ہو جائے) آپ نے یہ تفسیر بیان فرمائی تھی کہ سفید دھاگے سے دن کی روشنی مراد ہے اور کالے دھاگے سے مراد رات کی سیاہی ہے، ایک دوسرے موقع پر قرآن میں یہ ذکر آیا ہے ——— "اہل کتاب نے اپنے عالموں کو اللہ کے بجائے دیوتا بنا لیا ہے" اس کی وضاحت میں آپ نے فرمایا تھا کہ اس کی صورت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے عالموں کو خدا کی طرح اتنے اختیارات دے دیئے تھے کہ وہ حرام چیزوں کو حلال اور حلال چیزوں کو حرام کر دیا کرتے تھے۔

(۳) آپ کے شرعی احکام بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آپ کسی چیز کو حرام قرار دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرتے تھے گو اس کی اجازت کا ذکر زبان سے نہیں کرتے تھے۔ تاہم آپ کے خاموش رہنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیز مباح ہے،

(۴) بیان کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آپ اپنے عمل سے کوئی کام کرکے اس کے جواز کا ثبوت بہم پہونچاتے تھے۔ اور اس کے نہ کرنے کی ممانعت بھی نہ کرتے تھے۔

(۵) بعض دفعہ آپ کسی کام کا مشاہدہ کرتے تھے یا آپ کو اس کا علم ہوتا تھا تو اس کی تاکید فرما کر اس کے جواز کا فیصلہ صادر فرمایا کرتے تھے۔

(۶) کبھی کوئی شخص سوال کرتا تھا تو آپ اس کو بذریعہ وحی جواب دیا کرتے تھے یہ وحی قرآن کریم کا حصہ نہیں ہوتی تھی جیسا کہ ایک دفعہ ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے اپنے جبہ پر ایک مرکب خوشبو کو کثرت کے ساتھ اس طرح ملا کہ اس خوشبو کے رنگ کے نشان کپڑے پر نمودار ہو گئے اس کے بعد اس نے اسی جبہ کو پہنے ہوئے احرام باندھ لیا لہٰذا ایسی حالت میں وہ اب کیا کرے۔ اس سوال کے جواب میں وحی نازل ہوئی اور اس وحی کے مطابق آپ نے یہ جواب دیا کہ جبہ کو اتار دیا جائے اور خوشبو کے

نشان کو دھولیا جائے۔

(۷) بعض دفعہ آپ سوال کے بغیر کچھ شرعی احکام بتادیا کرتے تھے جیسا کہ آپ نے جنگلی گدھوں کو حرام قرار دیا تھا۔

(۸) بعض دفعہ قرآن کریم میں کسی چیز کے واجب، مباح یا حرام ہونے کی تصریح ہوتی ہے مگر اس حکم سے متعلق چند شرائط وغیرہ، موانع اور مخصوص اوقات، حالات اور اوصاف ہوتے ہیں جنہیں سنت نبویؐ آکر بیان کرتی ہے، جیسے کہ میراث کی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اولاد وارث ہوتی ہے۔ مگر سنت نبویؐ نے اس پر اس شرط کا اضافہ کیا ہے کہ باپ اور اولاد میں مذہبی اتحاد ہونا چاہیئے اور وہ اولاد نہ تو غلام ہو اور نہ انھوں نے قتل کا جرم کیا ہو، یعنی سنت نے یہ وضاحت کردی ہے کہ قتل، غلامی اور مذہبی اختلاف وارثوں کو میراث سے محروم کر دیتا ہے اسی وجہ سے امام اوزاعیؒ نے فرمایا تھا:۔

"کتاب اللہ کو (اس معاملے میں) سنت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت نبویؐ کتاب اللہ کی تفسیر کرتی ہے اور آیات اور آیات قرآنی کا اصل مقصد متعین کرتی ہے علامہ ابن عبدالبر نے بھی یہی فرمایا ہے ——— سنت کتاب (کے مفہوم کا) صحیح فیصلہ کرتی ہے اور اس کے اصل مقصد اور مفہوم کو واضح کرتی ہے"

سنّت کا تشریعی مقام

سنت نبوی سے جو شرعی احکام معلوم ہوئے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) جو احکام قرآن کریم سے ثابت ہیں، سنت نبوی نے ان کی تائید کی ہے اور ان کے پابند رہنے کا حکم دیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں میراث کے جو حصے بیان کئے گئے ہیں، نیز زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے احادیث میں بھی اسی طرح حکم دیا گیا ہے، نیز امانتیں ادا کرنے، ایفاء عہد، فواحش سے بچنے جھوٹ سے پرہیز کرنے اور کسی کو ناحق قتل نہ کرنے کی ہدایات اسی طرح دی گئی

ہیں جس طرح قرآن کریم میں ان کا تذکرہ آیا ہے اس صورت میں سنت نبویؐ سے ان احکام کی تائید و حمایت ظاہر ہوتی ہے،

(۲) بعض احکام قرآن کریم میں مجمل طریقے سے مذکور ہیں یا ان کا مفہوم عام اور مطلق ہوتا ہے یا اس کی عبارت میں دو یا دو سے زیادہ مفہوم و معانی کا احتمال ہوتا ہے ایسی صورت میں احادیث کے ذریعے مجمل احکام کی توضیح کی جاتی ہے اور عام و مطلق مفہوم کو مخصوص اور محدود مفہوم میں ادا کیا جاتا ہے اور مشتبہ الفاظ کے اصل مفہوم کا تعین کیا جاتا ہے، ایسی حالت میں احادیث کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں اور اصل مفہوم کو واضح کرتی ہیں، اس کی مثالیں بہت سی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہم پر احکامِ قرآنی کے مطابق نماز، زکوٰۃ روزے اور حج فرض کئے ہیں مگر اس کے ادا کرنے کا طریقہ نہیں بتایا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ ان کے ارکان و شرائط کیا ہیں؟ لہٰذا سنت نبویؐ کے ذریعے ہمیں دن رات میں نمازوں کی تعداد، ہر نماز کا وقت، ان کی رکعتوں کی تعداد اور دیگر ارکان و شرائط معلوم ہوئے ہیں اسی طرح زکوٰۃ کا مقدار نصاب، قابلِ زکوٰۃ مال اور ہر قسم میں سے زکوٰۃ نکالنے کی مقدار معلوم ہوتی ہے، روزے اور حج کے مسائل بھی احادیث کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں، علاوہ ازیں سنت نبویؐ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وارثوں کی اجازت کے بغیر وصیت پر عمل نہیں کیا جا سکتا نیز چوری کے جرم میں مال کی کتنی مقدار پر ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے اس کا تعین بھی سنت کے ذریعے کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ احکام قرآنیہ کے سلسلے میں اللہ کے اصل مفہوم و منشا کو کھول کر بیان کریں جیسا کہ گذشتہ آیات کے ذریعے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کو رسولؐ کے ذریعے نازل کرنے میں سب سے بڑی مصلحت یہی تھی کہ آپ پیغام خداوندی کو پیش کرتے وقت اس کے ساتھ اس کی توضیح و تشریح بھی کرتے جائیں آپ کا یہ بیان و تفسیر بھی الہام اور وحی الٰہی کے ذریعے ہوتا تھا کیونکہ اس صورت میں عقل کے اجتہاد کی گنجائش نہیں تھی بلکہ رسول اکرمؐ جب کسی

مجمل حکم کی توضیح فرماتے تھے یا عام اور مطلق مفہوم کو مخصوص اور محدود کرتے تھے یا مجمل عبارت میں اصل مفہوم کا تعین فرماتے تھے تو یہ سب کام خدا کی جانب سے کیا جاتا تھا جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے:-

"ہر وہ کام جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے تو وہ حکم قرآن فہمی پر مبنی ہوتا تھا۔"

سنت کے مخصوص احکام

(۳) احکام سنت کی ایک قسم وہ ہے جن کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے یعنی قرآن کریم میں وہ احکام مجمل یا مفصل کسی طریقے سے نہیں بتائے گئے ہیں بلکہ سنت نبوی کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں یہ احکام قرآنی احکام پر اضافہ کئے گئے ہیں ان کے بارے میں اہل علم کا اتفاق ہے کہ سنت کو مستقل طور پر احکام جاری کرنے کا اختیار حاصل ہے اور سنت بھی قرآن کریم کی طرح حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دے سکتی ہے، اسی طرح وہ مختلف حقوق کی فرضیت کو ثابت کرسکتی ہے جیسے کہ سنت کے ذریعے دادی کو میراث میں چھٹا حصہ دیا گیا ہے اور جنگلی گدھوں کا گوشت کھانا حرام کیا گیا ہے اس طرح بھیڑیئے، چیتے اور تیندوے جیسے درندوں اور پنجے والے شکاری پرندوں کا جیسے باز اور شکرہ ان کا گوشت کھانا حرام کیا گیا ہے۔ اسی طرح نکاح درست ہونے کے لئے گواہوں کا ہونا ضروری شرط ہے نیز سنت نبوی کی رو سے پھوپھی بھتیجی، خالہ بھانجی کو ایک ہی شوہر کے عقد نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، نیز جو ازدواجی رشتے نسب کے تعلق سے حرام ہیں وہی رشتے رضاعی (دودھ پلانے کے) تعلق سے حرام ہیں، حدیث کے مطابق مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔

مخصوص احکام کا اختیار

گزشتہ مباحث میں قرآنی آیات کے ذریعے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تفسیر و بیان کے اختیارات کے ساتھ قانون سازی کا اختیار بھی رسول اکرم کو دیا ہے اور رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کے برابر قرار دے کر آپ کی اتباع کو مسلمانوں کے لئے فرض قرار دیا ہے، لہٰذا رسول کی اطاعت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ آپ

کو احکام قرآنی کے علاوہ ایسے مخصوص احکام کو جاری کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ہو جو قرآن میں نہ ہوں، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

"آگاہ ہو جاؤ کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مشابہ چیز بھی دی گئی ہے" [1]

احکام سنّت کی اصلیت

یہ وہ مستقل شرعی احکام ہیں جو سنت نبویؐ سے ثابت ہیں ان میں سے بعض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ الہام و وحی معلوم ہوئے ہیں اور بعض احکام کو آپ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے بیان فرمایا ہے جس کے درست اور صحیح ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ غلطی سے بچاتا رہا ہے بلکہ آپ کا اجتہاد بھی آیات قرآنی اور ان کی عام تشریعی روح سے ماخوذ ہوتا ہے اسی لئے امام شافعی نے اپنے رسالہ اصولیہ میں ایسے احکام سنت کی اصلیت کے بارے میں علمار کرام کے خیالات بیان کئے ہیں چنانچہ اس معاملہ میں بعض علمار کا یہ قول ہے کہ ——— "اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے تشریعی اختیارات عطا فرمائے ہیں کہ اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو آپ سنت کے ذریعے ایسے احکام جاری کر سکتے ہیں"۔ بعض علمار کی یہ رائے ہے کہ ——— "سنت نبویؐ

---

[1] مشابہ چیز سے مراد سنت نبویؐ کے وہ احکام ہیں جو قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں ملاحظہ ہو ارشاد الفحول والاتقان از سیوطی جلد دوم صفحہ ۲۰۷۔ النھایہ کے چوتھے حصے میں اس حدیث کی تشریح میں مصنف نے یہ لکھا ہے "اس حدیث کی توضیح دو صورتوں سے کی جا سکتی ہے پہلی صورت یہ ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ کو قابل تلاوت قرآن کریم عطا ہوا ہے جو ظاہری وحی ہے اس طرح آپ کو باطنی وحی بھی عطا ہوئی ہے جو تلاوت نہیں کی جاتی ہے، توضیح کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس قدر وحی کی صورت میں آپ کو قرآن کریم عطا ہوا ہے اسی قدر آپ کو قوت بیانیہ بھی عطا ہوئی ہے تاکہ آپ کتاب اللہ کے معانی کی توضیح کر سکیں اور اس کے عام مفہوم کو مخصوص کر سکیں۔ اور اس میں مناسب کمی بیشی کر سکیں یہ حصہ بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہے،

کا کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصلیت قرآن کریم میں موجود نہ ہو "۔ بعض کا یہ قول ہے ــــــــــ " جو خاص حکم آپ نے بیان فرمایا ہے وہ بھی اللہ کی وحی اور حکم سے بیان فرمایا "۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حکم دینے سے پیشتر وہ بات پہلے ہی سے آپ کے دل میں ڈال دی جاتی تھی "، بہرحال اس معاملے میں علماء نے بہت بحث کی ہے مگر علامہ ابن القیم الجوزیہ نے اپنی دونوں کتابوں الطرق الحکمیہ اور اعلام الموقعین میں اس کے بارے میں سب سے اچھی بحث کی ہے ان دونوں کتابوں میں جو کچھ آپ نے بیان فرمایا ہے ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے

سنت کے تین مراحل

کتاب اللہ کے ساتھ سنت کے تعلقات تین مرحلوں پر قائم ہیں پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں سنت نبویؐ کتاب اللہ کے مضامین کی بالکل موافقت کرتی ہے اس صورت میں کتاب و سنت دونوں مل کر کسی حکم کی تائید و توثیق کرتی ہیں۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے جب کہ سنت کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح کرتی ہو اور اللہ کے اصل مقصد کو بیان کر کے اس کے وسیع مفہوم کو محدود کرتی ہو، چنانچہ سنت کا اکثر حصہ ایسا ہی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا اور آپ کے ذریعے لوگوں کو ہدایت حاصل ہوتی ہے اس لئے آپ سے زیادہ قرآن کے اصل مفہوم اور اصل مقصد کو کون سمجھ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث کتاب اللہ کی مخالف اور متضاد نہیں ہے،

سنت کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جبکہ سنت کے ذریعے ایسا مخصوص حکم بیان کیا گیا ہو جو کتاب اللہ میں نہ ہو ایسے موقع پر سنت اسی وقت اپنا حکم جاری کرتی ہے جبکہ اس کے بارے میں قرآن خاموش ہو ایسی صورت میں سنت یا تو کسی بات کو ضروری اور واجب العمل قرار دیتی ہے یا کسی چیز کو حرام ٹھہراتی ہے۔

بہرحال سنت کا دائرۂ عمل ان تینوں قسموں تک محدود ہے اور وہ کسی صورت میں بھی قرآن کریم کی مخالفت نہیں کرتی ہے اس لئے ان جدید احکام میں بھی رسول اکرم کی اطاعت واجب ہے اور کسی طرح حکم عدولی کی اجازت نہیں

دی جا سکتی ایسی حالت میں سب کو کتاب اللہ پر مقدم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس صورت میں بھی خدا کے اس حکم کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ رسول کی اطاعت کی جائے۔

اکثر علما کی یہ رائے ہے کہ سنت کے جو مخصوص احکام ہیں وہ بھی کسی نہ کسی حد تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ قرآن میں اُن کے بارے میں اجمالی یا تفصیلی بیان ملے گا یا اس کا بنیادی اصول بتایا گیا ہوگا۔ علمار نے اس کے ثبوت میں کئی دلائل بیان کئے ہیں جن میں سے اہم چار ہیں [1]

(۱) عام ثبوت یہ ہے کہ کتاب اللہ میں ایسی آیات مذکور ہیں جس میں یہ حکم دیا گیا کہ رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو بات وہ کہیں اسے مانو اور جس بات سے منع کریں اس سے باز آؤ یہاں تک کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا :-

" اللہ تعالیٰ نے گودنے والیوں اور گودوانے والیوں نیز حسن و جمال کے لئے اللہ کے بنائے ہوئے بدن میں تبدیلی کرنے والیوں پر لعنت کی ہے " ان کا یہ قول قبیلہ بنو اسد کی ایک عورت کو بھی معلوم ہوا تو اس نے آکر کہا۔

" اے ابو عبدالرحمٰن ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایسے لوگوں پر لعن طعن کیا ہے " انہوں نے فرمایا —— " میں ان لوگوں پر کیسے لعنت نہ بھیجوں جن کو رسولؐ اللہ نے ملعون قرار دیا ہو بلکہ یہ بات کتاب اللہ میں بھی موجود ہے " اس عورت نے کہا —— " میں نے قرآن کریم پڑھا ہے اس میں تو یہ بات میں نے نہیں پائی ہے " حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا " کیا تم نے یہ نہیں پڑھا " —— " جو کچھ رسولؐ تمہیں دے، وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز آجاؤ —— "

مقاصد میں یکسانیت

قرآن کریم کے تمام شرعی احکام جن بنیادی مقاصد پر مبنی ہیں، سنت کے احکام ان مقاصد سے باہر

[1] اس کی تفصیل شاطبی کی الموافقات کے چوتھے حصے مطبوعہ مطبع سلفیہ صفحہ ۱۳ (باقی صفحہ ۱۴۳)

نہیں ہیں قرآن کا سب سے بڑا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ دونوں جہانوں میں کامیابی کے راستے پر چلیں اور بدبختی کی راہ سے پرہیز کریں لہٰذا دونوں جہانوں کی فلاح وکامرانی تین چیزوں سے حاصل ہوتی ہے،

(۱) پانچ ضروری چیزوں یعنی مذہب، جان ومال، عقل اور نسل کی حفاظت کی جائے۔

(۲) ضروری حالات میں توسیع، سہولت اور آسانی مہیا ہو اور دقتوں اور تنگی کا خاتمہ کیا جائے جیسے کہ بیماری اور سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز رکھا گیا ہے اور پانی نہ ملنے پر تیمم کرلیا جاتا ہے۔

(۳) انسان شریفانہ اخلاق سے آراستہ ہو اور اچھی عادتیں اختیار کرے۔

مذکورہ بالا تینوں چیزوں کے لئے کتاب اللہ نے بنیادی اصول بیان کر دیئے ہیں جس کی تفصیل سنت نبویؐ میں موجود ہے اس لئے اگر تمام باتوں کا تحلیل وتجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ کتاب وسنت دونوں کا اصل مقصد ایک ہے،

قرآن سے سنت کا استنباط

بعض علماء نے یہ کوشش کی ہے کہ سنت کے ان احکام میں جن کے لئے نص قرآنی موجود نہ ہو، قرآن کا کوئی بنیادی اصول تلاش کریں اس کے لئے وہ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ یا تو وہ قرآنی قانون کے دونوں رخوں میں سے کسی ایک ایسے رُخ کے ساتھ سنت کے قانون کو شامل کر دیتے ہیں جس کے بارے میں قرآن کا واضح حکم موجود ہوتا ہے، یا وہ قرآن کے دیگر مشابہ احکام پر اس کو قیاس کر لیتے ہیں۔ اس طریقہ کی پہلی صورت مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہو سکتی ہے،

(۱) اللہ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال کیا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے مگر ان دونوں قسموں کے درمیان کئی مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں دونوں قسموں

(بقیہ صفحہ ۱۴۲) اور اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں سے کسی ایک کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے جیسا کہ جنگلی گدھوں کا گوشت کھانا یا لمبی کچلیوں والے درندوں، پنجے والے پرندوں کا گوشت کھانا ہے ان کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے اس لئے رسول اکرم ﷺ نے انھیں ناپاک چیزوں میں شامل کر کے ان کا گوشت کھانا حرام بتایا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام کیا ہے اور مذبوحہ کو حلال کیا ہے ان دونوں کے درمیان وہ بچہ ہے جو ذبح کئے ہوئے جانور کے پیٹ سے برآمد ہوتا ہے (وہ نہ مردار ہے اور نہ مذبوحہ ہے) لہٰذا رسول کریم ﷺ نے اسے مذبوحہ کے ساتھ شامل کر کے فرمایا ہے ———— "ماں کے ذبح کرنے سے بچے (جنین) کے ذبیحہ کا فرض ادا ہو جاتا ہے" اس میں اس بات کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ اس وقت ماں کا ایک حصہ تھا

(۳) آیت میراث میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر اولاد میں دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انھیں مال متروکہ میں سے دو تہائی حصہ ملے گا اور اگر ایک لڑکی ہو تو اسے نصف حصہ ملے گا ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ اگر دو بیٹیاں ہوں تو انھیں کیا حصہ ملے؟ قرآن کریم اس بارے میں خاموش ہے لہٰذا سنت نبویؐ نے انھیں دو سے زیادہ بیٹیوں کے شامل کر کے ان کے لئے بھی دو تہائی حصہ مقرر کیا ہے۔

دیگر احکام پر قیاس

قرآن کریم میں بعض ایسے احکام بیان کئے گئے ہیں جن میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے مشابہ معاملات میں بھی ایسے احکام جاری ہو سکتے ہیں اس وجہ سے اصولی احکام بیان کئے گئے ہیں اور فروعات کو اس لئے نظر انداز کیا گیا ہے کہ احادیث کے ذریعے ان کی تفصیلات بیان کی جا سکتی ہیں اور سنت نبویؐ قرآنی اصولوں پر قیاس کر کے دوسرے احکام بیان کر سکتی ہیں، اس صورت میں یہ قیاس اصل کے مطابق سمجھا جائے گا۔ قیاس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کریم میں ماں بیٹیوں اور دو سگی بہنوں کا ایک ہی مرد سے نکاح ممنوع اور حرام قرار دیا گیا ہے نیز چند رشتوں میں نکاح حرام قرار دیکر

آگے چل کر بتایا ہے کہ اس کے علاوہ دیگر عورتوں سے نکاح کرنا تمھارے لئے حلال ہے لیکن اس حکم کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجیوں کو ایک ہی مرد کے نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے اس میں ماں بیٹیوں اور دو بہنوں کو ایک ہی کے ساتھ نکاح کرنے کی حرمت پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ حرمت کی وجہ دونوں میں مشترک ہے بلکہ آپ نے اپنی حدیث میں حرمت کی وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ اگر تم ان دونوں کو ایک ہی کے نکاح میں دو گے تو تم قطع رحمی کے مرتکب ہو گے اس طرح قیاس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے

(۲) قیاس کی دوسری مثال رضاعی رشتوں کی حرمت ہے، قرآن میں صرف رضاعی ماؤں اور بہنوں سے نکاح کرنے کی ممانعت آئی ہے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رشتوں کو بھی حرام قرار دیا ہے مثلاً رضاعی پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی وغیرہ، چنانچہ آپ کا ارشاد ہے ——— " اللہ تعالیٰ نے رضاعی رشتوں کو بھی اسی طرح حرام کیا ہے جس طرح نسب کے سگے رشتوں کو حرام کیا ہے"

(۳) قرآن کریم میں میراث کے مقررہ حصے بیان کئے گئے ہیں لیکن والدین کے علاوہ عصبہ کی میراث کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی کی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین اس کے وارث ہوں تو اس کی والدہ کے لئے تہائی حصہ ہے، اولاد کے بارے میں مذکور ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ اسی طرح بہن بھائیوں کے بارے میں مذکور ہے ——— " اگر وہ بہن بھائی ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملتا ہے " ان کے علاوہ عصبہ کے باقی افراد مثلاً دادا۔ چچا اور چچا زاد بھائی کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے ——— " میراث کے جو مقررہ حصے ہیں وہ ان کے حقداروں کو دو اور جو حصہ باقی رہے وہ سب سے زیادہ قریبی مرد کو ملے گا " اس حدیث میں بھی اصحاب فروض کے بعد باقی ماندہ عصبہ کے افراد کو مذکورہ بالا آیات کے حکم پر قیاس کر کے وارث بنایا گیا ہے۔

کتب حدیث و احکام سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن کریم کی تدوین ہوئی تھی مگر آپ کی احادیث

مدون نہیں ہوئی تھیں گزشتہ صفحات میں (کتاب وسنت کی بحث میں) ہم اس کے اسباب و وجوہات بیان کر چکے ہیں البتہ چند صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو سُن کر آپ ہی کے زمانے میں لکھ لیا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں احادیث کو لکھوانے کا خیال پیدا ہوا اور وہ ایک مہینے تک اس مسئلے پر سوچتے رہے بعد ازاں انھوں نے یہ خیال چھوڑ دیا۔ بنوامیّہ کے دور میں کچھ خلفا اور علمار کے ذہن میں پھر یہ خیال آیا کہ احادیث کو جمع کر کے کتابی صورت میں مدون کیا جائے۔ مگر سب سے پہلے جنھوں نے عملی قدم اٹھایا وہ خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز تھے اور غالباً یہ عملی قدم پہلی صدی ہجری کے آخر میں اٹھایا گیا تھا کیونکہ موطا امام مالک میں محمد بن الحسن کی روایت مذکور ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھا[۱]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وسنن کو تلاش کر کے انھیں لکھ لو، کیونکہ مجھے علم اور علمار کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے۔"

آپ نے انھیں ہدایت کی کہ وہ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمٰن الانصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کی جو احادیث موجود ہوں انھیں لکھ لیں"۔

شیخ ابو نعیم نے تاریخ اصفہان میں حضرت عمر بن عبد العزیز کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے ——— "انھوں نے اہل عالم کو لکھا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تلاش کر کے جمع کر لو"

اسی زمانے میں حضرت محمد بن مسلم بن شہاب الزہری کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ وہ حدیث کی املار کرا کے تحریری صورت میں انھیں مدون کریں وہ حدیث کے بہت بڑے عالم اور حافظ تھے مگر قاضی ابوبکر بن محمد اور ابن شہاب الزہری کے مجموعوں میں سے کوئی مجموعہ ہمیں نہیں مل سکا۔

حدیث کے اولین مجموعے جب عباسی دور شروع ہوا تو محدثین احادیث کو مدون کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور

[۱] وہ انصاری اور مدنی تھے سلیمان بن عبد الملک اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے قاضی تھے ان کا ۱۲۰ھ میں انتقال ہوا

مختلف شہروں میں بیک وقت اس کا رجحان پیدا ہو گیا اور ہر شہر میں حدیثوں کے مجموعے تحریری صورت میں مرتب ہونے لگے اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس بارے میں اولیت کی فضیلت کس کو حاصل ہے، تاہم یہ گمان غالب ہے کہ یہ تمام مجموعات دوسری صدی کے نصف اول کے آخر اور نصف ثانی کے شروع میں مدون ہوئے تھے۔ بہر حال مدینہ منورہ میں سب سے پہلے محمد بن اسحاق اور امام مالک بن انس نے حدیثوں کے مجموعے مرتب کئے مکہ معظمہ میں ابن جریج نے کوفہ میں حضرت سفیان ثوری نے اور بصرہ میں معاذ بن سلمہ اور سعید بن ابی عروبہ نے اور یمن میں معمر بن راشد اور خراسان میں عبداللہ بن المبارک نے اور شام میں عبدالرحمٰن الاوزاعی نے احادیث کو تحریری صورت میں جمع کیا مصر میں امام لیث بن سعد نے احادیث کو جمع کیا مگر موطا امام مالک کے علاوہ اور کوئی مجموعہ ہمارے پاس نہیں پہونچا البتہ بعض مجموعوں کا یہ حال معلوم ہوا ہے کہ ان میں احادیث نبویؐ کے ساتھ ساتھ اقوال صحابہؓ اور تابعین کے فتاوے بھی شامل تھے۔

کتب مسانید

بعد ازاں دوسری صدی ہجری کے آخر پر ایک دوسرا طبقہ نمودار ہوا جس کی رائے یہ تھی کہ احادیث نبویؐ کو اقوال صحابہؓ وغیرہ سے الگ کر کے مرتب کیا جائے لہذا انھوں نے مسند کے طرز کی کتب احادیث مرتب کیں جن میں ہر ایک صحابیؓ کی روایت کردہ احادیث کو ایک ساتھ جمع کیا گیا تھا چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کی تمام احادیث مسند ابی بکر کے باب میں جمع کی گئی تھیں خواہ وہ مختلف مضامین و مسائل پر مشتمل کیوں نہ ہوں اس کے بعد ایک ایک کر کے ہر صحابی کی تمام احادیث ایک ہی جگہ پر اکٹھی کر دی گئی تھیں اس قسم کی مسانید میں حضرت امام احمد بن حنبل کی مسند زیادہ مشہور ہوئی اور انہی کی مسند آج کل متداول ہے

صحاح ستہ

تیسری صدی ہجری میں محدثین کا ایک تیسرا طبقہ نمودار ہوا، جو جمع حدیث کے ساتھ ساتھ تنقید حدیث کا فرض بھی انجام دیتا تھا، انھوں نے صحیح احادیث کو ضعیف احادیث سے چھانٹ کر الگ کرنا شروع

کیا۔ نیز وہ احادیث کے راویوں کی جانچ پڑتال بھی کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی کتب احادیث مرتب ہوئیں جن میں بالعموم صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا گیا تھا لہٰذا یہ کتب احادیث، سنت نبویؐ کی بنیادی کتابیں قرار پائیں اس طبقہ کے رہنما ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری المتوفی ۲۵۶ھ تھے جنھوں نے جامع صحیح بخاری کو مرتب کیا ان کے بعد امام مسلم بن الحجاج النیشاپوری المتوفی ۲۶۱ھ نے جامع صحیح مسلم کو مرتب کیا۔ یہ دونوں کتابیں کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح سمجھی جاتی ہیں، ان دونوں حضرات کی بہت سے محدثین نے پیروی کی جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:۔

(۱) ابو عبداللہ محمد بن یزید المتوفی ۲۷۳ھ جو ابن ماجہ کے نام سے مشہور ہیں سنن ابن ماجہ کو مرتب کیا (۲) شیخ ابو داؤد سلیمان بن الاشعث المتوفی ۲۷۵ھ نے سنن ابوداؤد لکھی (۳) جناب ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ السلمی الترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے جامع الترمذی تالیف کی (۴) جناب ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے سنن نسائی مرتب کی، یہ وہ کتب احادیث ہیں جو محدثین کی نگاہ میں صحاح ستہ کے نام سے مشہور رہیں اور مسلمانوں کے نزدیک صحیح ترین کتب احادیث سمجھی جاتی ہیں بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر بہت زیادہ اعتماد اور بھروسہ ہے امام احمد بن حنبل نے جن کی وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی ایک ضخیم مسند مرتب کی وہ بھی صحاح ستہ کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے۔

کتب احکام سنت جن کتابوں میں احادیث احکام کی تشریح کی گئی ہے اور جن میں ائمہ مجتہدین کے خیالات کو ظاہر کیا گیا ہے، ان میں سے ابن حجر العسقلانی کی کتاب فتح الباری بہت مشہور ہے یہ صحیح بخاری کی شرح ہے اس میں جہاں احکام کی احادیث آئی ہیں اس موقع پر انھوں نے ان کی پوری تشریح کی ہے اس سلسلے میں علامہ ابن القیم الجوزیہ کی کتاب زاد المعاد بھی کافی اہمیت رکھتی ہے، احکام کی احادیث کے لئے ایک مخصوص کتاب منتقی الاخبار ہے جو ابو البرکات مجد الدین عبدالسلام

بن عبداللہ[1] کی لکھی ہوئی ہے جن کی وفات ۶۵۲ھ میں ہوئی۔ اس کتاب کی شرح نیل الاوطار کے نام سے مشہور ہے جو مشہور عالم محمد بن علی بن محمد الشوکانی نے لکھی تھی ان کا انتقال ۱۲۵۵ھ میں ہوا حافظ ابن حجر العسقلانی کی کتاب بلوغ المرام بھی بہت مشہور ہے جس میں احکام کی احادیث کو جمع کیا گیا ہے اس کی شرح سبل السلام کے نام سے محمد بن اسماعیل الصنعانی المتوفی ۱۱۸۲ھ نے لکھی۔ یہ دونوں کتابیں احادیث احکام میں علمار مجتہدین کے اختلافات معلوم کرنے کے لئے بہت عمدہ ماخذ کا کام دے سکتی ہیں۔

ایسی کتابیں جن میں سنت نبوی اور احادیث کو جمع کیا گیا ہے بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ ہیں جن سے مصلحان قوم اور منکرین بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ آداب نبوی اور اخلاقِ قرآنی کا مجموعہ ہیں ان میں ایسی اعلیٰ درجے کی حکمت و موعظت کی باتیں ہیں جو صحیح غور و فکر پر مبنی ہیں اور ایسے قصص و امثال بھی ہیں جن سے عبرت حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کے دل اصلاح و ہدایت کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں ان میں ایسے مستحکم قوانین و احکام بھی ہیں جو عالم انسانیت کی تمام ضروریات کے کفیل ہیں ان کا تعلق عبادات معاملات اور دین و دنیا کے کاموں سے ہے ان قوانین کی بنیاد، مساوات اور کامل انصاف پر قائم ہے اور اخلاق و فضائل کے ذریعے اس کی عمارت کو مستحکم بنایا گیا ہے ان قوانین کے پیش نظر یہ ہے کہ انسان کو فلاح و بہبودی عطا کرکے ان کی خرابیوں کو دور کیا جائے تاکہ نہ تو کوئی خود نقصان اٹھائے اور نہ دوسروں کو نقصان پہونچائے بلکہ ایسا نظامِ معاشرہ قائم ہو جس میں کسی قسم کا فریب اور دھوکہ بازی نہ ہو اور کسی کو نہ تو کوئی تنگی ہو اور نہ کسی کے لئے امتیازی قوانین و احکام رکھے جائیں بلکہ شریعت کے قوانین سب کے لئے برابر ہوں

بہرحال سنت نبوی کے احکام و قوانین میں سہولت اور نرمی رکھی گئی ہے، اور وہ پاکیزہ فطرتِ انسانی اور عقل و حکمت کے عین مطابق ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے

---

[1] یہ ان مشہور علامہ احمد ابن تیمیہ کے دادا تھے جن کی وفات ۷۲۸ھ میں ہوئی۔

کہ وہ اعلیٰ قانون سازی کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور تمام افراد و قوم کی اصلاح و کامرانی کا بہترین ذریعہ ہیں

اب ہم سنتِ نبوی کے احکام و آداب کا کچھ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ اسلامی شریعت کا اعلیٰ معیار معلوم ہو سکے اور یہ پتہ چل سکے کہ اس کے احکام کتنے منصفانہ ہیں۔ اور وہ کہاں تک اصلاح انسانی کے تمام گوشوں پر اثر انداز ہے بالخصوص سماجی اور اخلاقی اصلاح میں اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے،

احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم

عبادات

سمندر کا پانی

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ——— "یا رسول! ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ تھوڑا پانی لے جاتے ہیں اگر اس پانی سے وضو کریں تو پیاسے رہ جائیں کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں" آپ نے فرمایا ——— "سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے" اس حدیث کو صحاح ستہ کی پانچ کتابوں میں روایت کیا گیا ہے، امام ترمذی نے نے فرمایا ——— "یہ حدیث حسن صحیح ہے" امام شافعی نے فرمایا۔ "یہ حدیث علم طہارت کا نصف حصہ ہے"

ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے — کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے جبکہ وہ خود ناپاک ہو" لوگوں نے پوچھا ——— "اے ابوہریرہ! پھر وہ کیا کرے" انھوں نے فرمایا ——— "وہ ایک طرف سے پانی لے" امام احمد اور ابوداؤد کی روایت ہے:۔

"تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں نہ پیشاب کرے اور نہ اس میں غسل جنابت کرے"

بلی کا جھوٹا

کبشہ بنت کعب بن مالک جو ابن ابی قتادہ کی بیوی تھیں بیان کرتی ہیں کہ ابو قتادہ ان کے پاس آئے تو وہ ان کو وضو کرانے کے لئے

پانی ڈالنے لگیں اتنے میں ایک بلی آئی اور اس میں سے پانی پینے لگی اس پر حضرت ابو قتادہ نے برتن کو آگے بڑھا دیا تاکہ وہ پانی پی لے ۔ کبشہ کہتی ہیں " انہوں نے مجھے دیکھا کہ میں تعجب سے دیکھ رہی ہوں اس پر وہ کہنے لگے اے بھتیجی! کیا تم تعجب کر رہی ہو؟ " میں نے کہا " ہاں " وہ کہنے لگے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے " یہ (بلی) نجس نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسی قسم ہے جو گھروں میں گشت کرتی رہتی ہے (صحاح ستہ کی پانچ کتابوں میں مذکور ہے)

(۲) حضرت عائشہ رضؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلی کی طرف برتن کو جھکا دیتے تھے تاکہ وہ پانی پی لے اس کے بعد آپؐ بچے ہوئے پانی سے وضو کرتے تھے ۔

مسواک کرنا

(۱) حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- " مسواک منہ کو صاف کرتی ہے اور یہ پروردگار کو بھی پسند ہے "

(۲) اگر میری امت پر یہ امر شاق نہ گذرتا تو میں انھیں ضرور حکم دیتا کہ وہ ہر نماز کے وقت مسواک کریں " امام احمد کی یہ روایت ہے " تو میں انھیں ضرور حکم دیتا کہ وہ ہر وضو کے ساتھ مسواک کریں "

(۳) حضرت حذیفہ رضؓ روایت کرتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت اٹھتے تھے تو وہ ایک مسواک کے ذریعے اپنے منہ کو صاف کرتے تھے " حضرت حذیفہ رضؓ کی روایت سے نسائی میں مذکور ہے کہ وہ فرماتے ہیں ـــــ " ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہم رات کی نیند سے بیدار ہوں تو مسواک کریں "

(۴) حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " پانچ چیزیں فطرت انسانی پر مبنی ہیں (۱) ناپاکی کے بال صاف کرنا (۲) ختنہ کرنا (۳) مونچھیں کاٹنا (۴) بغل کے بال صاف کرنا (۵) ناخن کاٹنا

خوشبو کا استعمال

حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " دنیا میں عورتیں اور خوشبو مجھے

پسند ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"

ہاتھ دھونا

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو وہ برتن میں اپنا ہاتھ نہ ڈالے کیونکہ اسے نہیں معلوم ہے کہ رات کے وقت اس کا ہاتھ کہاں کہاں رہا"

(۲) حضرت اوس بن اوس الثقفیؓ فرماتے ہیں ——— "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ نے اپنی ہتھیلیوں کو تین مرتبہ دھویا تھا۔

موزوں پر مسح کرنا

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ اپنے والد کی روایت سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات کی اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اس عرصے تک اپنے موزوں پر (وضو کے وقت) مسح کر سکتا ہے بشرطیکہ اس نے پاک وصاف ہو کر موزے پہنے ہوں"

(۲) حضرت مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں "ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا ہم میں سے کوئی موزوں پر مسح کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ——— ہاں بشرطیکہ پاک وصاف موزے پہنے ہوئے ہو"

سوتے وقت وضو

حضرت البراء بن عازب کی روایت ہے ——— کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —"جب تم اپنے بستر پر جاؤ تو جس طرح تم نماز کے لئے وضو کرتے ہو، اسی طرح وضو کرو اس کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹ کر یہ دعا پڑھو:۔

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِی اِلَیْکَ	اے اللہ! میں نے اپنی ذات کو
وَوَجَّھْتُ وَجْھِیَ اِلَیْکَ	تیرے سپرد کر دیا ہے اور تیری طرف
وَفَوَّضْتُ اَمْرِی اِلَیْکَ	متوجہ ہوں اور اپنا کام تجھ پر چھوڑ
وَاَلْجَأْتُ ظَھْرِی اِلَیْکَ	دیا اور خوشی اور ڈر سے تیری پشت پناہی

رغبة ورهبة اليك	میں آیا ہوں تیرے سوا میرا کوئی ٹھکانا
لا ملجأ ولا منجى منك	اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ اے اللہ
الا اليك ۔ اللهم امنت	میں تیری کتاب پر ایمان لایا ہوں
بكتابك الذى انزلت	جو تو نے نازل کی اور تیرے رسول پر
و نبيك الذى ارسلت	ایمان لایا ہوں جو تو نے بھیجا۔

اس کے بعد اگر تم اسی رات مرجاؤ تو فطرت انسانی پر مروگے اور تمھاری آخری گفتگو (اس دعا پر) ہوگی"

حیض کے مسائل

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں ـــــ "یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب ان کی کسی عورت کو حیض آتا تھا تو وہ اس کے ساتھ نہیں کھاتے تھے اور نہ وہ اس کے پاس جاتے تھے۔ لہذا آپ کے صحابیوں نے اس بارے میں دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی :۔

"وہ لوگ تم سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ وہ نجاست ہے لہٰذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو"

اس کے بعد آپ نے فرمایا ـــــ "جماع کے علاوہ تم ان سے ہر قسم کا تعلق رکھ سکتے ہو"[1]

(۲) حضرت معاذہ فرماتی ہیں "میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا ـــ" یہ کیا بات ہے کہ حائضہ پر روزے قضا کرنا فرض ہے اور نماز کی قضا فرض نہیں ہے"۔ انہوں نے فرمایا ـــــــ "رسول اللہ کے سامنے ہماری یہ حالت ہوتی تھی کہ ہمیں روزے قضا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز قضا کرنے کا ہمیں حکم نہیں تھا۔"

تیمم

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "ہمیں دوسرے لوگوں پر تین چیزوں کی وجہ

---

[1] بخاری کے علاوہ اکثر کتب حدیث میں یہ روایت منقول ہے ملاحظہ ہو نیل الاوطار (حصہ اول)

سے فضیلت ہے :۔

(۱) ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح مقرر کی گئی ہیں

(۲) تمام روئے زمین ہمارے لئے سجدہ گاہ (مسجد) بنادی گئی ہے ،

(۳) جب ہمیں پانی نہیں ملتا ہے تو اس کی مٹی ہمیں پاک کرتی ہے (مسلم)

(۴) حضرت عمار بن یاسر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "تیمم میں چہرے اور دونوں ہاتھوں پر مٹی پر ہاتھ مار کر مسح کیا جاتا ہے " دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں ——" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ وہ چہرے اور ہتھیلیوں پر مٹی سے مسح کر کے تیمم کرلیں "

نماز اور دیگر فرائض

حضرت طلحہؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں ——" ایک پراگندہ سر اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا —— " یا رسول اللہ ! آپ مجھے بتائیے کہ مجھ پر کتنی نمازیں فرض ہیں ؟" آپؐ نے فرمایا ——— " پانچ نمازیں فرض ہیں ، اس کے علاوہ جو پڑھوگے وہ تمہاری اپنی مرضی ہے " اس کے بعد اُس نے کہا " آپ مجھے بتائیے مجھ پر کتنے روزے فرض ہیں ؟ " آپؐ نے فرمایا —— " ماہ رمضان کے روزے ، اس کے علاوہ تمہارے مرضی کے ہیں " پھر اس نے کہا " آپ بتائیے مجھ پر کتنی زکوٰۃ فرض ہے ؟ " اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کے تمام احکام سے آگاہ کیا بعد ازاں اس نے کہا —— " اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت بخشی ہے اللہ نے مجھ پر جو چیز فرض کی ہے اس میں کمی نہیں کروں گا اور نہ اپنی مرضی سے اس سے زیادہ کام کروں گا " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— " اگر وہ سچا ہے تو کامیاب ہوگا " دوسری روایت میں ہے — " اگر وہ سچ کہتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا "

بچّوں کو نماز کا حکم

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— " تم اپنے بچّوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو

اور دس سال کی عمر میں نماز کے لئے مارو اور بستروں سے ان کو الگ کر دو"

مرد و عورت کا الگ الگ لباس

(۱) حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ موٹا قبطی کپڑا پہنایا جو آپ کو دحیۃ الکلبی نے تحفے کے طور پر دیا تھا، وہ میں نے اپنی بیوی کو پہنا دیا" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم وہ قبطی لباس کیوں نہیں پہنتے ہو؟" میں نے عرض کیا ——— "یا رسول اللہ! وہ میں نے اپنی عورت کو پہنا دیا ہے" آپ نے فرمایا ——— "اسے حکم دو کہ وہ اس کے نیچے ایک کرتی پہن لے کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی ہڈیاں نہ ظاہر ہو جائیں"

(۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعنت بھیجی ہے کہ مرد عورت کا لباس پہنتا ہو اور عورت مرد کا لباس پہنے"

بخاری - ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباس کی روایت سے یہ حدیث منقول ہے ——— "رسول اللہ نے لعنت بھیجی ہے کہ عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں اور مرد عورتوں کی مشابہت اختیار کریں" [۱]

قبر پرستی کی ممانعت

(۱) حضرت ابو مرثد الغنوی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— نہ تو قبروں کی طرف نماز پڑھو اور نہ اس پر بیٹھو"

(۲) حضرت جندب بن عبد اللہ البجلی فرماتے ہیں ——— "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وصال سے پانچ دن پہلے یہ فرماتے سنا ہے ——— تم میں سے جو لوگ پہلے تھے وہ اپنے پیغمبروں اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ (مساجد) بناتے تھے دیکھو قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنا لینا میں تمہیں اس بات سے منع کرتا ہوں [۲]

---

[۱] نیل الاوطار جلد دوم ص ۹۸ مطبوعہ ۱۳۴۷ھ

[۲] نیل الاوطار میں ممانعت کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ مردہ پرستی کے (باقی صفحہ ۱۵۷)

نماز کی دعائیں

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی روایت ہے کہ ـــ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے :-

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي	میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین
حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا اَنَا	کو پیدا کیا ، میں تمام باطل مذاہب
مِنَ الْمُشْرِكِينَ . اِنَّ	سے الگ ہو کر مسلمان ہوں اور
صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ	مشرکوں میں سے نہیں ہوں ، اے
وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ	اللہ تو ہی بادشاہ ہے تیرے سوا
لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ	کوئی معبود نہیں ہے تو میرا پروردگار
اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ	ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں
اللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا	نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنے
اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ، اَنْتَ	گناہ کا اقرار کرتا ہوں میرے
رَبِّي وَاَنَا عَبْدُكَ	تمام گناہوں کو معاف کر دے
ظَلَمْتُ نَفْسِي . وَاعْتَرَفْتُ	کیونکہ تیرے سوا اور کوئی گناہوں
بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي ذُنُوبِي	کو نہیں معاف کر سکتا ۔ مجھے اچھے
جَمِيعًا ۔ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ	اخلاق کی ہدایت دے کیوں کہ
اِلَّا اَنْتَ وَاهْدِنِي لِاَحْسَنِ	تیرے سوا اور کوئی میری
الْاَخْلَاقِ ، لَا يَهْدِي	برائیوں کو نہیں دور کر سکتا ہے
لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ	میں تیرے حکم کی تعمیل کے لئے
عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي	حاضر ہوں سب کچھ خیر و سعادت
سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ لَبَّيْكَ	تیرے ہاتھوں میں ہے اور برائی

(بقیہ صفحہ ۱۵۶) فتنے سے بچایا جائے جو بعض اوقات کفر کے درجے تک پہونچ جاتا ہے ، جیسا کہ گذشتہ قوموں میں ہوا جلد دوم صفحہ ۱۱۳ - ۱۱۴

وَسَعْدَيْكَ ، وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ - أَنَا بِكَ وَ إِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے میں تیرا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوں تو بابرکت اور سربلند ہے ۔ میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں ۔

جب آپ رکوع میں جاتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے :۔

اللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ ، وَلَكَ أَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِي ، وَبَصَرِي وَمُخِّي وَعَظْمِي وَعَصَبِي

اے اللہ! میں نے تیرے لئے رکوع کیا ہے اور تجھ پر ایمان لایا ہوں اور تیرے لئے اسلام قبول کیا ہے میری قوت سماعت وبصارت ، میرا مغز ، ہڈیاں اور اعصاب خشوع وخضوع کے ساتھ تیری طرف متوجہ ہیں "

جب آپ رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو پڑھا کرتے تھے ۔

اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمٰوٰتِ وَمِلْءُ الْأَرْضِ وَمِلْءُ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءُ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ -

اے اللہ سب تعریفیں تیرے لئے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں اور ان دونوں کے درمیان کے تمام حصوں میں بھری ہوئی ہیں اور اس کے بعد جتنی چیزوں میں تو چاہے یہ ان سب میں بھری ہوئی ہیں ۔

جب آپ سجدہ کرتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے :۔

اللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَبِكَ آمَنْتُ ، وَلَكَ أَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ

اے اللہ! تیرے لئے میں سجدہ کیا ہے اور تجھی پر ایمان اور اسلام لایا ہوں میرا سجدہ اس ذات کے لئے ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی شکل وصورت بنائی اور اس میں قوت

احسن الخالقین ۔	سماعت و بصارت کو نمودار کیا اللہ
	اللہ بہترین خالق اور با برکت والا ہے

بعد ازاں آپ تشہد اور سلام کے درمیان آخر میں یہ پڑھا کرتے تھے

اللھم اغفرلی ما قدمت	اے اللہ! میرے اگلے پچھلے پوشیدہ
وما اخرت وما اسررت	اور علانیہ گناہوں کو معاف کر اور جو
وما اعلنت وما اسرفت	زیادتیاں میں نے کی ہیں اور جنہیں تو
وما انت اعلم به منی	مجھ سے زیادہ جانتا ہے ان سب کو
انت المقدم و انت المؤخر	معاف کر تو ہی اول و آخر بس ہے ۔
لا الٰه الا انت	تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۔

(ب) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے تھے تو یہ پڑھا کرتے تھے ۔

سبحانك اللھم وبحمدك	اے اللہ تو پاک ہے اور ہم تیری
وتبارك اسمك وتعالٰی	تعریف کرتے ہیں تیرا نام مبارک ہے
جدك ولا الٰه غيرك	اور تیری شان بلند ہے اور تیرے سوا
	اور کوئی معبود نہیں ہے ۔

(ج) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں تکبیر کہتے تھے تو قرأت سے پہلے تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے ایک دفعہ میں نے عرض کیا۔ " یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ تکبیر اور قرأت کے درمیان خاموش رہتے ہیں اس میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ـــــ " میں یہ پڑھتا ہوں ۔

اللھم باعد بینی وبین	اے اللہ! تو میرے اور میری غلطیوں
خطایای، کما باعدت	کے درمیان اتنی دوری پیدا کر جیسا کہ
بین المشرق والمغرب	تو نے مشرق و مغرب کے درمیان دوری
اللھم نقنی من خطایای	پیدا کی ہے ۔ اے اللہ تو مجھے گناہوں
كما ينقى الثوب الابيض	سے ایسا پاک و صاف کر جیسا کہ سفید
من الدنس ۔ اللھم اغسلنی	کپڑا نجاست سے پاک و صاف کیا

من خطایای بالثلج والماء والبرد | جاتا ہے اے اللہ تو میری خطاؤں کو برف پانی اور اولے سے دھو ڈال۔

ذکر و دعا کی کرنیں ان تینوں احادیث میں نورِ نبوتؐ سے چھن چھن کر برآمد ہو رہی ہیں اور رسالتؐ کی خوشبو سے مہک رہی ہیں۔

نماز میں سورۃ فاتحہ حضرت عبادہؓ بن الصامت کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔" ایک دوسری روایت میں آیا ہے "اس آدمی کی نماز کافی نہیں ہے جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی"

تحیۃ المسجد حضرت ابو قتادہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ـــــ "جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہاں نہ بیٹھے جب تک کہ دو رکعت نماز نہ پڑھ لے"۔ دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا ـــــ "مساجد کا حق ادا کرو" لوگوں نے کہا ـــــ "ان کا کیا حق ہے" آپ نے فرمایا ـــــ مسجد میں بیٹھنے سے پیشتر دو رکعت نماز پڑھو۔"

عیدین کی نماز حضرت عمرو بن عوف المزنی فرماتے ہیں ـــــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں کہیں اور دوسری رکعت میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہیں" امام ترمذی نے اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس باب میں یہ بہترین روایت ہے [1]

"حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں ـــــ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف جاتے تھے اور اپنے عمل کی ابتدا نماز سے فرماتے تھے اس کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے مگر لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے تھے اس وقت آپ انھیں وعظ و نصیحت فرماتے

[1] (مترجم) حنفیوں کا عیدین کی تکبیروں کے بارے میں یہ مسلک نہیں ہے ان کے رہاتی صفحہ (۶۱)

اور کچھ احکام سناتے تھے اور اگر کوئی مہم بھیجنی ہوتی تھی یا کسی بات کا حکم دینا ہوتا تھا تو حکم دیتے تھے ۔ اس کے بعد لوٹ آتے تھے ۔

کسوف وخسوف کی نماز

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "سورج اور چاند اللہ کی دو نشانیاں ہیں ان میں کسی کی موت اور زندگی کی وجہ سے گہن نہیں آتا ہے اگر تم یہ حالت دیکھو تو اللہ سے دعا مانگو اور تکبیریں کہو، صدقہ دو، اور نماز پڑھو "

(۲) حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ـــــ "جب (آپؐ کے فرزند) ابراہیم فوت ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا تھا، اس پر لوگ کہنے لگے ـــــ "ابراہیم کی موت کی وجہ سے سورج گرہن ہوا ہے" اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "چاند سورج اللہ کی دو نشانیاں ہیں ان میں کسی کی موت اور زندگی کی وجہ سے گہن نہیں آتا ہے، جب تم انھیں اس حالت میں دیکھو تو اللہ سے دعا مانگو اور نمازیں پڑھو یہانتک کہ ان کا گہن دور ہو جائے ـــ ؎۲

زکوٰۃ کے احکام

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "پانچ اوقیہ ؎۳ سے کم چاندی میں صدقہ نہیں ہے اسی طرح پانچ سے کم اونٹ کے ریوڑ میں صدقہ نہیں ہے، نیز کھجوروں کے پانچ وسق سے کم میں بھی صدقہ نہیں ہے ۔

(۲) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "جب تمہارے پاس دو سو درہم ہو جائیں اور ان پر ایک

؎۱ (بقیہ صفحہ ۱۶۰) ہاں زائد تکبیریں صرف چھ ہیں تین تکبیریں پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے کہی جاتی ہیں اور تین زائد تکبیریں دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے پڑھی جاتی ہیں ان کا استدلال دوسری احادیث سے ہے (مترجم) ؎۲ نیل الاوطار جلد سوم صفحہ ۲۸۴

؎۳ فتح الباری میں مذکور ہے کہ اس حدیث میں اوقیہ کی مقدار چالیس درہم ہے

سال گزر جائے تو ان پر پانچ درہم (زکوٰۃ) ہے اور (زر خالص) میں تم پر کوئی (زکوٰۃ) نہیں ہے جب تک کہ تمھارے پاس بیس ۲۰ دینار نہ ہو جائیں۔ جب تمھارے پاس بیس ۲۰ دینار ہو جائیں اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر نصف دینار (زکوٰۃ) ہے"

(۳) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ اس اراضی پر جسے نہریں اور بارشیں سیراب کرتی ہوں، دسواں حصہ ہے اور ان کھیتوں پر جو کنویں کے پانی سے اونٹوں کے ذریعے سیراب ہوتے ہوں پانچواں حصہ ہے [۱]

زکوٰۃ جلد ادا کرنا

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں:— میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے — جب صدقہ مال و دولت میں شامل ہو جائے (اور ادا نہ کیا جائے) تو وہ ضرور مال و دولت کو بھی تباہ کر دیتا ہے، امام شافعیؒ نے اور امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں یہ حدیث روایت کی ہے اور حمیدیؒ نے بھی اس اضافہ کے ساتھ روایت کی ہے — "جب تمھارے مال میں صدقہ واجب ہو جائے اور تم اسے نہ ادا کرو تو حرام چیز حلال کو تباہ کر دے گی۔"

صدقہ اور سوال کرنا کس کیلئے ناجائز ہے

(۱) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:— "صدقہ دولت مند، طاقت ور اور کمانے والے شخص کے لئے حلال نہیں ہے"

(۲) حضرت عبیداللہ بن عدی بیان کرتے ہیں دو آدمیوں نے انھیں بتایا کہ وہ دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ مانگنے کے لئے گئے آپ نے ان پر ایک نظر ڈالی اور انھیں طاقت ور دیکھا تو آپ نے فرمایا "اگر تم چاہو تو میں تمھیں دے سکتا ہوں مگر صدقہ میں دولت مند اور طاقت ور کمانے والے شخص کا کوئی حصہ نہیں ہے"

[۱] نیل الاوطار چوتھا حصہ صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹

(۳) حضرت سہیل بن الحنظلہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔۔۔۔۔۔ "جس شخص کے پاس کافی مال ہو اور وہ سوال کرے تو وہ دوزخ کے انگارے بھرتا ہے" لوگوں نے کہا ۔۔۔۔۔۔ "یا رسول اللہ! اس کے لئے کافی مال کیا ہے" آپ نے فرمایا ۔۔۔۔۔۔ "اتنی روزی ہو جو اس کے صبح یا شام کے کھانے کے لئے کافی ہو۔"

(۴) حضرت قبیصہؓ بن مخارق بیان کرتے ہیں ۔۔۔ "میں جب بہت زیر بار ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے سوال کرنے لگا آپؐ نے فرمایا ۔۔۔۔۔۔ "توقف کرو یہاں تک کہ ہمارے پاس صدقہ آجائے تو اس موقع پر ہم تمہارے لئے کوئی فیصلہ کریں گے" بعد ازاں آپ نے فرمایا۔ "اے قبیصہ! سوال صرف تین قسم کے آدمیوں کے لئے جائز ہے"۔

(۱) ایسا شخص جو (قرضہ وغیرہ کی وجہ سے) بہت زیادہ زیر بار ہوگیا ہو تو اس صورت میں سوال کرنا اس کے لئے جائز ہے تاکہ وہ کچھ حاصل کرسکے اور پھر وہ (سوال کرنے سے) باز آجائے۔

(۲) ایسا شخص جس پر کوئی حادثہ نازل ہو جس سے اس کا مال تباہ ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے، یہاں تک کہ اس کی معاشی حالت بہتر ہو جائے۔

(۳) ایسا شخص جو فقر و فاقہ میں اس قدر مبتلا ہو کہ اس کی قوم کے تین عقلمند آدمی یہ کہیں ۔۔۔۔۔۔ "فلاں شخص فاقہ میں مبتلا ہے" تو ایسے موقع پر اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کی معاشی حالت بہتر ہو جائے۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے سوال کرنا حرام ہے اور جو سوال کرے وہ حرام کھاتا ہے"

حج کے احکام

(۱) حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ پڑھا اور فرمایا ۔۔۔۔۔۔ "اے لوگو! تم پر حج فرض ہوگیا ہے" اس پر اقرع بن حابسؓ کھڑے ہو کر کہنے لگے "یا رسول اللہ! کیا ہر سال فرض ہے؟" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔۔۔۔ "اگر میں کہہ دوں تو

وہ ہر سال ضروری ہو جائے اور جب وہ فرض ہو جائے تو تم اس پر عمل نہیں کروگے اور نہ عمل کر سکو گے۔ حج کرنا (عمر میں) ایک مرتبہ ہے جو اس سے زیادہ حج کرے تو یہ نفلی حج ہے۔

والدین کی طرف سے حج

(۱) حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ فرماتے ہیں "قبیلہ خثعم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا ——— "میرا باپ مسلمان ہے مگر وہ اس قدر بوڑھا ہے کہ سواری پر سوار نہیں ہو سکتا مگر حج اس پر فرض ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں" آپؐ نے فرمایا "کیا تم اس کے بڑے فرزند ہو" اس نے کہا "ہاں" آپؐ نے فرمایا ——— تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر تمھارے والد پر قرضہ ہوتا اور تم اسے ادا کر دیتے تو کیا یہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا۔ اس نے فرمایا "ہاں" "آپ نے فرمایا" لہذا تم اس کی طرف سے حج کر لو"

(۲) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جہینۃ کی ایک عورت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگی ——— "میری والدہ نے حج کرنے کی منت مانی تھی مگر حج کرنے نہیں پائی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟" آپ نے فرمایا "ہاں تم اس کی طرف سے حج کرو اگر تمھاری والدہ پر قرضہ ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہیں کرتیں؟ اللہ کا حق ادا کرو کیونکہ اللہ کے حق کو ادا کرنا سب سے مقدم ہے [۱]

(۳) حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے یہ سُنا "کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہا نہ بیٹھے جب تک کہ اس کے پاس کوئی محرم نہ ہو اور کوئی عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے" اس پر ایک مرد کھڑا ہو کر کہنے لگا ——— یا رسول اللہ! میری عورت حج کے ارادے سے روانہ ہوئی ہے اور میں نے ایک جنگ میں اپنا نام لکھوا لیا ہے" آپ نے فرمایا ——— "جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو"

[۱] نیل الاوطار جلد چہارم صفحات ۲۲۲-۲۲۳

معاملات کے احکام

دھوکے کی بیع منع[1]

(۱) حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ — رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — "پانی کے اندر کی مچھلیوں کو نہ خریدو کیونکہ یہ دھوکے کا معاملہ ہے"

(۲) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمل در حمل کی بیع (حبل الحبلۃ) سے منع فرمایا ہے حمل در حمل کی بیع کا مفہوم یہ ہے کہ اونٹنی کے پیٹ سے بچہ ہو پھر وہ بچہ بڑا ہو کر حاملہ ہو ان سب باتوں کا اندازہ لگا کر بیع و فروخت کی جائے[2]

(۳) حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں — "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ جانوروں کے پیٹ کے اندر بچوں کی خرید فروخت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ وہ پیدا نہ ہو جائیں اس طرح تھنوں کے اندر دودھ کو نہ فروخت کیا جائے۔ جب تک کہ اسے ناپ تول کر معلوم نہ کر لیا جائے، نیز بھاگے ہوئے غلام کو خریدنا اور تقسیم سے پہلے مال غنیمت کو خریدنا اور قبضہ کرنے سے پہلے صدقات کا خریدنا بھی منع ہے"

ناقابل فروخت اشیاء

حضرت جابرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے — "اللہ نے شراب، مردار،

---

[1] امام نووی فرماتے ہیں دھوکے کی بیع (بیع الغرر) شریعت کا ایک بنیادی قانون ہے جس کے ماتحت کئی مسائل آتے ہیں

[2] بعض علماء نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ جانور کا گوشت ادھار فروخت کیا جائے اس شرط پر کہ اونٹنی کا بچہ بڑا ہو کر بچے جنے بعض نے یہ تشریح کی ہے کہ اونٹنی کے بچے کو فوراً فروخت کر دیا جائے پہلی تشریح کے مطابق ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ مدت معلوم نہیں ہے اور دوسری تشریح کے مطابق یہ دھوکے کی بیع ہے کہ فروخت کی چیز موجود نہیں ہے اور اسے سپرد کرنے کی کسی کو قدرت حاصل نہیں ہے

سوئر، اور بتوں کو فروخت کرنا حرام کیا ہے"

لوگوں نے کہا ——— "یا رسول اللہ! مردار کی چربی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کیونکہ ایسی چربی کشتیوں پر ملی جاتی ہے اور کھالوں پر اس سے روغن کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے لوگ چراغ جلاتے ہیں" آپ نے فرمایا ——— "نہیں یہ حرام ہے" پھر آپ نے فرمایا ——— "اللہ یہودیوں کو غارت کرے کیونکہ جب چربیوں کو حرام کیا گیا تو وہ ان کو پگھلا کر بیچنے لگے اور اس کی قیمت کھانے لگے"

(۲) حضرت انسؓ فرماتے ہیں ——— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلے میں دس افراد پر لعنت فرمائی ہے۔ (۱) نچوڑ کر شراب بنانے والا (۲) شراب بنوانے والا (۳) شراب خور (۴) شراب لے جانے والا (۵) جس طرف شراب لے جائی جائے (۶) ساقی (۷) شراب فروش (۸) شراب کی قیمت کھانے والا (۹) شراب کا خریدار (۱۰) اور وہ شخص جس کے لئے شراب خرید کر لے جائی جائے۔"

(۳) حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں ——— "میں نے کہا "یا رسول اللہ! میرے پاس ایک آدمی آتا ہے وہ مجھ سے کہتا کہ جو چیز میرے پاس نہیں ہے وہ میں اسے فروخت کر دوں، پھر اسی کو بازار سے خریدتا ہوں" آپ نے فرمایا ——— "جو چیز تمہارے پاس نہ ہو اسے نہ بیچو"

(۴) حضرت سمرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:— "جس عورت کا نکاح اس کے دو سرپرست کر دیں تو اس کا نکاح پہلے ولی کی اجازت کے مطابق ہوگا اور جو شخص کوئی چیز دو آدمیوں کو فروخت کرے تو اس کا حقدار وہ ہے جس کو وہ چیز پہلے فروخت کی گئی ہو[1]"

قبضہ کی شرط

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جب تم کوئی کھانا خریدو تو اسے مت

[1] نیل الاوطار میں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز کسی ایک آدمی کو فروخت کی جائے اس کے بعد دوسرے آدمی کے پاس فروخت کر دی گئی تو دوسری بیع باطل ہے کیونکہ اس کو غیر مملوکہ چیز فروخت کی گئی ہے کیونکہ وہ چیز پہلے گاہک کی ملکیت میں چلی گئی تھی۔

فروخت کرو جب تک کہ تم اس پر پورا قبضہ نہ کرلو۔"

(۶) حضرت حکیم بن حزام فرماتے ہیں ــــــ" میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں کئی طرح کی خرید و فروخت کرتا ہوں تو بتائیے میرا کس قسم کا سودا حلال ہے اور کون سا معاملہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا ــــــ" جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے فروخت نہ کرو جب تک کہ اس پر قبضہ نہ کرلو"

(۷) حضرت زید بن حارث کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ جب کوئی سامان خریدا جائے تو اسے اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے جب تک کہ سوداگر انھیں اپنے قبضہ میں نہ کرلیں"،

(۸) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں ــــــ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دھوکے کی فروخت (نجش)[۱] سے منع فرمایا ہے"

(۹) حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ــــــ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ (شہر میں تجارتی قافلہ آنے سے پیشتر ان سے) آگے بڑھ کر خرید و فروخت کی جائے[۲]

(۱۰) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں ــــــ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ پہلے سے تاجروں سے خریداری کرکے تمام غلہ نہ حاصل کرلیا جائے (اس صورت میں شہر والوں اور تاجروں دونوں کا نقصان ہوتا ہے) اگر کوئی اس طریقے سے خریداری کرے گا تو جب سامان والا بازار میں آئے (اور اسے اصل حقیقت معلوم ہو) تو اسے اختیار ہے (کہ وہ پہلی خرید و فروخت کو منسوخ کردے)

---

[۱] نجش کا اصل معنے مکر و فریب ہے مگر اصطلاحی معنوں میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ محض سامان تجارت کی قیمت بڑھانے کا سودا کیا جائے تاکہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ قیمت لگائیں حالانکہ اس کے خریدنے کا ارادہ نہ ہو اگر بائع کی مرضی سے یہ کام ہو تو ایسی خرید و فروخت فاسد ہوگی اور گاہک کو اختیار ہوگا کہ وہ چیز واپس کردے،

[۲] اس حدیث کی تشریح اور اس کے بعد کی احادیث کے لئے ملاحظہ ہو نیل الاوطار جلد پنجم صفحہ ۳۲۱

(۱) حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی خرید و فروخت پر معاملہ نہ کرے اور نہ اپنے کسی بھائی کی منگنی کے پیغام پر پیغام بھیجے مگر اس وقت جبکہ وہ اس کی اجازت دیدے"۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں ——— "کوئی مرد اپنے بھائی کی منگنی کے ہوتے ہوئے رشتہ نہ دے اور نہ اس کے معاملہ پر معاملہ کرے"۔

نیلام

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ اور ٹاٹ کو نیلام میں فروخت کیا۔[1]

پھلوں کی فروخت

(۱) حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ پھلوں کو پختہ ہونے سے پیشتر نہ فروخت کیا جائے۔ آپ نے بیچنے والے اور خرید اور دونوں کو منع فرمایا"۔

(۲) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے پھلوں کی فروخت کو اس وقت تک منع فرمایا جب تک کہ وہ پختہ ہو کر سرخ نہ ہو جائیں" آپ نے فرمایا ——— "جب اللہ نے پھلوں کو روک رکھا ہو تو تم کس وجہ سے اپنے بھائی کے مال کو حلال سمجھتے ہو؟

حضرت ابن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ عہد جاہلیت میں منقذؓ کے دماغ میں چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے ان کی زبان بگڑ گئی تھی چنانچہ جب وہ فروخت کرتے تھے تو اس میں دھوکا کھاتے تھے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم فروخت کے وقت لکھو تاکہ کوئی دھوکا فریب نہ ہو"۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے (کہ اگر تم فریب دیکھو تو معاملہ فسخ کرو) آپ نے یہ لفظ تین دفعہ دہرایا حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں" میں نے اس کے بعد اسے اپنی توتلی زبان میں یہ الفاظ کہتے ہوئے سنا" دھوکا فریب نہ ہو"۔

خیار مجلس

حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

[1] سنن ابوداؤد اور مسند احمد کے یہ الفاظ ہیں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک غریب صحابیؓ کی امداد کے سلسلے میں) ایک پیالہ اور ٹاٹ بیچنے کے لئے اپنے صحابہؓ میں آواز لگائی تو ایک آدمی نے کہا" میں ان دونوں کو ایک درہم میں لیتا ہوں اور دوسرے نے کہا" میں دونوں کے لئے دو درہم دیتا ہوں" (نیل الاوطار جلد ۵)

ہے کہ وہ خرید و فروخت کے مقام پر) بائع اور خریدار کو بیع فسخ کرنے کا) اختیار ہوتا ہے جب تک وہ دونوں اس مقام سے اٹھ کر نہ چلے جائیں؛ اگر انھوں نے سچا معاملہ کیا ہو اور ہر بات کھول کر بیان کردی ہو تو ان کی بیع میں برکت حاصل ہو گی اور اگر ان دونوں نے جھوٹ بول کر (عیب کو) چھپایا تو ان کے فروخت کی برکت جاتی رہے گی "

سود کی حرمت

(۱) حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود خور، سود دینے والے، اس کے دونوں گواہوں اور کاتب پر لعنت بھیجی ہے"۔ نسائی کے الفاظ میں اتنا اضافہ ہے "جب انہیں (سودی معاملہ کا) علم ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے ان پر روز قیامت تک لعنت ہوتی رہے گی۔"

(۲) حضرت ابو سعیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سونے کو سونے کے ساتھ اسی کے مطابق فروخت کرو اور اس میں زائد نفع نہ لو اس طرح چاندی کو چاندی کے ساتھ یکساں حالت میں فروخت کرو اور ایک دوسرے سے زائد نفع نہ لو اور غیر موجود کو موجود کے بدلے میں نہ فروخت کرو" دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں " سونا سونے کے بدلے ہیں، چاندی، چاندی کے بدلے گیہوں، گیہوں کے بدلے ہیں، جو، جو کے بدلے ہیں، کھجور کھجور کے بدلے ہیں اور نمک نمک کے بدلے میں مساوی حالت میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں جو ان میں اضافہ کرے یا اضافہ کرانا چاہے تو وہ سود خوار ہے اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں "

(۳) حضرت عبادہ بن الصامت کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ——— " سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے ہیں، گیہوں گیہوں کے بدلے میں، جَو جَو کے بدلے ہیں، کھجور کھجور کے بدلے میں اور نمک نمک کے بدلے ہیں ایک جیسے برابر اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں جب ان کی قسمیں بدل جائیں، تو جیسا چاہو فروخت کرو بشرطیکہ وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں،

ادھار اور نقد کا فرق

حضرت ابن اسحاق السبیعی اپنی بیوی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں تو ان کے ساتھ

زید بن ارقمؓ کی ام ولد لونڈی بھی تھی اس نے کہا ——— "اے ام المومنینؓ میں نے زید بن ارقمؓ کو ایک غلام آٹھ سو درہم پر ادھار فروخت کیا اور پھر میں نے اسکو اس سے چھ سو درہم نقد میں خرید لیا"، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا ——— "تم نے بری چیز خریدی اور بری چیز خریدی گئی کیونکہ اس کی وجہ سے زید بن ارقمؓ کی رسول اللہ کے ساتھ جہاد کرنے کی فضیلت ضائع گئی بجز اس کے کہ وہ توبہ کرلے"۔

عیب ظاہر کرنا

حضرت واثلہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی چیز فروخت کرے اور اس کا اصل حال نہ بتائے اور اگر کوئی شخص اس کا حال جانتا ہو تو اسے کھلم کھلا بتانا چاہیئے"۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ ایک آدمی کے پاس سے گذرے، جو اشیائے خوردنی فروخت کر رہا تھا اس وقت آپ نے ان کے اندر ہاتھ ڈالا تو وہ چیزیں تر بتر تھیں آپ نے فرمایا ——— "جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے ـــ"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ آمدنی اور نفع ذمہ داری کے ساتھ ہے" دوسری روایت میں یہ مذکور ہے ——— "ایک آدمی نے ایک غلام کو خریدا اور اس سے نفع حاصل کیا پھر اس میں کوئی عیب پایا تو عیب کی وجہ سے اسے واپس کر دیا تو فروخت کرنے والے نے کہا "میرے غلام کا نفع کہاں ہے؟" اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "نفع ذمہ داری کے ساتھ ہے"۔

ذخیرہ اندوزی

حضرت سعید بن المسیب معمر بن عبداللہ العدوی کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-
"خطا کار اور گناہ گار ہی ذخیرہ اندوزی (احتکار) کرتا ہے سعید تیل کی ذخیرہ اندوزی کیا کرتے تھے"۔

(۲) حضرت معقل بن یسارؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص مسلمانوں کے نرخ میں اس نیت سے مداخلت کرے کہ اسے گراں

کر دے تو اللہ کے لئے ضروری ہو جائے گا کہ وہ اسے قیامت کے دن جہنم کے بڑے ٹھکانے پر بٹھائے "

(۳) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ——— "جو کوئی ذخیرہ اندوزی کرے (اور اس ذخیرہ کو فروخت نہ کرے) تاکہ وہ اسے مسلمانوں پر گراں کر کے بیچے تو وہ خطا کار ہے "

بیع سلم[1]

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ بالعموم پھلوں کے سال دو سال کے لئے پیشگی سودے کیا کرتے تھے اس پر آپ نے فرمایا "جو پیشگی سودا کرے تو اس کی ناپ تول اور مدت معلوم ہونی چاہیئے "

قرض دینے کی فضیلت

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے ـ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ——— "جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دے تو یہ عمل ایسا ہے جیسا کہ اس نے ایک مرتبہ اس کا صدقہ دیا ہو ـ"

حق ادا کرنا

(۲) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک اونٹ قرض تھا، وہ اس کا تقاضا کرنے آیا تو آپ نے فرمایا ——— "اسے وہ اونٹ دیدو" لوگوں نے اس سن کا اونٹ تلاش کیا مگر اس سے بڑی عمر کا اونٹ ملا آپ نے فرمایا "وہی اس کو دے دو" اُس نے کہا ——— "آپ نے میرا پورا حق ادا کیا اللہ آپ کا پورا حق ادا کرے " اس پر آپ نے فرمایا ——— "تم میں سے بہتر ین شخص وہ ہے جو بہترین طریقے سے کسی کا حق ادا کرے "

تحفہ قبول نہ کرنا

(۳) حضرت ابوبردہ بن ابوموسیٰ فرماتے ہیں ——— "جب میں مدینہ منورہ آیا تو میں حضرت عبداللہ بن سلام سے ملا، انھوں

---

[1] فتح الباری میں مذکور ہے کہ بیع سلم وہ بیع ہے جس میں قیمت پیشگی ادا کی جائے، بیع سلم کی شرائط مفصل طور پر کتب فقہ میں مذکور ہیں،

نے مجھ سے فرمایا ——— تم ایسی سرزمین میں ہو جہاں سود خوری عام ہے لہٰذا اگر تمہارا کسی شخص پر حق (قرضہ) ہو اور وہ تمہاری طرف، چارے، جو یا کسی اور چیز کا ذخیرہ بھیجے تو تم اسے قبول مت کرو کیونکہ یہ سود خوری ہے۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب کوئی کسی کو قرضہ دے تو وہ (اس کا) ہدیہ قبول نہ کرے"

مال مسروقہ کا ملنا

حضرت حسن حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جو کوئی اپنا مال بعینہٖ کسی شخص کے پاس پائے تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، خریدار کو چاہیئے کہ وہ بائع کا پیچھا کرے" دوسری روایت یہ ہے ——— "جب کسی شخص کا سامان چوری ہو جائے یا ضائع ہو جائے اس کے بعد کسی شخص کے پاس بعینہٖ وہی مال ملے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے خریدار کو چاہیے کہ وہ بائع سے اس کی قیمت کا مطالبہ کرے۔"

ٹال مٹول کی مخالفت

حضرت عمرو بن الشرید رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "مالدار کا (قرضہ وغیرہ کے ادا کرنے میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے جس سے وہ اپنی آبرو خراب کرنے اور سزا پانے کا مستحق ہو جاتا ہے"[1]

مقروض کے ساتھ رعایت

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے پھل خریدے جو خراب ہو گئے تھے اس کی وجہ سے بہت جلد مقروض ہو گیا آپ نے

---

[1] اس حدیث سے بعض علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر مقروض قرض ادا کرنے کے قابل ہو اور وہ ادا نہ کرتا ہو تو اسے سزا دینے کے لئے قید کیا سکتا ہے مگر جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ اس کی چیزوں کو حاکم فروخت کروے مگر تنگ دست کے بارے میں تمام علماء کا یہ اتفاق ہے کہ اسے قید نہ کیا جائے۔ ملاحظہ ہو۔ نیل الاوطار۔

فرمایا ——— "اس کی مالی مدد کرو" چنانچہ لوگوں نے اسے صدقہ دیا مگر اس سے بھی اس کا قرض پورا ادا نہیں ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا ——— "جو تمہیں مل گیا ہو وہی قبول کرو اور تمہارے لئے یہی سب کچھ ہے"

مال کی ضبطی

حضرت کعب بن مالک رضی فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کے مال پر قبضہ کر کے اسے فروخت کر دیا تاکہ اس کے ذریعے ان کا قرضہ ادا کیا جائے۔

صلح جوئی

حضرت عمرو بن عوف رضی کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمانوں کے درمیان صلح کرانی جائز ہے مگر ایسی صلح نہ ہو جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کر دے" بعض روایات میں یہ اضافہ ہے "مسلمان اپنے شرائط کے پابند ہیں مگر وہ شرط ایسی نہ ہو جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کر دے"

امانت کو ادا کرنا

حضرت عمرو بن شعیب رضی اپنے والد اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس امانت رکھی جائے اس پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے"

(۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو کوئی تمہارے پاس امانت رکھے تو اس کی امانت ادا کرو اور جو تم سے خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو"

(۳) صفوان بن امیہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے موقع پر مجھ سے زرہیں عاریۃً مانگیں، میں نے کہا ——— "اے محمدؐ! کیا آپ اسے غصب کرنا چاہتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا ——— "نہیں بلکہ قابل ضمانت عاریت پر لی جا رہی ہیں" بعد ازاں ان زرہوں کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نقصان کو ادا کرنے کے لئے تلافی کی پیش کش کی تو میں نے کہا ——— "میں آج کل اسلام کی طرف زیادہ راغب ہوں"

بنجر زمینوں کو آباد کرنا

(۱) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جو مردہ زمین کو زندہ کرے تو وہ اس کی ملکیت ہے" دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

"جو کسی زمین پر چار دیواری بنالے تو وہ اس کی ہے"

(۲) حضرت سعید بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— جس نے بنجر زمین کو آباد کیا تو وہ اس کی ہے اور کسی ظالم کا اس پر کوئی حق نہیں ہے"

(۳) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ——— "جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی کی ملکیت نہ ہو تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے"

مال غصب کرنا

(۱) حضرت سائب بن یزید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا سامان نہ تو مذاق میں چھینے اور نہ سنجیدگی سے غصب کرے اور جب کوئی اپنے بھائی کا عصا لے تو اسے واپس کر دے"

(۲) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-
"کسی مسلمان کا مال چھیننا جائز نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ خوشی سے دے دے"

(۳) حضرت سعید بن زیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی زبردستی اور ظلم سے ایک بالشت بھر زمین چھینتا ہے تو وہ قیامت کے دن ایسی سات زمینوں کا طوق گردن میں ڈالے گا۔

(۴) حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جو کوئی کسی قوم کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کاشت کرے تو اسے اس کاشت کا کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور اس کا خرچ اس کے ذمے ہے [1]

[1] کسی کی زمین کو چھین کر اس میں کاشت کرنے کے بارے میں علماء کی رائیں نیل الاوطار جلد پنجم صفحہ ۲۷۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ——— "میں نے حضرت صفیہؓ سے بڑھ کر کھانے پکانے والا نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک برتن میں کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ کے طور پر بھیجا۔ اس موقع پر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں نے وہ برتن توڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے پوچھا" یا رسول اللہؐ اس کا کفارہ کیا ہے؟" آپ نے فرمایا ——— "برتن کے بدلے میں برتن اور کھانے کے بدلے میں کھانا"

جانور کا تاوان

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے زبان جانوروں کا زخم معاف ہے[1]

(۲) حضرت حرام بن محیصہ کی روایت ہے کہ براء بن عازب کی اونٹنی ایک باغ میں داخل ہوکر تباہی مچانے لگی تو اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ باغ والوں کو دن کے وقت اس کی حفاظت کرنی چاہیئے اور رات کے وقت اگر مولیشی خرابی برپا کریں تو مولیشیوں کے مالک اس کے ذمہ دار ہیں۔

(۳) حضرت نعمان بن بشیر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جو کوئی اپنی سواری کو مسلمانوں کے عام راستے میں یا ان کے کسی بازار میں کھڑا کرے اور وہ کسی کے ہاتھ یا پاؤں کو کچل دے تو اس کا مالک ذمہ دار ہے"۔

جان ومال کے لئے جنگ

(۱) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں ——— "ایک آدمی آکر کہنے لگا ——— "یا رسول اللہ! اگر کوئی آدمی میرا مال چھیننے کے لئے آئے تو میں کیا کروں؟" آپ نے فرمایا ——— "اسے اپنا مال مت دو" اس نے کہا ——— "اگر وہ مجھ سے جنگ کرے" فرمایا۔ تم بھی اس سے جنگ کرو" وہ کہنے لگا ——— "اگر وہ مجھے قتل کر دے" فرمایا۔ "تم شہید ہوگے" اس نے کہا ——— "اگر میں اسے قتل کر دوں" فرمایا۔

---

[1] بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ جانوروں کا جرم ناقابل ضمانت ہے مگر یہ صورت اس وقت ہے جب کہ جانور نے بذات خود زیادتی کی ہو اور اس کے مالک نے اس کی پوری طرح حفاظت کر رکھی ہو۔ مگر اتفاقیہ اس سے کوئی زیادتی ہوگئی ہو۔ پوری تفصیل نیل الاوطار میں ہے۔

"وہ دوزخ میں ہوگا"

(۲) حضرت سعید بن زید فرماتے ہیں ـــــــ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ـــــ "جو اپنے مذہب کی حفاظت میں مقتول ہو وہ شہید ہے، اور جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے اور جو اپنے مال کی حفاظت میں مقتول ہو تو وہ بھی شہید ہے اور جو کوئی اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے تو وہ بھی شہید ہے،

شفعہ

(۱) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر تقسیم شدہ چیزوں میں شفعہ کا حکم دیا ہے اگر حدود متعین ہو جائیں اور راستے الگ ہو جائیں تو شفعہ نہیں ہے

(۲) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے ہر شرکت میں شفعہ کا حکم دیا ہے، خواہ وہ مکان ہو یا باغ ہو، لہذا کسی شریک کے لئے ان کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے جب تک کہ اس کا دوسرا شریک اس کی اجازت نہ دے اس صورت میں شریک اگر چاہے تو اسے لے سکتا ہے اور اگر چاہے تو چھوڑ سکتا ہے اور اگر اس کی اجازت کے بغیر فروخت کر دیا گیا تو اس کا شریک اس کا زیادہ حقدار ہے"

(۳) حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے زمینوں اور گھروں کے شرکاء کے درمیان شفعہ کا حکم دیا ہے،

(۴) حضرت سمرۃ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ـــــــ "گھر کا پڑوسی دوسروں کی بہ نسبت اس گھر کا زیادہ حقدار ہے"

(۵) حضرت شرید بن سوید فرماتے ہیں" میں نے عرض کیا ـــــ "یا رسول اللہ! ایک زمین ایسی ہے جس میں نہ کسی کی شرکت اور نہ کسی کا حصہ ہے مگر اس کا ایک پڑوسی ہے" آپ نے فرمایا ـــــــ "پڑوسی اپنے پڑوسی کی وجہ سے اس کا زیادہ حقدار ہے"

(۶) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"پڑوسی اپنے پڑوسی کے شفعہ کا زیادہ مستحق ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو اس

کا انتظار کیا جائے۔ بشرطیکہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔[1]

اولاد کے ساتھ انصاف

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "اپنے فرزندوں کے درمیان انصاف کرو"

(۲) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ بشیرؓ کی بیوی نے کہا ——— "میرے بیٹے کو ایک غلام عطا کرو اور اس کی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرو" اس پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے ——— "فلاں شخص کی لڑکی نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس کے بیٹے کو اپنا غلام عطا کردوں" آپؐ نے فرمایا ——— "کیا اس کے اور بھائی ہیں؟" انھوں نے کہا ——— "ہاں" آپؐ نے فرمایا ——— "کیا تم نے سب کو اتنا ہی عطا کیا ہے جو تم اس کو دینا چاہتے ہو؟" انھوں نے کہا ——— "نہیں" اس پر آپؐ نے فرمایا "یہ طریقہ درست نہیں ہے لہٰذا میں صرف حق بات کی شہادت دے سکتا ہوں"

ابوداؤد میں حضرت نعمان بن بشیر کی روایت پر یہ اضافہ ہے ——— "مجھے ظلم کی بات پر گواہ نہ بناؤ کیونکہ تمھارے فرزندوں کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ انصاف کرو" صحیح مسلم کی یہ روایت ہے ——— "تم بخشش میں اپنی اولاد کے درمیان ایسا ہی انصاف کرو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ وہ حسن سلوک میں تمھارے ساتھ انصاف کریں" ابوداؤد کی دوسری روایت یہ ہے ——— "ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے درمیان اسی طرح انصاف کرو جیسا کہ تمھارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے ساتھ اچھا سلوک کریں"[2]

ہبہ لوٹانا

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— جو اپنی بخشش کی ہوئی چیز کو لوٹاتا ہے تو وہ

---

[1] شفعہ کے اسباب استحقاق کے سلسلے میں علماء کے اختلافات کتب فقہ اور علامہ ابن القیم کی کتاب القیاس صفحہ ۱۸۲ اور اس کے بعد کے صفحات میں مذکور ہیں مطبوعہ ۱۳۴۶ھ

[2] نیل الاوطار حصہ ششم صفحہ ۸

ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی اپنی قے کو منہ کے اندر لوٹائے"۔

(۲) حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے ۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــــ "کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کو کوئی چیز بخشے اور پھر اسے لوٹائے، بجز والد کے کہ وہ اپنے بیٹے کو دی ہوئی چیز لوٹا سکتا ہے، وہ شخص جو دے کر وہ چیز لوٹائے، ایک ایسے کتے کی مانند ہے جو پیٹ بھر کر کھانے کے بعد قے کر دے اور پھر اس قے کو منہ میں لوٹائے

اجنبی کے لئے وصیت

(۱) حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ــــــ "اللہ نے اجازت دی ہے کہ تم اپنی وفات کے وقت اپنے تہائی مال کو اپنی نیکیاں بڑھانے کے لئے صدقہ کرو تاکہ تمہارے عمل میں اضافہ ہو"۔

(۲) حضرت سعد بن وقاصؓ فرماتے ہیں ــــــ "میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے آئے اس وقت مجھے شدید درد تھا میں نے عرض کیا ــــــ "یا رسول اللہ! میری تکلیف اور میرا درد اس حد تک پہونچ گیا ہے جو آپؐ دیکھ رہے ہیں اور میں مالدار بھی ہوں اور میری وارث صرف میری بیٹی ہے کیا میں اپنے دو تہائی مال کو صدقے میں دیدوں" آپؐ نے فرمایا ــــــ "نہیں" میں نے کہا ــــــ "آدھا مال" آپؐ نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ اس کے بعد میں نے کہا ــــــ "تہائی مال" آپ نے فرمایا ــــــ "ہاں تہائی مال زدیا جا سکتا ہے، مگر تہائی مال بھی بہت ہے اگر اپنے وارثوں کو دولت مند چھوڑ دو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں محتاج چھوڑ دو۔ اور وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کریں"۔

(۳) حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی :-

"اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کا حق رکھا ہے لہذا وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہے [1]

[1] وصیت کے بارے میں علماء کے خیالات کی تفصیل کے لئے (باقی صفحہ ۱۷۹)

(۴) حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے بجز اس کے کہ تمام وارث اس کی اجازت دے دیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۷۸) ملاحظہ ہو نیل الاوطار جلد ششم صفحات ۳۳، ۳۵ مطبوعہ ۱۳۴۵ھ

حدیث کے عائلی قوانین

نکاح کی ترغیب

(۱) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو کوئی نکاح کی استطاعت رکھتا ہو تو وہ شادی کرے کیونکہ نکاح کرنا نظروں کو نیچی رکھتا ہے اور عصمت کی حفاظت کرتا ہے اور جس کے لئے نکاح کرنا ممکن نہ ہو تو وہ روزے رکھے کیونکہ اس سے اس کی خواہش دور ہوگی۔

(۲) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے ایک نے کہا ——— "میں نکاح نہیں کروں گا" دوسرے نے کہا "میں نمازیں پڑھوں گا اور نہیں سوؤں گا" کسی اور نے کہا ——— "میں لگاتار روزے رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا۔" ——— یہ باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہونچ گئیں اس وقت آپؐ نے فرمایا ——— "لوگ اس طرح کی باتیں کیوں کیا کرتے ہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادیاں بھی کرتا ہوں لہٰذا جو میری سنت سے منہ موڑتا ہے اس کا مجھ سے تعلق نہیں ہے"

(۳) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کرنے کا حکم دیتے تھے اور دنیا سے کنارہ کشی کی بہت مخالفت کرتے تھے آپ فرماتے تھے ——— "تم اولاد پیدا کرنے والی اور محبت کرنے والی عورت سے شادی کرو کیونکہ میں قیامت کے دن دوسرے پیغمبروں کے سامنے تمھاری کثرت پر فخر کروں گا۔"

(۸) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عورت کے ساتھ چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، مال، حسب ونسب حسن وجمال اور دینداری لہٰذا تم دیندار عورت کو حاصل کرو"

منگیتر کو دیکھنا

(۱) حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے منگنی کی آپؐ نے فرمایا تم اسے دیکھو کیونکہ اس طرح تم دونوں کے درمیان موافقت اور محبت پیدا ہوگی"

(۲) حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "مومن مومن کا بھائی ہے لہٰذا کسی مومن کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی خرید وفروخت پر اپنا معاملہ کرے اور نہ اپنے بھائی کی منگنی پر اپنی منگنی کا پیغام دے جب تک کہ وہ اس رشتے کو نہ چھوڑ دے

منکوحہ کی رضامندی حاصل کرنا

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے —
"جو کنواری عورت نہ ہو، وہ اپنے سرپرست کی بہ نسبت اپنی ذات کی خود مختار ہے، مگر کنواری لڑکی سے بھی نکاح کی رضامندی حاصل کی جائے اور اس کا خاموش رہنا ہی اس کی اجازت ہے"

(۲) حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ——— "بیوہ عورت کی شادی نہ کی جائے جب تک کہ اس کی رضامندی حاصل نہ کی جائے اور کنواری لڑکی سے بھی اجازت حاصل کی جائے" لوگوں نے پوچھا۔ اس کی اجازت کی صورت کیا ہوگی؟" آپ نے فرمایا ——— "اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے"

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ——— "میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا ——— "کیا عورتوں سے بھی ان کے نکاح کے بارے میں اجازت حاصل کی جاتی ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں" میں نے کہا ——— اگر کنواری لڑکی سے اجازت مانگی جائے تو وہ شرماتی ہے" آپ نے فرمایا ——— "اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے"

(۴) حضرت خنسار بنت خدام الانصاریہ کی روایت ہے کہ جب وہ کنواری تھیں

اس وقت ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا مگر یہ نکاح انھیں ناپسند تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نکاح فسخ کر دیا۔

(۵) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے بیان کیا کہ اس کے باپ نے زبردستی اس کا نکاح کر دیا تھا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار دے دیا کہ وہ نکاح باقی رکھے یا نہ رکھے۔

(۶) حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عورتوں سے ان کی بیٹیوں کے بارے میں مشورہ کیا کرو۔"

نکاح کے احکام

حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ ــــ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ "نکاح ولی اور دو معتبر گواہوں کے بغیر نہیں ہوتا ہے۔"

(۲) حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ــــ "ایک لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا ــــ "میرے باپ نے میری شادی اپنے بھتیجے کے ساتھ کر دی ہے تاکہ وہ میرے ذریعے اپنی کمتری کی تلافی کرے۔" اس پر آپؐ نے اسے اپنے معاملے کا اختیار دے دیا۔" اس لڑکی نے کہا ــــ "میں نے اس فعل کی اجازت دے دی ہے جو میرے باپ نے کیا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ عورتوں کو بتاؤں کہ والدین کو اس معاملہ کا اختیار نہیں ہے۔"

(۳) حضرت عائشہؓ اور حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ــــ "میں اعلیٰ حسب ونسب کی خواتین کو صرف ان کے ہم پلہ مردوں سے شادی کرنے کی اجازت دوں گا[۱]

(۴) حضرت ابوحاتم المزنی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] کفو اور ہمسری کے بارے میں مجتہدین کرام کے خیالات کتب فقہ اور نیل الاوطار کی جلد ششم صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ کریں۔

نے فرمایا ——— "جب تمھارے پاس وہ شخص آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمھیں پسند ہوں تو اس کا نکاح کردو اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین میں بہت بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا"

شرائط نکاح

(۱) حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت ہے کہ ——— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— سب شرائط سے زیادہ قابل ایفاء وہ شرائط ہیں جن کی بدولت تم کسی عورت کو اپنی بیوی بناتے ہو"

(۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ پھوپھی، بھتیجی یا خالہ بھانجی کا ایک ہی مرد کے ساتھ نکاح کیا جائے"

(۳) ضحاک بن فیروز اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد فرماتے ہیں ——— "جب میں مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں دو بہنیں تھیں لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ان میں سے کسی ایک کو طلاق دیدوں" ترمذی کے الفاظ یہ ہیں ——— "آپؐ نے فرمایا ——— تم ان دونوں میں سے جس کو چاہو پسند کرلو"

(۴) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں "جب غیلان الثقفی مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں وہ سب ان کے ساتھ مسلمان ہوگئیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ان میں سے چار کا انتخاب کرلیں"

زوجین کے حقوق

(۱) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ——— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— عورت پسلی کی مانند ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے لگو تو تم اسے توڑ دوگے اور اگر تم اسے اس کی حالت پر چھوڑ دوگے تو اس کے ٹیڑھا پن ہونے کے باوجود اس سے فائدہ اٹھاؤگے"

دوسری روایت ہے ——— "عورتوں سے اچھا سلوک کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور پسلی کا سب سے اونچا حصہ سب سے زیادہ ٹیڑھا ہوتا ہے لہٰذا اگر تم اسے سیدھا کرنے لگ جاؤگے تو تم اسے توڑ دوگے اور اگر تم نے اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا وہ ٹیڑھا ہی رہے گا، لہٰذا عورتوں سے اچھا سلوک کرو"

(۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـ

"کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ رکھے اگر اسے اس عورت کی کوئی ایک عادت پسند نہ ہو تو دوسری عادت ضرور پسند آئے گی"

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کامل ترین مومن وہ ہے جس کے اخلاق بہترین ہوں اور سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورت کے لئے سب سے اچھا ہو"

(۴) حضرت عمرو بن الاحوصؓ فرماتے ہیں کہ وہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ نے حمد و ثنا کے بعد یہ ارشاد فرمایا

"عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو کیونکہ وہ تمھاری مددگار ہیں تمھارا ان پر کسی قسم کا اختیار نہیں ہے بجز اس صورت کے کہ وہ کھلم کھلا بدکاری کا اظہار کریں، اگر وہ ایسا کریں تو انھیں اپنے بچھونوں سے جدا کر دو اور انھیں ہلکے طریقے سے زدوکوب کرو اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی دوسرا راستہ نہ تلاش کرو کیونکہ جس طرح ان عورتوں پر تمھارے حقوق ہیں اس طرح ان عورتوں کے بھی تم پر حقوق ہیں، عورتوں پر تمھارا حق یہ ہے کہ وہ تمھارے بچھونوں پر اُن کو نہ بٹھائیں جنھیں تم پسند نہیں کرتے ہو، اور ان لوگوں کو تمھارے گھروں میں آنے کی اجازت نہ دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور تم پر ان کا یہ حق ہے کہ تم کھلانے اور پہنانے میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو"

(۵) حضرت معاویہ القشیری کی روایت کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے دریافت کیا ——— "عورت کا اپنے شوہر پر کیا حق ہے؟" آپ نے فرمایا ——— "جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ اور اس کے چہرہ پر نہ مارو اور نہ اسے برا کہو اور (اگر اس سے جدا ہونے کی ضرورت پیش آئے تو) گھر ہی میں اس سے الگ رہو [۱]

[۱] مراد ہے کہ اگر کسی بات پر اس سے رنجش ہو جائے تو اس سے الگ رہے مگر وہاں سے دوسرے گھر نہ جائے یا اسے دوسرے گھر نہ منتقل کیا جائے ملاحظہ ہو نیل الاوطار

(۶) حضرت عائشہ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔۔۔ "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہترین ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے زیادہ اچھا سلوک کرتا ہوں"

بیویوں کے ساتھ انصاف

(۱) حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ ۔۔۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔۔۔ "جس کسی کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہو تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں ہوگا کہ اس کا ایک ہونٹ نیچے کی طرف کھنچتا ہوا اور گرتا ہوا ہوگا" [1]

(۲) حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں ۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عورتوں کی باری کی) تقسیم میں انصاف کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے ۔۔۔ "اے اللہ! جس چیز میں میرا اختیار ہے اس میں یہ میری منصفانہ تقسیم ہے اور جو میرے اختیار میں نہ ہو بلکہ تیرے اختیار میں ہو (یعنی دلی محبت کسی ایک بیوی کے ساتھ ہو جیسا کہ آپؐ کو حضرت عائشہ رضؓ سے محبت تھی) اس میں مجھے ملامت نہ کر"

(۳) حضرت عائشہ رضؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے لئے روانہ ہوتے تھے تو اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی کرتے تھے اور قرعہ میں جن کا حصہ نکلتا تھا انھیں سفر میں ساتھ لے جاتے تھے،

طلاق

(۱) حضرت لقیط بن صبرۃ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے عرض کیا۔ "یارسولؐ اللہ! میری بیوی بری ہے" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔ "اسے طلاق دیدو" میں نے کہا ۔۔۔ "میرا اس سے تعلق بہت عرصے سے ہے اور اس کی اولاد بھی ہے" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔ "تم اسے ہدایت کرو اگر اس میں کچھ شرافت ہوگی تو وہ (تمہاری ہدایت پر) عمل کرے گی مگر تم اپنی بیوی کو ایسا نہ مارو جیسا تم اپنی لونڈی کو مارتے ہو"

(۲) حضرت ثوبان رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

[1] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کھلانے پہنانے اور ان کاموں میں جو اس کے اختیار میں ہوں مساوات بہت ضروری ہے،

(۳) حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"سب سے بری حلال چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے"

طلاق کی بہتر صورت

حضرت ابن عمرؓ نے ایک دفعہ حالت حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ ناراض ہو کر فرمانے لگے —— "اسے چاہیئے کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے اور پاک وصاف ہونے تک اسے اپنے پاس رکھے اس کے بعد جب ماہواری ایام آنے کے بعد وہ دوبارہ پاک وصاف ہو تو اس موقع پر اگر وہ طلاق دینا چاہے تو بیوی کے پاس جانے سے پیشتر طلاق دے، یہی وہ عدت ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے" ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں "یہی وہ صورت ہے جس کے مطابق اللہ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے"

(۴) حضرت عکرمہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا —— "طلاق کی چار صورتیں ہیں، ان میں سے دو صورتیں حرام ہیں اور دو صورتیں حلال ہیں، جو دو صورتیں حلال ہیں وہ یہ ہیں کہ مرد، عورت کو اس کے پاس جانے سے پیشتر اس وقت طلاق دے جب کہ وہ ایام ماہواری سے فارغ ہو، یا اس حالت میں طلاق دے جب عورت کا حمل اچھی طرح ظاہر ہو جائے۔ طلاق کی دو حرام صورتیں یہ ہیں کہ مرد، عورت کو حیض کی حالت میں طلاق دے یا جماع کے بعد طلاق دے مگر ایسی صورت میں اسے نہیں معلوم ہوگا کہ اسے حمل ہے یا نہیں ہے؟"

(۵) حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ اور دادا کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "فرزند آدم کی نذر اس چیز پر نہیں ہو سکتی جو اس کی ملکیت میں نہ ہو اسی طرح اس چیز کو آزاد کرنے کا سوال نہیں پیدا ہو سکتا جو اس کی ملکیت میں نہ ہو، نیز نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہو سکتی"

(۶) حضرت مسور بن مخرمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہو سکتی اور نہ ملکیت کے بغیر آزاد کیا جا سکتا ہے"

خلع

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جمیلہ بنت سلول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی —— "خدا کی قسم!

میں ثابت رضؓ کی دینداری اور اخلاق کی شکایت نہیں کرتی ہوں لیکن اسلام میں رہ کر کفر کو ناپسند کرتی ہوں، میں بغض کی وجہ سے اسے برداشت نہیں کر سکتی " آپؐ نے فرمایا ———" کیا تم اس کا باغ واپس کر دو گی؟" اس نے کہا ———" ہاں" اس پر آپؐ نے ثابت رضؓ کو حکم دیا کہ وہ اس سے صرف اپنا باغ واپس لے اور اس سے زیادہ نہ لے "

تین طلاقیں

حضرت عائشہ رضؓ کی روایت ہے کہ رفاعۃ القرظی کی بیوی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی ———" میں رفاعۃ کے نکاح میں تھی اس نے مجھے تین طلاقیں دیں اس کے بعد میں نے عبدالرحمن بن الزبیر سے نکاح کیا مگر وہ کپڑے کی جھالر کی طرح لٹکا ہوا ہے (ناکارہ ہے)" آپؐ نے فرمایا ———" کیا تم چاہتی ہو کہ تم رفاعۃ کے نکاح میں دوبارہ آجاؤ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا جب تک تم اس کا ذائقہ نہ چکھو اور وہ تمہارا ذائقہ نہ چکھے"

حلالہ

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور جس شخص کے لئے حلالہ کیا جائے دونوں پر لعنت بھیجی ہے "

(۲) حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ———" کیا میں بتاؤں کہ کرایہ کا سینڈھا کون سا ہوتا ہے؟" لوگوں نے کہا ——— ضرور یا رسول اللہ فرمائیے " آپ نے فرمایا ———" وہ حلالہ کرنے والا ہے۔ اللہ نے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے "

حاملہ کی عدت

(۱) حضرت ابن مسعودؓ نے اس حاملہ عورت کے بارے میں جس کا شوہر مر چکا ہو، یوں فرمایا ———" کیا تم اس پر سختی کرنا چاہتے ہو اور اس کی سہولت نہیں دیتے ہو حالانکہ چھوٹی سورہ نساء (سورۃ طلاق) طویل سورۃ النساء کے بعد نازل ہوئی ہے جس میں یہ حکم ہے ———" حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے "

(۲) حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا ———" یا رسول اللہ! حاملہ

عورتوں کی عدت وضع حمل تک، کیا تین طلاقوں والی عورت، اور جس کا شوہر وفات پا گیا ہو، دونوں کے لئے ہے؟" آپ نے فرمایا ——— "یہ عدت تین طلاقوں والی عورت اور جس کا شوہر مر گیا ہو، دونوں کے لئے ہے"

رضاعی رشتوں کی حرمت

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ نے فرمایا ——— "یہ رشتہ میرے لئے حلال نہیں ہے کیونکہ وہ میری رضاعی بھتیجی ہے اور جو رشتہ نسب کی رو سے حرام ہو، اسی قسم کا رضاعی رشتہ بھی حرام ہے"

(۲) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ نے وہ سب رضاعی رشتے حرام کئے ہیں جو نسب سے حرام ہیں"

بیوی کا نان نفقہ

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے نفقہ کے بارے میں فرمایا ——— "خرچ کی ابتدار اپنی ذات سے کرو اگر (ذاتی اخراجات سے) کچھ بچے تو وہ تمہارے گھر والوں کے لئے ہے، اگر اہل وعیال سے بچے تو وہ تمہارے رشتہ داروں کے لئے ہے اور اگر رشتہ داروں سے بچے تو ادھر ادھر کے لئے ہے (صدقہ کرو)

(۲) حضرت معاویہ القشیری فرماتے ہیں، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا ——— "آپ ہماری عورتوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟" آپ نے فرمایا ——— "جو تم کھاتے ہو اسی میں سے تم کھلاؤ اور جیسا تم کپڑا پہنتے ہو ایسا ہی تم ان کو پہناؤ اور انھیں نہ مارو اور نہ انھیں برا بھلا کہو"

(۳) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ہندؔ نے کہا ——— "یا رسول اللہ! ابوسفیان بہت کنجوس آدمی ہے اور مجھے اتنا نہیں دیتا ہے جو مجھے اور میری اولاد کے لئے کافی ہو اس لئے میں اس کی لاعلمی میں کچھ زیادہ نکال لیتی ہوں" آپ نے فرمایا ——— "اتنا معقولیت کے ساتھ لے لیا کرو جو تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے کافی ہو" (ہند ابوسفیان کی بیوی تھیں)

بچے کی کفالت

حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کے

بارے میں حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زیدؓ میں جھگڑا ہوا حضرت علیؓ نے کہا —— "میرا اس پر زیادہ حق ہے کیونکہ وہ میری چچا زاد بہن ہے" حضرت جعفرؓ نے کہا —— "وہ میری چچا زاد بہن بھی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے" حضرت زیدؓ نے کہا —— "وہ میری بھتیجی ہے" اس پر آپؐ نے اس کی خالہ کے حق میں فیصلہ دیا اور فرمایا —— "خالہ ماں کی مانند ہے"

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے "ایک عورت نے کہا۔ "یا رسولؐ اللہ! میرا شکم میرے بیٹے کا مقام تھا اور میری آغوش سے اس کو تسکین پہونچتی ہے اور میری چھاتی اس کے لئے مشکیزہ کا کام دیتی ہے مگر اس کا باپ چاہتا ہے کہ وہ اس کو مجھ سے چھین لے" آپ نے فرمایا —— "تم اس کی زیادہ حقدار ہو جب تک کہ تمہارا کسی دوسرے سے نکاح نہ ہو جائے" امام احمد نے اسے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں یہ الفاظ ہیں —— اس کے باپ نے مجھے طلاق دیدی ہے اور وہ اس لڑکے کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے"

میراث کے احکامِ نبویؐ

فرائض

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "(بنیادی) علوم تین ہیں اور اس کے علاوہ علوم فالتو ہیں (۱) صاف اور غیر مشتبہ آیات (۲) سنت (۳) عادلانہ فرائض

میراث کا طریقہ

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "مقررہ حصے (فرائض) حصہ داروں میں تقسیم کردو اور جو باقی بچے وہ سب سے قریبی مرد کے لئے ہے"

(۲) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں —— حضرت سعد بن الربیعؓ کی بیوی سعدؓ سے اپنی دو بیٹیوں کو لے کر آئیں اور کہنے لگیں —— "یا رسول اللہ! یہ سعد بن الربیعؓ کی دو بیٹیاں ہیں ان کا باپ آپ کی جنگِ اُحد میں شہید ہو گیا ہے اور ان کے چچا نے ان کے مال پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لئے کوئی مال نہیں چھوڑا ہے اور

ماں کے بغیر ان کا نکاح نہیں ہو سکتا " آپؐ نے فرمایا ـــــــ " اللہ اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا " اس کے بعد میراث کی آیت نازل ہوئی تو آپ نے ان لڑکیوں کے چچا کو بلا بھیجا اور فرمایا ـــــــ " تم سعدؓ کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی حصہ دو اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دو اور جو باقی رہے وہ تمہارا ہے "

بہنیں اور بیٹیاں

حضرت ھزیل بن شرجیل فرماتے ہیں ـــــــ " حضرت ابوموسیٰؓ سے (میراث کے بارے میں) یہ پوچھا گیا کہ ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن ہے " انہوں نے فرمایا " بیٹی کے لئے نصف حصہ ہے اور بہن کے لئے نصف ہے، تاہم تم ابن مسعودؓ کے پاس جاؤ (اور یہ مسئلہ دریافت کرلو) لہذا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مسئلہ دریافت کیا گیا اور حضرت ابوموسیٰؓ کا فیصلہ بھی بتایا گیا۔ انھوں نے فرمایا ـــــــ " اگر یہ بات ہے تو میں گمراہ ہوں اور ہدایت یافتہ نہیں ہوں " میں وہی فیصلہ کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے، بیٹی کا آدھا حصہ ہے اور پوتی کا چھٹا حصہ ہے تاکہ دو تہائی حصہ مکمل ہو جائے اور باقی جو رہے وہ بہن کا حصہ ہے " امام احمد اور بخاری میں یہ اضافہ ہے ـــــــ " جب ہم ابوموسیٰؓ کے پاس آئے تو ہم نے حضرت ابن مسعودؓ کے فیصلے سے انھیں مطلع کیا تو انھوں نے فرمایا ـــــــ " جب تک تم میں یہ عالم و فاضل موجود ہوں، اس وقت تک مجھ سے نہ پوچھا کرو "

(۲) حضرت اسود کی روایت ہے کہ معاذ بن جبل نے بہن اور بیٹی کو وارث بنایا اور ان میں سے ہر ایک کو نصف حصہ دیا۔ اس وقت وہ یمن میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ تھے "

دادی کی میراث

حضرت قبیصہ بن ذویب فرماتے ہیں ـــــــ " ایک دادی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور اپنی میراث مانگنے لگی آپؓ نے فرمایا ـــــــ کتاب اللہ میں تمھارے لئے کوئی حصہ نہیں ہے اور مجھے سنت نبویؐ کا بھی اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے، تم جاؤ میں لوگوں سے پوچھ کر بتاؤں گا " چنانچہ انھوں نے لوگوں سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا " میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا جب کہ

آپؐ نے (دادی کو) چھٹا حصہ عطا فرمایا تھا"۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ـــــ "کیا کوئی دوسرا آدمی تمہارے ساتھ ہے"۔ اس پر حضرت محمد بن مسلم الانصاری کھڑے ہوئے اور انھوں نے مغیرہ بن شعبہؓ کی تائید کی۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اس کا حصہ مقرر کر دیا۔ بعد ازاں ایک دوسری دادی حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور اپنی میراث مانگنے لگی۔ آپؓ نے فرمایا ـــــ "کتاب اللہ میں تمہارے لئے کوئی حصہ نہیں ہے البتہ وہی چھٹا حصہ ہے اگر تم دو ہو تو وہ تم دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائیگا اور اگر ایک مرجائے تو وہ صرف ایک کے لئے ہے"۔

قاتل اور دیت

(۱) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ـــــ "قاتل میراث کا حقدار نہیں ہے"۔

(۲) حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں ـــــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا۔ کہ دیت میراث کی طرح مقتول کے وارثوں کے درمیان ان کے مقررہ حصوں کی طرح تقسیم ہوگی"۔

کافر وارث نہیں

حضرت اسامہ بن زیدؓ کی روایت ہے کہ ـــــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا۔ اور نہ کافر مسلمانوں کا وارث بن سکتا ہے"۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ـــــ "دو مختلف مذاہب کے اشخاص ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے"۔

لاوارث

حضرت مقدام بن معدی کرب کی روایت ہے کہ ـــــ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا میں وارث ہوں، اس کی طرف سے دیت دوں گا اور اس کا وارث بنوں گا۔ اور جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا ماموں اس کا وارث ہے اس کی طرف سے دیت دے گا اور اس کا وارث بنے گا۔"

جرم و سزا کے احکامِ نبویؐ

قصاص حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
کہ ان تین باتوں کے علاوہ مسلمان کا قتل کسی صورت سے جائز نہیں ہے
(۱) شادی شدہ زانی ہو تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔ (۲) کوئی شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا (۳) وہ شخص جو اسلام سے مرتد ہو کر اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرے تو یا تو قتل کیا جائے گا یا سولی پر لٹکایا جائے گا یا ملک سے جلا وطن کیا جائے گا۔[1]

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کسی کا کوئی آدمی مارا جائے تو اسے دو باتوں میں سے کسی ایک کا اختیار حاصل ہے یا تو وہ (فدیہ) خون بہا حاصل کرے یا (قاتل کو) قتل کرے" ترمذی کے الفاظ یہ ہیں —— "یا وہ معاف کرے یا قتل کرے"

(۳) حضرت ابو شریح الخزاعیؓ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا —— "جس کسی کے ہاں کوئی خون ہو جائے یا زخمی ہو جائے تو اسے تین باتوں میں سے کسی ایک چیز کا اختیار ہے (۱) قصاص لیا جائے (۲) دیت دی جائے (۳) معاف کر دیا جائے۔ اگر کوئی چوتھی چیز کا ارادہ کرے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو"

سزا میں مساوات حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "مسلمانوں کے خون (قصاص و دیت) میں برابر ہیں، اور ان کا قریب ترین فرد ان کا ذمہ دار ہے اور وہ سب کے سب دوسروں کے خلاف متحد رہتے ہیں، لہٰذا کوئی مومن کافر کے

---

[1] اس عبارت کی حدیث کتاب سبل السلام حصہ سوم مطبوعہ ۱۳۴۴ھ صفحہ ۳۱ میں موجود ہے

بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی معاہد ذمی کو اس کے معاہدہ کے زمانے میں قتل کیا جائے گا[1]

ذمی کی حفاظت

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "جس نے کسی ایسے (غیر مسلم) ذمی کو قتل کیا جس کا اللہ اور اس کے رسول نے معاہدہ کے رو سے ذمہ لیا ہو تو اس نے اللہ کی ذمہ داری کو توڑا ہے اور وہ جنت کی خوشبو کو نہیں سونگھ سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس خریف کی مسافت سے محسوس ہوگی ۔"

غلطی کا قتل

(۱) عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "دیکھو جو خطا اور غلطی سے مارا جائے وہ بھی قتلِ عمد کے مشابہ ہے اور جو کوڑے یا عصا سے مقتول ہو اس کی دیت ایک سو (۱۰۰) اونٹ ہیں جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں اور ان کے پیٹ میں بچے ہوں۔"

(۲) حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "مشابہ قتل عمد[2] کی دیت بھی قتل عمد کی طرح سخت ہے، مگر اس کے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ شیطان لوگوں کے درمیان گھس جائے اور کسی دشمن کے بغیر ہتھیار اٹھائے خون ریزی ہو جائے ۔"

شریکِ قتل

(۱) حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "جب کوئی آدمی کسی شخص کو پکڑے رکھے اور دوسرا اس کو قتل کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو قید کر دیا جائے گا۔"

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو جان بوجھ کر قتل کیا اور دوسرے نے اس کو پکڑے رکھا۔ انھوں نے فرمایا قاتل کو قتل کیا جائے اور دوسرے

---

[1] سبل السلام صفحہ ۲۴۳ جلد سوم

[2] مشابہ قتل عمد وہ ہے، کہ ایسی چیزوں کو سے کسی کو مارا جائے جس سے قتل واقع نہ ہوتا ہو، جیسے لاٹھی اور کوڑے ،

شخص کو زندگی بھر قید رکھا جائے یہاں تک کہ وہ مرجائے"۔

دانتوں کا قصاص

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ان کی پھوپھی رُبیّع بنت النضر نے ایک لونڈی کے دانت توڑ دیئے۔ اس کے بعد انھوں نے معافی کی درخواست کی مگر اس کے وارثوں نے انکار کردیا۔ اس کے بعد انھوں نے تاوان پیش کیا۔ تو اس پر بھی نہ مانے آخر کار وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور قصاص پر اصرار کرتے رہے، اس پر آپ نے قصاص کا حکم دیا تو (ان کے بھائی) انس بن النضرؓ نے کہا ——— "یا رسول اللہ! کیا آپ رُبیّع کے دانت توڑیں گے۔ نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول برحق بنا کر بھیجا ہے، اس کے دانت نہیں توڑے جائیں گے" اس پر آپ نے فرمایا ——— "اے انس! اللہ کی طرف سے قصاص فرض ہے" آخر کار وہ لوگ رضامند ہوگئے اور انھوں نے معاف کردیا۔ اس پر آپ نے فرمایا ——— "اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ جو قسم کھاتے ہیں، اللہ ان کی قسم پوری کرتا ہے"۔

خودکشی کی مذمت

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "جو کسی لوہے کے آلے سے خودکشی کرے تو اس کے ہاتھ کا لوہا دوزخ کی آگ میں اس کا پیٹ پھاڑتا رہے گا، اور وہاں وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور جس نے زہر کے ذریعے خودکشی کی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں زہر پیتا رہے گا۔ اور جس نے پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا کر خودکشی کی ہو تو وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ پہاڑ سے اپنے آپ کو گراتا رہے گا اور وہاں اسی حالت میں ہمیشہ رہے گا۔"

مختلف اعضاء کی دیت

حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اپنے باپ اور دادا کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر تھا:

"جس نے کسی مومن کو ناحق قتل کیا ہو اور اس کا ثبوت ہو تو اس کے لئے قصاص ہے بجز اس صورت کے کہ مقتول کے سرپرست (دیت کے لئے) رضامند ہوجائیں، جان کی دیت ایک سو اونٹ ہیں اور اگر پوری ناک کاٹی جائے تو اس میں بھی دیت ہے اور

زبان، ہونٹوں، خصیوں، آلہ تناسل، پشت اور دونوں آنکھوں پر بھی دیت ہے، ایک پاؤں کی نصف دیت ہے اور دماغ کی چوٹ کی ایک تہائی دیت ہے اور وہ زخم جو اندر تک پہونچ جائے اس میں ایک تہائی دیت ہے اور چھوٹی ہڈیوں کے توڑنے پر پندرہ[۱۵] اونٹ ہیں، اور ہاتھ اور پاؤں کی ایک انگلی ٹوٹنے پر دس[۱۰] اونٹ ہیں، اور دانت ٹوٹنے پر پانچ اونٹ ہیں اور ایسا زخم جس سے بڑی ہڈی ظاہر ہو جائے اس پر پانچ اونٹ ہیں، اور عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جا سکتا ہے اور جن کے پاس سونا ہو، ان پر ہزار دینار ہیں "

دیت کی مختلف اجناس

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "غلطی اور خطا سے قتل کرنے کی دیت میں مکمل تین سالہ بیس[۲۰] اونٹنیاں، اور چار سالہ بیس[۲۰] اونٹنیاں، اور ایک سالہ بیس اونٹنیاں، دو سالہ بیس[۲۰] اونٹنیاں اور ایک سالہ بیس[۲۰] اونٹ شامل ہیں۔

(۲) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ والوں پر ایک سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکری بھیڑ والوں دو ہزار بھیڑ بکریاں اور پوشاک والوں پر دو سو پوشاکیں مقرر فرمائیں [۱]

(۳) حضرت عقبہ بن اوس ایک صحابیؓ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر خطبہ میں فرمایا ـــــ "دیکھو جو کوئی خطا سے کوڑے، لاٹھی اور پتھر سے مر جائے تو ایسے مقتول کی دیت بھی سخت ہے جو سو[۱۰۰] اونٹ ہے جن میں سے چالیس مختلف عمر کی حاملہ اونٹنیاں ہوں گی۔

دیت دینے کی ذمہ داری

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ صحیح طور پر منقول ہے کہ آپ نے حاملہ مقتولہ کی دیت اور اس کے پیٹ کے بچے کی دیت قاتل کے گروہ پر مقرر فرمائی تھی [۲]

---

[۱] نیل الاوطار حصہ ہفتم صفحہ ۶۵، ۶۶

[۲] ملاحظہ ہو نیل الاوطار حصہ ہفتم صفحات ۶۸ - ۶۹ - حضرت اصم اور اکثر خوارج سے (باقی صفحہ ۱۹۷)

(۲) حضرت عمرؓ نے فرمایا ——— عمد، غلام اور صلح و اعتراف کی صورتوں میں دیت دینے والی جماعت دیت نہیں دے گی" امام زہری کا قول ہے ——" سنت کا فیصلہ یہ ہے کہ قاتل کے وہ افراد خاندان جو دیت ادا کرتے ہیں، قتل عمد کی دیت کے ذمہ دار نہیں ہیں، لیکن اگر وہ چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں"

عطائی طبیب پر تاوان

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ اور دادا کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو طبیب بن جائے اور علم طب میں اس کی شہرت نہ ہو اور وہ کسی کی جان کو بھی نقصان پہونچائے تو وہ اس کا ذمہ دار ہے [1]

بدکار کی سزا

حضرت ابوہریرہؓ اور زید بن خالدؓ دونوں کی روایت ہے کہ ایک بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا ———
"یا رسول اللہ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق میرے معاملے میں فیصلہ دیجئے" اس کا مخالف جو اس سے زیادہ سمجھدار تھا کہنے لگا ——
"ہاں آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر کے مجھے صادر فرمائیے"
آپ نے فرمایا ——" اصل حقیقت بیان کرو" وہ کہنے لگا ——" میرا فرزند اس کا نوکر تھا اس نے اس کی عورت کے ساتھ زنا کیا اس پر مجھے بتایا گیا کہ میرے بیٹے کو سنگساری کی سزا ملے گی اس پر میں نے اسے ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی کا فدیہ دے دیا۔ اس کے بعد جب میں نے اہل علم سے دریافت کیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کی جلاوطنی ہو گی

(بقیہ صفحہ ۱۹۶) یہ منقول ہے کہ خطا کے قتل کی دیت قاتل کے مال میں سے ہونی چاہئیے اور وہ اس کی جماعت اور خاندان کے لئے لازم نہیں ہے حضرات علقمہ، ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ کی یہ رائے ہے کہ محض غلطی کی صورت میں خاندان پر دیت لازم ہے مگر قتل عمد اور مشابہ عمد میں قاتل کے مال میں سے دیت دی جائے گی۔

[1] ملاحظہ ہو کتاب سبل السلام حصہ سوم

اور اس عورت کو سنگسار کیا جائے گا۔" آپؐ نے فرمایا ــــ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تم دونوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا ــــ لونڈی اور بکریاں لوٹائی جائیں گی اور تمہارے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اے انیسؓ (جو قبیلہ اسلم کا آدمی تھا) اس عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اقرار کرے تو اسے سنگسار کردو"، چنانچہ وہ اس عورت کے پاس گیا اور اس نے اقرار کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اسے سنگ سار کر دیا گیا۔

زنا کا بار بار اقرار

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز بن مالک سے فرمایا ــــ "کیا جو بات مجھے معلوم ہوئی ہے وہ صحیح ہے؟" اس نے پوچھا ــــ "آپ کو کیا خبر معلوم ہوئی ہے؟" آپؐ نے فرمایا ــــ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے فلاں خاندان کی لونڈی کے ساتھ زنا کیا ہے؟" اس نے کہا ــــ "ہاں" اور اس نے چار مرتبہ اقرار کیا اس پر آپؐ کے حکم کے مطابق اسے سنگسار کیا گیا" ایک دوسری روایت میں ہے، ماعز بن مالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھوں نے دو مرتبہ زنا کا اقرار کیا۔ آپؐ نے انھیں دھتکار دیا۔ اس کے بعد وہ پھر آیا اور پھر دو مرتبہ زنا کا اقرار کیا تو آپؐ نے فرمایا ــــ "تم نے اپنے برخلاف چار مرتبہ اقرار کیا ہے، لہٰذا اسے لے جاکر سنگسار کردو"

ملزم کو شبہ کا فائدہ

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ "اگر میں ثبوت کے بغیر کسی کو سنگسار کرتا تو فلاں عورت کو ضرور سنگسار کرتا کیونکہ اس کی گفتگو، وضع قطع اور اس کے پاس آنے والے لوگوں کی وجہ سے مجھے اس پر شبہ ہو گیا ہے"

(۲) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ "تم مسلمانوں کو جہاں تک ممکن ہو، حدود شرعیہ (سزاؤں) سے بچاؤ اگر ملزم کے لئے سزا سے نکلنے کی کوئی صورت ہو تو اسے چھوڑ دو کیونکہ اگر حاکم غلطی سے معاف کردے تو یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے"۔ ترمذی

نے یہ روایت کرکے یہ بتایا ہے کہ یہ حدیث موقوف و منقول ہے اور اسی طرح کی روایت زیادہ صحیح ہے

حاملہ اور بیمار کے لئے رعایت

(۱) حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے والد کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قبیلہ ازد میں سے غامد خاندان کی ایک عورت آئی اس نے کہا ——— "یا رسول اللہ! مجھے پاک وصاف کیجئے" آپ نے فرمایا ——— "تجھ پر افسوس ہے واپس چلی جا اور اللہ سے توبہ استغفار کر" اس نے کہا ——— "میرا خیال ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ مجھے بھی لوٹا دیں۔ جس طرح آپ نے ماعز بن مالک کو لوٹایا تھا" اس پر آپ نے فرمایا ——— "کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ وہ زنا کی وجہ سے حاملہ ہے"، آپ نے فرمایا ——— "کیا تو وہی ہے؟" اس نے کہا ——— "ہاں" اس پر آپ نے فرمایا کہ توقف کرو یہاں تک کہ تیرا وضع حمل ہو جائے"، چنانچہ ایک انصاری شخص اس کی خبر گیری کرتا رہا یہاں تک کہ اسے وضع حمل ہو گیا اس کے بعد وہ شخص آپ کے پاس آکر کہنے لگا "اس غامدیہ عورت کا وضع حمل ہو گیا ہے" آپ نے فرمایا ——— "ابھی ہم اسے سنگسار نہیں کریں گے کیونکہ اس کا بچہ چھوٹا ہے اور کوئی اسے دودھ پلانے والا نہیں ہے" اس پر ایک انصاری شخص نے کھڑے ہو کر کہا ——— یا رسول اللہ مجھ پر اس کے دودھ پلوانے کی ذمہ داری ہے"، لہذا اسے سنگسار کر دیا گیا۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ——— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی نے زنا کیا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے کوڑے ماروں جب میں اس کے پاس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ نفاس کے ایام میں ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں کوڑے ماروں تو وہ مر جائے گی لہذا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا ——— تم نے اچھا کیا تم اسے چھوڑے رکھو یہاں تک کہ وہ اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جائے،

حدود شرعیہ میں سفارش کی ممانعت

(۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— جس کی سفارش اللہ کی حد شرعی کے قائم کرنے میں حائل ہو جائے تو وہ اللہ کے حکم کی مخالفت کر رہا ہے"

(۵) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ــــــ "قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اس پر قریش بہت پریشان ہوئے اور وہ کہنے لگے ــــــ "کون ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں گفتگو کرے البتہ اس معاملے میں اسامہ بن زیدؓ ہی جرأت کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے ہیں[1]" چنانچہ انھوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا ــــــ "کیا تم اللہ کی حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟" اس کے بعد آپؐ نے کھڑے ہو کر خطبہ میں فرمایا ــــــ "اے لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اس لئے تباہ و برباد ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف خاندان کا شخص چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور انسان چوری کرتا تھا تو اسے سزا دیتے تھے، خدا کی قسم! اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا ہاتھ ضرور کاٹیں گے"

شراب نوشی کی سزا

(۱) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی پر شاخوں اور جوتیوں سے مارا ہے اور حضرت ابوبکرؓ نے چالیس کوڑوں کی سزا دی ہے۔

(۲) حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے آغاز میں جب شراب نوشوں کو ہمارے پاس لایا جاتا تھا تو ہم اسے اپنے ہاتھوں، جوتیوں اور چادروں سے مارا کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا آخری زمانہ آیا تو انھوں نے چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی، مگر جب یہ جرم بہت بڑھ گیا اور لوگ کثرت سے اس کا ارتکاب کرنے لگے تو انھوں نے اسّی کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی[2]

حضرت علیؓ نے شراب فروش کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے ــــــ جب کوئی شراب پیتا ہے تو نشہ میں ہو جاتا ہے اور جب نشہ میں ہوتا ہے تو بے ہودہ بکواس کرتا ہے اور جب بکواس کرتا ہے تو کسی پر تہمت لگاتا ہے اور تہمت لگانے والے پر اسّی (۸۰)

---

[1] نیل الاوطار جلد دوم صفحہ ۱۱۰-۱۱۴، سبل السلام جلد چہارم صفحہ ۲۶

[2] اس عبارت کی حدیث کی روایت بخاری میں مذکور ہے۔

کوڑے ہیں "

تہمت پر قید

حضرت بہز بن حکیم اپنے والد اور دادا کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو تہمت کے الزام پر قید کر دیا اور پھر اسے چھوڑ دیا۔

مفسدوں اور رہزنوں کی سزا

(۱) حضرت ابن عباسؓ نے رہزنوں کے بارے میں فرمایا ہے ـــــ "جب وہ قتل کریں اور مال پر بھی ڈاکہ ڈالیں تو انھیں قتل کیا جائے گا اور سولی دی جائے گی اور اگر وہ صرف لوگوں کو قتل کریں اور مال نہ چھینیں تو وہ صرف قتل کئے جائیں گے، انھیں سولی نہیں دی جائے گی اور اگر وہ مال چھین لیں اور انھوں نے قتل نہ کیا ہو تو ان کے ہاتھ پاؤں برعکس سمت سے کاٹے جائیں گے اور اگر راستوں پر بدامنی پھیلائیں اور مال نہ چھین سکیں تو جلا وطن کر دیا جائے گا۔

(۲) حضرت عرفجہ الاشجعیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ـــــ جب تمھاری حکومت متحدہ طور پر ایک شخص کے سپرد ہو اس وقت کوئی آکر تم میں نا اتفاقی پیدا کرے یا تمھاری جماعت میں پھوٹ ڈالے تو اسے قتل کر دو "

جہاد کے احکام نبوی

ترغیب جہاد

(۱) حضرت ابو ایوبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ " اللہ کی راہ میں صبح یا شام کے وقت نکلنا ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر آفتاب طلوع وغروب ہوتا ہے"

(۲) حضرت ابو عبس الحارثی فرماتے ہیں ـــــ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ـــــ "جس کے دونوں پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کرتا ہے"

(۳) حضرت عثمان بن عفانؓ فرماتے ہیں ـــــ " میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ـــــ " اللہ کی راہ میں ایک دن بھی گھوڑے باندھنا دوسرے مقامات کے

ہزار دنوں سے بہتر ہے،

(۴) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ــــ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ــ دو آنکھوں کو آگ نہیں چھو سکتی (۱) وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئے (۲) وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں حفاظت کرتی رہے "

جہاد کا صحیح مفہوم

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں ــــــ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ ایک شخص بہادری کے اظہار کے لئے جنگ کرتا ہے اور دوسرا غیرت وحمیت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے اور تیسرا شخص ریاکاری کے طور پر جنگ کرتا ہے تو ان تینوں قسموں میں سے کون سا شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا ــــــ "جو شخص اس لئے جنگ کرے کہ اللہ کے مذہب کا بول بالا ہو تو وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے "

(۲) حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں ــــــ " ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے کہنے لگا ــــ " آپؐ کی کیا رائے ہے کہ اگر کوئی شخص اجر اور شہرت کی خاطر جنگ کرے تو اسے کیا ملے گا؟ " آپؐ نے فرمایا ــــــ " اسے کچھ نہیں ملے گا " اس شخص نے تین مرتبہ سوال کیا اور آپؐ نے تینوں مرتبہ یہی جواب دیا، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا ــ ــــــ " اللہ تعالیٰ وہی عمل قبول کرتا ہے جو اس کے لئے خالص ہو اور اس کے ذریعے اس کی رضا مندی طلب کی جائے"

جنگی تیاریوں میں امداد

حضرت زید بن خالدؓ کی روایت ہے کہ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ " جو اللہ کی راہ میں غازیوں کے لئے سازوسامان مہیا کرے تو وہ بھی غازی ہے اور جو ان کے گھر والوں کی بخیر و عافیت نگرانی کرے وہ بھی غازی ہے "

فوجیوں سے مشورہ

(۱) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابو سفیان کے لشکر کے آنے کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے گفتگو کی آپؐ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، ان کے بعد حضرت عمرؓ بولے تو ان کی طرف بھی آپؐ نے رخ نہیں کیا، بعد ازاں سعد بن عبادہؓ کھڑے ہو کر کہنے لگے ــــ یا رسول اللہؐ

اگر آپؐ کا رُخ ہماری طرف ہے تو میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر آپؐ ہمیں حکم دیں تو ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیں اور اگر آپؐ یہ حکم دیں کہ ہم خطرناک ترین مقامات تک گھوڑے دوڑائیں تو ہم ضرور بالضرور ایسا ہی کریں گے" اس پر آپؐ نے لوگوں کو حکم دیا اور وہ (جنگ کے لئے) روانہ ہو گئے"

(۲) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سفر اور جہاد میں) راستے میں پیچھے رہ کر کمزور کو آگے بڑھاتے تھے (اور جب کسی کے پاس سواری نہیں ہوتی تھی (اسے) پیچھے سوار کر لیتے تھے اور ان کے لئے دعا کرتے تھے

جنگی تدابیر

حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مہم کا ارادہ کرتے تھے تو دوسری مہم کا (ارادہ) پوشیدہ رکھتے تھے"

(۲) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "جنگ دھوکا ہے"

(۳) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "یوم احزاب میں مجھے قوم (دشمن) کی خبر کون لا کر بتائے گا" اس کے جواب میں حضرت زبیرؓ نے کہا —— "میں (خبر لاؤں گا)" پھر آپؐ نے فرمایا —— "مجھے قوم کی خبر کون دے گا" اس کے جواب میں بھی حضرت زبیرؓ نے کہا —— "میں" اس پر رسول اکرمؐ نے فرمایا —— ہر پیغمبر کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے"

غازی کا استقبال

حضرت سہل بن معاذ اپنے باپ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر میں کسی غازی کو رخصت کروں اور اس کی سواری کے ساتھ صبح یا شام چلوں تو یہ مجھے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے"

(۲) حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں —— "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ سے واپس آئے تو لوگ آپؐ کا استقبال کرنے کے لئے ثنیۃ الوداع پہونچے میں بھی لوگوں کے ساتھ روانہ ہوا تھا اس وقت میں لڑکا تھا۔

(۳) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ (مجاہدوں)
بقیع الغرقد تک پیدل چلے اس کے بعد آپ نے انھیں روانہ کر دیا اور پھر فرمایا ۔۔۔
"اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ" اور فرمایا :- "اے خدا ! ان کی مدد فرما"، یہ وہ جماعت
تھی جسے آپ نے "کعب الاشرف" یہودی کے خلاف بھیجا تھا ۔"

خواتین کی جنگی خدمات

حضرت الربیع بنت معوذ فرماتی ہیں ۔۔۔ ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے تھے ہم مجاہدوں کو
پانی پلاتے تھے اور ان کی خدمت کرتے تھے اور مقتولوں اور زخمیوں کو مدینہ منورہ واپس
لے جاتے تھے ،

(۲) حضرت انسؓ فرماتے ہیں ۔۔۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے
روانہ ہوتے تھے تو حضرت امِ سلمہؓ اور انصار کی عورتیں بھی آپ کے ساتھ ہوتی تھیں
وہ پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کا علاج معالجہ کرتی تھیں ،،

(۳) صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضرت امِ سلیم نے جنگ حنین
میں ایک خنجر اپنے پاس رکھا ہوا تھا وہ فرماتی تھیں ۔۔۔ "میں نے یہ خنجر اس
لئے تیار رکھا ہے کہ اگر مشرکوں میں سے کوئی میرے قریب آئے تو میں اس کا
پیٹ پھاڑ دوں گی [1]

عورتوں، بچوں، اور بوڑھوں کی حفاظت

(۱) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں ۔۔۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی ایک جنگ میں ایک
عورت مقتول پائی گئی تو آپ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

(۲) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔۔۔
" اللہ کے نام اور اس کی امداد اور رسول خدا کی ملت میں رہتے ہوئے روانہ ہو
جاؤ، کسی شیخ فانی ، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرو ، مال غنیمت میں خیانت
نہ کرو۔ اور تمام مال غنیمت کو اکٹھا کر لو، اصلاح اور احسان کرو کیونکہ اللہ احسان
کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے "

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نیل الاوطار حصہ ہفتم صفہ ۳۰

(۳) حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کو بھیجتے تھے تو فرماتے تھے ——— اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ، اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ کا انکار کرتے ہوں، نہ غدّاری کرو اور نہ خیانت کرو اور نہ کسی کے اعضا کاٹو نیز بچّوں اور خانقاہ والوں کو قتل نہ کرو"

(۴) حضرت اسود بن سریع کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنگ میں بچّوں کو قتل کرو" لوگوں نے کہا ——— کیا وہ مشرکوں کی اولاد نہیں ہیں؟" آپؐ نے فرمایا ——— "کیا تمھارے بہترین اشخاص مشرکوں کی اولاد نہیں ہیں؟"

جنگی ھدایات

(۱) حضرت صفوان بن عسال رضؓ فرماتے ہیں" ——— ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم میں بھیجا تو آپ نے فرمایا ——— اللہ کے نام پر اور اللہ کی راہ میں روانہ ہو جاؤ ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ کا انکار کریں کسی کے اعضا نہ کاٹو اور نہ غدّاری کرو اور نہ کسی بچّے کو قتل کرو"

(۲) حضرت یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں ——— حضرت ابو بکر رضؓ نے شام کی طرف فوجیں بھیجیں اور وہ خود یزید بن ابی سفیان کے ساتھ تھوڑی دور تک پیدل چلے۔ یزید بن ابی سفیان ان فوجوں کے چوتھائی حصّہ کے سالار تھے لہٰذا حضرت ابو بکر رضؓ نے (یزید سے خطاب کرتے ہوئے) فرمایا ——— "میں تمھیں دس ہدایات دیتا ہوں۔ کسی عورت، بچّے اور بہت بوڑھے آدمی کو قتل مت کرو۔ پھل دار درخت کو نہ کاٹو۔ آباد مقام کو ویران مت کرو۔ اپنے کھانے کے علاوہ ناحق بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کو نہ کاٹو اور نہ کوئی کھجور کا درخت کاٹو اور نہ اسے جلاؤ اور مال غنیمت میں خیانت نہ کرو۔

گھوڑ دوڑ کا مقابلہ

(۱) حضرت ابن عمر رضؓ فرماتے ہیں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کا مقابلہ کرایا چنانچہ وہ گھوڑے جو سدھا کر لاغر کر لئے گئے تھے ان کے مقابلہ کی مسافت مقام حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک تھی اور جو گھوڑے لاغر نہیں ہوئے تھے ان کے مقابلے کی مسافت ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک تھی،

صحیح مسلم و بخاری میں حضرت موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک چھ یا سات میل ہیں، اور بخاری میں حضرت سفیان کی روایت ہے کہ حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک پانچ چھ میل ہیں اور ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک صرف ایک میل کی مسافت ہے۔ [له]

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مقابلہ کا معاوضہ (جائز) نہیں ہے مگر اونٹوں کی دوڑ تیر اندازی یا گھوڑ دوڑ میں یہ (جائز) ہے۔" [ٹہ]

له اس حدیث سے مقابلہ اور گھوڑ دوڑ کا جواز ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ یہ جوئے بازی کی شکل میں نہ ہو اور بیکار تفریح اور لہو لعب کے لئے نہ ہو بلکہ ایک اچھی قسم کی ورزش ہو جس سے جہاد کے مقاصد حاصل ہوتے ہوں یا اس سے ضرورت کے موقع پر اور کوئی مفید کام لیا جا سکے یہ چیز حسب موقع مستحب اور مباح کے درمیان ہے، بعض کتب حنفیہ میں مذکور ہے کہ تیر اندازی گھوڑ دوڑ، اونٹوں کی دوڑ، پیدل دوڑ میں مقابلہ کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ تمام مقابلے جہاد کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں لہذا اگر اس سے ورزش اور جہاد کرنا مقصود ہو تو یہ مستحب ہے لیکن اگر لہو و لعب اور فخر کرنا مقصد ہو تو مکروہ ہے کیونکہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے، علامہ قرطبی نے فرمایا ہے (علماء کا اس میں) کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی دوڑ اور پیدل دوڑ میں مقابلہ کرانا جائز ہے، اسی طرح تیر اندازی اور دیگر اسلحہ کے استعمال کے مقابلے بھی جائز ہیں، بعض علماء نے صرف گھوڑوں اونٹوں اور تیر اندازی کے مقابلہ کو جائز قرار دیا ہے۔ بعض علماء نے صرف گھوڑ دوڑ کے مقابلہ کو جائز قرار دیا ہے اور حضرت عطاء نے ہر چیز میں مقابلہ کرنے کی اجازت دی ہے،

یہ تمام صورتیں مقابلے کی اس وقت جائز ہیں جبکہ کوئی معاوضہ نہ دیا جائے لیکن اگر معاوضہ دیا جائے تو ہم اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کریں گے

ٹہ اس حدیث میں سَبَق کے لفظ سے یہ مراد لیا گیا ہے کہ جو مقابلے میں آگے بڑھ جائے اسے معاوضہ دیا جائے اس حدیث میں معاوضہ کا ثبوت ملتا ہے اس معاملے میں علماء نے تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مقابلہ کی (باقی صفحہ ۲۰۷)

(۳) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——
"جو دو گھوڑوں کے درمیان ایک گھوڑا شامل کرے اور اسے یقین نہ ہو کہ وہ آگے بڑھ جائے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے دو گھوڑوں کے درمیان ایک گھوڑا اس یقین کے بعد شامل کیا کہ وہ آگے بڑھ جائیگا تو وہ قماربازی ہے

(بقیہ صفحہ ۲۰۶) دو صورتیں جائز ہیں اوّل یہ کہ مقابلہ معاوضہ کے بغیر ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ معاوضہ مقابلہ کرنے والوں کی طرف سے نہ پیش کیا جائے بلکہ تیسرے آدمی کی طرف سے پیش کیا جائے مثلاً حاکم معاوضہ پیش کرے کہ جو کوئی آگے بڑھ جائے اسے اس قدر ملے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا اسے کچھ نہیں ملے گا، امام مالکؒ کے نزدیک حاکم کے علاوہ اور کوئی معاوضہ نہیں دے سکتا اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ ایک تیسری صورت میں بھی مقابلہ جائز ہے کہ فریقین میں سے صرف ایک فریق کی طرف سے معاوضہ پیش کیا جائے مثلاً مقابلہ کرنے والے دو اشخاص میں سے ایک شخص یہ کہے —— "اگر تم مجھ سے آگے بڑھ جاؤ گے تو میں تمھیں اس قدر رقم دوں گا اور اگر میں تم سے آگے بڑھ جاؤں تو میں تم سے کچھ نہیں لوں گا" لیکن اگر فریقین سے مال کی شرط ہو تو وہ حرام ہے جیسے کوئی یہ کہے "اگر میرا گھوڑا آگے بڑھ جائے تو تم مجھے اتنی رقم دو اگر تمھارا گھوڑا آگے بڑھ جائے تو میں تمھیں اس قدر رقم دوں گا"۔ اس طرح یہ مقابلہ جوئے بازی بن جائے گا کیونکہ اس صورت میں ایک کا مال دوسرے کے پاس جانے کا امکان ہے اور دوسرے کے مال سے فائدہ اٹھایا جائے گا، جو حرام ہے البتہ فقہائے نے ایسی صورت میں مقابلہ کرنے کو جائز قرار دیا ہے جبکہ ان دونوں اشخاص کے ساتھ تیسرا شخص بھی شامل ہو جائے بشرطیکہ وہ اپنے پاس سے کوئی رقم نہ نکالے اس کا طریقہ یہ ہے کہ تیسرا آدمی یہ کہے کہ اگر وہ ان دونوں سے آگے بڑھ جائے تو وہ ہر ایک سے آدھی آدھی رقم لے گا اور اگر وہ آگے نہیں بڑھ سکا تو وہ خود ان کو کچھ نہیں دے گا اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائے تو وہ دوسرے کے مال سے ایک مقررہ رقم لے گا، لہٰذا اب اگر یہ تیسرا آدمی دونوں سے آگے بڑھ جائے تو اسے معاوضہ ملے گا اور اگر آگے نہ بڑھ سکا تو وہ ان دونوں کو کچھ نہیں دے گا اور ان دونوں میں سے جو آگے بڑھ جائے تو وہ شرط کے مطابق اپنے ساتھی سے معاوضہ لے گا۔ علامہ زیلعی فرماتے ہیں "یہ چیز اس لئے جائز ہے کہ تیسرے آدمی پر ان تمام صورتوں میں کوئی تاوان عائد نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ معاملہ جوئے بازی کی حد سے (باقی صفحہ ۲۰۸)

(۴) حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"گھوڑے تین قسم کے ہیں (۱) وہ گھوڑا جو خداوند رحمٰن کے لئے مخصوص ہو (۲) وہ گھوڑے جو انسان کے لئے ہوں (۳) وہ گھوڑا جو شیطان کے لئے ہو۔ رحمٰن کا گھوڑا وہ ہے جو اللہ کی راہ میں باندھا جائے اس کا چارہ، لید اور بول و براز وغیرہ سب کارِ ثواب میں ہے مگر شیطان کا گھوڑا وہ ہے جس کے ذریعے قمار بازی کی جائے اور شرط لگائی جائے۔ انسان کا گھوڑا وہ ہے جسے انسان شکم پری کے لئے باندھے وہ اس کے فقر و افلاس کا پردہ ہے،

(۵) ایک انصاری راوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——
"گھوڑے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک گھوڑا وہ ہوتا ہے جسے انسان اللہ کی راہ میں باندھتا ہے لہٰذا اس کی قیمت۔ اس کی سواری اور اس کا عاریۃً لین دین اور اس کا چارہ سب کار ثواب ہے، دوسرا گھوڑا وہ ہے جس کے ذریعے انسان جوا کھیلتا ہے اور شرط لگاتا ہے اس کی قیمت، اس کا چارہ اور اس کی سواری سب گناہوں کا بوجھ ہے، تیسرا گھوڑا پیٹ کے لئے ہوتا ہے اس کے ذریعے اگر اللہ چاہے تو فقر و افلاس دور ہوتا ہے"

(بقیہ صفحہ ۲۰۷) خارج ہوتا ہے امام مالک اور ابن الصباغ جانبین سے مال خرچ کرنے کو جائز اور صحیح نہیں مانتے خواہ وہ تیسرا آدمی مذکورہ طریقے پر آکر شامل ہو جائے (اس وقت بھی مقابلہ کی یہ صورت جائز نہیں ہوگی)

وہ مقابلے جنہیں جائز مانا گیا ہے ان کے لئے شرائط مقرر ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے ــ ملاحظہ ہو نیل الاوطار جلد ششم صفحہ ۷۵ ــ رد المختار جلد پنجم صفحات ۲۶۶ و ۲۶۷

اصولِ حکمرانی

حکومت کی خواہش نہ کی جائے

(۱) حضرت ابو موسیٰ رض فرماتے ہیں ــــ "میں اور میرے دو چچازاد بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ان میں سے ایک نے کہا ــــ "یا رسول اللہ! آپ ہمیں اپنے کسی علاقہ کا حاکم بنا دیجئے" دوسرے شخص نے بھی ایسی بات کہی آپ نے فرمایا ــــ "ہم اس کام پر کسی ایسے آدمی کو مقرر نہیں کرتے ہیں جو اسے طلب کرتا ہو یا اس کا خواہشمند ہو"

(۲) حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے عبدالرحمٰن بن سمرہ! تم حکومت طلب نہ کرو کیونکہ اگر تمھیں بغیر مانگے حکومت عطا کی جائے تو (خدا کی طرف سے) تمھیں اس کام میں مدد حاصل ہو گی اور اگر وہ تمھیں مانگنے کے بعد ملے تو وہ تم پر مسلط ہو جائیگی"

منصف اور ظالم قاضی

(۱) حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ "اللہ تعالیٰ قاضی کے ساتھ رہتا ہے جب تک کہ وہ ظلم نہ کرے جب وہ ظلم کرنے لگتا ہے تو اللہ اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہے"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں ــــ "اللہ قاضی کے ساتھ ہوتا ہے جب تک کہ وہ ظلم نہیں کرتا ہے ــــ جب وہ ظلم کرتا ہے تو وہ اس سے الگ ہو جاتا ہے اور شیطان اس سے چمٹ جاتا ہے،

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ انصاف کرنے والے اللہ کے قریب خداوند رحمٰن کے دائیں ہاتھ کی طرف نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے ۔ وہ لوگ ہیں جو لوگوں اور حکوموں کے ساتھ انصاف کا فیصلہ کرتے تھے"

حکومت کے فرائض

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــــ "قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں ان میں سے ایک قسم جنت میں ہوگی اور باقی دو قسمیں دوزخ میں ہوں گی، جنت میں وہ شخص داخل ہوگا جو حق شناس ہو اور اس کے مطابق فیصلہ کرے مگر وہ شخص جو حق شناس تو ضرور ہو مگر فیصلہ کرنے میں ظلم کرے تو وہ دوزخ میں ہوگا اور وہ شخص جو جہالت کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے وہ بھی دوزخ میں داخل ہوگا"۔

(۲) حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں "میں نے عرض کیا ـــــــ" یارسول اللہ! آپ مجھے حاکم کیوں نہیں بناتے ہیں؟" (اس کے جواب میں) آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا "اے ابوذر! تم کمزور ہو اور (حکومت) ایک بڑی امانت ہے بلکہ روز قیامت میں یہ رسوائی اور ندامت (کا ذریعہ) ہے بجز ان لوگوں کے جو اس کے حقوق پورا کریں اور اس کے فرائض ادا کریں۔

(۳) حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں ـــــــ" میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ـــــــ" کوئی حاکم غصے کی حالت میں دو شخصوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے"

رشوت کی ممانعت

(۱) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــــ" رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے"

(۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کی لعنت اس شخص پر ہو جو حکومت کے معاملے میں رشوت لے اور رشوت دے"

عدالت میں مساوات

حضرت عبداللہ بن الزبیر فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مقدمہ کے فریقین دونوں، حاکم کے سامنے بیٹھیں"

(۲) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــــ اے علیؓ! جب تمہارے سامنے دونوں فریق بیٹھ جائیں تو اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ کرو جب تک کہ تم مدعی کا بیان سننے کے بعد مدعا علیہ کا بیان نہ سن لو اگر تم یہ طریقہ اختیار کرو گے تو اصل حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی"

ظاہری اور باطنی حکم

حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــــ "میں بشر ہوں اور تم میرے سامنے اپنے مقدمات پیش کرسکتے ہو اور شاید تم میں سے کوئی دوسرے سے زیادہ اپنے معاملہ کو ثابت کرسکے اور یہ ممکن ہے کہ میں (اس کے دلائل کے مطابق) فیصلہ کردوں، پس اگر میں اس کے بھائی کے حق کے خلاف فیصلہ کردوں تو وہ اس کا حق نہ مارے کیونکہ اس وقت میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دوں گا"

گواہ اور قسم

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہ کے ساتھ قسم پر فیصلہ کیا"

(۲) حضرت جعفر بن محمد اپنے والد کے واسطہ سے حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ کی گواہی اور حقدار کی قسم پر فیصلہ کیا تھا۔ اور اسی طرح امیر المومنین حضرت علیؓ نے عراق میں فیصلہ کیا"

مدعی علیہ پر قسم

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی علیہ سے قسم کھلوا کر فیصلہ کیا" دوسری روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ انسانوں کے جان و مال پر دعویٰ کر بیٹھیں بہرحال مدعی علیہ پر قسم ہے"

بیہقی نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے "مدعی پر ثبوت پیش کرنا ہے اور جو انکار کردے اس کے ذمے قسم کھانا ہے"[1]

(۲) حضرت ابو امامہ الحارثیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق مارے تو اللہ اس کو ضرور دوزخ میں داخل کرے گا۔ اور اس پر جنت حرام کرے گا۔" ایک آدمی نے کہا "خواہ وہ معمولی چیز ہو" آپ نے فرمایا ـــــ "خواہ وہ پیلو کی ٹہنی ہو"

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

[1] بعض محدثین کا خیال ہے کہ بیہقی کے یہ الفاظ حدیث میں راوی کا اضافہ ہیں۔

بڑے بڑے گناہ یہ ہیں (۱) اللہ کے ساتھ شرک کرنا (۲) والدین کی نافرمانی (۳) قتل کرنا (۴) جھوٹی قسمیں کھانا۔

شہادت کے قوانین

(۱) حضرت عمروؓ بن شعیب اپنے والد اور دادا کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خیانت کرنے والے مرد اور عورت کی گواہی اور کسی کینہ ور کی گواہی اپنے بھائی کے خلاف ناجائز ہے اسی طرح ایک ماتحت اور نوکر کی گواہی گھر والوں کے حق میں جائز نہیں ہے"

(۲) حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں سے مطلع نہ کروں؟" ہم نے کہا۔ یا رسول اللہ ضرور بتائیے" آپ نے فرمایا (وہ یہ ہیں) (۱) اللہ کے ساتھ شرک کرنا (۲) والدین کی نافرمانی کرنا" یہ کہتے وقت آپ سہارا لگائے ہوئے بیٹھے تھے اس کے بعد آپ سیدھے بیٹھ کر فرمانے لگے ——" دیکھو جھوٹی بات اور جھوٹی شہادت (سے پرہیز کرو) آپ یہ بات بار بار اس قدر دہراتے رہے کہ ہمیں یہ خیال پیدا ہوا (کہ آپ اب تھک گئے ہوں گے اس لئے) کاش آپ خاموش ہوجائیں"

قاضی کے لئے مکمل ہدایات

قاضیوں کے لئے مکمل ہدایات کا نمونہ حضرت عمرؓ کا وہ خط ہے جو انھوں نے حضرت ابوموسیٰ الاشعری کے نام ارسال فرمایا تھا جو یہ ہے"[1]

حمد وثناء کے بعد واضح ہو کہ فیصلہ کرنا ایک مستحکم فریضہ ہے جس کے لئے ایک دستور مقرر ہے، اس لئے تمھیں عقلمندی، سمجھداری اور بہت یادداشت سے کام لینا چاہیئے، جب کوئی شخص دلائل تمہارے سامنے پیش کردے تو اسے خوب سمجھو، اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد فیصلہ کرو اور جب فیصلہ سناؤ تو اسے نافذ بھی کرو کیونکہ اس حق بات کے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جو عمل میں نہ آسکے،

---

[1] ملاحظہ ہو سبل السلام چوتھا حصہ مطبوعہ ۱۳۴۷ھ صفحہ ۱۵۹

اپنی مجلس عدالت میں اور فیصلہ کرنے میں سب لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرو تاکہ نہ تو کسی شریف آدمی کو تم سے بے انصافی کی توقع ہو اور نہ کوئی کمزور آدمی تمہارے انصاف سے مایوس ہو جائے، مدعی کے ذمے ثبوت پیش کرنا ہے اور جو انکار نہ کرے اس کے ذمے ثبوت پیش کرنا ہے اور جو انکار کرے اس کے ذمے قسم کھانا ہے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانی جائز ہے مگر وہ صلح ایسی نہ ہو جو حرام کو حلال کرے یا حلال کو حرام کردے۔ اور جو کوئی کسی حق کا دعویٰ کرے اور وہ غائب ہو یا اس کے پاس فی الحال ثبوت نہ ہو تو اس کے لئے ایسی مدت مقرر کردجس کے اندر وہ پہونچ سکے اگر وہ اپنا ثبوت لے آئے تو اس کے مطابق اس کا حق دلا دیدو ورنہ اس کا مقدمہ خارج کردو کیونکہ یہ طریقہ قابل عذر ہے۔ اور اندھا دھند فیصلے سے بچانے والا ہے، اگر آج تم نے کوئی فیصلہ کیا ہو اس کے بعد جب تم نے اپنی عقل کی طرف رخ کرکے صحیح بات معلوم کرلی ہو تو اس وقت تمہیں حق وصداقت کی طرف رجوع کرنے سے باز نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ حق بات ہر حالت میں مقدم ہے اور حق کی طرف لوٹنا باطل پر اڑنے سے بہتر ہے"

قیاس پر عمل

جو بات کتاب اللہ اور سنت نبویؐ میں موجود نہ ہو مگر تمہارے دل میں وہ بات کھٹک رہی ہو تو اس کو اچھی طرح سمجھو اور اس وقت ان معاملات کو (اسلامی اصول پر) قیاس کرو اور جو بات اللہ تعالیٰ کے اصول اور حق وصداقت کے زیادہ قریب ہو اس پر عمل کرو۔

تمام مسلمان ایک دوسرے کے لئے قابل اعتبار ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہیں حد شرعی کے مطابق سزا دی گئی ہو یا جو جھوٹی شہادت کے مرتکب ہوں یا جن کے نسب اور قرابت مشتبہ اور قابل اعتراض ہو، اللہ تعالیٰ بھیدوں سے خوب واقف ہے وہی گواہی اور قسموں کے ذریعے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے۔

جب (تمہارے سامنے) مقدمہ پیش ہو تو غصہ، پریشانی تنگ دلی اور لوگوں کو ایذا دہی اور ان سے بیزاری کے جذبات کا اظہار نہ کرو، کیونکہ حق بات کے فیصلے پر بھی اللہ تعالیٰ بہت ثواب دیتا ہے اور اس سے نیک نامی بھی ہوتی اور جس کی نیت میں حق کے لئے خلوص ہو، خواہ وہ اس کی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اللہ تعالیٰ لوگوں کے معاملوں میں اس کا مددگار بنتا ہے اور جو لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو اس کے دلی جذبات کے مطابق نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کا وہی عمل قبول کرتا ہے جو خلوص پر مبنی ہو لہٰذا (خلوص کے بغیر) اللہ سے فوری رزق اور رحمت کے خزانوں کی کیسے توقع رکھ سکتے ہو؟ والسلام"

میں نے (مختلف موضوعات پر) احکام نبوی کی یہ احادیث "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر پیش کی ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی شریعت کے اصولِ زندگی ہر گوشے پر حاوی ہیں اس لئے میں حیران ہوتا ہوں جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے حکام اور ارباب حل وعقد غیر ملکی قوانین کا سہارا لیتے ہیں حالانکہ ہمارے پاس اسلامی قوانین کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے یہ ہماری وہ عظیم میراث ہے کہ ہمارے دینی و دنیاوی حالات اس کو زندہ کئے بغیر درست نہیں ہو سکتے، ہمیں ہر حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ماخذ اور کتب حوالہ جات

برائے

بحث نبویؐ

(۱) الموافقات — شاطبی (۲) ارشاد الفحول — شوکانی۔
(۳) تاریخ التشریع الاسلامی خضری (۴) کتاب الاُمّ — امام شافعی
(۵) اصول الفقہ۔ استاذ عبدالوہاب خلاف بک (۶) فجر الاسلام۔ احمد امین بے
(۷) اعلام الموقعین۔ علامہ ابن القیم (۸) الطریق الحکمیہ۔ علامہ ابن القیم
(۹) النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر — ابن اثیر
(۱۰) تاویل مختلف الحدیث — ابن قتیبہ الدینوری
(۱۱) سبل السلام — محمد اسماعیل الصنعانی
(۱۲) نیل الاوطار — محمد بن علی بن محمد الشوکانی
(۱۳) فتح الباری شرح صحیح البخاری۔ علامہ ابن حجر العسقلانی

فصل سوم

اجماع

اجماع اسلامی، احکام و قوانین کا تیسرا ماخذ ہے اس میں مندرجہ ذیل امور قابل بحث ہیں :-

(۱) اجماع کا مفہوم (۲) اجماع کے امکان میں اختلاف (۳) اجماع کی کا قابل ثبوت ہونا (۴) اجماع کی سند (۵) اجماع صحابہ (۶) پہلے اجماع دوسرے اجماع سے تنسیخ۔

اجماع کا مفہوم اجماع کا مفہوم یہ ہے کہ کسی زمانے کے تمام مجتہدین اور اور علمار کرام کسی مذہبی معاملہ میں متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کریں، اس سلسلے میں محض عوام کا اتفاق و اختلاف معتبر نہیں ہے اس طرح یہ بھی معتبر نہیں ہے کہ کچھ مجتہدین متحد ہوں اور کچھ مخالف ہوں،

امکان اجماع مسلمانوں کی ایک جماعت جن میں معتزلی عالم نظام[1] اور بعض شیعہ بھی شامل ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ اجماع کا ہونا محال ہے کیونکہ تمام مجتہدین کا کسی ایک ایسے معاملے پر متفق ہونا محال ہے جو پہلے سے معلوم نہ ہو، اسی طرح ایک ہی وقت میں سب لوگوں کا جمع ہو کر کسی ایک

[1] نظام معتزلی کا نام ابراہیم بن سیار ہے اور اس کی کنیت ابو اسحاق ہے بچپن ہی سے بہت ذہین اور ہوشیار تھا وہ بہت فصیح و بلیغ بھی تھا، فرقہ معتزلہ کا بہت بڑا امام تھا اس کی وفات ۲۲۱ھ میں ہوئی۔

مسئلہ پر گفتگو کرنا بھی محال معلوم ہوتا ہے، مگر ان کے یہ خیالات غلط ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اگر کسی مذہبی معاملے کو دلائل سے ثابت کیا جائے تو سب مجتہدین اتفاق رائے کریں یہ لوگ اس بات سے بھی استدلال لاتے ہیں کہ مجتہدین کرام دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے ایسے مذہبی معاملے کی ہر جگہ نہیں پہونچ سکتی ہے، یہ دلیل بھی اس لئے باطل ہے کہ اگرچہ علمار کرام اور مجتہدین مختلف ملکوں میں آباد ہیں تاہم اگر دوڑ دھوپ کی جائے اور طلب صادق ہو تو انھیں ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ہے اور ان کی رائے معلوم کی جا سکتی ہے

آمد و رفت کی دقتیں

اجماع کے مخالفین مزید دلائل یہ پیش کرتے ہیں — اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اجماع ہو سکتا ہے تو ان کے اجماعی فیصلے کا علم ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ مجتہدین تمام مشرق و مغرب میں ایسے ایسے مقامات پر مقیم ہیں جہاں پہونچنا ناممکن ہے، چہ جائیکہ ان کے فیصلوں کا علم ہو سکے کیونکہ انسانی عمر تو محض ان تمام مقامات تک پہونچنے میں ختم ہو جاتی ہے، جہاں اہل علم رہتے ہوں، تو ایسی صورت میں ان علمار کا حال معلوم کرنا اور یہ پتہ چلانا کہ وہ اجماع کی محفل میں شریک ہونے کے قابل ہیں یا نہیں، بہت مشکل ہے" آخر میں وہ یہ کہتے ہیں" اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ اجماع کے فیصلوں کا علم ہو سکتا ہے تو ان فیصلوں کی اطلاع ان لوگوں کو کس صورت میں پہونچائی جا سکتی ہے جو ان پر عمل کرنا چاہیں یا تو اس کی صورت خبر متواتر کی شکل میں ہو جو بظاہر محال ہے یا کسی ایک آدمی کے ذریعے عام لوگوں کو اطلاع کرائی جائے، اگر ایک آدمی کی اطلاع ہو (خبر آحاد ہو) تو اس کی اطلاع قابل اعتبار نہیں ہے اور محض اس کی اطلاع پر اجماع قابل عمل نہیں بن سکتا ہے [۱]

اجماع کے مخالفوں نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اجماع کا علم ہونا بہت مشکل ہے اور اس کی اطلاع مشکوک اور مشتبہ ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے وقوع کا امکان نہ ہو اور اگر اجماع ممکن العمل

[۱] ارشاد الفحول بحث اجماع

ہو جائے تو وہ حجت و دلیل نہیں بن سکتا بہرحال ان لوگوں جو اعتراضات پیش کئے ہیں وہ شکوک و شبہات کے درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکے لہٰذا وہ صحیح غور و فکر کے بعد مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں معلوم ہوتے،

صحابہ کے بعد اجماع

تاہم بعض علمار کی یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ صحابۂ کرام کے بعد سے اجماع کا ہونا مشکل ہو گیا ہے کیونکہ علمار مختلف ممالک اور مختلف شہروں میں آباد ہو گئے تھے اور اسلامی فتوحات کے بعد دُور دراز کے ممالک میں چلے گئے تھے اور چونکہ اس زمانے میں آمد و رفت کے سلسلے میں بہت دقتیں تھیں اس لئے کسی ایک مسئلے پر مختلف ممالک کے علمار کرام کے خیالات معلوم کرنے بہت مشکل ہو گئے تھے چہ جائیکہ ان کا اتفاق رائے معلوم کیا جائے۔ اس وجہ سے علامہ اصفہانی نے صحابہ کے بعد اجماع کے ممکن ہونے کی مخالفت کی ہے اور ان کا رجحان یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے اجماع سے مطلع ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ اسلامی فتوحات کی کثرت کی وجہ سے علمار کی کثرت بھی ہو گئی تھی اس لئے ان کے کسی اجماعی مسئلہ کا علم نہیں ہو سکا۔

البتہ صحابہؓ کے عہد میں اجماع سے مطلع ہونا آسان تھا کیونکہ اس زمانے میں اجماع میں شریک ہونے والے علمار کی تعداد بہت کم تھی اسی وجہ سے امام احمد بن حنبل جیسے عالم و محدث جن کی معلومات اس بارے میں بہت وسیع تھیں یہ کہنا پڑا ۔۔۔ "جو کوئی اجماع کے وجود کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے" اس قول کے باوجود امام احمد اجماع کی حجیت کے قائل تھے، خواہ کسی زمانے میں اس کی صورت ممکن ہو جائے بلکہ امام شافعی نے اجماع کی حجیت کو ثابت کرنے اور اسے شرعی اصول تسلیم کرانے کے بعد اس کے امکان اور وجود کو مشکل قرار دیا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جن باتوں میں اجماع ہو اس کا کوئی مخالف نکل آئے؛ امام موصوف اس بحث کے دوران میں اجماع کے طریقۂ نقل سے بھی مطمئن نہیں تھے تاہم ان کی رائے میں علمار سلف کے احکام کو نقل کرنا بھی ایک مذہبی دلیل ہے، جبکہ یہ نہ معلوم ہو سکے کہ اس معاملے میں انھوں نے اختلاف کیا تھا[1] بیضاوی نے بھی اپنی کتاب منہاج میں بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اجماع سے مطلع ہونا مشکل ہے کیونکہ

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی چوتھا ایڈیشن صفحات ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰

علماء مختلف مقامات میں آباد ہو گئے تھے اور یہ ممکن ہے کہ ان علماء میں سے کوئی نامعلوم مقام میں رہتا ہو یا گمنام ہو یا لوگوں کے خوف کی وجہ سے تقیہ کر کے جھوٹ بول دے یا کسی دوسرے فتوے سے پہلے رجوع کرلے

دورِ حاضر میں اجماع کی ضرورت

چند لوگوں کو چھوڑ کر جنہوں نے اجماع کا انکار محض اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کا امکان نہیں ہے یا اس کی اطلاع کا کوئی طریقہ متیسر نہیں ہے، باقی تمام علماء اجماع کے قائل ہیں، مگر انھوں نے بھی اجماع ہونے کو ناممکن العمل قرار دیا ہے کیونکہ اس وقت علماء مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ کسی معاملے میں متفق نہیں ہو سکتے تھے، جہاں تک قدیم زمانے کا تعلق ہے یہ بات درست ہے کیونکہ اس زمانے میں مواصلات کی بڑی دقتیں تھیں اور ممالک بہت دُور دُور تھے مگر موجودہ زمانے میں جبکہ مواصلات کا بہترین انتظام ہو اور قومیں ایک دوسرے سے بہت قریب آگئی ہوں یہ عذر قابل قبول نہیں ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ کانفرنسیں اور بین الاقوامی جلسے ہیں جو مختلف ممالک کے شہروں میں منعقد ہوتے رہتے ہیں خواہ وہ جلسے سیاسی قسم کے ہوں یا قانونی یا علمی قسم کے ہوں، وہ لوگ جو ان بین الاقوامی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں یہ لوگ تبادلہ خیالات اور کافی بحث و تمحیص کے بعد متفقہ طور پر چند تجاویز منظور کرتے ہیں، لہٰذا اگر اجتہاد کے دروازے کھول دیئے جائیں اور ہر ملک میں مجتہدین پیدا ہونے لگیں تو یہ ممکن ہے کہ جب مذہبی مسائل میں تحقیق کی ضرورت ہو تو (بین الاسلامی) کانفرنسیں بلا کر ان میں مذہبی مشکلات کو پیش کیا جائے، لہٰذا دورِ حاضر میں اگر اجتہاد کے دروازے کو کھول دیا جائے، تو اجماع کا ہونا نہ صرف ممکن العمل ہے بلکہ بہت آسان ہے اور جب علماء کسی بات پر اجماع کرلیں تو اس پر عمل کرنا سب مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگا، بالخصوص ایسے مسائل میں جن کا تمام عالمِ اسلام سے تعلق ہو،

اجماع کی حجیت

نظام معتزلی، بعض خوارج اور امامیہ شیعہ حضرات کی یہ رائے ہے کہ اجماع دلیل شرعی نہیں بن سکتا البتہ اگر اجماع کی محفل میں کسی خاص مستند دلیل شرعی کی بنا پر فیصلہ کیا جائے تو اس مستند دلیل

کو حجت تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اگر کسی مستند دلیل کے بغیر اجماع ہو جائے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہے [۱] جہاں تک امامیہ شیعہ فرقہ کا تعلق ہے وہ اسے قطعی طور پر شرعی اصول نہیں تسلیم کرتے کیونکہ ان کے مذاہب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ان کے ائمہ معصوم ہیں اور ان کی رائے شارع کی رائے کے برابر ہے، لہٰذا جو لوگ شیعوں کے امام نہ ہوں ان کے قول کو وہ تسلیم نہیں کرتے [۲]

ہمارے جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے اور اس کے ذریعے شرعی احکام و قوانین ثابت کئے جا سکتے ہیں اور یہ بھی شریعت کا ایک بنیادی اصول ہے لہٰذا اگر کوئی مسئلہ کتاب و سنت میں موجود نہ ہو اور اس بارے میں علماء سلف کا کوئی ایسا فتویٰ مل جائے جس کی کسی نے مخالفت نہ کی ہو تو تمام فقہاء کرام اسے شرعی دلیل کی حیثیت سے اس طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح انھوں نے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور کتاب و سنت کے احکام کو تسلیم کیا ہے۔ اجماع کا ثبوت مندرجہ ذیل احادیث و روایات سے ثابت ہوتا ہے۔

(۱) بغوی نے میمون بن مہران کی اس روایت کا ذکر کیا ہے "حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب مقدمات پیش ہوتے تھے تو ان کے فیصلے کے لئے وہ کتاب اللہ کا مطالعہ کرتے تھے اگر وہاں کوئی حکم مل جاتا تھا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں ملتا تھا اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث معلوم ہو جاتی تھی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے تھے لیکن اگر وہاں بھی کوئی مسئلہ نہیں ملتا تھا تو آپ مسلمانوں سے پوچھتے "میرے سامنے یہ معاملہ درپیش ہے کیا تمھیں اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث معلوم ہے؟ اس سوال کے جواب میں بعض اوقات سب مل کر رسول اللہؐ کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے مگر بعض دفعہ کوئی حدیث نہیں ملتی تھی تو آپؓ بہترین اہل علم اور اہلِ رائے کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے تھے جب وہ کسی بات پر اتفاق کر لیتے تھے تو حضرت ابوبکرؓ اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے،

---

[۱] ارشادات الفحول

[۲] تاریخ التشریع الاسلامی چوتھا ایڈیشن

حضرت عمرؓ کا بھی یہی طریقہ تھا جب انھیں قرآن و سنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تھا تو وہ پوچھتے تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں کیا فیصلہ کیا تھا۔ اگر ان کا کوئی فیصلہ معلوم ہو جاتا تو اس پر عمل کرتے تھے ورنہ وہ بھی مسلمانوں کے سرکردہ علماء کو جمع کر کے ان کی متفقہ رائے معلوم کرتے تھے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے،

مذکورہ بالا مفہوم کے مطابق اجماعِ صحابہؓ کے زمانے میں ممکن تھا کیونکہ اس زمانے میں مجتہدین کی تعداد بہت تھوڑی تھی اس لئے ان سے مشورہ لے کر ان کی متفقہ رائے معلوم ہو سکتی تھی۔

حضرت سعید بن المسیب حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا — "یا رسول اللہ! بعض دفعہ ہمارے سامنے ایسا معاملہ پیش ہوتا ہے جس کا ذکر کتاب و سنت میں موجود نہیں ہوتا" آپؐ نے فرمایا — "ایسی صورت میں عالم اور عابد مسلمانوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو ان کے سامنے مشورہ کے لئے پیش کرو اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو"۔

(۳) علماء نے ترمذی کی اس حدیث سے بھی اجماع کو ثابت کیا ہے جو حضرت ابن عمرؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — "میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو جماعت سے الگ ہو جائے وہ دوزخ میں جائے گا"۔ ایک دوسری حدیث ہے — "جو جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہو جائے تو وہ اسلام کے حلقہ کو اپنی گردن سے نکال لیتا ہے"۔

اس سلسلے میں قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال لایا جاتا ہے

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (پ۵ سورۂ نساء)	اور جو کوئی ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسولؐ کی مخالفت کرے اور مسلمانوں سے الگ راستے کی پیروی کرے تو ہم اس کا رخ ادھر پھیر دیں گے جدھر وہ چلے اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اس آیت کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومنوں سے الگ راستے پر چلنا اجماع کی مخالفت کرنا ہے [1]

اجماع کی سند

عام علمار کی یہ رائے ہے کہ اجماع کا انعقاد بھی کتاب وسنت یا قیاس کے دلائل پر مبنی ہوتا ہے لہٰذا اگر اجماع کو ان دلائل کے ساتھ مشروط کر دیا جائے تو اجماع بذاتِ خود مستقل دلیل شرعی نہیں رہتا اور اس صورت میں اس کی کوئی مخالفت نہیں کر سکتا بلکہ یہ ایک قطعی حکم بن جاتا ہے لہٰذا اجماع پر عمل کرنا بہت ضروری ہے خواہ اس کی بنیادی دلیل معلوم نہ ہو سکے آمدی اور دیگر علمار اصول نے یہ بیان کیا ہے کہ اجماع کے لئے کسی سند اور دلیل کا ہونا شرط نہیں ہے بلکہ اجماع توفیق خداوندی سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو کسی دلیل کے بغیر کوئی صحیح راستہ دکھا دے۔[2]

اجماع صحابہؓ

صحابہؓ کرام کا اجماع متفقہ طور پر دلیل شرعی ہے، البتہ قاضی عبدالوہاب نے ایک بدعتی فرقہ کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ وہ لوگ اجماعِ صحابہؓ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، فرقہ ظاہریہ کے امام داؤد الظاہری تو اجماع کو صرف اجماع صحابہؓ تک محدود رکھتے ہیں اور امام احمد بن حنبل کے بارے میں بھی یہی مشہور ہے کیونکہ امام موصوف کے خیال میں صحابہؓ کے زمانے کے بعد اجماع کا منعقد ہونا دشوار ہو گیا تھا۔

ایک اجماع سے دوسرے اجماع کی تنسیخ

اس کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ اجماع کی پہلی مجلس کے ارکان ایک حکم صادر کرنے کے بعد پھر وہی مجلس دوبارہ طلب کریں اور اس میں پہلے حکم کو منسوخ کریں مثلاً اہل مصر نے متفقہ طور پر ایک فیصلہ کیا پھر انھیں اس فیصلے سے رجوع کرنے کا خیال پیدا ہوا تو انھی لوگوں نے متفقہ طور پر اس کے خلاف دوسرا فیصلہ کیا۔ ایسی حالت میں بعض علمار اسے جائز سمجھتے ہیں اور بعض اس کی مخالفت کرتے ہیں

---

[1] یہ تمام دلائل قابل بحث ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے اجماع ثابت نہیں ہوتا ہے ملاحظہ ہو ارشاد الفحول [2] اصول للخضری۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پہلی جماعت سے الگ دوسری جماعت اس کے خلاف فیصلہ کرے اس صورت کی تمام علمار نے مخالفت کی ہے کیونکہ اجماع کے دلیل شرعی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مخالف کوئی دوسرا اجماع نہیں ہوسکتا البتہ ابوعبداللہ البصری نے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں پہلا اجماع ہمیشہ کے لئے حجت نہیں تھا بلکہ یہ اسی وقت تک حجت تھا جب تک کہ دوسرا اجماع منعقد نہ ہو، امام رازی نے بھی اس خیال کو ترجیح دی ہے اور علامہ صفی ہندی نے فرمایا ہے کہ یہ قوی دلیل ہے [1]

اجماع کے مراتب صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود البخاری الحنفی نے اپنی اصولِ فقہ کی کتاب میں جو توضیح کے نام سے مشہور ہے یہ فرمایا ہے کہ اجماع کے چند مراتب ہیں (۱) اجماع صحابہؓ (۲) صحابہؓ کے بعد کے لوگوں کا ان مسائل میں اجماع جن میں صحابہؓ کا اختلاف منقول نہ ہو۔ (۳) ان مسائل میں اجماع جن میں صحابہؓ کا اختلاف منقول ہو، تیسرے مرتبہ کا یہ اجماع ایسا ہے جس میں اختلاف ہے [2] لہٰذا اس قسم کا اجماع کسی زمانے میں تبدیل ہوسکتا ہے،

اختلافی اجماع کتاب تلویح میں مذکور ہے کہ جناب فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی کی یہ رائے ہے کہ ایک اجماع خواہ وہ قطعی ہو، دوسرے اجماع کی رو سے منسوخ ہوسکتا ہے یہاں تک کہ اگر صحابہؓ کسی فیصلے پر متفق ہوں اور پھر اس کے خلاف بھی متفق ہوجائیں تو یہ بات جائز ہے۔ تلویح کے مصنف نے اس کے بعد یہ لکھا ہے۔" جمہور علمار کے نزدیک یہ معاملہ تفصیل طلب ہے یعنی اگر اجماع قطعی اور متفقہ ہو تو وہ تبدیل نہیں ہوسکتا

---

[1] ارشاد الفحول۔

[2] پہلے مرتبہ کا اجماع آیت قرآنی اور خبر متواتر کے درجے پر ہے جس کا منکر کافر ہے دوسرا مرتبہ خبر مشہور کے درجے پر ہے جس کا منکر گمراہ ہوتا ہے اور تیسرے مرتبے کے منکر کو گمراہ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اس میں اختلاف ہے ملاحظہ ہو التلویح فی اصول الفقہ

چنانچہ علمائے اصول کے اس قول کا مفہوم بھی یہی ہے کہ " اجماع نہ تو منسوخ ہوتا ہے اور نہ اس کے ذریعے کسی اور کو منسوخ کرایا جا سکتا ہے " مگر وہ اجماع جس میں اختلاف ہو تبدیل ہو سکتا ہے مثلاً دوسری صدی ہجری کے علمار کسی ایسے مسئلہ پر اجماع کریں جس میں صحابہؓ کا اختلاف منقول ہو، اس کے بعد وہی لوگ یا ان کے زمانے کے بعد کے علمار پہلے اجماع کے برخلاف کسی بات پر متفق ہو جائیں تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اس مسئلہ کی جو اجماع سے ثابت ہو مدت ختم ہو جائے اور اس کے بعد اللہ اجماع کی دوسری مجلس کو یہ توفیق دے کہ وہ اس کے برخلاف دوسرا اجماع منعقد کریں، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد کسی حکم کو منسوخ کرنا ممنوع ہے مگر یہ اصول صرف انہی مسائل تک محدود ہے جو وحی کے ذریعے ثابت ہوئے ہیں وہ مسائل جو اجماع سے ثابت ہوں ان پر یہ اصول حاوی نہیں ہے [۱]

ماخذ و کتب حوالہ جات

برائے بحث اجماع

(۱) ارشاد الفحول ——— (۲) اصول الفقہ ——— (خضری)

(۳) تاریخ التشریع الاسلامی (از خضری) (۴) سرح العیون ——— ابن نباتہ

(۵) التوضیح فی اصول الفقہ ——— عبد اللہ بن مسعود البخاری الحنفی

(۶) التلویح – سعد الدین التفتازانی (*)

---

[۱] التلویح – از سعد الدین تفتازانی حصہ دوم

فصل چہارم

رائے اور قیاس

قیاس اسلامی شریعت کا چوتھا اصول ہے اس میں یہ مباحث شامل ہیں،

(۱) رائے اور قیاس کا مفہوم (۲) قیاس کی تعریفیں (۳) قیاس کے مخالف و موافق (۴) قیاس میں افراط و تفریط (۵) قیاس کہاں نہیں ہو سکتا۔

قیاس کا مفہوم صحابہؓ اور تابعین کو جب کوئی مسئلہ کتاب و سنت میں نہیں ملتا تھا تو وہ اپنی رائے اور قیاس سے اجتہاد کرتے تھے اس زمانے میں قیاس کا مفہوم، جیسا کہ ان کے فتاوی سے ظاہر ہوتا ہے، یہ تھا کہ مذہب کے عام اصولوں کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "نہ تو کسی کو نقصان ہو اور نہ کسی دوسرے کو نقصان پہونچایا جائے"، یا آپؐ نے ایک دوسرا اصول یہ مقرر فرمایا ـــــ "مشتبہ چیزوں کو چھوڑ کر غیر مشتبہ چیزوں کی طرف رجوع کرو"، یا ایسے اصول ہوں جو انسانوں کے ساتھ انصاف اور بھلائی پر مبنی ہوں اور وہ ان کی خرابیوں کو دُور کر سکیں اس زمانے میں وہ اصل بنیاد نہیں تلاش کرتے تھے، جس پر وہ اس مسئلہ کو قیاس کر سکیں جس کا یہ فتویٰ دیتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ محمد بن سلمہؓ کے پڑوسی کی نہر اس کی زمین میں سے گذر سکتی ہے کیونکہ ان کے پڑوسی کو اس سے فائدہ پہونچے گا اور انھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اس طرح ان کے حکم کی بنیاد یہ عام قاعدہ تھا کہ لوگوں کو فائدہ پہونچایا جائے اور انھیں نقصان سے بچایا جائے ان کے ساتھ بھلائی کی جائے اور ان سے خرابیوں کو دور کیا جائے، اس وقت حضرت عمرؓ نے اس فیصلہ کو کسی واضح اور مخصوص بنیادی حکم پر قیاس نہیں کیا تھا بلکہ ان کا اصول وہی تھا جسے فقہاء "مصالح مرسلہ"

کے نام سے موسوم کرتے ہیں [1]

اس لئے علامہ ابن القیم نے نصِ صریح نہ ملنے کی صورت میں عہد سلف کی رائے کی الفاظ میں تشریح کی ہے (ان کی رائے وہ ہوتی تھی جو) غور وفکر اور صحیح بات معلوم کرنے کی تلاش کے بعد دل کو پسند آئے،

زمانے کے گزرنے پر جب رائے اور قیاس کے مفہوم میں توسیع ہوئی تو علمار نے اس کے مفہوم کو متعین کیا اور یہ شرط لگادی کہ جو کوئی اپنی رائے اور قیاس سے فتویٰ دے تو اس کے پیش نظر کوئی خاص بنیادی اصول ہونا چاہیے جس کی بنیاد پر وہ حکم دے سکے۔ قیاس کا یہی وہ مفہوم ہے جسے کتاب وسنت کے بعد بنیادی اصول قرار دیا گیا ہے [2]

قیاس کی تعریف

امام شوکانی اور دیگر علمائے اصول نے قیاس کی کئی طرح تعریفیں کی ہیں جن میں سے اکثر اعتراض اور تنقید سے خالی نہیں ہیں، ہمارا مقصد ان سب تعریفوں کو بیان کرنا نہیں ہے البتہ چند تعریفوں کو ہم اس لئے بیان کر رہے ہیں کہ ان کے ذریعے اصل حقیقت معلوم ہوسکے،

بعض علمار نے قیاس کی یہ تعریف کی ہے "تلاش حقیقت میں پوری کوشش صرف کی جائے" دوسرے لوگوں نے اس کی یہ تعریف کی ہے کہ "نامعلوم حکم کو معلوم مذکور حکم کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا جائے" محققین کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ کسی مسئلے کی شاخ کو اصل مسئلہ کے ساتھ اس کی اصل وجہ میں برابر کا شریک کیا جائے یا اس کے کسی خاص مفہوم میں اس پر اضافہ کیا جائے" ایک عالم نے قیاس کی یہ تعریف کی ہے کہ "اصل مسئلہ کے مضمون کو فرعی مسئلہ میں بھی ثابت کیا جائے کیونکہ ایک مجتہد کے نزدیک دونوں میں اصل وجہ مشترک پائی جاتی ہے" ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ "فرعی مسئلہ میں اصل مسئلہ کے حکم کو برقرار رکھا جائے کیونکہ دونوں میں مشترکہ سبب پایا جاتا ہے،

[1] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۲۱۱

[2] تاریخ التشریع الاسلامی

قیاس کی مثالیں

قیاس کی مثالیں یہ ہیں "حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں آج بہت برا کام کر بیٹھا ہوں کہ میں نے روزے کی حالت میں (بیوی کا) بوسہ لیا ہے" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — "اگر تم روزے کی حالت میں کلی کرو تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا — "اس میں کوئی حرج نہیں ہے" آپ نے فرمایا — "اسی طرح تم بھی روزہ رکھو" اس روایت میں آپ نے بوسہ کو جو قربت کا ذریعہ ہے منہ میں پانی ڈالنے کے مشابہ قرار دیا ہے جو پانی پینے کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور جس طرح کلی کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح اس کے بارے میں یہی حکم دیا ہے"

ایک دوسری مثال عبادۃ بن الصامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — "سونا سونے کے بدلے میں، چاندی چاندی کے بدلے میں، گیہوں گیہوں کے بدلے میں، جَو جَو کے بدلے میں، کھجوریں کھجوروں کے بدلے میں، نمک نمک کے بدلے میں، یکساں برابر اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں، جب یہ قسمیں بدل جائیں تو جس طرح چاہو اسی فروخت کرو بشرطیکہ وہ ہاتھوں ہاتھ ہوں" اس حدیث کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا چھ چیزوں میں سود حرام ہے ان کے علاوہ اور قسموں کے بارے میں حدیث خاموش ہے جیسے باجرے کے بدلے میں باجرہ، لوہے کے بدلے میں لوہا، چاول کے بدلے میں چاول ہو، لہٰذا ائمہ کرام نے مذکورہ بالا اجناس میں سود کے حرام ہونے کی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کسی ایک سبب کو معلوم کرنے پر وہ سب متفق نہ ہوسکے حنفیہ کے نزدیک ان میں سود کی حرمت کی وجہ مقدار وجنس ہے [1] چنانچہ سونے کے بدلے سونا اور چاندی کے بدلے چاندی زیادہ کرکے فروخت کرنا اس لئے حرام ہے کہ دونوں چیزیں وزن اور جنس میں برابر ہوتی ہیں اور گیہوں اور جَو میں حرمت اسی وجہ سے ہے کہ وہ دونوں چیزیں

[1] شافعیہ اور مالکیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے چاندی میں سود کی حرمت کا سبب ہم جنسی اور ہم قیمت ہونا ہے باقی اقسام میں مالکیوں کا یہ قول ہے کہ ان میں ہم جنسی اور غلہ ہونے کی صفات (باقی صفحہ ۲۳۰)

ہم جنس ہیں اور ایک ہی طرح فروخت کی جاتی ہیں، اس لئے انھوں نے لوہے کو سونے چاندی پر قیاس کیا اور چاول اور باجرہ کو گیہوں اور جَو کے مشابہ قرار دے کر ان میں بھی سود کو حرام قرار دیا۔ اس طرح حدیث کی چھ اقسام کی حرمت اصل شرعی مسئلہ کی بنیاد ہیں اور باقی اقسام کی حرمت فرعی ہے اور اصل و فرع کی حرمت کا سبب مشترک ہے یعنی دونوں میں مقدار اور جنس متحد ہیں، لہٰذا جب اصل مسئلہ ہی میں سود حرام ہوا تو اس پر قیاس کر کے فرعی مسئلہ میں بھی سود حرام قرار دیا گیا

قیاس کے مخالف و موافق

تمام علماء اس امر پر متفق ہیں کہ دنیاوی کاموں نیز دواؤں اور غذاؤں میں قیاس کرنا مستند و معتبر ہے البتہ مذہبی امور میں قیاس کرنے میں کسی قدر اختلاف ہے علماء کی ایک قلیل تعداد اس کی مخالفت کرتی ہے اور علماء کی بہت بڑی تعداد قیاس کو شرعی دلیل مانتی ہے

وہ لوگ جو قیاس کے مخالف ہیں ان کے تین گروہ ہیں

(۱) پہلا گروہ معتزلہ کی ایک جماعت ہے جن کا سربراہ نظام معتزلی تھا یہ جماعت قیاس کی منکر ہے، نظام ان میں پہلا شخص تھا جس نے اس کا انکار کیا ــــ چنانچہ ابوالقاسم البغدادی لکھتے ہیں:-

"جہاں تک مجھے علم ہے نظام سے پہلے کسی نے قیاس سے انکار نہیں کیا تھا"

(۲) دوسرا گروہ، جو قیاس کا منکر ہے وہ امامیہ شیعہ کا فرقہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قیاس ایک قسم کی رائے ہے اور ان شیعوں کے نزدیک مذہبی علم رائے کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا اور چونکہ شرعی احکام کا تعلق دین سے ہے اس لئے انھیں رائے اور اجتہاد کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ دین کی تعلیم اللہ اس کے رسولؐ اور ان ائمہ معصومین کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جو سب کے سب معصوم ہیں اور ان سے کوئی خطا اور غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۹) پائی جاتی ہیں شافعی حضرات یہ کہتے ہیں کہ باقی اقسام میں جنس اور خوراک کا اتحاد ہے فرقہ ظاہریہ کہتا ہے کہ (حرمت کے) اس حکم میں حدیث کی مذکورہ بالا اقسام کے علاوہ اور کسی قسم کو شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ قیاس کے منکر ہیں ملاحظہ ہو نیل الاوطار اور دیگر کتب فقہ،

(۳) تیسرا گروہ داؤد بن علی الظاہری اور اس کی جماعت ہے، ان کے نزدیک اللہ کے دین میں قیاس کرنا باطل ہے[1]۔ داؤد کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں قرآن وسنت میں صاف حکم موجود نہ ہو یا ان کی عبارت سے اس کا پتہ نہ چلتا ہو، لہٰذا قیاس کی کوئی ضرورت نہیں ہے خواہ نص شرعی میں حکم کی علت بیان کردی گئی ہو بلکہ جیسا کہ شوکانی نے بیان کیا ہے ان لوگوں کے نزدیک ایک مجتہد عالم کا یہ فرض نہیں ہے کہ اگر کسی حکم کی علت نہ بیان کی گئی ہو تو وہ اس کے سبب وعلت کو تلاش کرکے قیاس کرنا شروع کردے۔ ظاہریہ کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے ''صاحب شریعت نے جس کو ضروری اور واجب قرار دیا ہو وہ واجب ہے اور جس کو حرام کردیا ہو وہ حرام ہے اور جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہو وہ معاف ہے''

کہتے ہیں کہ داؤد الظاہری قیاس جلی کا منکر نہیں ہے وہ صرف قیاس خفی کا انکار کرتا ہے وہ قیاس کو صرف اسی صورت میں جائز سمجھتا ہے جبکہ کتاب وسنت میں حرام وحلال کا صاف حکم موجود ہو اور اس کا سبب بھی صاف طور پر بیان کیا گیا ہو مثلاً یہ کہا جائے ''گیہوں کے بدلے میں گیہوں زیادہ کرکے فروخت کرنا حرام ہے کیونکہ یہ ناپ تول سے فروخت کئے جاتے ہیں'' یا یہ کہا جائے ''اس کپڑے کو دھولو کیونکہ اس میں خون ہے'' اسی طرح دوسری مثالیں موجود ہیں۔ اس قول کے باوجود داؤد الظاہری کی یہ رائے ہے ''کسی حکم کو ثابت کرنے کا اصل سبب وہ نص شرعی ہے جس میں اس کی علت مذکور ہوتی ہے لہٰذا علت مذکورہ کو قیاس

---

[1] داؤد بن علی خلف الاصبہانی ۲۰۰ھ یا ۲۰۲ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوا اور بغداد میں اس نے نشوونما پائی اور وہیں ۲۷۰ھ میں اس کا انتقال ہوا وہ ایک مخصوص مسلک کا بانی مبانی تھا۔ جس کی بنیاد اس پر تھی کہ کتاب وسنت کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا جائے یا اجماع پر اس صورت میں عمل کیا جائے جب کہ ظاہری عبارت کے علاوہ اور کوئی مفہوم مراد لیا جائے۔ وہ قیاس کا قطعی منکر تھا اس کے خیال میں کتاب وسنت کے عام الفاظ قیاس سے بے نیاز کردیتے ہیں۔

کہنا مجازی طور پر ہے "

بعض علماء نے قیاس کی کچھ صورتوں کو جائز قرار دیا ہے اور کچھ صورتوں سے انکار کیا ہے یہ لوگ قیاس کی صرف ان دو صورتوں کے قائل ہیں:-

(۱) اصل مسئلہ میں کسی حکم کی علت اور سبب کو بیان کیا گیا ہو،

(۲) وہ حکم جسے بیان نہ کیا گیا ہو، اصل حکم سے بڑھ کر ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا والدین کے بارے میں قول ہے "ان دونوں کو اف تک نہ کہو" لہٰذا جب والدین کو اُف تک کہنا بھی حرام ہو تو انہیں زدوکوب کرنا بدرجہ اولیٰ حرام ہے، علامہ شوکانی بھی ایسے قیاس کی طرف مائل ہیں انھوں نے اہل قیاس کے دلائل پر تنقید کرنے کے بعد یہ کہا ہے " وہی قیاس درست ہو سکتا ہے جس کی علت بیان کی گئی ہو یا فرعی مسئلہ اصل حکم سے اپنے درجے میں بڑھ چڑھ کر ہو"

مخالفین کے دلائل

اب ہم مخالفین قیاس کے بعض دلائل بیان کرتے ہیں۔

(۱) (قیاس کی ممانعت کو) انھوں نے اس آیت کریمہ سے ثابت کیا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا	اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے
اللہ واطیعوا الرسول واولی	رسول کی اور ان کی جو تم میں سے
الامر منکم فان تنازعتم	صاحب حکم ہوں اطاعت کرو اگر تمھارا
فی شیء فردوہ الی اللہ	کسی چیز میں اختلاف ہو تو (اس معاملہ
والرسول ان کنتم تومنون	کو) اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو بشرطیکہ
باللہ والیوم الآخر۔	اللہ اور روز آخرت پر تمھارا ایمان ہو

(پ۵ سورہ نساء)

(وہ یہ کہتے ہیں کہ) کسی معاملے میں یا تو اللہ کی طرف رجوع کیا جائے گا جو کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہو اور رسول کی طرف ان کی زندگی میں رجوع کیا جائے گا۔ اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی سنت کا اتباع کیا جائے گا۔ لیکن قیاس کا ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک چیز سے کوئی تعلق نہیں ہے،

(۲) انھوں نے دوسرا ثبوت اس آیت سے پیش کیا ہے۔

وَمَا اختلفتم فیہ شیءٍ فحکمہ الی اللہ۔ — جس چیز کے بارے میں تمھارا اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے

اس آیت میں یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اختلاف کی صورت میں اللہ کا فیصلہ قابل قبول ہوگا اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ اپنے قیاس اور رائے سے فیصلہ کرو بلکہ اللہ نے لوگوں کے قیاس اور رائے کو امت اسلامیہ کے درمیان کبھی فیصلہ کن معیار قرار نہیں دیا۔

(۳) وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہرگز قیاس کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ آپ سے یہ صحیح روایت منقول ہے کہ جب آپ نے حضرت عمرؓ اور حضرت اسامہؓ کے پاس دو ریشمی پوشاکیں بھیجیں، تو اس سلسلے میں انھوں نے اپنے اجتہاد سے جو قیاس کیا تھا، اسے آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔ اس وقت حضرت اسامہؓ نے اپنے آپؐ کو اس کا مالک سمجھ کر وہ پوشاک پہن لی تھی مگر حضرت عمرؓ نے اسے اس لئے واپس کر دیا تھا کہ اس کا مالک بن کر انھیں یہ پوشاک ضرور پہننی پڑے گی۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے (اپنے قیاس کے مطابق) اسے حرام قرار دیا۔ اور حضرت اسامہؓ نے اسے (اپنے قیاس کے مطابق) جائز قرار دیا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قیاسوں کو باطل ٹھہرایا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا ——— میں نے یہ پوشاک تمھارے پاس اس لئے بھیجی تھی کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ" حضرت اسامہؓ سے آپؐ نے فرمایا۔" میں نے یہ پوشاک تمھارے پاس اس لئے نہیں بھیجی تھی کہ تم اسے پہن ڈالو بلکہ میں نے اسے اس لئے بھیجا تھا کہ اسے پھاڑ کر اپنی عورتوں کے لئے دوپٹے بناؤ۔"

(۴) وہ اس حدیث سے بھی استدلال لائے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ——— اللہ تعالیٰ نے چند فرائض مقرر کئے ہیں انھیں ضائع نہ کرو اور چند حدود مقرر کئے ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور چند چیزوں سے منع فرمایا ہے ان میں مشغول نہ ہو جاؤ اور چند چیزوں سے ازراہ ہمدردی اس نے خاموشی اختیار کی ہے وہ انھیں بھولا نہیں ہے لہٰذا ان کی کرید نہ کرو۔" اس حدیث کی بنا پر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان چیزوں کے بارے میں جس پر خدا نے سکوت اختیار کیا ہو، بحث کر کے اسے حرام یا

واجب قرار نہیں دینا چاہیئے۔

(۵) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر قیاس دلیل وحجت ہوتا تو مختلف قسم کے قیاس ایک دوسرے کے متعارض نہ ہوتے اور ایک قیاس دوسرے کی کوئی تردید نہ کرتا حالانکہ اہل قیاس میں سے ہر ایک یہی کہتا ہے کہ اس کا قول صحیح قیاس پر مبنی ہے مگر ان کے قیاس کے اصول واحکام ایک دوسرے سے مختلف ہیں جبکہ اللہ کے دلائل اور احکام مختلف اور متضاد نہیں ہوتے، لیکن اہل قیاس کے دلائل واحکام میں بہت اختلاف وتضاد پایا جاتا ہے اور ان میں طرح طرح کی الجھنیں اور پیچیدگیاں ہیں اس لئے وہ شرعی احکام کے لئے کیسے دلیل بن سکتے ہیں [1] اس کے علاوہ اہل قیاس ان چیزوں کو ملا دیتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے الگ کیا ہے اور جن چیزوں کو اللہ نے جمع کر رکھا ہے، انھیں جدا کر دیتے ہیں، پہلی مثال یہ ہے کہ وہ نجاست دور کرنے اور باوضو ہونے کی حالت کو ایک ہی حکم میں شامل کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نیت کے بغیر دونوں چیزیں یکساں درست ہوجاتی ہیں، حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان میں فرق رکھا ہے۔ کیونکہ پانی قدرتی طور پر نجاست کو دور کر کے کسی چیز کو پاک وصاف کر دیتا ہے، اس لئے اس میں نیت کی شرط نہیں ہے مگر وضو یا غسل کے ذریعے ناپاکی کو دور کرنا اس کے مشابہ نہیں ہے اس صورت میں پانی قدرتی طور پر ناپاکی کو دور نہیں کرتا ہے، کیونکہ حدث (ناپاکی) محسوس ہونے والی شے نہیں ہے، کہ اسے دور کر دے بلکہ یہ چیز نیت کے ذریعے دور ہوتی ہے،

دوسری بات (اہل قیاس کے خلاف) یہ کہی گئی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے ایک حکم میں جمع کر رکھا ہے انہیں جدا کر دیا گیا ہے مثلاً جس طرح نماز کے ارکان کو ایک

---

[1] (مخالفین کے دلائل کے سلسلے میں) پہلی دو آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں قیاس کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی ہے تیسری دلیل کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت اسامہؓ نے اپنے قیاس میں غلطی کی ہو، اور چونکہ ہر قیاس صحیح نہیں ہوتا ہے اس لئے غلط قیاس ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیاس کا شرعی رہا قی صفحہ

خاص ترتیب کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح جسم کے اعضا کو خاص ترتیب کے ساتھ وضو میں دھونا ضروری ہے، مگر انھوں نے (اہل قیاس نے) نماز کے ارکان کی ترتیب کو ضروری قرار دیا لیکن وضو کے اعضاء کی ترتیب کو ضروری نہیں رکھا حالانکہ درحقیقت ان میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ان کی نقل و روایت میں فرق رکھا گیا ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خدا کے احکام کے شارح اور مفسر ہیں ہمیشہ ترتیب کے ساتھ وضو فرمایا اور عمر بھر کبھی بے ترتیب وضو نہیں کیا اسی طرح آپ نے ہمیشہ ارکان کی ترتیب کے ساتھ نماز پڑھی، لہذا ان دونوں میں اس طرح کی تفریق کیسے درست ہو سکتی ہے،

بے بنیاد دلائل

حق بات یہ ہے کہ قیاس کے مخالفین کے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو اعتراض اور تنقید سے سالم رہ سکے اس کی تردید ہم نے گذشتہ صفحے کے فٹ نوٹ میں تحریر کر دی ہے وجہ یہ ہے کہ مخالفین کی رائے ایک ایسی شریعت کے شایان شان نہیں ہے جس نے آکر تمام شریعتوں اور مذاہب کا خاتمہ کر دیا ہو، یہ اسلامی شریعت ایسی ہے جسے اللہ وہ قوت اور صلاحیت دینا چاہتا ہے جس کی بدولت وہ غیر فانی ہو کر ہمیشہ برقرار رہے، جب اس کا یہ حال ہو تو یہ تقریباً محال ہے کہ کتاب و سنت کے نصوص اور ان کے الفاظ آنے والے تمام واقعات و مسائل پر حاوی ہو سکیں اور صاف صاف حکم بتا سکیں۔ اس لئے نئے نئے واقعات و مسائل کا حل معلوم کرنے کے لئے اجتہاد

(بقیہ صفحہ ۲۳۴) طور پر استعمال کرنا ممنوع ہو، اسی طرح مذکورہ بالا حدیث سے جو بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ثابت نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس میں زیادہ سوال کرنے کی ممانعت آئی ہے تاکہ اس کی وجہ سے وحی یا دوسرے ذرائع سے کوئی چیز حرام نہ ہو جائے جیسا کہ کسی نے یہ پوچھا تھا کہ "کیا حج ہر سال فرض ہے" ان کی پانچویں دلیل سے انتہائی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیاس کا حد سے زیادہ استعمال جیسا کہ بعض احناف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے قیاس میں غلطیاں اور خلل پیدا کر دیتا ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ شریعت میں قیاس کا استعمال ممنوع ہے۔"

کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی، خواہ اس مقصد کے لئے شرعی نصوص پر بھروسہ کیا جائے یا رائے اور قیاس کا سہارا لیا جائے اس کی تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی

قیاس کی حمایت

اکثر صحابہؓ، تابعین، فقہاء اور متکلمین کا یہ فیصلہ ہے کہ رائے اور قیاس کے ذریعے اجتہاد کرنا شریعت اسلامیہ کا ایک بنیادی اصول ہے اور اس کے ذریعے شرعی احکام کو ثابت کیا جا سکتا ہے اس بارے میں کئی احادیث منقول ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ، اور تابعین کے عہد میں جب کتاب و سنت میں کوئی حکم نہیں ملتا تھا تو اس وقت قیاس پر عمل ہوا کرتا تھا۔

قیاس کے موافقین نے قیاس شرعی کو ثابت کرنے کے لئے عقلی اور نقلی دونوں قسم کے دلائل پیش کئے ہیں جس میں انھوں نے کتاب و سنت اور اجماع کی طرف رجوع کیا ہے گو ان کے کچھ دلائل نقد اور خامیوں سے خالی نہیں ہیں، تاہم ان کے دلائل بالعموم زوردار ہیں، ان کے چند دلائل کو بیان کیا جا رہا ہے:—

(۱) موافقین قیاس یہ کہتے ہیں "قرآن و حدیث کی نصوص (الفاظ و عبارات) تمام احکام کو واضح طور پر بیان نہیں کرتے ہیں کیونکہ یہ نصوص محدود ہیں، اور حوادث اور واقعات نہ ختم ہونے والے ہیں لہٰذا جو احکام نہیں بیان کئے گئے ہیں انھیں ثابت کرنے کے لئے ہم رائے اور قیاس کے محتاج رہیں گے، اس صورت میں ہم اسلام کے عام اور مشہور اصولوں اور ان احکام کے اسباب کا سہارا لے کر کام کریں گے اور اپنے مسائل کا حل ان جیسے صاف اور واضح احکام پر قیاس کر کے معلوم کریں گے نیز ملتے جلتے احکام میں اصل سبب معلوم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے سورہ حشر میں فرمایا ہے،

فاعتبروا یا اُولی الابصار — اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو

اس سے قیاس کا استعمال ثابت ہوتا ہے مگر یہ دلیل موافق و مخالف کے لئے محل نزاع ہے،

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو آپؐ نے ان سے پوچھا ۔۔۔ "جب تمھارے سامنے مقدمہ درپیش ہو تو تم کیا کروگے؟" انھوں نے فرمایا ۔۔۔ "میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔ "اگر وہ کتاب اللہ میں نہ ہو" اس پر انھوں نے فرمایا ۔۔۔ "رسولؐ اللہ کی سنت کے مطابق عمل کروں گا" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔ "اگر سنت میں بھی وہ معاملہ نہ ہو" اس پر وہ کہنے لگے ۔۔۔ "میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا"۔ حضرت معاذؓ کا بیان ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا سینہ تھپک کر فرمایا ۔۔۔ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہؐ کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جو اس کے رسولؐ کی مرضی کے مطابق ہے"،

اس واقعہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص شرعی میں حکم موجود نہ ہونے کی صورت میں حضرت کے اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کے فیصلے کو پسند فرمایا ہے

(۴) خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بہت دفعہ قیاس کرنے کا ثبوت ملتا ہے یہاں تک کہ ناصح الدین ابوالفرج عبدالرحمن بن نجم نے جو ابن الحنبلی[1] کے نام سے مشہور ہیں آپ کے قیاسات کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں یہ حدیث مذکور ہے ۔۔۔ "ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی ۔۔۔ "میری ماں نے منت مانی تھی کہ وہ حج کرے گی مگر حج کرنے سے پہلے مرگئی کیا میں اس کی طرف سے حج کروں" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔ "ہاں اس کی طرف سے حج کرلو، اگر تمھاری والدہ پر کچھ قرضہ ہو تو کیا تم اسے ادا کروگی؟" اس نے کہا ۔۔۔ "ہاں، ضرور ادا کروں گی" آپؐ نے فرمایا ۔۔۔ "اللہ کا حق ادا کرو کیونکہ اللہ سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کا حق ادا کیا جائے"

دوسری حدیث یہ ہے "ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا ۔۔۔ "میری عورت نے ایک کالا لڑکا جنا ہے۔ مجھے (اس کو اپنا جائز

[1] ان کی پیدائش اور وفات دمشق میں ہوئی، ان کی وفات سنہ ۶۳۴ھ میں ہوئی

بیٹا تسلیم کرنے سے) انکار ہے" آپؐ نے فرمایا ــــ "کیا تمھارے پاس کچھ اونٹ ہیں" اس نے کہا "ہاں" آپؐ نے فرمایا ــــ "ان کے رنگ کیا ہیں" اس نے کہا ــ "وہ سرخ رنگ کے ہیں"، آپؐ نے فرمایا ــــ "کیا ان میں سے کچھ خاکی رنگ کے بھی ہیں" اس نے کہا "ہاں ان میں کچھ خاکی رنگ کے ہیں"، آپؐ نے فرمایا ــــ "وہ اس رنگ کے کیسے ہوگئے؟" اس نے کہا ــ "شاید کوئی رگ اس میں کھنچ کر آگئی ہو" آپؐ نے فرمایا ــ "یہی حال اس لڑکے کا ہے"[1] بہرحال آپ نے اجازت نہیں دی کہ وہ (اس کی ولدیت سے) دستبردار ہو جائے۔

(۵) اللہ اور اس کے رسولؐ نے بہت سے احکام کے ساتھ ان کے اسباب و علل کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور ان پر اثر انداز ہونے والے اوصاف کو بیان کیا ہے ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان احکام کا ان اسباب و اوصاف سے بہت بڑا تعلق ہے اور ان پر ان احکام کا دار و مدار ہے، قیاس کا بھی یہی مفہوم ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے بارے میں یہ فرمایا ہے:-

"یہ نجس نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو تم پر ہر وقت گشت کرتی رہتی ہیں" اسی طرح آپ نے نکاح میں پھوپھی اور خالہ کے ساتھ ان کی بھتیجی اور بھانجی کو شامل کرنے سے منع فرمایا ہے کہ اگر تم یہ کام کروگے تو تم اپنی رشتہ داری کے تعلقات کو قطع کردوگے" ایک دوسری جگہ آپ نے فرمایا ہے، اللہ اور اس کے رسول تمھیں گدھوں کے گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ یہ غلاظت ہے" اسی طرح باری تعالیٰ کا قول ہے ــــ "وہ لوگ تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہدیجئے (اے پیغمبر) کہ وہ نجاست ہے لہٰذا حیض کے زمانے میں عورتوں سے الگ رہو۔"

(۶) بعض صحابہؓ کے اقوال سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ رائے اور قیاس سے اجتہاد کرنے کو تسلیم کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کے نام حضرت عمر بن الخطابؓ کا جو رسالۂ قضا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں ــ "وہ بات

[1] اعلام الموقعین حصہ اوّل صفحہ ۱۷۳

جو کتاب و سنت میں نہ ہو اور تمہارے دل میں کھٹکتی ہو اسے اچھی طرح سمجھو پھر اس کے مشابہ احکام اور نظائر کو معلوم کرو اور ان پر اس کو قیاس کرو اور جو بات اللہ اور حق و صداقت کے زیادہ قریب ہو اسے اختیار کرو۔" اسی طرح قاضی شریح کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا ــــ کتاب اللہ سے جو بات تمہیں معلوم ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر تمہیں کتاب اللہ سے وہ بات معلوم نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر عمل کرو اگر ان کے تمام احکام معلوم نہ ہوں تو اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کرو۔ اور اہل علم و عمل سے مشورہ کرو[1]

صدیوں تک مشرق و مغرب کے تمام اسلامی ممالک میں مسلم قوم قیاس کے مطابق عمل کرتی رہی ان میں سے چند لوگ اس دائرہ عمل سے باہر رہے[2] بعض علماء نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قیاس کے استعمال پر صحابہؓ کا اجماع ہے، تاہم یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ ناگہانی واقعات کی صورت میں اکثر صحابہؓ اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام میں دوسرے احکام پر قیاس کیا کرتے تھے بلکہ ایک مشابہ معاملہ کا دوسرے مشابہ معاملے سے اندازہ لگا کر فیصلہ کرتے تھے اور جب کوئی نص شرعی موجود نہ ہوتی تھی تو وہ اپنی رائے کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے،

حضرت عمرؓ کا اجتہاد

حضرت عمرؓ اس معاملے میں سب سے زیادہ جرأت کا ثبوت دیتے تھے تاکہ حق بات کا اظہار ہو سکے ایک دفعہ ان کے سامنے یہ معاملہ لایا گیا کہ ایک آدمی کو اس کی سوتیلی ماں اور اس کے آشنا نے قتل کیا۔ حضرت عمرؓ سوچنے لگے کہ کیا ایک آدمی کے بدلے میں کئی آدمیوں کو قتل کیا جائے یا نہیں؟ اس پر حضرت علیؓ کہنے لگے۔

" اگر کئی آدمی ایک ذبح کئے ہوئے اونٹ کے چرانے میں اس طرح شریک

---

[1] اعلام الموقعین حصہ اول صفحہ ۱۷۷

[2] یہ عبارت ابن دقیق السعید کی ہے

ہو جائیں کہ ایک آدمی اس کا ایک عضو چرالے اور دوسرا اس کا دوسرا عضو لے جائے تو کیا آپؓ ان سب کا چوری میں ہاتھ کاٹیں گے؟ آپؓ نے فرمایا۔ "ہاں" حضرت علیؓ نے کہا ــــ "یہ معاملہ بھی اسی طرح کا ہے" اس پر حضرت عمرؓ نے اپنے عامل کو لکھ کر بھیج دیا کہ ان دونوں کو قتل کردیا جائے[1]

حضرت عمرؓ کی طرف یہ واقعہ بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ انھوں نے قحط سالی میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا تھا اور آپؓ نے یہ بھی حکم دے دیا تھا کہ اگر ایک لفظ کے ساتھ تین طلاقیں کہی جائیں تو تین طلاقیں واقع ہوں گی اس کے بارے میں ان کا یہ قول تھا ــ "لوگوں نے ایک ایسے کام میں جلد بازی شروع کردی ہے جس میں نہایت صبر و تحمّل سے کام لینا چاہیئے تھا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے ہم یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں۔"

میراث کا مسئلہ

ایک دفعہ میراث کے ایک مسئلے میں صحابہؓ کا اختلاف ہوگیا وہ مسئلہ یہ تھا کہ ایک عورت مرگئی اور اس نے یہ ورثاء چھوڑے، شوہر، والدہ، اخیافی بھائی، سگے بھائی۔ ایک صحابیؓ کی یہ رائے تھی کہ شوہر کو نصف حصہ دیا جائے ماں کو چھٹا اور اخیافی بھائیوں کو تہائی حصہ ملے اس طرح سگے بھائیوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ دوسرے صحابیؓ کی یہ رائے تھی کہ سگے بھائیوں کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ تہائی حصہ میں شریک کیا جائے۔ جب یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے سگے بھائیوں کے لئے کوئی حصہ نہیں مقرر کیا اس پر وہ بھائی کہنے لگے ــ "اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ ہمارا باپ گدھا تھا تو کیا ہم سب ایک ماں سے نہیں ہیں (اگر باپ کی طرف سے نہیں تو ایک ماں کی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ سب اس حصہ میں شریک ہیں) اس پر آپ نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کیا اور ان سب کو حصہ میں شریک کیا۔

ابن العربی نے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ قیاس مذہب کا بنیادی اصول ہے

---

[1] اعلام الموقعین

فرمایا ــــ "حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہؓ نے جب قرآن کریم کی کتابت شروع کی تو نص نہ ہونے کی صورت میں انھوں نے بھی قیاس سے کام لیا اور سورۂ برأۃ کو سورۂ انفال کے ساتھ شامل کرلیا کیونکہ انھوں نے یہ ملاحظہ کیا کہ سورۂ برأۃ کا مضمون سورۂ انفال کے مضمون کے مشابہ ہے جب قرآن کریم کی ترتیب میں قیاس کو صحیح اور معتبر سمجھا گیا ہو تو دیگر احکام میں وہ بدرجہ اولیٰ معتبر ہے [1]"

صحابہ کا اجتہاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے احکام میں صحابۂ کرامؓ کے اجتہاد کا ثبوت ملتا ہے اس موقع پر آپؐ نے انھیں کبھی منع نہیں فرمایا اور نہ ان پر سختی کی (اس کی مثال یہ ہے کہ) آپؐ نے صحابہؓ کو جنگ احزاب کے موقع پر یہ حکم دیا کہ ــــ "قبیلۂ بنو قریظہ میں عصر کی نماز پڑھیں" اس حکم پر بعض صحابہؓ نے اجتہاد کرکے راستے میں نماز پڑھ لی اور کہنے لگے ــــ "آپؐ کا منشا یہ نہ تھا کہ ہم تاخیر کریں، بلکہ آپؐ یہ چاہتے تھے کہ ہم جلد روانہ ہوجائیں اس لئے انھوں نے حقیقی مفہوم کو پیش نظر رکھا مگر دوسرے لوگوں نے (اسے لفظ بلفظ) ماننے کی کوشش کی اور (نماز میں تاخیر کردی یہاں تک کہ جب وہ قبیلہ بنو قریظہ کے علاقہ میں پہنچے تو رات کے وقت انھوں نے نماز پڑھی،

دوسرا واقعہ حضرت سعد بن معاذؓ کا ہے کہ جب انھیں قبیلہ بنو قریظہ کے معاملے میں ثالث بنایا گیا تو انھوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کیا جسے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پسند کیا اور ارشاد فرمایا ــــ "تم نے ساتوں آسمانوں کے اوپر خدا کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ سنایا"

تدوین فقہ کے ابتدائی دور میں چاروں اماموں نے قیاس کو شریعت کا ایک بنیادی اصول تسلیم کیا ہے مگر اسے کم یا زیادہ استعمال کرنے کے بارے میں ان کا اختلاف ہے وہ ایک ہی درجہ پر قیاس کو استعمال نہیں کرتے تھے، حنبلی حضرات نے قیاس کو سب سے کم استعمال کیا اور احناف نے سب سے زیادہ قیاس سے کام لیا۔ مالکی اور شافعی علماء قیاس کے استعمال میں ان دونوں فرقوں کے درمیان میں تھے

[1] تفسیر قرطبی حصہ ہشتم صفحہ ۶۳ مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۳۵۸ھ مصر۔

امام ابوحنیفہؒ

عراق کے اکثر فقہاء قیاس کے ماہر تھے بالخصوص امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی قیاس کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے میں ضرب المثل ہو گئے تھے اور ان کی بہت شہرت تھی، بالخصوص امام ابوحنیفہؒ قیاس کے معاملے میں ایسی راہ پر گامزن ہوئے کہ اپنے پیشروؤں سے سبقت لے گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت تیز فہم، ذہین اور دوربین تھے، علم فقہ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے انھوں نے علم کلام میں مہارت پیدا کرلی تھی اس لئے ان کے دلائل بہت زوردار ہو گئے تھے بلکہ ان کے دلائل اس قدر مستحکم ہوا کرتے تھے کہ لوگ یہ کہنے لگے کہ اگر امام ابوحنیفہ یہ ثابت کریں کہ یہ ستون سونے کا ہے تو وہ ایسا کر سکتے ہیں،

امام ابوحنیفہؒ کسی فتویٰ کے پیش ہونے کا انتظار نہیں کرتے تھے اور نہ وہ کسی واقعہ کے رونما ہونے کا انتظار کرتے تھے۔(بلکہ قبل از وقوع مسائل کو بھی حل کر دیتے تھے) وہ امام قتادہ سے فرمایا کرتے تھے ـــ "علماء کسی واقعہ کے رونما ہونے پر تیاری کرتے ہیں اور اس سے پیشتر وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں" ائمہ کے کتب مناقب میں کئی واقعات ایسے مذکور ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؒ قیاس کے بہت ماہر تھے اور آپؒ کی قوتِ تقریر اور دلائل زبردست ہوتے تھے،

ایک دفعہ آپؒ کے سامنے ایک عالم کا یہ قول نقل کیا گیا ـــ "یہ کہنا کہ۔ میں نہیں جانتا ہوں" نصف علم کے برابر ہے" اس پر آپؒ نے فرمایا ـــ "اسے دومرتبہ یہ کہنا چاہیئے کہ میں نہیں جانتا تاکہ علم کی تکمیل کر سکے"

ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ سے دریافت کیا گیا ـــ "ایک ایسے پیالے میں پانی پینا جس کے کنارے چاندی کے ہوں، کیسا ہے؟" آپؒ نے فرمایا ـــ "کوئی حرج نہیں ہے" اس پر کسی نے کہا۔ کیا سونے اور چاندی کے برتن میں پانی پینا منع نہیں ہے؟" آپ نے فرمایا ـــ "ایک آدمی نہر کے پاس سے گزرے اسے اس وقت بہت پیاس لگی ہو اور اس کے پاس کوئی برتن نہ ہو لہٰذا اگر وہ نہر سے اپنے ہاتھ میں پانی کا چلو بھر کے اوک سے پانی لے مگر اس کی انگلی میں (چاندی کی) انگوٹھی ہو تو کیا اس کا پانی پینا جائز ہے یا نہیں؟" اس آدمی نے کہا ـــ "کوئی حرج نہیں ہے" امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ـــ "یہ مسئلہ بھی ایسا ہے"

مدینہ منورہ سے علماء کی ایک جماعت امام ابو حنیفہؒ کے پاس اس مقصد کے لئے آئی کہ وہ امام کے پیچھے قرأت پڑھنے کے بارے میں ان سے مناظرہ کرے، امام موصوف امام کے پیچھے قرارت پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ آپؒ نے ان سے فرمایا۔ سب لوگوں سے مناظرہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے تم میں سے جو سب سے بڑا عالم ہو اس کو اپنا نمائندہ بنادو" اس پر انھوں نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا آپؒ نے فرمایا۔ کیا یہ تم میں سب سے بڑا عالم ہے، اور اس کے ساتھ مناظرہ کرنا ایسا ہے جیسا تمھارے ساتھ مناظرہ کرنا ہو" انھوں نے کہا۔ "ہاں" آپ نے فرمایا "اگر میں نے اس کے ساتھ مناظرہ کیا اور اس پر غالب آگیا تو تمھیں اسے تسلیم کرنا ہوگا کیونکہ تم نے اسے اپنا نمائندہ تسلیم کیا ہے" انھوں نے کہا: "ہاں" آپ نے فرمایا۔ "ہم نے امام کو اسی طرح نمائندہ منتخب کیا ہے اس کی قرأت ہماری قرأت ہے" ایسی مثالیں بہت ہیں۔

قیاس میں افراط و تفریط

مذکورہ بالا بیانات سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ فرقہ ظاہریہ اور ان کے ماننے والوں نے قیاس کی مخالفت کی ہے اور بعض حنفی علماء نے حد سے زیادہ قیاس کو استعمال کیا ہے اس طرح ان دونوں جماعتوں نے قیاس کے معاملے میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے فرقہ ظاہریہ نے احکام کے حقیقی مفہوم اور اس کے اسباب و علل اور ان کے اثرات کو معلوم کرنے کا دروازہ اپنے اوپر بند کر دیا ہے اس طرح انھوں نے اس اسلامی شریعت پر ظلم کیا ہے جن کی بنیاد عقل اور اسباب و علل پر ہے اور اس میں لوگوں کی بھلائی کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور خرابیوں کو دور کیا جاتا ہے مگر انھوں نے قیاس کا انکار کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے اسی طرح جن لوگوں نے قیاس کے استعمال میں حد سے تجاوز کیا ہے وہ بھی باطل پرستی میں مبتلا ہیں اور حق و صداقت کو کھو بیٹھے ہیں،

جیسا کہ علامہ ابن القیمؒ نے فرمایا۔ "بہتر طریقہ یہ ہے کہ مجتہد درمیانی راہ پر گامزن رہے بلکہ حق و صداقت کا طریقہ یہی ہے کہ اعتدال کو اختیار کیا جائے اور افراط و تفریط سے پرہیز کیا جائے۔ ابن القیمؒ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین"

کے حصہ اول میں قیاس پر جو شریعت کے اصول و فروع پر حاوی ہے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، کہ لوگ قیاس کے معاملے میں دو رخ پر ہیں اور اس کا ایک درمیانی راستہ بھی ہے اس کے بعد انھوں نے قیاس کے موافق و مخالف کے خیالات ظاہر کئے ہیں اور دونوں طریقوں کے دلائل بیان کرنے کے بعد افراط و تفریط کو چھوڑ کر درمیانی مسلک اختیار کرنے کی دعوت دی ہے اس طرح انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے اور کسی دوسرے کے لئے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے،

قیاس کا دائرہ عمل قیاس کا دائرہ عمل انہی چیزوں تک محدود ہے جن کی حقیقت اور ان کا مفہوم عقل میں آسکے اور جن باتوں کو عقل نہ سمجھ سکتی ہو وہاں قیاس نہیں چل سکتا ہے نہ عام علمار امت کا یہی مسلک ہے صرف چند آدمی اس کے مخالف ہیں، البتہ حدود و کفارہ کے مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں علمار کا یہ اختلاف ہے کہ آیا ان مسائل میں بھی قیاس کا کوئی دخل ہے یا نہیں؟ حنفی علمار کا یہ مسلک ہے کہ اس میں قیاس نہیں چل سکتا کیونکہ ان میں ایسی باتیں ہیں جو عقل کے دائرہ سے باہر ہیں مثلاً زنا کاری میں کوڑے مارنے کی تعداد ۱۰۰ ہے، اور تہمت لگانے کی سزا ۸۰ کوڑے ہیں، لہٰذا عقل یہ نہیں سمجھ سکتی کہ ایک جرم میں ۱۰۰ کی مخصوص تعداد کیوں ہے اور دوسرے جرم میں ۸۰ کوڑے کی تعداد کیوں ہے؟ اس لئے قیاس صرف وہیں جاری ہو سکتا ہے جہاں عقل کسی حکم کے اسباب و علل کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ البتہ چور کے ہاتھ کاٹنے کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ اس نے ہاتھ سے چوری کی، تاہم اس میں خطا اور غلطی کا احتمال ہے اس لئے حدود میں قیاس کے استعمال کو منع کیا گیا ہے۔ یہی حال کفارہ کا ہے اسی طرح رکعتوں کی مخصوص تعداد کا سبب معلوم کرنا عقل کے دائرہ سے باہر ہے،

غیر حنفی علمار حدود و کفارہ میں بھی قیاس کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ قیاس کو ہر جگہ استعمال کرنا ثابت کیا گیا ہے ان میں حدود و کفارہ

۱؎ امام شوکانی نے اپنی کتاب ارشاد الفحول میں اسی مثال میں ملزم کے خاندان پر دیت مقرر کرنے کا مسئلہ پیش کیا ہے مگر ان کی یہ مثال تنقید و اعتراض سے خالی نہیں ہے

بھی شامل ہیں لہٰذا ان میں بھی ان کا استعمال کرنا ضروری ہے جیسا کہ صحابہؓ نے قیاس اور مشورہ کے بعد شراب نوشی کی سزا مقرر کی تھی بلکہ حضرت علیؓ نے اس موقع پر قیاس سے کام لے کر یہ فرمایا ـــ "جب کوئی شراب پیتا ہے تو وہ نشے میں مخمور ہو کر بے ہودہ بکواس کرتا ہے اور دوسروں پر تہمت باندھتا ہے اس لئے میری رائے میں اس پر تہمت کی حد مقرر ہونی چاہیئے" اس قیاس پر حضرت عمرؓ نے شراب نوشی کی سزا تہمت کی سزا کے برابر یعنی اسّی کوڑے مقرر کی تھی لہٰذا یہ علماء ثابت کرتے ہیں کہ قیاس حدود و کفارہ کے علاوہ دوسری چیزوں میں اس لئے قابل عمل ہے کہ ان چیزوں میں رائے اور گمان کا دخل ہو سکتا ہے چونکہ رائے اور قیاس کا دخل کبھی حدود و کفارہ میں بھی ہو جاتا ہے، اس لئے ان دونوں چیزوں میں اسے استعمال کرنا چاہیئے۔ [۱]

---

[۱] ارشاد الفحول از شوکانی

بحثِ قیاس کے ماخذ

اور

کتب حوالہ جات

(۱) تاریخ التشریع الاسلامی ۔ خضری (۲) ارشاد الفحول ـــــ شوکانی ۔

(۳) اعلام الموقعین ـــ ابن قیم (۴) الطرق الحکمیہ ـــ ابن قیم ۔

(۵) نیل الاوطار ـــ شوکانی (۶) فجر الاسلام ـــ احمدامین

(۷) اصول الفقہ ـــــــــــــــ خضری

(۸) التوضیح فی اصول الفقہ ـــــــــــــ عبداللہ بن مسعود الحنفی

(۹) التلویح فی اصول الفقہ ـــــــــــــ سعدالدین تفتازانی

(۱۰) کتاب الام ـــــــــ امام شافعی (٭)

باب دوم

اخلاقی اصول

یا

استدلال

گذشتہ صفحات میں وہ متفقہ بنیادی اصول بیان کئے گئے تھے جن پر علمائے اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے، وہ اصول کتاب وسنت اجماع اور قیاس ہیں ان کے علاوہ دیگر اصول بھی ہیں جن سے علماء اسلام نے شریعت کے احکام و قوانین کے استنباط کرنے میں فائدہ اٹھایا ہے ان کی تفصیلات اور ان کے طریقۂ استنباط میں مجتہدین میں اختلاف ہے تاہم ان کے ذریعے نئے نئے اسلامی قوانین کو زمانے کے مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق وضع کرنے میں بہت کام لیا گیا ہے، ان سب اصولوں کے لئے جامع لفظ استدلال مقرر کیا گیا ہے [1] اس میں یہ چار دلائل شامل ہیں :-

(۱) استصحاب الحال (۲) مصالح مرسلہ (۳) استحسان

(۴) گذشتہ پیغمبروں کے قوانین -

استدلال میں قول صحابی اور اہل مدینہ کے معمولات بھی شامل ہیں

(ان سب کا مفصل حال آئندہ فصلوں میں بیان ہوگا)

---

[1] ارشاد الفحول مطبوعہ ۱۳۴۹ھ صفحہ ۲۰۷ - علامہ شوکانی کا قول ہے کہ علماء کی اصطلاح میں استدلال اس اصول کو کہتے ہیں جو نہ تو کوئی نص شرعی ہو اور نہ اجماع وقیاس ہو،

فصل اوّل

قول صحابہ رضی اللہ عنہ

اقوال صحابہؓ کی دو صورتیں ہیں:۔

(۱) ایسے مسائل میں جہاں اجتہاد جاری نہ ہو سکتا ہو، کسی صحابیؓ نے کوئی شرعی مسئلہ یا فقہی حکم بیان کیا ہو اور دلائل سے یہ ثابت ہو جائے کہ صحابی نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہو، اگر ایسا معاملہ ہو تو صحابی کا قول سنت نبویؐ میں شامل سمجھا جائے گا اور وہ سنت نبوی کی طرح قابل اعتبار و اتباع ہے اس صورت میں یہ اختلافی دلیل نہیں ہے بلکہ متفقہ طور پر قابل تسلیم اصول ہے،

(۲) اگر اجتہادی مسائل میں کسی صحابیؓ کا قول مذکور ہو تو اس بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ یہ قول ان جیسے دوسرے صحابیؓ کے لئے حجّت نہیں ہے اس اتفاق رائے کو قاضی ابوبکر، آمدی اور ابن الحاجب وغیرہ نے بیان کیا ہے، البتہ صحابہؓ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کے لئے یہ قول کہاں تک قابل تسلیم ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے اور اس میں علماء کی یہ رائیں ہیں:۔

(الف) بعض علماء کا خیال ہے کہ اس قسم کا قولِ صحابیؓ شرعی حجّت ہے اور قیاس پر اسے مقدم کیا جائے گا۔ امام مالک اور اکثر حنفیہ کی یہی رائے بیان کی جاتی ہے اور امام شافعی کا یہ قدیم مسلک ہے ان کا استدلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہے:۔

"میرے صحابیؓ ستاروں کی مانند ہیں، تم جس کسی کی پیروی کروگے تمھیں اس کے ذریعے ہدایت حاصل ہوگی"۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ گمان غالب یہی ہے کہ صحابیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یہ بات کہی ہوگی اور اگر سماع

ثابت نہ ہو تو اس صورت میں بھی صحابیؓ کا قول حق و صداقت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں اور انھوں نے تمام حالات اور اسباب کو مشاہدہ کیا ہے جن کے زیر اثر شرعی احکام نازل ہوئے تھے اس لئے صحابی کا قول قابل ترجیح دلیل ہے،

(ب) بعض علمار کا یہ خیال ہے کہ اگر قولِ صحابیؓ کو قیاس کی تائید حاصل ہو جائے تو وہ شرعی حجت بن سکتا ہے، قاضی حسین وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ امام شافعی کے جدید مسلک کے مطابق ہے اور اسی پر شافعی مسلک کی بنیاد قائم ہے۔

(ج) اکثر علمار کی یہ رائے ہے کہ ایسا قول صحابی قطعی طور پر شرعی حجت نہیں بن سکتا اور جیسا کہ ارشاد الفحول میں مذکور ہے ان علمار کا استدلال یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں صحابیؓ معصوم نہیں ہے لہذا اس معاملے میں صحابیؓ اور دیگر مجتہدوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور اگر قولِ صحابیؓ کو حجت شرعی مان لیا جائے تو اجتماع ضدین لازم آتا ہے کیونکہ بعض احکام میں صحابہؓ کے متضاد اقوال منقول ہیں اور بہت سے مسائل میں خود صحابہؓ کا باہمی اختلاف پایا جاتا ہے امام غزالی نے بھی اس رائے کو قابلِ ترجیح سمجھا ہے کیونکہ شرعی حجت وہی ہو سکتی ہے جس کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو جائے جہاں تک صحابہؓ کا تعلق ہے وہ کبھی قیاس کرتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ قول صحابیؓ استنباط اور اجتہاد پر مبنی ہو[1]

امام شوکانی بھی اس رائے کی حمایت کرتے ہیں چنانچہ وہ اپنی کتاب ارشاد الفحول میں فرماتے ہیں ــــ حق بات یہ ہے کہ قول صحابیؓ حجت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی طرف صرف ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے ہمارا صرف ایک رسولؐ ہے اور ایک کتاب ہے اور تمام امت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کی کتاب و سنت نبویؐ کی پیروی کریں اس

---

[1] اصول الفقہ ۔ خضری

لئے صحابہؓ اور ان کے بعد کے علماء میں اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ سب شرعی فرائض و احکام کے پابند ہیں اور کتاب وسنت کی پیروی کرتے ہیں، اب اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت خداوندی میں کتاب وسنت کے علاوہ دوسرے لوگوں کی پیروی بھی کی جائے تو وہ ایسی چیز کا قائل ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور وہ اسلامی شریعت میں ایسی شریعت جاری کرنا چاہتا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا اور یہ بڑی ناگوار بات ہے"

اس کے بعد علامہ موصوف نے فرمایا ـــــ "بعض لوگ قولِ صحابیؓ کی حجیت کو اس حدیث سے ثابت کرتے ہیں ـــ "میرے صحابیؓ ستاروں کی مانند ہیں تم جس کسی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے" مگر یہ حدیث ایسی نہیں ہے جو صحیح ثابت ہو سکے اور محدثین کو اس پر اعتراض ہے اس لئے اس لئے اس سے شریعت کا ایک معمولی حکم بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ شریعت کا اتنا بڑا اصول ثابت ہو جائے"

حنفی علماء کے خیالات

قول صحابیؓ کے بارے میں حنفی علماء کے خیالات یہ ہیں کہ اگر صحابیؓ کا قول قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو اور ایسے معاملات میں ہو جہاں اجتہاد اور رائے جاری نہ ہو تو ان کے نزدیک متفقہ طور پر قول صحابیؓ شرعی حجت ہے کیونکہ یہ قول اصل حدیث نبویؐ کے برابر ہے کیونکہ وہ مسئلہ جس کا تعلق اجتہاد اور رائے سے نہ ہو، اس کے بارے میں کوئی جلیل القدر صحابیؓ اس وقت تک فتویٰ نہیں دے سکتا جب تک کہ ان کے پاس کوئی شرعی سند نہ ہو یہ دلیل عقلی نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا مسئلہ عقل اور رائے پر مبنی نہیں ہوتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ زید بن ارقمؓ کی ام ولد (لونڈی) نے حضرت عائشہؓ سے کہا ـــــ "میں نے زیدؓ سے ایک غلام ادھار آٹھ سو درہم میں فروخت کیا اور چھ سو درہم نقد میں خرید لیا۔"

اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا ـــــ "زیدؓ کو یہ پیغام پہونچا دو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا جہاد باطل ہو گیا ہے اب توبہ کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے، تم نے بہت بری چیز فروخت کی اور خریدی"

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیدؓ کی ام ولد نے حضرت عائشہؓ سے اس قسم

کی خرید و فروخت کے بارے میں فتویٰ طلب کیا تو حضرت عائشہؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ ایسی بیع حرام ہے اور زید بن ارقمؓ کا جہاد بھی اس سے باطل ہو گیا ہے یہ ایسا مسئلہ ہے جو قیاس اور رائے سے ثابت نہیں ہو سکتا اس لئے یہی سمجھا جائے گا کہ حضرت عائشہؓ نے یہ مسئلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اسی وجہ سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ زید بن ارقمؓ نے حضرت عائشہؓ کے اس قول کے بعد ان کے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔

اسی طرح اگر کسی عام ضرورت کے وقت کسی بڑے صحابیؓ نے کوئی فتویٰ دیا ہو اور دیگر صحابہؓ نے اس کا انکار نہ کیا بلکہ وہ خاموش رہے ہوں تو یہ بھی حنفی علماء کے نزدیک شرعی حجت ہے کیونکہ یہ ایسے اجماع کے مانند ہے جسے سب لوگوں نے اپنی خاموشی کے ذریعے تسلیم کر لیا ہو اس کی مثال جمعہ کی اذان کا مسئلہ ہے جب خطیب منبر پر بیٹھتا تھا اس وقت یہ اذان مسجد کے دروازے پر ہوا کرتی تھی مگر جب حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدینہ منورہ میں لوگوں کی کثرت ہو گئی تو حضرت عثمانؓ نے اس اذان سے پہلے زوال آفتاب کے بعد ایک اور اذان کا اضافہ کیا۔ یہ اذان خطبہ کے لئے امام کے نکلنے سے پہلے ایک گھر کے اوپر جسے الزوراء کہا جاتا تھا دی جاتی تھی تاکہ لوگوں کو جمعہ کا وقت معلوم ہو سکے اور یہ پتہ چل سکے کہ نماز جمعہ ہونے والی ہے حضرت عثمانؓ کے اس اضافے پر کسی صحابیؓ نے مخالفت نہیں کی۔

اسی طرح حنفی علماء کا اس مسئلہ پر بھی اتفاق ہے کہ اجتہاد و رائے کے معاملات میں ایک صحابیؓ کا قول دوسرے صحابی کے لئے شرعی حجت نہیں بن سکتا اور کسی صحابیؓ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس رائے کو چھوڑ کر جسے وہ صحیح سمجھتا ہو، دوسرے صحابیؓ کے قول پر عمل کرے

اب یہ سوال رہ گیا کہ آیا رائے اور اجتہاد کے معاملات میں صحابیؓ کا قول، صحابہؓ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کے لئے بھی شرعی دلیل بن سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں خود حنفی علماء میں اختلاف ہے ابوبکر الرازی - ابو سعید البردعی، فخر الاسلام البزدوی

اور شمس الائمہ السرخسی اسے شرعی دلیل تسلیم کرتے ہیں مگر علامہ کرخی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہر فریق کے دلائل بیان کئے جا چکے ہیں [1]

---

[1] ملاحظہ ہو ارشاد الفحول از شوکانی و اصول الفقہ از خضری

فصل دوم

اہل مدینہ کا عمل اور ان کا اجماع

امام مالک کا یہ مشہور اصول تھا کہ وہ فقہی احکام حاصل کرنے میں اہل مدینہ کے معمولات اور ان کے اجماع پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے کیونکہ وہ معمولات، مدینہ کے جلیل القدر صحابہؓ سے منتقل ہوتے ہوئے آئے تھے اس لئے وہ اہل مدینہ کے طریقوں کو قابل عمل سمجھتے تھے انھیں ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں بعض احادیث کو بھی ادا کر دیتے تھے [۱] امام مالک نے چالیس سے زیادہ ایسے مسائل بیان کئے ہیں جن پر اہل مدینہ کا اجماع تھا [۲] لہٰذا مالکی علماء نے عمل اہل مدینہ کو اپنا بنیادی اصول مانا ہے مگر اکثر علماء نے اس کی مخالفت کی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اہل مدینہ کا عمل دوسرے شہر والوں کے عمل کے برابر ہے اسی لئے ان کے معمولات میں اور اہل عراق، اہل شام اور اہل حجاز کے معمولات میں کوئی فرق قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل قابل اعتبار اصول سنت نبویؐ ہے جو لوگ سنت نبویؐ کو پیش کریں گے ان کا اتباع کیا جائے گا لہٰذا جہاں اختلاف علماء ہو، وہاں کچھ علاقے کے لوگوں کے معمولات کو دوسروں کے مقابلے میں شرعی حجت نہیں تسلیم کیا جا سکتا بالخصوص جبکہ اکثر صحابی مدینہ منورہ سے منتقل ہو چکے ہوں اور وہ مختلف شہروں میں آباد ہو چکے ہوں بلکہ اکثر علماء کوفہ، بصرہ اور شام میں آباد ہو گئے تھے، اس لئے اصل شرعی حجت، اتباع سنت ہے اور کسی شہر کے

---

[۱] اصول الفقہ از خضری صفحہ ۳۴۲ مطبوعہ ۱۹۳۳ھ

[۲] اعلام الموقعین جلد دوم صفحہ ۲۹۷ مطبعہ منیریہ

معمولات کو شرعی معیار اور اصول نہیں مانا جا سکتا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسی سنت نبویؐ اہل مدینہ پر پوشیدہ رہے جس کا علم باہر کے لوگوں کو ہو، لہٰذا ایسے لوگوں کے عمل کے مقابلے میں جن پر سنت نبویؐ پوشیدہ رہ جائے، سنت نبویؐ کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

یہ امام مالک اور ان کے مخالفین کے خیالات کا اجمالی خلاصہ ہے اس سلسلے میں مزید تشریح و توضیح کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ لوگ کن معاملات میں متفق ہیں اور کن معاملات میں ان کا اختلاف ہے اور یہ بھی پتہ چل سکے کہ عمل اہل مدینہ سے جسے شرعی حجت سمجھا جاتا ہے، کیا مراد ہے؟ اور کیا یہ تمام امت کے لئے لازمی دلیل ہے یا نہیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات کے لئے بحث کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) اہل مدینہ کے عمل کی تقسیم اور اس کی نوعیت کا بیان، (۲) اخبار آحاد کے مقابلے میں اہل مدینہ کے عمل کی کیا حیثیت ہے؟ کیا تعارض اور مخالفت کی صورت میں اسے اخبار آحاد پر مقدم سمجھا جاتا ہے یا اخبار آحاد عمل اہل مدینہ سے زیادہ قابل اعتبار ہیں؟

عمل اہل مدینہ کی تقسیم | (۱) ابن القیم اور ان کی اتباع میں علامہ خضری نے اہل مدینہ کے عمل اور اجماع کی دو قسمیں بیان کی ہیں:۔

(۱) وہ معمولات جو نقل و بیان سے جاری ہوئے۔

(۲) وہ معمولات جو اجتہاد و استدلال کی بنا پر قابل عمل بنے۔

بہر حال وہ اعمال جو منقول و ماثور ہیں ان کی بھی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت و احکام کو بیان کیا گیا ہو خواہ وہ حکم آپؐ کے قول و فعل سے ثابت ہو یا آپ نے اس کی تائید کی ہو یا آپ نے کسی کام کو ترک کر دیا ہو یا اسے نہ کیا ہو۔ یہ در اصل مدنی احادیث ہیں خواہ قول کی شکل میں ہوں یا فعل کی صورت میں ہوں مثلاً آپ عید کے دن شہر سے باہر عید گاہ کی طرف جاتے تھے اور وہاں لوگوں کو عید کی نماز پڑھاتے تھے اس وقت آپ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اور آپ کا رُخ لوگوں کی طرف ہوتا تھا اور پشت قبلے کی طرف ہوتی تھی (اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ) آپ بیماروں کی خبر گیری کرتے تھے

اور ان کے جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔

وہ احادیث جن میں آپ کی حمایت اور تائید ظاہر ہوتی ہے یہ ہیں کہ صحابہؓ کو ان کے مختلف پیشوں پر قائم رکھا جیسے تاجر، درزی اور رنگریز کا پیشہ ہے، انھیں آپ نے صرف اس بات سے منع کیا ہے کہ وہ اپنے پیشوں میں دھوکے بازی نہ اختیار کرلیں، ایام جاہلیت کے واقعات کو بیان کرنے اور دوڑ کا مقابلہ کرنے کو جائز قرار دیا ہے نیز وہ جنگ کے دوران فخر کا اظہار کرسکتے ہیں،

ان احادیث میں بعض باتوں کے ترک کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے مثلاً یہ کہ عید کی نماز میں اذان اور اقامت نہیں ہوتی ہے اور یہ کہ جنگ احد کے شہداء کو نہ غسل دیا گیا تھا اور نہ ان پر نماز پڑھی گئی تھی، نیز یہ کہ سبزیوں اور ترکاریوں میں زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی حالانکہ وہ ان کی ہر سال مدینہ منورہ میں کاشت کیا کرتے تھے

علامہ خضری نے بیان کیا ہے کہ اس قسم کی روایات میں بعض محدثین کا مسلک یہ ہے کہ تعارض اور اختلاف کی صورت میں ایسی مدنی روایات دوسری روایات پر مقدم ہیں مگر اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ مدنی راویوں کو دوسرے شہروں کے راویوں کے مقابلے میں کوئی وجہ ترجیح حاصل نہیں ہے، ترجیح صرف اسی صورت میں ہوگی جبکہ کوئی راوی اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار اور قوت حافظہ کی بنا پر (عدالت وضبط میں) دوسرے سے برتر ہو۔ بہرحال علامہ ابن القیمؒ نے بیان کیا ہے کہ اس قسم کی اکثر احادیث کو صحابہؓ اور علماء اسلام نے تسلیم کیا ہے،

(۲) دوسری قسم میں وہ روایات شامل ہیں جن کے ذریعے بعض اشیاء اور مقامات کا تعین کیا گیا ہے جیسے صاع اور مد کے پیمانوں کا بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آپؐ کا منبر کہاں ہوتا تھا اور آپؐ کہاں نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے،

اس طرح آپؐ کے مزار، روضہ، جنت البقیع اور عیدگاہ کا تعین کیا گیا ہے اس قسم کا تعین اس طرح کیا گیا ہے جیسا کہ مراسم حج کا تعین کیا گیا ہے جیسے صفا، مروہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفہ اور احرام باندھنے کے مقامات ہیں چنانچہ بعض مالکی علماء نے امام مالکؒ کے قول کو اس قسم کے بیان پر محمول کیا ہے

(۳) تیسری قسم اہل مدینہ کے عمل کی یہ ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ یہ کام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر اس وقت تک لگاتار اسی صورت میں ہوا

جیسے یہ بیان کیا گیا ہے کہ مزارعت کا طریقہ اہل مدینہ میں رائج رہا اور اونچی جگہ پر اذان دی جاتی تھی اور فجر کی اذان صبح سے پہلے دی جاتی تھی اذان میں الفاظ کو دوہرایا جاتا تھا اور اقامت میں الفاظ کو ایک دفعہ ہی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مؤطا میں امام مالک کے لب ولہجہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ اہل مدینہ کے عمل کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے بھی تیسری قسم مراد لیتے ہیں، علامہ ابن القیم اس بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ایسا عمل حجت اور قابل اتباع ہے اور ایسی سنت ہے جو قابل تسلیم ہے اور اگر کسی عالم کو ایسی سنت کا پتہ چل جائے تو اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون حاصل ہوتا ہے"

اہل مدینہ کا اجتہاد

بعض دفعہ کوئی عمل اہل مدینہ کا حدیث ونقل کی صورت میں نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اجتہاد واستنباط کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور اس سے کسی مسئلے پر استدلال لاکر قابل ترجیح بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جیسا کہ یہ کہا گیا ہے کہ بیع میں خیار مجلس باطل ہے، اور نماز میں ایک سلام کافی ہے یا یہ کہ اہل مدینہ رکوع سے پہلے نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے،

یہ قسم وہ ہے جس پر اختلاف کا معرکہ برپا ہے چنانچہ قاضی عبدالوہاب المالکی فرماتے ہیں ——— "ہمارے علماء کے اس بارے میں تین گروہ ہیں"

(۱) بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ شرعی حجت نہیں ہے مگر شرعی حجت اہل مدینہ کا وہ اجماع ہے جو بطریقۂ روایت منقول ہو اس طرح اس کے ذریعے ایک قسم کے اجتہاد کو دوسری قسم پر ترجیح حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ اگرچہ اس قسم کا اجتہاد شرعی حجّت نہیں ہے تاہم ان کے اجتہاد کو دوسروں کے اجتہاد پر ترجیح دی جا سکتی ہے بعض شافعی علماء بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

(۳) بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ جس طرح اہل مدینہ کا اجماع بذریعہ روایت شرعی حجت ہے، اسی طرح اہل مدینہ کا اجماع بذریعہ اجتہاد بھی شرعی حجت بن سکتا ہے

گو اس کی مخالفت کرنا حرام نہیں ہے، اس آخری رائے سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ اہل مدینہ کا عمل امام مالکؒ کے نزدیک تمام امت اسلامیہ کے لئے لازمی نہیں تھا بلکہ جب وہ اہل مدینہ کا کسی مسئلہ میں کوئی عمل متواتر دیکھتے تھے تو اسے قابل ترجیح سمجھتے تھے اور انھوں نے کسی مقام پر ہرگز یہ نہیں کہا کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقۂ عمل جائز نہیں ہے[1]

اخبار آحاد اور عمل اہل مدینہ

اگر کسی مسئلہ میں اہل مدینہ کا متفقہ عمل ہو اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخبار آحاد[2] بھی منقول ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) اہل مدینہ کا عمل اخبار آحاد کے موافق ہو تو اس صورت میں اخبار آحاد کی صحت مزید یقینی ہو جائے گی اور اس پر عمل کرنا ضروری ہو جائے گا بشرطیکہ یہ عمل بذریعہ روایت ثابت ہو اور اگر ان کا یہ عمل بذریعہ اجتہاد ثابت ہو تو یہ عمل بھی حدیث کو قابل ترجیح کردے گا۔

(۲) اہل مدینہ کا عمل اگر اخبار آحاد کے مخالف ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر یہ عمل بطریقۂ اجتہاد ہو تو حدیث اس پر مقدم ہے، البتہ وہ لوگ جو اہل مدینہ کے اجماع کو بطریقۂ اجتہاد بھی شرعی حجت مانتے ہیں (وہ اسے مقدم نہیں سمجھتے) اور اگر ان کا یہ عمل روایت کے طریقے پر مذکور ہو تو وہ حجت ہے جیسا کہ صاع مد اور ترکاریوں کی زکوٰۃ کی روایات ہیں اور اگر اس عمل پر ان کا اجماع ہو تو وہ اخبار آحاد پر مقدم ہے اس صورت میں حدیث کو چھوڑ کر اہل مدینہ کے عمل کو مقدم کیا جائے گا کیونکہ جب اہل مدینہ روایت کی صورت اور عمل متواتر کی

---

[1] اعلام الموقعین حصہ دوم صفحات ۲۹۷، ۳۰۴، ۳۰۵ مطبوعہ

[2] علماء اہل سنت والجماعت نے حدیث کی سند کے لحاظ سے دو قسمیں مقرر کی ہیں خبر متواتر اور خبر آحاد۔ خبر آحاد وہ حدیث ہے جو متواتر کے مقام تک نہ پہونچ سکے حنفی علماء نے ایک تیسری قسم کا بھی اضافہ کیا ہے جو خبر مشہور کہلاتی ہے ان کی تفصیل اور مزید توضیح اصول الفقہ اور اصول حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے

شکل کسی مسئلے پر اجماع کرلیں تو اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ایسی متواتر روایت سے ثابت ہے جس سے یقین حاصل ہوتا ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی متواتر خبر، آحاد کے مخالف ہو تو خبر آحاد کو ترک کر دیا جاتا ہے، جس طرح ایک راوی کی حدیث کو جماعت کے مقابلے میں چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن اگر ان کا اجماع اجتہاد کے طریقے سے ہو، تو وہ اجماع حدیث کے مقابلے میں مقدم نہیں ہے، کیونکہ اجتہاد کی وجہ سے غلطی کا احتمال باقی رہ گیا ہے [1]

---

[1] اصول الفقہ خضری صفحہ ۳۴۳، ۳۴۵، اعلام الموقعین حصہ دوم صفحہ ۲۹۴، ۳۰۶

فصل سوم

گذشتہ انبیاء کی شریعت

گذشتہ انبیاء کی شریعت پر عمل کرنے کے سلسلے میں چار صورتیں ہیں جن میں سے تین صورتوں میں تمام علماء کا اتفاق ہے اور ایک صورت میں علماء کا اختلاف ہے وہ صورتیں یہ ہیں :-

(۱) وہ احکام جن کا ذکر گذشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں آیا ہو مگر قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر نہ ہو اور نہ اس کا سنت نبویؐ سے صحیح ثبوت ملتا ہو، ایسے احکام کے بارے میں یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہم ان کے پابند نہیں ہیں کیونکہ ایسے احکام کے معلوم ہونے کا کوئی طریقہ نہیں ہے اور نہ اس کے صحیح ہونے پر یقین کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ احکام غیر معتبر طریقے سے معلوم ہوئے ہیں۔

(۲) بعض احکام کا ذکر ہمارے ہاں آیا ہے مگر ہماری شریعت نے صاف طور پر انہیں منسوخ اور باطل کر دیا ہے ایسے احکام کا تعلق بھی ہماری شریعت سے نہیں ہے اس کی مثال وہ اشیاء خوردنی ہیں جو بنو اسرائیل کے لئے حرام کر دی گئی تھیں مگر ہمارے لئے جائز ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں انہیں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"یہودیوں پر ہم نے لمبے ناخن والے جانور کو حرام کر دیا تھا اور گائے بھیڑ بکریوں کی چربیوں کو بھی ہم نے حرام کر دیا تھا بجز اس صورت کے کہ وہ چربی ان کی پشت یا آنتوں میں لگی ہوئی ہو یا کسی ہڈی سے چمٹی ہوئی ہو"

بعض ایسے احکام کی طرف حدیث نبویؐ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے ——— "مجھے ایسی سنتیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی (پیغمبر) کو عطا نہیں کی گئیں"

اس سلسلے میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے ـــــ "روئے زمین میرے لئے مسجد اور پاک وصاف بنائی گئی ہے لہٰذا میری امت کے جس آدمی کے لئے نماز کا وقت آئے تو وہ (زمین پر) نماز پڑھے، میرے لئے مال غنیمت حلال کئے گئے ہیں، مجھ سے پہلے یہ کسی کے لئے حلال نہیں کئے گئے تھے"

(۳) گذشتہ شریعتوں کے بعض احکام ایسے ہیں جسے ہماری شریعت نے برقرار رکھا ہے لہٰذا اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہم بھی اس کے پابند ہیں کیوں کہ وہ اب ہماری شریعت میں داخل ہو گئے ہیں اس کی مثال قربانی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ـــــ "قربانی کرو کیونکہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے،

(۴) گذشتہ شریعتوں کے بعض احکام اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں یا وہ سنت نبویؐ میں مذکور ہیں مگر ہماری شریعت اس کے بارے میں خاموش ہے اس میں نہ تو اس کی تائید کی گئی ہے اور نہ اسے منسوخ کیا گیا ہے یہ آخری صورت ایسی ہے جس کے بارے میں علمار کا اختلاف ہے،

اس بارے میں معتزلہ اور بعض علمار اہل سنت مثلاً ابو اسحاق شیرازی کا آخری قول یہ ہے کہ ہم مسلمان ان کے ایسے احکام کے بھی پابند نہیں ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ امام غزالی نے بھی اپنی آخری عمر میں یہی رائے اختیار کی تھی اور علامہ ابن حزم نے بھی اسی کی حمایت کی ہے لہٰذا اپنے اس خیال کی تائید میں اس جماعت نے یہ دلائل پیش کئے ہیں:۔

(۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تھا تو انھیں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ وہ کتاب وسنت پر عمل کریں اس کے بعد اپنی رائے سے اجتہاد کریں، اگر ہم گذشتہ شریعتوں کے پابند ہوتے تو حضرت معاذؓ اس کا ذکر کرتے یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر نہ کرنے پر ان کی غلطی پر انھیں متنبہ فرماتے،

اس دلیل کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے اس کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ کتاب وسنت پر عمل کرنے کے ضمن میں ان شریعتوں پر بھی عمل ہو جاتا ہے،

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ہم گذشتہ شریعتوں پر عمل کرنے کے پابند ہوتے تو ہم پر ان کا سیکھنا ضروری ہوجاتا اور مجتہدین کرام کے لئے بھی یہ ضروری نہیں ہوجاتا کہ وہ انھیں معلوم کرتے، اس کا جواب بھی یہ دیا جاتا ہے کہ قابل غور وہ احکام ہیں جو قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں نہ کہ وہ احکام جو ان میں مذکور نہیں ہیں۔

اکثر شافعی، مالکی اور حنفی علماء نیز متکلمین کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ ان احکام کو چھوڑ کر جو منسوخ ہو گئے ہیں ان کے باقی وہ احکام جو صحیح طریقے سے معلوم ہوں، ہمارے لئے قابل عمل ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہودیوں پر قصاص کی فرضیت کا ذکر کیا ہے اور ان کی فرضیت سے استدلال لاکر ہم پر قصاص فرض کیا گیا ہے اگر ہم گذشتہ شریعتوں کے پابند نہ ہوتے تو بنو اسرائیل پر قصاص واجب ہونے کی وجہ سے ہم پر قصاص واجب نہ ہوتا۔ اس طرح ان کا استدلال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی ہے کہ آپؐ نے فرمایا —— "جو کوئی نماز پڑھے بغیر سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے (نماز کا پڑھنا) یاد آجائے تو اسی وقت نماز پڑھ لے" اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی:-

واقم الصلوٰۃ لذکری   میرے ذکر کے لئے نماز کو قائم کرو

یہ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے لہٰذا اگر پہلی شریعتوں کی پابندی نہ ہوتی تو اس موقع پر اس آیت کریمہ کے تلاوت کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا [1]

---

[1] ارشاد الفحول از شوکانی و اصول الفقہ از خضری

فصل چہارم

استصحاب الحال

اس فصل میں مباحث مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) استصحاب کا مفہوم اور اس سے کیا مراد ہے؟

(۲) استصحاب کے قابل عمل ہونے میں مختلف فقہار اور علمائے اصول کا اختلاف۔

(۳) استصحاب کی قسمیں اور مختلف صورتیں۔

استصحاب کا مفہوم

استصحاب کی بعض علمار نے یہ تعریف کی ہے — "اگر کوئی تسلیم شدہ معاملہ فنا نہ ہو جائے تو اس کے برقرار رہنے کا فیصلہ کیا جائے" دوسری تعریف یہ ہے :— "تسلیم شدہ شے کو ہمیشہ مسلّم الثبوت رکھا جائے یا جو موجود نہ ہو اس کی نفی کی جائے[۱] علامہ شوکانی نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے —: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ گزشتہ زمانے میں ثابت ہو جائے تو اصولی طور پر وہ زمانۂ مستقبل میں بھی اسی طرح برقرار رہے گا۔ یہ لفظ مصاحبت سے ماخوذ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ جوں کا توں رہے جب تک کہ دوسری چیز آکر اسے تبدیل نہ کردے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ استصحاب الحال حالت اثبات یا حالت نفی میں بھی ہوتا ہے اور موجود یا معدوم میں بھی ہوتا ہے اور اگر کوئی معاملہ زمانہ ماضی میں ہو تو وہ زمانہ حال میں بھی برقرار رہتا ہے۔

---

[۱] یہ تعریف علامہ ابن القیم کی اعلام الموقعین میں ہے۔

لیکن بعض حنفی علمار نے جن میں کتاب ہدایۃ کے شارح مصنف العنایۃ [۱] بھی شامل ہیں ۔ استصحاب کی یہ تعریف کی ہے کہ اگر کوئی معاملہ کسی وقت بھی ثابت ہو جائے تو اسے دوسرے وقت میں بھی تسلیم کیا جائے گا" اسی تعریف کی بنا پر استصحاب الحال کا مفہوم زمانہ ماضی کے ثبوت تک محدود نہیں ہے اسے زمانہ حال میں برقرار رکھا جائے بلکہ بعض علمار کے نزدیک اس کی دو قسمیں ہیں

(۱) جو شے زمانہ ماضی میں تسلیم شدہ ہو وہ زمانۂ حال میں بھی تسلیم شدہ رہے گی مثلاً اگر کوئی آدمی گم ہو جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مردہ تو اس کے زمانۂ ماضی کی زندگی کے حقوق زمانہ حال میں بھی برقرار رکھے جائیں گے یہ سب کچھ استصحاب کے اصول کے مطابق ہوگا لہٰذا جب تک کہ اس کی وفات کا حکم نہ دے دیا جائے اس وقت تک اس کا مال وارثوں میں تقسیم نہیں ہوگا۔

(۲) جو چیز فی الحال ثابت ہو جائے تو زمانۂ ماضی کے لئے بھی اس کا ثبوت برقرار ہے اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی شوہر مر جائے اس کے بعد اس کی مسلمان بیوی آکر یہ دعویٰ کرے "میں اس کی موت کے بعد مسلمان ہوئی تھی" تاکہ یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کی وارث بن سکے لیکن اس کے دیگر ورثا یہ کہیں "تم اس کی موت سے پہلے مسلمان ہوئی ہو" یہ کہہ کر وہ اسے میراث کے حق سے محروم کرنا چاہیں تو ایسی صورت میں وارثوں کا قول تسلیم کیا جائے گا۔ اور اس عورت کی تصدیق صرف اس وقت کی جائے گی جب کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں گواہ نہ پیش کرے کیونکہ میراث سے محرومی کا سبب فی الحال ثابت ہے لہٰذا حال کے مطابق ماضی کے معاملہ میں بھی فیصلہ ہوگا۔

یہ دوسری قسم استصحاب مقلوب یعنی الٹا استصحاب کہلاتی ہے، حنفی علمار کی کتابوں میں بعض فروعی مسائل ایسے ہیں جن کے احکام کی بنیاد ایسے اصول پر رکھی گئی ہے اسی طرح مالکی علمار نے بھی اس کی بنیاد پر فتوے دیئے ہیں مثلاً اگر مال وقف ایسا ہو جس کے اصل مصرف کا تحقیق و تفتیش کے بعد پتہ نہ

[۱] العنایۃ جلد پنجم صفحہ ۵۸۵

چل سکے اور نہ وقف کرنے والے کی شرائط معلوم ہو سکیں تو ایسی صورت میں اسے زمانہ حال میں بھی اس کی مقررہ صفت اور حالت کے مطابق صرف کیا جائے گا۔ اس بارے میں ان کا یہ قول ہے ـــــ "اس حالت کا گذشتہ زمانے سے تعلق ہے، اور یہی خیال کیا جائے گا کہ اس کا مصرف اس کے مطابق ہے اور یہ حالت جس کے مطابق مال وقف صرف کیا جائے اس وقت تک صحیح سمجھی جائے گی جب تک کہ وقف کرنے والے کی طرف سے اس کے خلاف کھلا ثبوت مہیا نہ ہو۔[۱]

فقہار کا اختلاف استصحاب الحال کو بنیادی اصول نہ ہونے کی صورت میں شرعی حجت تسلیم کرنے میں فقہار اور علمائے اصول کا بہت زیادہ اختلاف ہے یہ اختلاف اس قدر شدید ہے کہ بعض اوقات ایک ہی عالم کی طرف اس بارے میں کئی متضاد رائیں منسوب کی جاتی ہیں بہرحال ہم ان کے اہم اقوال بیان کرتے ہیں۔

(۱) حنبلی، مالکی اور اکثر شافعی اور فرقہ ظاہرہ کے علمار کا قول یہ ہے کہ استصحاب نفی واثبات موجود اور معدوم امور میں حجت شرعیہ ہے،

(۲) بعض حنفی علمار اور متکلمین کا قول یہ ہے کہ استصحاب شرعی حجت نہیں ہے، مشہور حنفی عالم ابن نجیم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ پہلے زمانے میں اور دوسرے زمانے میں کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے ہر حالت میں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ ہو یا نہ ہو

(۳) بعض علمار یہ کہتے ہیں کہ استصحاب، معدوم کے لئے حجت ہے اور امر موجود کے لئے حجت نہیں ہے۔

(۴) بعض علمار اسے صرف قابل ترجیح اصول سمجھتے ہیں۔ یہ رائے امام شافعی کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ انھوں نے فرمایا :- یہ اصول درست ہو سکتا ہے مگر حجت نہیں ہے،

---

[۱] رسائل الاصلاح از محمد خضر حصہ سوم و العنایۃ شرح الهدایۃ جلد پنجم

(۵) بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ استصحاب بحث کے دوران میں فریق مخالف کے خلاف حجت نہیں بن سکتا۔ گو مجتہد کے لئے اس کے اور اللہ کے درمیان اس وقت حجت بن سکتا ہے جب کہ اسے اور کوئی دلیل نہ ملے، صرف ایسی صورت میں اسے اختیار کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اپنی مقدور بھر کوشش کا ذمہ دار ہے

(۶) بعض حضرات کا یہ مسلک ہے کہ استصحاب کا اصول کسی حق کو زائل کرنے کے لئے حجت ہے اور استقرار حق کے لئے ثبوت نہیں بن سکتا۔ یعنی اس کے ذریعے کسی حق کو ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے فریق مخالف کے سامنے حق حاصل کرنے کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے یہ وہ رائے ہے جسے تینوں مشہور فقہاء یعنی ابوزید، شمس الائمہ اور فخر الاسلام نے قابل ترجیح سمجھا ہے اور حنفیہ کے نزدیک اصول فقہ میں اسے کمزور دلیل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ کتب حنفیہ میں یہ مشہور قاعدہ پایا جاتا ہے :- استصحاب ایسی دلیل ہے جو استقرار حق کے لئے نہیں بلکہ ازالۂ حق کے قابل ہے"

ہم اس قاعدہ کی وضاحت چند مثالوں سے کرتے ہیں:۔

(۱) جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اگر کوئی آدمی گم ہو جائے اور اس کی موت و زندگی کا پتہ نہ چلے تو جب تک کہ قاضی اس کی وفات کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرے استصحاب کے قاعدے کے مطابق گذشتہ ثبوت کی وجہ سے اسے زندہ تصور کیا جائے گا اور اس کے ورثاء میں مال تقسیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ استصحاب، مطالبات اور استحقاق کو دور کرنے کے لئے ہے یہ اصول کسی حق کو ثابت کرنے کے لئے نہیں ہے اس لئے وہ گم شدہ انسان کسی کی میراث بھی حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس کا حصہ اس وقت تک رکھا جائے گا جب تک صحیح حقیقت حال نہ معلوم ہو سکے۔ شافعی علماء کے نزدیک یہ گم شدہ انسان وارث بن سکتا ہے کیونکہ حسب قاعدۂ استصحاب اس کی زندگی کا ثبوت برقرار ہے اس لئے اس کو میراث بھی ملے گی۔

(۲) ایک مشترکہ گھر کا ایک حصہ فروخت کر دیا گیا اس کے بعد شریک نے شفعہ کا مطالبہ کیا تو خریدار نے مدعی کی ملکیت تسلیم نہ کرتے ہوئے یہ کہا ۔۔۔ یہ

تمہارے قبضے میں عاریت کے طور پر ہے" ایسی حالت میں خریدار کے قول کو تسلیم کیا جائے گا یہ فیصلہ حنفی علمار کا ہے کیونکہ ان کے نزدیک استصحاب فریق مخالف کے لئے مثبت دلیل نہیں ہے مگر شافعی علمار کے نزدیک مدعی کا شفعہ ثابت ہے کیونکہ استصحاب کے اصول کے مطابق اس کی ملکیت ایک تسلیم شدہ امر ہے، اور شافعی علمار کے مسلک کے مطابق استصحاب استقرار حق کے لئے لازمی دلیل ہے،

(۳) اگر کوئی عیسائی مرجائے اور اس کی بیوی مسلمان ہو کر آئے اور وہ یہ کہے — "میں اس کی موت کے بعد مسلمان ہوئی تھی (یہ وہ مثال ہے جو پہلے بیان کی جاچکی ہے) اور دیگر ورثا یہ کہیں — "تم اس کی موت سے پہلے مسلمان ہوئی ہو" تو ایسی صورت میں اس عورت کو سچا نہیں سمجھا جائے گا اور وہ ثبوت اور گواہوں کے بغیر وارث نہیں بن سکتی بلکہ ورثا کے قول کو اس کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے تسلیم کیا جائے گا یہ فیصلہ بھی استصحاب کے اصول کے مطابق ہے کیونکہ اس کی موجودہ حالتِ اسلام کو اس کے ماضی پر قیاس کیا گیا ہے اور شوہر کی موت سے پہلے اسے مسلمان سمجھ کر اسے میراث سے محروم کر دیا گیا ہے، یہاں بھی استصحاب کو میراث کے حق سے محروم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے

(۴) اگر کوئی مسلمان مرجائے اور اس کی بیوی عیسائی ہو اس کے مرنے کے بعد وہ مسلمان ہو کر آئے اور کہے "میں اس کی موت سے پہلے مسلمان ہوئی تھی" اور دیگر ورثا یہ کہیں "تو اس کی موت کے بعد مسلمان ہوئی تھی" ایسی صورت میں بھی حنفی علمار کے نزدیک تیسری مثال کی طرح وارثوں کا قول معتبر سمجھا جائے گا کیونکہ گو استصحاب الحال کے اصول کے مطابق وہ اس کی موت سے پہلے مسلمان سمجھی جاسکتی ہے مگر ثبوت اور گواہوں کے بغیر اس کی تصدیق نہیں ہو سکتی اور نہ وہ وارث بن سکتی ہے کیونکہ استصحاب الحال کسی حق کو حاصل کرنے یا فریق مخالف کی تردید کے لئے معتبر دلیل نہیں بن سکتا۔

استصحاب کی اقسام | استصحاب کی کئی قسمیں اور صورتیں ہیں جن میں سے

بعض پر علماء کا اتفاق ہے اور بعض میں ان کا اختلاف ہے اہم اقسام یہ ہیں :—

(۱) **استصحاب العدم الاصلی**، جیسے ان باتوں سے بری الذمہ ہونا جن کا ثبوت شریعت میں موجود نہ ہو، مثلاً چھٹی نماز فرض نہیں ہے، یہ قسم متفقہ طور پر ان لوگوں کے لئے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت کے بغیر حکم نافذ نہیں ہوتا۔

(۲) **عقلی اور شرعی استصحاب**، ان کا تعلق ان مسائل سے ہے جنھیں عقل اور شریعت نے ہمیشہ ثابت کر دیا ہو جیسا کہ نکاح ثابت ہونے کے بعد بیوی ہمیشہ کے لئے حلال ہو جاتی ہے اسی طرح جب کسی چیز کا کوئی ذمہ دار ہو جائے تو اس کے تلف ہونے کی ذمہ داری بھی اس پر ہوتی ہے یا ملکیت کا حق ثابت ہونے کے بعد وہ ملکیت ہمیشہ باقی رہتی ہے یا جیسے کہ طہارت یا حدث (بے وضو ہونا) کا حکم برقرار رہتا ہے،

یہ قسم بھی حجت اور قابل عمل ہے، جب تک کہ اس کے مخالف کوئی چیز ثابت نہ ہو یا اس کے متضاد کوئی چیز موجود نہ ہو۔

(۳) **استصحاب دلیل**، اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ کوئی اور مخالف ثبوت آکر اس کی تخصیص کر دے یا اسے منسوخ کر دے، یہ بھی متفقہ طور پر قابل عمل ہے بلکہ محققین اس قسم کو استصحاب کے نام سے موسوم نہیں کرتے کیونکہ اس صورت میں حکم لفظی حیثیت سے ثابت ہوتا ہے اور استصحاب کے نقطۂ نظر سے نہیں ثابت ہوتا ہے،

(۴) **استصحاب** کی ایک قسم یہ ہے کہ اختلاف کے موقع پر اجماع کا حکم برقرار رہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک حالت میں کوئی حکم متفقہ طور پر ثابت ہو اس کے بعد اس متفقہ حکم کی صفت بدل جائے اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی کو پانی نہ ملے تو وہ تیمم کر کے نماز پڑھ لیتا ہے اور اس کی نماز متفقہ طور پر صحیح ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ نماز پڑھتے ہوئے پانی دیکھ لے تو اس صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟ کیا ہم حکم اجماع کے استصحاب (برقرار رہنے) کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نماز درست ہوگئی کیونکہ پانی کے مشاہدہ

سے پہلے اجماعی حکم یہی تھا۔ اور یہ حکم اس وقت تک برقرار ہے جب تک کہ کوئی دلیل یہ ثابت نہ کردے کہ پانی کے مشاہدہ نے نماز باطل کردی ہے؟ یا ہم یہ کہیں گے کہ اس کی نماز باطل ہو گئی ہے کیونکہ محل اجماع کی صفت بدل گئی ہے بہرحال استصحاب کی یہ قسم ایسی ہے جس میں فقہاء اور علمائے اصول کا اختلاف ہے۔ اور اس مسئلہ میں ان کے دو گروہ ہیں،

پہلا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ قسم شرعی حجت نہیں ہے اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ حجت شرعی ہے، اس لئے حکم اجماع کا استصحاب اس وقت تک رہے گا جب تک کہ کوئی اور ثبوت اس حکم اجماع کو باطل نہ کردے،

علامہ ابن القیم نے استصحاب کی تقسیم میں ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے انھوں نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) اصلی بریت کا استصحاب۔

(۲) اختلاف کے موقع پر حکم اجماع کا استصحاب (یہ وہ قسم ہے جو ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں)

(۳) استصحاب الوصف جو کسی حکم کو ثابت کرتا رہے یہاں تک کہ اس کے خلاف کوئی بات ثابت ہو جائے۔

بہرحال ان تینوں قسموں میں سے پہلی دو قسموں میں فقہاء اور علمائے اصول کا اختلاف بیان کیا جا چکا ہے ان میں کچھ انھیں حجت مانتے ہیں اور کچھ اسے حجت نہیں مانتے ہیں، تیسری قسم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حجت شرعیہ ہے لیکن اگر اس پر مزید غور کیا جائے تو یہ تیسری قسم بھی اس دوسری قسم میں شامل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

ماخذ و کتب حوالہ جات

برائے

بحث استصحاب

۱. ارشاد الفحول — شوکانی

۲. الاشباہ والنظائر - ابن نجیم المصری الحنفی

۳. شروح الہدایۃ جلد پنجم — از صفحہ ۵۱۵

۴. اعلام الموقعین حصہ اوّل صفحہ ۲۹۴ مطبعہ میریہ - ابن قیم

۵. رسائل الاصلاح — حصہ سوم

فصل پنجم

استحسان

استحسان کے مفہوم کی تشریح میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ بعض علماء نے اس کے لفظی مفہوم سے اس کی تعریف کی ہے چنانچہ علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب الاحکام میں اس کی تعریف اس طرح کی ہے،

"استحسان وہ ہے جس کی نفس، خواہش اور موافقت کرے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، یعنی خواہش کے مطابق کسی دلیل کے بغیر کسی چیز کو حلال، حرام کرلیا جائے، تقریباً یہی مفہوم شافعی علماء نے سمجھا ہے چنانچہ امام شافعی نے اپنے رسالہ اصولیہ میں اور اپنی کتاب الام کے ساتویں حصے میں تفصیل کے ساتھ اس کی تردید کی ہے اور اسے معتبر شرعی اصول سے خارج کیا ہے امام شافعی فرماتے ہیں "وہ شخص جو حاکم یا مفتی بننے کی قابلیت رکھتا ہو تو اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ کتاب و سنت یا اہل علم کے متفقہ احکام کے مطابق فیصلہ کرے یا ان میں سے کسی ایک اصول پر قیاس کرے لیکن اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ استحسان کے اصول کے مطابق کوئی فیصلہ یا فتویٰ دے" آگے چل کر فرماتے ہیں جو کوئی مستند نص شرعی یا قیاس کے بغیر حکم یا فتویٰ دے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرتا ہے[1]

یہ قول بھی امام شافعی کی طرف منسوب ہے ـــ جو استحسان کے مطابق حکم دے وہ نئی شریعت نکالتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اسلامی شریعت

[1] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۲۱۴/۲۱۵ مطبوعہ ۱۳۵۳ھ

کے خلاف اپنی طرف سے نئی شریعت قائم کرتا ہے"۔ ایک دوسری روایت میں امام شافعی نے یہ فرمایا ہے — "استحسان کے مطابق فتویٰ دینا باطل ہے"۔ اسی وجہ سے متکلمین کے علمائے اصول نے استحسان کی تردید کی ہے اور اسے غیر معتبر اور بے بنیاد دلائل میں شمار کیا ہے جس پر استنباط احکام کے لئے اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اسے بے دلیل حکم سمجھتے ہیں، انہیں میں سے ایک عالم نے کہا ہے — "یہ ایسی دلیل ہے جو مجتہد کی ذات کو داغ دار کر دیتی ہے اور اس کے لئے اس کی توضیح اور توجیہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے"۔

استحسان کی حمایت

بعض علماء استحسان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:- "استحسان کمزور قیاس کو چھوڑ کر اس سے زیادہ زور دار قیاس کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے"۔ دوسری تعریف یہ ہے — "دلیل کو چھوڑ کر لوگوں کی بھلائی کی خاطر عادت اور رسم و رواج کی طرف رجوع کرنے کا نام استحسان ہے"۔

بہرحال تینوں ائمہ کرام امام احمد بن حنبل، امام مالک اور امام ابو حنیفہؒ نے استحسان کی حمایت کی ہے اور اسے ان معتبر اور مستند دلائل میں شامل کیا ہے جن کے ذریعے شرعی احکام معلوم ہوتے ہیں مگر وہ استحسان کا وہ مفہوم مراد نہیں لیتے ہیں جو امام شافعی نے بیان کیا ہے کیونکہ ایسے مفہوم کا قائل کوئی نہیں ہے کہ استحسان کا مفہوم یہ ہو کہ علم و دلیل کے بغیر شریعت کی کوئی بات بتائی جائے۔

ایک عالم کا قول ہے — "امام احمد بن حنبل استحسان کو تسلیم کرتے ہیں جس کی تعریف یہ ہے کہ ایک حکم کو چھوڑ کر اس سے بہتر حکم کی طرف رجوع کیا جائے"۔ یہ ایسا اصول ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مالکیہ کے نزدیک استحسان

مالکی علماء کے نزدیک استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قاعدہ کلیہ کے مقابلے میں کسی جزوی مصلحت کو اختیار کیا جائے ان کے نزدیک استحسان کا وہ مفہوم نہیں ہے جو امام شاطبی نے اپنی کتاب الموافقات میں بیان کیا ہے کہ وہ محض طبعی ذوق اور خواہش

پر مبنی ہو، بلکہ استحسان یہ ہے کہ شارع کا مقصد معلوم کرکے اس کی طرف رجوع کیا جائے لے یہ ان مسائل میں جاری ہوتا ہے جن میں قیاس کے مطابق عمل کرنے سے کوئی مفاد حاصل نہ ہوتا ہو بلکہ خرابی اور نقصان کا اندیشہ ہو۔ بلکہ اگر قیاس کو اس موقع پر جاری کیا جائے تو اس سے حرج اور تکلیف ہو لہٰذا حرج اور تکلیف کی وجہ سے بعض مسائل کو قیاس سے مستثنیٰ کر لیا جاتا ہے،

اسی مفہوم کے قریب قریب ابن العربی المالکی نے استحسان کی تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ "دلیل و قیاس کے منشا کو چھوڑ کر بعض مصلحت کی بنا پر کچھ مسائل کو مستثنیٰ کر لیا جائے اور ان میں رعایت دی جائے" چنانچہ فاضل موصوف اپنی کتاب احکام القرآن میں بیان فرماتے ہیں —

"ہمارے اور حنفی علماء کے نزدیک استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ دو دلیلوں میں سے سب سے طاقتور دلیل کے مطابق عمل کیا جائے"

لہٰذا مالکی علماء مسائل کو عام اصول یا قیاس کو عام منشا تک محدود نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے انسانی مصلحت کے ساتھ بھی مخصوص کرتے ہیں۔ وہ انسانی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کچھ چیزوں کو ایسے کلیہ قاعدوں سے مستثنیٰ کر لیتے ہیں، ان کے اس فعل کی تائید بعض ایسی شرعی نصوص بھی کرتی ہیں جو نص شرعی کے عام قاعدوں سے بعض دفعہ کچھ چیزوں کو مستثنیٰ کر دیتی ہیں یا ان قاعدوں کے دائرہ عمل کو مخصوص کر دیتی ہیں۔

مالکی فقہ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں اور احکام ملتے ہیں، جیسا کہ عریہ کا حکم ہے اس کا مفہوم مالکی فقہ کے مطابق یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے باغ میں کھجور کے ایک یا چند درختوں کے پھل ایک خاص شخص کو بیع ہبہ کر دے اس کے بعد ہبہ کرنے والے شخص کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان پھلوں کو خشک کھجوروں کے ساتھ سودا کرکے ان شروط کے مطابق جو مالکی کتب فقہ میں مذکور

لے اس کا منشا جیسا کہ موافقات میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ استدلال مرسل کو قیاس پر مقدم کیا جائے

ہیں خرید لئے لہ اس خریداری میں رعایت دے کر اسے بیع مزابنہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تروتازہ کھجوروں کو خشک کھجوروں کے بدلے میں فروخت کیا جائے، اس قسم کی بیع ممنوع ہے کیونکہ اس کا تعلق ایسے سودی مال سے ہے جس میں اتحاد جنس کی وجہ سے اسے بڑھا کر فروخت کرنا یا ادھار بیچنا حرام ہے مگر بیع العریہ کو حرج اور تکلیف کا ازالہ کرنے کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے کیونکہ کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک شخص کھجور کے پھل کسی کو ہبہ کر دیتا ہے، اس کے بعد اسے تروتازہ کھجوروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ایسے شخص کے لئے جائز رکھا گیا ہے کہ وہ خشک کھجوروں کے بدلے انھیں خرید لے۔ یہ طریقہ استحسان کا ہے اگر ممانعت کر دی جائے تو ممکن ہے کہ ہبہ کرنے کا دستور بند ہو جائے ——

علاوہ ازیں اس استحسان کی تائید میں ایک حدیث بھی مذکور ہے چنانچہ حضرت سہل کی روایت ہے کہ —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خشک کھجوروں کو تروتازہ کھجوروں کے بدلے فروخت کرنے سے منع کیا ہے مگر آپؐ نے بیع العریہ میں یہ رعایت دی ہے کہ اندازہ کر کے کھجوریں فروخت کی جائیں تاکہ گھر والے تروتازہ کھجور کھا سکیں ۲ے قرض کی صورت بھی یہی ہے کیونکہ دراصل یہ بھی سود کی ایک قسم ہے اس میں وقت مقررہ کے لئے درہم کو درہم کے بدلے میں فروخت کیا جاتا ہے مگر تنگ دستوں اور محتاجوں کی ضرورت رفع کرنے کے لئے اسے جائز قرار دیا گیا ہے لیکن اگر اسے منع کیا جاتا تو لوگوں کو بہت تکلیف پہونچتی اس قسم کی عام تکالیف کو دور کرنے کے لئے مسافر کے لئے ظہر اور عصر کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا یا مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز رکھا گیا ہے، اسی طرح بارش کے موقع پر مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے ۳ے نیز عام مصلحت کے پیش نظر علاج کے لئے پوشیدہ اعضاء کو کھولنا

لہ شافعی اور حنفی علماء نے بیع العریہ کی دوسری قسم کی تشریح کی ہے ملاحظہ ہو حصہ دوم بدایۃ المجتہد از ابن رشد ۲ے بدایۃ المجتہد و الموافقات و موطا امام مالک۔ (مترجم)

(۳ے) حنفی فقہ میں دو نمازوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھنا جائز نہیں ہے (مترجم)

جائز ہے۔

اس قسم کے احکام اس کثرت سے ہیں کہ ایک مشہور مالکی عالم اصبغ بن الفرج کو یہ کہنا پڑا کہ علم فقہ میں استحسان کے مسائل قیاس سے زیادہ چھلکے ہوئے ہیں وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں " وہ شخص جو قیاس کے معاملے میں حد سے بڑھ جائے تو وہ سنت نبوی سے الگ ہونے لگتا ہے مگر استحسان علم کا ستون ہے " ابن القاسم کی روایت ہے کہ امام مالک نے فرمایا ــــ " استحسان علم کا ۹/۱۰ حصہ ہے "

استحسان کے بارے میں مذکورہ بالا بیانات کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اصول شریعت کے بنیادی اصولوں کے مقاصد سے الگ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ان اصولوں کے انجام اور ان کے لوازم پر نظر رکھی جاتی ہے اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مصلحت انسانی کے انجام کو پیش نظر رکھا جائے اور عام خرابیوں کے انسداد کی طرف اس وقت خصوصی توجہ مبذول کی جائے جبکہ عام اصولوں کی لفظی پابندی کی وجہ سے یہ منشا پورا نہ ہوتا ہو، ورنہ اگر ہم ہر وقت عام اصولوں کو پیش نظر رکھیں تو ہماری مصلحت بینی کا مقصد فوت ہو جائے۔

ابن سمعانی کا قول ہے ــــ " اگر استحسان کا مفہوم یہ ہو کہ انسان اپنی خواہش اور پسند کے مطابق کسی دلیل کے بغیر کوئی بات کہے تو یہ مفہوم غلط اور باطل ہے اور اس کا کوئی قائل نہیں ہے اور اگر اس کا مقصد یہ ہو کہ ایک دلیل کو چھوڑ کر اس سے زیادہ زوردار دلیل کی طرف رجوع کیا جائے تو یہ وہ اصول ہے جس کا کوئی منکر نہیں ہو سکتا " قفال کہتے ہیں ــــ " اگر استحسان سے مراد وہ اصول ہو جو شرعی اصول کی حقیقی منشاء کو پورا کرتا ہو تو وہ ایک اچھا اصول ہے اور اس سے شرعی حکم کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ کسی دلیل وحجت یا اصل ونظیر کے بغیر اپنے خیال کے مطابق ایک چیز کو برا کہا جائے اور دوسری چیز کو اچھا سمجھا جائے تو یہ برا طریقہ ہے اور اس کے مطابق گفتگو کرنا غیر مناسب ہے "

استحسان حنفیہ کے نزدیک

حنفی علماء بھی استحسان کو تسلیم کرنے میں بہت مشہور ہیں بلکہ یہ اصول ان کی کتابوں میں بہت جگہ مذکور ہے اور ان کے علماء کے ورد زبان ہے دراصل اس کی شہرت اس کے مخالفوں کے انکار

کی وجہ سے اور زیادہ ہو گئی ہے، کیونکہ مخالفین یہ کہتے ہیں کہ استحسان بے بنیاد مذہبی گفتگو کا نام ہے اور بے اصول قانون سازی پر مبنی ہے مگر حنفی علمار کے نزدیک استحسان کی اصل حقیقت وہ نہیں ہے جیسا کہ اس کے منکرین خیال کرتے ہیں حنفیہ کے نزدیک استحسان نص شرعی، اجماع یا قیاس اور شریعت کے عام اصول سے خارج نہیں ہے بلکہ اسلام کے عام اصول وقواعد کے ماتحت ہے مثلاً عام اسلامی اصول یہ ہیں کہ (۱) نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی دوسرے کو نقصان پہونچاؤ (۲) ضرورت اور مجبوری ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہے (۳) مشقت آسانی مہیا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور حنفی مجتہد عالم ابوبکر الرازی الجصاص فرماتے ہیں ـــ "جن معاملات میں ہمارے علمار استحسان کے قائل ہوئے ہیں وہ سب دلائل اور اصول پر مبنی ہیں، ان میں سے کسی چیز میں ان کی خواہش اور ذاتی رجحان نہیں پایا جاتا"

اس قول کی مزید وضاحت کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک استحسان کا اطلاق اس دلیل پر ہوتا ہے جو قیاس جلی کے مخالف ہو خواہ وہ نص شرعی یا اجماع ہو، بالعموم حنفی علمار استحسان کا اطلاق قیاس خفی پر کرتے ہیں اور اسے استحسان کے نام سے اس لئے موسوم کرتے ہیں کہ انھوں نے قیاس خفی کے مقابلے میں قیاس جلی کو چھوڑنا مستحسن سمجھا۔

استحسان کی اقسام

مذکورہ بالا تعریف کے مطابق حنفیوں کے نزدیک استحسان کی دو بڑی قسمیں ہیں:۔

(۱) استحسان القیاس۔ یہ قسم وہ قیاس خفی ہے جس کے اثرات اس قدر زبردست ہوں کہ وہ اپنے مخالف قیاس جلی پر غالب آجائے تاہم وہ قابل ترجیح قیاس شرعی کے دائرہ سے باہر نہیں ہوتا ہے اس کی صورت یوں ہوتی ہے کہ کبھی کسی فرعی مسئلہ کی دو اصول کے ساتھ کشمکش برپا ہوتی ہے اور ہر ایک سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ہوتا ہے آخر کار کسی خاص نکتہ کی بنا پر اسے کسی ایک اصول کے ساتھ شامل کرنا پڑتا ہے اس طرح استحسان کا یہ طریقہ بہت پیچیدہ اور دشوار بن جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں مجتہد کو بہت غور وفکر اور دقت نظر

سے کام لینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی وہ کسی ایک اصول کو ترجیح دے کر فرعی مسئلہ کو اس کے ساتھ شامل کرتا ہے اس کی مثال شکاری پرندوں کی جھوٹ ہے قیاس جلی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے درندے حیوانات کی جھوٹ پر قیاس کر کے نجس اور ناپاک سمجھا جائے کیونکہ گوشت پر جھوٹ کا دارومدار ہے اور دونوں کا گوشت نجس اور حرام ہے۔ مگر اس ظاہری قیاس کے مقابلے میں اگر پوشیدہ طور پر قیاس کیا جائے (جسے استحسان کہتے ہیں) تو قیاس خفی کے مطابق یہ جھوٹ پاک ہے، کیونکہ اسے آدمی کی جھوٹ پر قیاس کیا گیا ہے، درندوں کی جھوٹ اس لئے نجس ہے کہ وہ اپنی زبان سے پانی پیتے ہیں اور اس طرح ان کا نجس لعاب پانی کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے مگر شکاری پرندے اپنی چونچ سے پانی پیتے ہیں جو پاک اور خشک ہوتی ہے اس میں کسی قسم کی رطوبت نہیں ہوتی اس لئے چونچ کے ذریعے پانی پینے سے باقی پانی نجس نہیں ہوتا جس طرح آدمی کے لعاب سے پانی ناپاک نہیں ہوتا چونکہ دونوں چیزیں طاہر اور پاک ہیں اس لئے قیاس خفی کے مطابق شکاری پرندوں کے جھوٹے پانی وغیرہ کو پاک اور طاہر قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ قیاس جلی کا سبب کمزور ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ نجس لعاب پانی کے ساتھ شامل ہو جائے یہ سب درندوں میں موجود ہے مگر شکاری پرندوں میں نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنی چونچ سے پانی پیتے ہیں،

(۲) خلاف قیاس استحسان کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) استحسان النص یعنی وہ استحسان جو نص شرعی کے ذریعے ثابت ہو۔ حنفی علماء نے اس کی کئی مثالیں دی ہیں ان میں سے بیع سلم ہے کیونکہ اس میں معدوم اور غیر موجود چیز کو (پیشگی قیمت لے کر) فروخت کیا جاتا ہے قیاس کی رو سے ایسی بیع ممنوع ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی وجہ سے قیاس کے برخلاف اس کی اجازت دی گئی ہے آپؐ نے فرمایا — "جو بیع سلم کو اختیار کرے تو وہ مال کا اندازہ اور مدت مقرر کر کے کسی سے معاملہ کرے"، ایسا ہی خلاف قیاس مسئلہ روزہ دار کا بھول کر کھانا ہے، اس صورت میں بھی خلاف قیاس یہ حکم دیا گیا ہے کہ بھول کر کھانے کے باوجود روزہ

باقی رہتا ہے۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق ایسا روزہ ٹوٹ جاتا ہے مگر حنفی علماء نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق روزہ کو برقرار رکھا ہے کہ آپؐ نے ایک اعرابی کو جس نے بھول کر کھانا کھا لیا تھا یہ حکم دیا تھا " تم اپنا روزہ پورا کرو کیونکہ تمھیں اللہ نے کھلایا پلایا ہے"[1]

(۲) **استحسان الاجماع** - اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کاریگر سے کوئی چیز بنوائی جائے جیسا کہ بالعموم لوگوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ وہ کاریگر سے یہ کہتے ہیں — "میرے لئے موزے یا برتن بناؤ" وہ کام کی نوعیت، مقدار اور اس کی صفات سب اسے سمجھاتے ہیں لہذا قیاس اور قاعدہ کے مطابق یہ بیع جائز نہیں ہونی چاہیئے - کیونکہ یہ معدوم شے کی بیع ہے (ابھی تک وہ چیز نہیں بنی ہے)، لہذا قبل از وقت خرید و فروخت جائز نہیں ہونی چاہیئے مگر چونکہ (لوگوں کی ضروریات اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتیں) اس لئے اجماع امت کے فیصلے سے یہ معاملہ جائز رکھا گیا ہے ایسے احکام کو استحسان الاجماع کہتے ہیں۔"

---

[1] علامہ ابن القیم اپنے استاد ابن تیمیہ کی پیروی میں کوئی شرعی حکم خلاف قیاس تسلیم نہیں کرتے بلکہ انھوں نے علماء کے اس قول کی تردید کی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ نص شرعی سے بعض احکام خلاف قیاس ثابت ہوئے ہیں مگر علامہ موصوف یہ فرماتے ہیں کہ یہ احکام بھی صحیح قیاس کے مطابق ہیں جیسے اجارہ، بیع سلم، مزارعت، مساقاۃ، قرض، روزہ میں بھول کر کھا لینا وغیرہ، مثلاً بیع سلم کے بارے میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ وہ قیاس کے عین مطابق ہے کیونکہ یہ قابل ضمانت بیع ہے جس میں بائع مال دینے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کا ذمہ دار ہے یہ معاملہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص ادھار پر کوئی چیز خریدے کیونکہ ان دونوں قسم کے معاملات میں ایک چیز مقررہ مدت کے لئے ادھار ہوتی (جب ادھار خریدنا جائز ہے تو ادھار فروخت کرنا بھی جائز ہو سکتا ہے) بیع سلم کو ایسے معدوم مال کی فروخت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے جس میں فروخت کرنے والا مال کو مہیا نہیں کر سکتا اور اس وجہ سے یہ دھوکے کی بیع ہو جاتی ہے مزید تفصیلات حصہ اول اعلام الموقعین اور کتاب القیاس الشرع الاسلامی از علامہ ابن تیمیہ میں ملاحظہ فرمائی جائیں۔

(۳) استحسان الضرورۃ . اس کی مثال یہ ہے کہ جب حوض اور کنوئیں ناپاک ہو جائیں تو اس کے پانی کا کچھ حصہ نکال کر انھیں پاک کر لیا جاتا ہے جیساکہ کتب فقہ میں مذکور ہے ، مگر قاعدہ اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جب یہ ناپاک ہو جائیں تو وہ پاک نہیں ہو سکتے کیونکہ نہ تو پانی ڈال کر انھیں پاک و صاف کیا جا سکتا ہے اور نہ پورا پانی نچوڑ کر نکالا جا سکتا ہے تاکہ اس کی پوری نجاست دور ہو جائے بلکہ کنوؤں کے سوتوں سے جو تازہ پانی آتا ہے ، وہ بھی نجس پانی سے مل کر ناپاک ہو جاتا ہے اس لئے پانی کا کچھ حصہ نکالنے سے باقی ماندہ پانی کی صفائی نہیں ہو سکتی تاہم عوام کی ضرورت کو رفع کرنے کے لئے طہارت کے عام قاعدہ کو نظر انداز کیا گیا ہے اور اس ضرورت کے لئے استحسان کے اصول کو اختیار کیا گیا ہے ،

لفظی اختلاف

استحسان کی اس تقسیم سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حنفی علمار قیاس جلی کے مقابلے کی ہر دلیل کو استحسان سے تعبیر کرتے ہیں وہ دلیل ایسی ہوتی ہے جس پر تمام علمار کا اتفاق ہے ، لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ان علمار کا استحسان کے معاملے میں باہمی اختلاف محض لفظی ہے اگر یہ سب علمار استحسان کے صحیح مفہوم پر اتفاق کر لیتے تو شافعی اور حنفی علمار کے درمیان اختلاف کی کوئی صورت باقی نہ رہتی کیونکہ امام شافعی استحسان کا جو مفہوم بتاتے ہیں اس کا حنفی ، مالکی اور حنبلی علمار میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہے اور حنفی علمار نے استحسان کا جو مفہوم سمجھایا ہے اس سے شافعی علمار بھی انکار نہیں کر سکتے کیونکہ اس مفہوم کے مطابق استحسان کسی صورت سے معتبر اور مستند شرعی اصولوں کے دائرہ سے خارج نہیں ہے ، لہٰذا محقق علمار کو آخر میں یہ کہنا پڑا کہ ایسے استحسان کا کوئی وجود نہیں ہے جس میں اختلاف کیا جا سکے ۔

⁂

ماخذ و کتب حوالہ جات

برائے

بحث استحسان

(۱) حصہ چہارم الموافقات مطبعہ سلفیہ ..... شاطبی

(۲) ارشاد الفحول .... شوکانی

(۳) اصول الفقہ .... خضری

(۴) تاریخ التشریع الاسلامی .... خضری

(۵) بدایۃ المجتہد .... ابن رشد قرطبی

(۶) القیاس فی الشرع الاسلامی .... ابن تیمیہ

(۷) اعلام الموقعین .... ابن القیم

(۸) مجلۃ الازہر صفحہ ۳۱۱ وما بعد جلد دوازدہم

(۹) مشہور کتب فقہ حنفیہ و کتب اصول فقہ

(۱۰) کتاب الأم .... امام شافعی

فصل ششم

مصالح مرسلہ

مصالح مرسلہ[1] وہ اصول ہیں جن کی تائید و تردید میں کوئی معین شرعی قاعدہ نہ ہو ان کے ذریعے ان شرعی مقاصد کی حفاظت کی جاتی ہے جن کا علم کتاب و سنت یا اجماع سے حاصل ہوتا ہے مگر یہ کسی مقررہ اصول پر مبنی نہیں ہوتے ہیں ان کا پتہ قرائن، حالات اور دیگر علامات سے چلتا ہے اس لئے ان مصالح کو مرسلہ کہتے ہیں کیونکہ اس سے متعلقہ احکام کسی معین دلیل کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں اور نص شرعی، قیاس یا اجماع کے پابند نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ان کے ذریعے کسی بڑی مصلحت کی تکمیل ہوتی رہے یا بہت بڑے فتنہ و فساد یا شدید ضرر و نقصان کا ازالہ کیا جاتا ہے، یا شریعت کے اغراض و مقاصد، مصالح عامہ، انصاف اور ان بنیادی اصول کی تکمیل پیش نظر ہوتی ہے جن کی وجہ سے شریعت کا وجود عمل میں لایا گیا ہے،

امام غزالی ان کی توضیح اس طرح فرماتے ہیں ــــ: "مصالح مرسلہ وہ ہیں جن کی بنیاد عقل کے مطابق مناسب حکم پر ہو اور ان کے ثبوت کے لئے کوئی متفقہ اصول نہ ہو"

خوارزمی فرماتے ہیں ــــ: "ان کا مقصد یہ ہے کہ عوام کی خرابیوں کو دور کر کے

---

[1] امام غزالی نے اس کا نام استصلاح رکھا ہے بعض علماء نے اس کا نام استدلال مرسل رکھا ہے اور امام الحرمین اور ابن اسمعانی اسے استدلال کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

شرعی مقاصد کی حفاظت کی جائے "

علمار کا اختلاف مصالح مرسلہ کو قابل عمل اور حجت تسلیم کرنے اور اسے شرعی اصول تسلیم کرنے میں علمار کا اختلاف ہے اس بارے میں چار مختلف اقوال منقول ہیں [1]

(۱) جمہور علمار کا مسلک یہ ہے کہ یہ شرعی حجت نہیں ہے اور تمام حالات میں اس کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔

(۲) بعض علمار کی یہ رائے ہے کہ اگر یہ کسی شرعی اصول کے موافق ہوں تو اس صورت میں ان پر شرعی احکام کی بنیاد قائم کی سکتی ہے اور اگر یہ کسی شرعی اصول کے موافق نہ ہوں تو ان سے استنباط احکام کرنا جائز نہیں ہے، یہ قول امام الحرمین نے امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے اکثر ساتھیوں کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ مصالح مرسلہ کو اسی صورت میں جائز قرار دیتے جب وہ شرعی اصولوں کی موافقت کر سکیں۔

(۳) امام غزالی اور ان کے ساتھیوں کی یہ رائے ہے کہ مصالح مرسلہ اس وقت شرعی حجت بن سکتے ہیں جب ان میں یہ تین اوصاف موجود ہوں یعنی وہ اوصاف ضروری، قطعی اور کلی ہوں اگر ان میں سے کوئی وصف موجود نہیں ہوگا تو قابل اعتبار نہیں سمجھے جائیں گے، اوصاف ضروریہ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا تعلق ان پانچ ضروری بنیادوں پر ہو جن پر شرعی احکام کا دارومدار ہے "

---

[1] علامہ خضری اپنی کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" میں تحریر فرماتے ہیں :- "مصالح مرسلہ پر عمل کرنے میں اختلاف اس صورت میں پایا جاتا ہے جبکہ اس کا نص یا قیاس کی کسی دلیل سے تصادم ہو جائے " اس کے بعد انھوں نے فرمایا ہے اس بارے میں اختلاف اس صورت میں ہے جب اس کے مقابلے میں دوسری مصلحت درپیش ہو اور اس موقع پر اس بات پر اختلاف رونما ہوتا ہے کہ دونوں مصلحتوں میں سے کسی مصلحت کو ترجیح دی جائے " یہ تفصیل کسی دوسرے عالم کے ہاں نہیں ملتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ خضری نے یہ نتیجہ خود نکالا ہے جبکہ انھوں نے امام غزالی کی کتاب المستصفی میں ان کے اور دیگر علمار کے مصالح مرسلہ پر تفصیلی خیالات مطالعہ کئے تھے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ شرعی احکام پانچ چیزوں کی حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) مذہب (۲) جان (۳) مال (۴) نسل (۵) عقل - لہٰذا اگر ہم شریعت کے احکام و مسائل پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انہی پانچ چیزوں پر شرعی احکام گردش کرتے ہیں -

عام مصلحت اور ضرورت اوصاف کلیہ سے مراد یہ ہے کہ ان کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہو، اگر کسی مصلحت کا تعلق کچھ مسلمانوں سے ہو اور کچھ سے نہ ہو یا ایک حالت میں ہو اور دوسری حالت میں نہ ہو تو جائز نہیں ہے[1]

امام غزالی نے مذکورہ بالا تینوں اوصاف کی جامع مثال یہ پیش کی ہے کہ کافروں نے مسلمان قیدیوں کو ڈھال بنا کر لڑائی میں آگے اس طرح کھڑا کر دیا کہ اگر ہم (ان مسلمان قیدیوں کو بچانے کے لئے) ان سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو کفار ہم سے جنگ کر کے ہمارے دارالاسلام پر قابض ہو جائیں گے اور مسلمانوں کا قتل عام کریں گے لیکن اگر ہم جنگ کریں تو پہلے ہم بے گناہ مسلمانوں کو قتل کریں گے۔

اس صورت میں عام مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم جنگ کریں خواہ چند معصوم مسلمان اس میں قتل ہو جائیں کیونکہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ یا تو خون ریزی بالکل نہ ہو یا کم از کم خون ریزی ہو اور یہ مقصد کافروں سے جنگ کرنے میں پورا ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم جنگ کرنے سے باز رہ گئے تو وہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد ان مسلمان قیدیوں کو بھی قتل کریں گے لیکن جنگ کی صورت میں اگر ہم خون ریزی کو بالکل بند نہ کر سکیں تو کم از کم خون ریزی میں تو کامیاب ہو جائیں گے لہٰذا یہ ایک ایسی مصلحت ہے جس میں ایک عام شرعی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے

---

[1] قطعی اوصاف سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس کے برخلاف کام کا تصور نہ ہو سکے بلکہ جیسا کہ علامہ خضری نے اپنی کتاب اصول فقہ میں بیان کیا ہے " امام غزالی کی مراد اس سے وہ وصف ہے کہ جس پر غالب گمان ہو سکے - کیوں کہ انھوں نے مثالیں بھی اسی قسم کی پیش کی ہیں -

اگر عام مصلحت نہ ہو تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا مثلاً اگر ایک جماعت کشتی میں ڈوبنے لگے تو یہ جائز نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو سمندر میں پھینک کر باقی افراد کو ڈوبنے سے بچایا جائے [1]

کیونکہ اس مصلحت کا تعلق سب مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ اس صورت میں صرف محدود تعداد کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے اور اس وقت کسی ایک کو غرق کردینے کا تعین قرعہ کے ذریعے ہو سکتا ہے، اگر قرعہ کا طریقہ ناقابل اعتبار اور بے بنیاد ہے۔

اگر مصلحت غیر ضروری ہو یا غیر قطعی ہو تو وہ بھی قابل عمل نہیں ہے، مثلاً کفار ایسے قلعے میں محصور ہو کر کسی مسلمان کو ڈھال بنا کر آگے کردیں جس کا فتح کرنا ضروری نہ ہو، یا جنگ کی صورت میں ہمیں اس کے فتح ہونے کی قطعی امید نہ ہو، یا بصورت عدم جنگ ہمیں کفار کے تسلط پر شک و شبہ ہو، تو ان تمام حالات میں ان مسلمانوں پر حملے کرنا جائز نہیں ہے جنھیں دشمن نے قلعہ میں بیٹھ کر ڈھال بنا رکھا ہو۔

امام مالک کی رائے

(۴) امام مالک کی یہ رائے ہے کہ مصالح مرسلہ پر عمل کرنا اور ان کے ذریعے شرعی احکام معلوم کرنا جائز ہے خواہ ان میں وہ اوصاف نہ پائے جائیں جو قول نمبر ۲ دو اور ۳ تین میں اکثر پیش نظر رکھے گئے ہیں نیز وہ عام خرابیوں اور نقصانات کا ازالہ کرنے کے لئے بھی اس اصول پر عمل کرتے تھے۔ مثلاً امام مالک اس بات کے قائل تھے کہ چوری کے ملزم کو چوری کا اقرار کرانے کے لئے زدوکوب کیا جائے دوسرے علماء اس کے مخالف ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ملزم بے گناہ ہو اس صورت میں اس کو تکلیف پہونچانا جائز نہیں ہوگا۔ امام مالک نے بھی غالباً ایسے ملزم کو سزا دینے کے لئے کہا ہے جس پر چوری کا الزام قوی ہو اور قرائن وحالات اس الزام کو قابل ترجیح حد تک ثابت کرتے ہوں، ایسی حالت میں امام مالک نے لوگوں کے مال کی حفاظت اور امن وامان

---

[1] اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کا ڈوبنا بہت سے افراد کے ڈوبنے سے کم نقصان دہ ہے

کی خاطر ملزم کو سزا دینے کو ترجیح دی ہے بلکہ اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے ملزم کو قید کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔

گم شدہ مرد کی بیوی کے بارے میں امام مالک نے ایسی ہی مصلحتوں کے پیش نظر فتویٰ دیا ہے یعنی اگر مرد کی موت و زیست کے بارے میں کوئی علم نہ ہو اور بیوی کئی سال تک انتظار کی زحمت برداشت کر چکی ہو تو اس صورت میں امام مالک نے حضرت عمر فاروق رضؓ کی رائے پر عمل کیا ہے کہ گمشدہ مرد کی بیوی کے لئے جائز ہے کہ اس کی گم شدگی کی خبر کے چار سال کے بعد نکاح ثانی کرلے۔ اس مسئلہ میں بیوی کی بھلائی کو ترجیح دی گئی ہے اور معاشرہ کے فتنہ و فساد کو دور کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے گم شدہ شوہر کی بھلائی پر اسے ترجیح دی گئی ہے [۱]

تاہم امام الحرمین الجوینی جیسے بعض علماء نے امام مالک پر یہ شدید اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے مصالح مرسلہ پر بے حد اعتماد کر رکھا ہے اس پر بعض مالکی علماء جن میں قرطبی بھی شامل ہیں، اس پر مجبور ہوئے کہ وہ یہ کہیں کہ امام مالک اس کے قائل نہیں ہیں، مگر دونوں قسم کی رائیں صحیح نہیں ہیں کیونکہ مصالح مرسلہ پر امام مالک کا اعتماد خود رائی پر مبنی نہیں ہے اور نہ ان کا یہ اعتماد بے دلیل اور بے بنیاد ہے وہ اس رائے میں تن تنہا بھی نہیں ہیں بلکہ بہت سے ائمہ اور فقہا اس خیال میں ان کے حامی اور مؤید ہیں اور کبھی کبھی وہ بھی اس اصول کے ذریعے استنباط احکام کرتے ہیں گو اس کے کم و بیش استعمال میں ان کا اختلاف ہو۔ ابن دقیق العید فرماتے ہیں ـــ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام مالک دیگر فقہاء کی بہ نسبت اس اصول کو زیادہ پسند فرماتے ہیں اس معاملے میں دوسرے درجے پر امام احمد بن حنبل ہیں تاہم دیگر فقہا بھی کسی نہ کسی حد تک اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہ دونوں امام دوسروں کی بہ نسبت عملاً اسے ترجیح دیتے ہیں۔

قرافی فرماتے ہیں ـــ یہ اصول اگر تحقیق کی جائے، فقہاء کے تمام مکاتب فکر میں موجود ہے اور اسے وہ مناسب موقعوں پر حسب ضرورت کام میں لاتے ہیں [۲]

---

[۱] تاریخ التشریع الاسلامی از خضری صفحہ ۲۵۴ مطبع الاستقامۃ

[۲] بہرحال اس کے استعمال کے وقت بہت غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ مجتہد شرعی مقاصد (باقی صفحہ ۲۸۸)

ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود صحابہؓ اور تابعین بھی جب کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں صاف طور پر نہیں ملتا تھا تو وہ قیاس ورائے کو اختیار کرتے تھے اور جیسا کہ ان کے فتووں سے ظاہر ہے وہ شریعت کے مقاصد اور اس کے عام قواعد کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس چیز پر عمل کرتے تھے جس میں عام لوگوں کا فائدہ ہو اور جو اسلامی شریعت کی اصل روح سے زیادہ نزدیک ہو [۱]

اس کی مثال یہ ہے کہ جب صنعتی کاریگر ان چیزوں کو جو انھیں بنوانے کے لئے دی جاتی تھیں کھونے لگے تو صحابہؓ نے انھیں ان چیزوں کا ذمہ دار قرار دیا جو انھیں دی جائے جیسا کہ کپڑا جو سینے یا رنگنے کو دیا جاتا تھا۔ انھوں نے اس کے لئے بھی یہ قاعدہ جاری کیا کہ اگر ان کے پاس سے کوئی چیز کھو جائے اور وہ اس کے ناگہانی تلف ہونے پر کوئی ثبوت نہ پیش کر سکیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں اس معاملے میں یہ قاعدہ مصالح مرسلہ کے اصول کے مطابق جاری کیا گیا تاکہ لوگوں کا مال ضائع نہ ہو سکے، کیونکہ کاریگروں سے کام کرانے کی لوگوں کو بار بار ضرورت پیش آتی تھی اسی وجہ سے حضرت علیؓ کی طرف یہ روایت منسوب ہے کہ انھوں نے فرمایا ــــ "لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے" یعنی کاریگروں کو چیزوں کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے [۲]

اسی عام مصلحت کے پیش نظر بعض علمار نے ایک آدمی کے بدلے ایک جماعت کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے

حضرت عمرؓ کی مصلحت پسندی

اس معاملے میں حضرت عمر فاروقؓ کا اسوہ حسنہ قابل اتباع ہے انھوں نے اپنے اجتہادی احکام میں عوام کے مصالح کا اس قدر خیال رکھا تھا کہ انھوں نے قحط سالی کے زمانے میں چور پر حد شرعی قائم کرنے کو ملتوی کر دیا تھا اسی طرح انھوں نے ان لوگوں کو تالیف قلب

(بقیہ صفحہ ۲۸۷) کی راہ سے نہ ہٹ سکے۔ مصالح مرسلہ اس وقت معتبر سمجھے جائیں گے جب کہ وہ کسی مستحکم نص شرعی کے خلاف نہ ہوں

[۱] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۱۴۱/۲

[۲] رسائل الاصلاح حصہ سوم

اور دلجوئی کے لئے صدقہ وخیرات کا حصہ دینا بند کر دیا تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی مذکور ہے، انھوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کر دیا تھا اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے زناکاری کے جرم میں جلاوطنی کی سزا کو ترک کر دیا تھا۔ جبکہ ایک جلاوطن شخص رومی علاقے میں جاکر عیسائی ہو گیا تھا نیز انھوں نے ایک جملہ میں تین طلاقوں کا اعلان کرنے پر اسے تین طلاقوں کے برابر قرار دیا جبکہ رسول اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور خود ان کے ابتدائی زمانے میں اسی قسم کی طلاق صرف ایک سمجھی جاتی تھی [۱]

مصالح مرسلہ کی اہمیت

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصالح مرسلہ کو شرعی احکام میں داخل کرنا اس امر کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اسلامی اجتہاد کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں شریعت کی اصل روح اور اس کے مقصد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اگر اس کی صحیح روح اور اس کے اصل مقاصد کی حفاظت ہوتی ہو اور اس سلسلے میں نص شرعی کی لفظی پابندی سے کسی قدر انحراف ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا ہے بشرطیکہ عوام کے مصالح اس پر غالب رہیں، لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اور شریعت کے بنیادی مقاصد محفوظ رہیں اس طرح عدل وانصاف کے اس اعلیٰ معیار کی حفاظت ہو سکے گی جس کا پتہ ترجیح اور مقابلے کے بعد ہی چل سکتا ہے [۲]

غیر فانی شریعت

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر آپ فقہ اسلامی کے ان اصولوں پر غور وفکر سے کام لیں جنہیں ہم بیان کر چکے ہیں یعنی کتاب وسنت اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ وغیرہ اور ان اصولوں کا دوسری شریعت سے

---

[۱] اصول الفقہ از خضری صفحہ ۳۹۱ مطبعہ الرحمانیہ

[۲] مصالح مرسلہ پر مزید تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو (۱) تاریخ التشریع الاسلامی (۲) اصول فقہ از خضری (۳) ارشاد الفحول از شوکانی (۴) المستصفیٰ از امام غزالی (۵) رسائل الاصلاح

مقابلہ کریں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اسلامی شریعت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ نہ صرف عدل و انصاف کی حامی ہے بلکہ امن و امان اور عوام کی بھلائی کے ذرائع بھی اس میں بافراط مہیا کئے گئے ہیں نیز یہ حقیقت بھی ہر ایک پر واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلامی شریعت کے غیر فانی اور لازوال ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں قیاس و اجتہاد نیز مصالح مرسلہ شریعت کے بنیادی اصول قرار دیئے گئے ہیں، ان اصولوں کے ذریعے شریعت ہمیشہ تر و تازہ ہوتی رہتی ہے اور اس میں عوام کے ان مفادات کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے جو زمانوں اور قوموں کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت نے جزئیات اور انفرادی معاملات و واقعات کی طرف بہت کم توجہ دی ہے کیونکہ ان کے لئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھول رکھا ہے اور مجتہدین کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ شرعی اصولوں اور عوامی بھلائی کے مسائل کو عدل و انصاف کے اصول پر منطبق کر کے فیصلہ کریں، اسی نکتہ میں اس کے زندۂ جاوید ہونے کا راز پوشیدہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اور جس قدر قومیں ترقی کرتی جا رہی ہیں اسی قدر زمانے کے ساتھ ساتھ اور قوموں کے دوش بدوش اسلامی شریعت بھی رواں دواں ہوتی رہی ہے اگرچہ دور حاضر میں ہم پر جمود طاری ہے اور ہم میں جذبہ اجتہاد نہیں باقی رہا ہے تاہم اس کے اصول ابھی تک اسی طرح پرانی آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں، بلکہ وہ بہ آواز بلند پکار کر اور ہمیں بیدار کر کے یہ کہہ رہے ہیں :-

"آؤ ہماری طرف رجوع کرو یہاں تمہیں نہایت صاف و شفاف چشمہ ملے گا"

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟

باب سوم

شرعی احکام

میں

اختلاف کے اسباب

شرعی احکام میں اختلاف کے اسباب

جب انسان پہلی مرتبہ سوچتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی شریعت میں اختلاف نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اصول کی وضاحت کردی ہے اور بہت سے احکام و قواعد کتاب و سنت میں مذکور ہیں تو پھر کس چیز میں اختلاف ہے؟ اور فقہ کی کتابوں میں مختلف احکام کیوں پائے جاتے ہیں؟ نیز علماء اور مجتہدین احادیث احکام کی کتابوں میں اپنے دلائل و براہین کے ساتھ کیوں برسرپیکار نظر آتے ہیں؟

صحابہؓ کا اختلاف

خیالات کا یہ اختلاف نہ صرف ائمہ فقہ تک محدود ہے جو صحابہؓ کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے بلکہ خود صحابہؓ نے بھی بہت سے مسائل میں اختلاف کا اظہار کیا ہے اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جو امام مسلم اور امام احمد بن حنبل نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کی ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر کی خلافت کے پہلے دو سالوں میں تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں، آخر کار حضرت عمرؓ نے فرمایا ــ لوگوں نے ایسے معاملے میں جلدبازی شروع کر دی ہے جس میں انھیں تحمل اور صبر کرنا تھا، اگر ہم (ایک جملے ہی میں تین طلاق دینے کو تین طلاقی کی) قانونی صورت جاری کو دیں (تو بہتر ہوگا) چنانچہ آپؓ نے یہ قانون جاری کر دیا۔ اس معاملے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابوموسیٰؓ نے ان کی مخالفت کی۔

حضرت زید بن ثابتؓ، دادا اور بھائیوں میں میراث کی تقسیم کیا کرتے تھے اور حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ بھی انہی کے ہم خیال تھے مگر تقسیم میں ان کے طریقے

مختلف تھے مگر حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ دادا باپ کی مانند ہے اس لئے وہ بھائیوں کو محروم کرتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے انھیں میراث نہیں ملے گی۔

حضرت عمر فاروقؓ کی یہ رائے تھی کہ اگر کسی حاملہ عورت کا شوہر مرجائے تو اس کی عدت حمل کے بعد ختم ہوجائے گی مگر حضرت علیؓ کا قول یہ تھا کہ حاملہ عورت چار مہینے دس دن اور وضع حمل کی مدت میں سے جو لمبی مدت ہوگی اس کے مطابق عدت گذارے گی۔ اسی طرح حضرت علیؓ کا یہ قول تھا کہ اگر کسی کی نگرانی میں کچھ یتیم بچے ہوں تو ان کے مال میں سے زکوٰۃ نکالنی ضروری ہے مگر دوسرے صحابہؓ یہ کہتے تھے کہ یتیم کے مال میں زکوٰۃ نہیں ہے، ان کے علاوہ بہت سے مسائل میں صحابہؓ کا اختلاف مذکور ہے اس کے بعد مخالفت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ دوسری تیسری صدی ہجری میں مجتہدین کرام کی پختہ فکر ونظر کی بدولت کثرت اختلاف سے مختلف مکاتیب فکر قائم ہوگئے لہٰذا ان اختلافات کے اسباب کیا ہیں اور اس قدر فرقے کیوں پیدا ہوگئے؟

اختلاف کے اسباب

اس سوال کا جواب دینے کے لئے مختلف زمانوں میں بہت سے علماء نے کوشش کی اور انہوں نے اس اختلاف کی وجوہات بیان کیں، یہاں تک کہ بعض علماء نے اس پر الگ اور مستقل تصانیف لکھیں ان میں سے ابومحمد عبداللہ البطلیوسی الاندلسی نے جن کی وفات ۵۲۱ھ میں ہوئی، اس بارے میں ایک کتابچہ لکھا ہے جس کا نام الانصاف فی التنبیہ علی الاسباب اللتی اوجبت الاختلاف یعنی اختلاف کے بارے میں منصفانہ رائے" اس کتابچہ کے مصنف بہت قابل ہیں اور اس میں ایک حد تک بہت مفید باتیں پہلی مرتبہ بیان کی گئی ہیں تاہم اس میں موضوع کا تفصیل اور غور وفکر کے ساتھ پورا حق ادا نہیں کیا گیا ہے اس کتابچہ کو صرف فقہی اختلاف تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ مختلف فرقوں کے اختلاف کو بھی بیان کیا گیا ہے علاوہ ازیں اس میں فقہ اور تشریع کی صحیح روح کے مطابق بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ ایک نحوی، ادیب اور ماہر لغت کی حیثیت سے بحث کی گئی ہے یہاں تک کہ مصنف نے اپنے مقدمے میں یہ کہا ہے،

"فقہی طریقہ علم ادب کا محتاج ہے جو کلام عرب کے اصولوں پر قائم ہے" اس کے

بعد انھوں نے اپنی کتاب کے ابتداء میں یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام مذہبی اختلافات کے بنیادی اسباب آٹھ ہیں ان کے علاوہ جس قدر اختلافات ہیں وہ سب اسی بنیادی اسباب میں سے کسی ایک سے ماخوذ ہیں۔

اور وہ آٹھ اسباب یہ ہیں:۔

(۱) الفاظ و معانی کا مشترک ہونا (۲) حقیقت و مجاز (۳) مفرد و مرکب ہونا (۴) خاص و عام (۵) روایت و نقل کا اختلاف (۶) جہاں نص شرعی نہ ہو وہاں اجتہاد کا اختلاف (۷) ناسخ منسوخ (۸) حکم کو مباح اور وسیع قرار دینا

اس کے بعد مصنف موصوف نے ان آٹھوں اسباب کی تشریح و توضیح کی ہے اور یہی کتابچہ کا اصل موضوع ہے اس کتابچہ کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس کا نام "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" ہے، مگر انھوں نے ان اسباب کو معلوم کرنے اور اس کے بیان کرنے میں دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے بہرحال ہیں کتب فقہ و اصول و احکام القرآن نیز تاریخ فقہ اسلامی اور بعض کتب حدیث اور مذکورہ بالا رسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہوں

"علماء نے عام طور پر تمام احکام میں اختلاف کیا ہے خواہ وہ کتاب اللہ سے ماخوذ ہوں یا سنت نبوی اور قیاس و رائے سے ان کا تعلق ہو اس اختلاف کے اسباب بہت سے ہیں اور شاخ در شاخ ہیں، انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے فقہ کے اصول و فروع کی کتابوں کی چھان بین کرنی لازمی ہوگی اس لئے ہم انھیں پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کر سکتے البتہ نمونہ کے طور پر کچھ اسباب کا ذکر کرتے ہیں تاکہ اس سے دوسری باتوں کا اندازہ لگایا جاسکے بلکہ ہم ان اسباب کو اس لئے بیان کر رہے ہیں تاکہ ہم یہ ثابت کرسکیں کہ علماء اسلام کے ہاں رائے اور اجتہاد کی کس قدر آزادی تھی کہ وہ شرعی اصول اور عدل و انصاف کے بنیادی اصولوں کے علاوہ اپنے اجتہادات میں اور کسی چیز کے پابند نہ تھے۔

فصل اوّل

احکامِ قرآن میں اختلاف کے وجوہات

قرآن کریم کے احکام میں اختلاف کا سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ علما اور مجتہدین میں الفاظ کی تفسیر اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں اختلاف ہے کیونکہ ان میں مشترک الفاظ ہوتے ہیں جن کے کئی معانی ہوتے ہیں یہ مشترک الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(الف) کوئی لفظ مختلف اور متضاد معانی میں مشترک ہو جیسے مندرجہ ذیل آیت میں قرءٍ کا لفظ ہے:-

والمطلقات یتربصن	مطلقہ عورتیں تین دفعہ ماہواری
بانفسھن ثلثة قروء	ایام کا انتظار کریں۔

اس لفظ کی تفسیر حضرت عثمان رضؓ، زید بن ثابت رضؓ اور حضرت عائشہ رضؓ نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد ایام ماہواری سے فارغ ہونا ہے اور حضرت عمر رضؓ اور حضرت ابن مسعود رضؓ کی یہ رائے ہے کہ اس سے ماہواری ایام مراد ہیں ہر ایک کے پاس حدیث اور لغت سے اس کا ثبوت موجود ہے [۱] لہٰذا صحابہ رضؓ کے اختلاف کے ساتھ ساتھ فقہا کرام میں بھی اختلاف نمودار ہوا اور اہل عراق کے فقہار نے حضرت ابن مسعود رضؓ کے قول کی پیروی کی اور اہل حجاز کے فقہار نے مدینہ کے صحابہ رضؓ کے قول کو تسلیم کیا

اس طرح وضوء میں سر کے مسح کی فرضیت کے بارے میں فقہار کا اختلاف ہے

---

[۱] الانصاف از بطلیوسی

اس کی بنیاد بھی آیت کا یہ حصہ ہے :-

وَامسحُوا برؤوسكم اپنے سروں کا مسح کرو۔

اس آیت کے مطابق امام مالک کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض ہے اور امام شافعی نے ایسا کم از کم حصہ مراد لیا ہے جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے۔ حنفیہ نے کہا ہے کہ سر کا بعض حصہ فرض ہے جس کا اندازہ انھوں نے چوتھائی سر سے کیا ہے اس اختلاف کی اصل وجہ حرف بار کا استعمال ہے، کلام عرب میں حرف بار کبھی زائد ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے تنبت بالدهن اس میں بارؔ قرارت کے مطابق زائد ہے جس میں تنبتُ پڑھا جاتا ہے کبھی بار کے معنی بعض کے آتے ہیں جیسے یہ کہتے ہیں اخذتُ بثوبه وبعضده "(میں نے اس کا کپڑا اور اس کا بازو پکڑا)[1]" لہذا امام مالک نے پورے سر کا مسح مراد لیا ہے جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے کیونکہ باء ان کے نزدیک بعض کے معنوں میں ہے اور چونکہ آیت کریمہ میں مسح کا لفظ مطلق آیا ہے اور مجمل نہیں ہے اس لئے کم از کم یقینی چیز پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے حنفیہ کے محقق علمار یہ کہتے ہیں کہ حرف بار کے اصل معنی ملانے کے ہیں جس پر سب ماہرین لغت کا اتفاق ہے اس کے برخلاف بعض کا مفہوم علمائے عربیہ کے نزدیک اس کا مستقل اور اصلی معنی نہیں ہے بلکہ ملانے کے مفہوم کے ضمن میں یہ معنے مراد لئے جاتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں یہ مفہوم مراد لیا گیا ہے بہرحال حرف بار کی وجہ سے آلۂ مسح کا پتہ چلتا ہے جو ہاتھ ہے اور چونکہ ہاتھ تمام سر کا مسح نہیں کر سکتا اس لئے چوتھائی سر کا مسح تعین کیا گیا کیونکہ ہاتھ آسانی سے اتنی مقدار تک ہی پہونچ سکتا ہے لہٰذا چوتھائی سر کا مسح ضروری ہوا[2]

حنفی علمار کی یہ رائے ہے کہ آیت سر کے مسح کی مقدار بیان کرنے میں مجمل ہے لہٰذا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں واضح کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "آپ نے وضو کیا اور اپنے سر کے آگے کے حصے پر مسح فرمایا"

---

[1] حصہ اوّل بدایۃ المجتہد صفحہ ۱۰ مطبوعہ ۱۳۳۹ھ

[2] حصہ اوّل فتح القدیر صفحہ ۱۱ مطبوعہ بولاق الامیریہ

اس کا اندازہ چوتھائی سر سے کیا گیا ہے۔

(ب) مشترک الفاظ کئی مختلف معانی پر مشتمل ہوں مگر وہ معانی میں متضاد نہ ہوں جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے

"ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہوں، اور زمین میں فساد کرنے کی کوشش کرتے ہوں، یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا انھیں سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انھیں زمین سے جلاوطن کر دیا جائے"

(اس آیت میں بار بار اَو کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ "یا" ہے) لہٰذا امام حسن بصری، عطاء اور امام مالک کی یہ رائے ہے کہ مذکورہ آیت میں اَو کا لفظ اختیار دینے کے لئے ہے یعنی حاکم وقت کو یہ اختیار ہے کہ وہ راہزن کو مذکورہ سزاؤں میں سے کوئی سی سزا دے، دوسرے علماء کا یہ خیال ہے کہ اَو کا لفظ تفصیل اور جداگانہ سزاؤں کے بیان کے لئے آیا ہے (اور ہر صورت کے لئے جداگانہ سزا مقرر کی گئی ہے) مثلاً جو مال نہ چھینے اور صرف قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا اور جو جنگ کرے اور قتل کر کے مال چھین لے تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور جس نے صرف مال لیا ہو اور کسی کو قتل نہ کیا ہو تو اس کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں گے اور جس کا مقصد محض خوف اور دہشت پھیلانا ہو تو اسے جلاوطن کر دیا جائے، اور یہی امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا قول بھی ہے، اسی طرح جلاوطنی کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ صرف ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف بھیج دیا جائے، مگر عراق کے فقہاء کی یہ رائے ہے کہ اسے وہاں بند کر کے قید کر دیا جائے [1]

(۲) احکام القرآن میں اختلاف کی دوسری وجہ مشترک الفاظ کے علاوہ عام طریقے پر قرآن فہمی میں اختلاف بھی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایلاء کے حکم میں

---

[1] الانصاف از بطلیوسی

علماء کا اختلاف ہے لہ کہ اگر قسم کھانے والے شوہر پر چار مہینے رجوع کئے بغیر گذر جائیں (اور وہ قسم توڑ کر بیوی کے پاس نہ جائے) تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر رجوع کئے بغیر وہ مدت گزر گئی تو عورت کو طلاق واقع ہو گئی، دوسرے علماء نے یہ کہا ہے کہ جب مقررہ مدت گذر جائے تو اس موقع پر شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ یا تو وہ رجوع کرے یا طلاق دیدے اس قرآنی آیت سے دونوں رایوں کا ثبوت ملتا ہے

"وہ لوگ جو اپنی عورتوں کے بارے میں قسمیں کھاتے ہیں تو وہ چار[1] مہینے انتظار کریں اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کریں تو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"

(۳) دو آیات دو[2] مختلف احکام کے مطابق ہوں اس وقت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دونوں متضاد مفہوم کا اظہار کرتی ہیں تو ایسی صورت میں استنباط احکام میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عورت کا شوہر مر گیا ہو اور وہ اس کی وفات کی وجہ سے عدت میں ہو، اس سلسلے میں قرآن کریم میں دو آیات مذکور ہیں ایک آیت میں یہ مذکور ہے :-

"تم میں جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑیں تو وہ چار[3] مہینے اور دس دن تک عدت میں بیٹھیں"

مگر ایسی عورتیں جو حاملہ ہوں، ان کے بارے میں یہ حکم ہے :-

"حاملہ عورتوں کی مدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے"

لہذا اگر بیوہ عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت کیا ہو گی؟ اس معاملے میں حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ وہ عورت دونوں میں سے لمبی مدت کے مطابق عدت گذارے تاکہ دونوں آیات پر عمل ہو سکے مگر حضرت عمرؓ کی یہ رائے ہے کہ دوسری آیت پہلی آیت کو مخصوص کر دیتی ہے اس لئے ان کا یہ قول ہے کہ بیوہ حاملہ عورت

لہ ایلاء کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر یہ قسم کھائے کہ وہ چار مہینے یا اس سے زیادہ عرصے کے لئے اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔

کی عدت وضع حمل پر ختم ہو جاتی ہے"

رہی پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن وسنت کے درمیان بہت تعلق اور رابطہ قائم ہے جب کوئی آیت اپنے مفہوم میں مطلق، مجمل یا عام ہو اور پھر اس موضوع پر کچھ احادیث منقول ہو جائیں تو ان احادیث کے بیان و توضیح اور کتاب وسنت میں موافقت پیدا کرنے میں علماء کا اختلاف ہے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ احادیث مطلق مفہوم کو محدود اور عام کو مخصوص کر دیتی ہیں مگر کچھ علماء کی رائے اس سے مختلف ہے اسی اختلاف کو ہم دو مثالوں سے واضح کرتے ہیں :-

سنگسار کرنے کا حکم

(الف) اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں زنا کی سزا اس طرح بیان کی ہے :-

" بدکار عورت اور بدکار مرد میں سے ہر ایک کو سَو سَو کوڑے مارو "

یہ حکم عام ہے اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد و عورت (محصن اور غیر محصن) دونوں شامل ہیں - اس وجہ سے خوارج، بعض معتزلہ جیسے نظام اور اس کے ساتھی ہیں، اس کے قائل ہیں کہ زنا کی سزا صرف کوڑے ہیں وہ سنگسار کرنے (رجم) کے منکر ہیں کیونکہ اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے، یہ حکم محض خبر واحد پر مبنی ہے جو ان کے نزدیک شرعی حجت نہیں ہے، اس لئے وہ سورۂ نور کی اس آیت کے عام مفہوم پر عمل پیرا ہیں اور اسے غیر شادی شدہ کے لئے مخصوص نہیں کرتے ہیں -

مگر جمہور علماء اور فقہاء کا یہ مسلک ہے کہ شادی شدہ (محصن) زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے، کچھ علماء نے یہ کہا ہے کہ پہلے اسے کوڑے مارے جائیں [1] پھر اسے سنگ سار کیا جائے - وہ سنگ سار کرنے کے حکم کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں کیونکہ آپؐ نے ماعز کو جو شادی شدہ (محصن) تھا - سنگسار کیا تھا بلکہ بخاری اور مسلم میں حضرت

---

[1] تاکہ قرآن وسنت دونوں پر عمل ہو سکے -

ابن مسعودؓ کی یہ حدیث موجود ہے —— "کسی مسلمان کا خون بہانا صرف تین صورتوں میں جائز ہے —— (۱) جب کہ وہ شادی شدہ زانی ہو (۲) جب کہ جان کے بدلے میں جان لی جائے (قصاص لیا جائے) (۳) اور جب کوئی اپنی جماعت کو چھوڑ کر دین سے مرتد ہو جائے" چونکہ یہ مشہور حدیث ہے اس لئے مذکورہ آیت کے مفہوم کو صرف غیر شادی شدہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے کیونکہ سنت نبویؐ سے شادی شدہ (محصن) کو سنگسار کرنا (رجم) ثابت ہے۔

مشہور حنفی عالم ابن الھمام نے خوارج کی تردید اس طرح کی ہے —— شادی شدہ کو سنگسار کرنا اوّل تو صحابہؓ کے اجماع سے ثابت ہے دوسری بات یہ ہے —— کہ شادی شدہ کو سنگسار کرنے کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح متواتر اور مسلسل چلتا چلا آرہا ہے جس طرح حضرت علیؓ کی شجاعت اور حاتم کی سخاوت کا ثبوت ملتا ہے، یہ احادیث اخبار احاد اپنی ظاہری صورت اور روایت کے لحاظ سے ہیں ورنہ رجم کی اصلیت اور اس کا مفہوم متواتر ہے اور مسلسل طریقے سے ثابت ہے، خوارج بھی معنی کے لحاظ سے متواتر حدیث کو واجب العمل سمجھتے ہیں مگر چونکہ وہ صحابہؓ اور عام مسلمانوں سے ملتے جلتے نہیں تھے نیز مسلم علماء اور راویان حدیث کے پاس ان کی آمد و رفت نہیں تھی اس لئے وہ ان احادیث سے ناواقف رہے [۱]

ابو بکر الرازی اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھتے ہیں —— "ایک معمولی جماعت نے رجم کے حکم سے انکار کیا اور وہ خارجیوں کی جماعت ہے حالانکہ رجم کا ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے اور تمام امت مسلمہ اسے دستور بنا کر اسے نقل کرتی چلی آئی ہے، یہ ایسی مشہور خبر ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے،

چوری کے مال کی مقدار

(ب) اللہ تعالیٰ نے چوری کی سزا اس طرح بیان فرمائی ہے "خواہ مرد چوری کرے یا عورت چوری کرے، ان دونوں

---

[۱] جلد چہارم فتح القدیر صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲ نیز نیل الاوطار از شوکانی،

کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ ان کے کرتوتوں کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے سزا ہے"
یہ آیت مطلق یا مجمل ہے اس میں چوری کے مال کی وہ مقدار نہیں بیان کی گئی
ہے جس پر حد شرعی واجب ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے بھی علمار میں اختلاف
پیدا ہوا۔

ایک قلیل جماعت نے اس کا عام اور مطلق مفہوم مراد لیا ہے اور وہ معمولی
سے معمولی قیمت پر بھی ہاتھ کاٹ دینے کی قائل ہے، یہ رائے خوارج ۔
داؤد الظاہری اور امام حسن بصری کے تین اقوال میں سے ایک قول کے مطابق
ہے انھوں نے آیت کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے۔

اکثر علمار و فقہار کا فتویٰ یہ ہے کہ خاص مقدار کے مال پر ہاتھ کو کاٹا جاسکتا
ہے اور چونکہ آیت میں مقدار کو بیان نہیں کیا گیا ہے اس لئے وضاحت کی
ضرورت ہے کیونکہ آیت کے عام اور مطلق مفہوم کے مطابق ہر مقدار پر حد شرعی
جاری نہیں ہو سکتی ہے،

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ عامر بن سعد کی حدیث کو پیش کرتے
ہیں جو انھوں نے اپنے باپ کے واسطے سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ــــــ "چور کا ہاتھ صرف ایسے مال کی چوری میں کاٹا جاسکتا
ہے جس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔" اسی طرح حضرت عائشہ رض کی روایت
ہے کہ آپ نے فرمایا ــــ "چور کا ہاتھ اس وقت تک نہیں کاٹا جاسکتا جب تک
کہ چوری کے مال کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو" ایک
روایت یہ ہے "کم از کم مال جس پر چور کا ہاتھ کاٹا جائے، ڈھال کی قیمت کے برابر ہو"
اب کم از کم مال کے اندازے میں اختلاف رونما ہوا اور اس ڈھال کی قیمت
مقرر کی گئی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہاتھ کاٹا گیا تھا کیونکہ
سابقہ روایات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اس سے کم قیمت کا مال نہیں ہونا چاہئے
تابعین کی ایک جماعت اور حنفی علمار کا اندازہ یہ ہے کہ وہ مال کم از کم دس
درہم کا ہونا چاہیئے کیونکہ ترمذی میں حضرت ابن مسعود رض کی یہ حدیث موجود ہے
"ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر جب کہ مال ایک دینار ہو یا دس درہم ہوں" حضرت

عمر فاروق رضؓ، حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت عمر بن عبد العزیز، امام لیث اور امام شافعی کے اقوال یہ ہیں کہ یہ مال چوتھائی دینار یا اس کے برابر ہو، کیونکہ آپؐ نے فرمایا تھا —" کہ چور کا ہاتھ صرف چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ قیمت پر کاٹا جائے "

امام مالک اور امام احمد حنبل کا مسلک یہ ہے کہ وہ چوتھائی دینار ہو یا تین درہم ہوں کیوں کہ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں —" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کا ہاتھ ایک ڈھال کی چوری میں کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی۔ امام شافعی کے کے قول کے مطابق عہد رسالتؐ میں ایک دینار کی قیمت بارہ۱۲ درہم تھی اس لئے تین درہم اس کا چوتھائی حصہ ہیں۔

اس موقع پر اختلاف کے دو پہلو ہیں (۱) کیا مال کم ہو یا زیادہ، ہر صورت میں ہاتھ کاٹا جائے یا اس کی کوئی حد مقرر ہونی چاہیئے کہ اس سے کم پر ہاتھ قطع نہ ہو؟ یہ اختلاف اس لئے رونما ہوا کہ بعض علمار آیت کے مطلق اور عام مفہوم پر عمل کرنے لگے تھے۔ اور ان کے نزدیک مال کی کوئی معین مقدار ثابت نہیں ہوئی تھی مگر جمہور علمار نے مطلق آیت کو مقید کر دیا ہے اور اس کے عام مفہوم کو مخصوص کر لیا ہے کیونکہ صحیح احادیث اور اجماع سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے (جیسا کہ صاحب فتح الباری نے بیان کیا ہے)

(۲) اب ان لوگوں میں جو معین مقدار کے قائل ہیں کم از کم مال کی مقدار مقرر کرنے میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس اختلاف کا سبب ایک طرف سے مختلف روایات ہیں تو دوسری طرف سے اس ڈھال کی قیمت مقرر کرنے میں صحابہؓ کا اختلاف ہے جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کاٹا تھا اس کی قیمت میں یہ اختلاف ہے کہ آیا اس کی قیمت تین درہم ہے یا دس درہم ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور قیمت ہے، امام مالک نے کم از کم قیمت پر عمل کیا۔ کیونکہ یہ یقینی عمل ہے اور حنفی علمار نے زیادہ سے زیادہ قیمت پر عمل کیا کیونکہ وہ اس اصول کے پابند ہیں کہ —" جہاں تک ممکن ہو، حد شرعی کو دور کرو " چونکہ کم از کم مال میں جرم کے ثابت نہ ہونے کا شک وشبہ ہے اس لئے حد شرعی

جاری نہیں کی گئی،

اس مسئلے پر بہت مختلف روایات ہیں اور قرطبی نے اس مسئلے پر ساتؔ اقوال نقل کئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام علمار کا اس پر اتفاق ہے کہ معمولی چیز پر ہاتھ قطع نہیں ہو سکتا لہٰذا چوری کا ثبوت بہم پہونچانے کے لئے کم از کم مقدار مال کو متعین کرنے کی ضرورت ہے مگر اس کی حد ایک، تین، پانچ یا دس درہم مقرر کرنے سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا اس لئے اس کی قیمت کے تعین کا فیصلہ ہر زمانے کے اہل علم اور مجتہد حضرات پر چھوڑ دینا چاہیئے جو حالات اور لوگوں کی نفسیات کے مطابق فیصلہ کریں [1]

قتل عمد میں کفارہ

(۸) اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم میں اس مسئلہ کے حکم کو مخصوص وصف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس جیسے دوسرے مسئلے کے حکم کو مخصوص وصف کے بغیر ذکر کیا گیا ہے ایسی صورت میں بعض علمار دونوں واقعات کو ان کے ظاہری حکم پر محدود رکھتے ہیں اور ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتے ہیں مگر بعض علمار قیاس کے ذریعے ان میں کوئی نہ کوئی تعلق اور رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سلسلے میں بعض علمار یا تو اس کی کوئی تاویل کرتے ہیں یا ان کے نزدیک وہ حدیث ثابت نہیں ہوتی، اس کی مثال یہ ہے کہ قتل عمد پر آیات کی رو سے قصاص واجب ہے مگر کفارہ کے واجب ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے — "تم پر مقتولوں کا قصاص فرض کر دیا گیا ہے" مگر خطا اور غلطی سے قتل کرنے کے سلسلے میں دیت کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہے جیسا کہ ارشاد ہے — "جب کوئی کسی مومن کو خطا سے قتل کرے تو وہ ایک غلام آزاد کرے اور پوری دیت اس کے گھر والوں کو دے بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں"،

ایسی حالت میں امام شافعی اور دیگر فقہار کا یہ مسلک ہے کہ عمداً قتل کرنے والے پر بھی کفارہ ہے کیونکہ جب خطا کے قتل میں کفارہ واجب ہو تو قتل عمد

[1] احکام القرآن از رازی و فتح القدیر جلد چہارم بحث سرقہ و تفسیر القرطبی۔

میں بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اس سے زیادہ سخت جرم ہے، وہ اس کی تائید میں حضرت ضمرہ کی حدیث بھی پیش کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں۔
"ہم اپنے ایک ساتھی کو لے کر آئے جو قتل کے جرم میں دوزخ کا مستحق ہو چکا تھا تو آپؐ نے فرمایا "اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کردو"

حنفی علمار اور دیگر فقہار کی یہ رائے ہے کہ قتل عمد میں کفارہ نہیں ہے کیونکہ دونوں قسم کے قتل کا حکم صاف طور پر بیان کر دیا گیا ہے اس لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم خدا کے واضح اور صریح احکام سے آگے بڑھ جائیں ایسی صورت میں قیاس بھی جائز نہیں ہے کیونکہ کفارہ کا مسئلہ ایسا ہے جس میں قیاس کو جاری نہیں کیا جا سکتا بلکہ کفارہ کے احکام قیاس کے خلاف ہیں اور صرف نص شرعی پر مبنی ہیں، یہ لوگ مذکورہ بالا حدیث پر بھی عمل نہیں کرتے ان کی رائے میں زیادہ صحیح سلسلہ روایت سے جو حدیث منقول ہے اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ "وہ قتل کے ذریعے دوزخ کا مستحق ہو گیا تھا"[1]

[1] حصہ دوم احکام القرآن از رازی
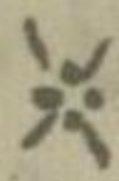
فصل دوم

احکام سنت میں اختلاف کے اسباب

جب قرآن کریم کے احکام میں اختلاف ممکن ہے اور اس اختلاف کی وجہ ہم بیان کرچکے ہیں تو سنت نبویؐ کے احکام میں اختلاف کا امکان زیادہ ہے، کیونکہ سنت کی تدوین اموی دور میں شروع ہوئی تھی اور اس کی ترتیب صحابہؓ اور تابعین کی روایت پر رکھی گئی تھی اس لئے ہر ایک کو روایت کے تمام سلسلوں کی احادیث کا پورا علم نہ تھا بلکہ ہر راوی کے پاس ایسی احادیث تھیں جو دوسروں کے پاس نہ تھیں علاوہ ازیں بعض صحابہؓ نے تھوڑی احادیث بیان کیں اور بعض نے کثرت سے احادیث کو بیان کیا نیز یہ بھی ہوا کہ صحابہ کرامؓ مختلف اسلامی ممالک میں منتشر ہوگئے تھے اس کے بعد مسلمانوں میں بھی اختلاف و انتشار پیدا ہوا اور ان میں گروہ بندی شروع ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ایسے لوگ بھی مسلمان ہوگئے جو مخلص نہیں تھے اور ان کے ذریعے جعلی احادیث پھیلنے لگیں، لہذا ایسے حالات میں ان احکام میں اختلاف کا ہونا ناگزیر تھا جو سنت نبوی سے ماخوذ تھے لہذا ہم ان اختلافات کے اسباب معلوم کرکے ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یا تو متواتر ہیں جو قول سنت میں بہت کم ہیں یا تقریباً نایاب ہیں یا غیر متواتر ہیں اس صورت میں ان کے مختلف مراحل و درجات ہیں اور ان کے مطابق ان میں قوی، ضعیف، صحیح اور

۱؎ متواتر وہ احادیث ہیں جسے راوی اس کثرت سے روایت کریں کہ ان سب کا دروغ گوئی پر متفق ہونا ناممکن ہوجائے۔

حسن کا فرق کیا جاتا ہے بہرحال اگر متواتر حدیث ہو تو کم ہونے کے باوجود ان کا متواتر ہونا ثابت ہو جائے تو انھیں تسلیم کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر جو غیر متواتر احادیث ہیں ان کی بعض قسموں میں علمار کا اختلاف ہے لہذا جن کے نزدیک ایسی قسمیں صحیح ہیں تو وہ ان احادیث پر عمل کرتے ہیں مگر جن کے نزدیک وہ احادیث ثابت نہیں ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صحابی نے وہ حدیث سنی اور اس کے مطابق انھوں نے کوئی فیصلہ کر دیا مگر دوسرے صحابی نے وہ حدیث نہیں سنی اس لئے انھوں نے اس کے خلاف بیان کیا جیسا کہ حضرت ابن عمر کے ساتھ ہوا کہ انھوں نے اپنے اجتہاد کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ غسل کے وقت عورتیں اپنے بال کھول لیا کریں جب حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اس کو ناپسند فرمایا وہ فرمانے لگیں ——— " میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن میں غسل کرتے تھے اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی تھی کہ اپنے سر پر تین مرتبہ پانی ڈالتی تھی [1]

(۲) کبھی کسی حکم کے سبب و علت میں اختلاف ہو جاتا تھا جیسا کہ ایک مرتبہ ایک جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے تھے اس کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ایک یہودی کا جنازہ تھا لہذا آپؐ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ وہ آپؐ کے سر کے اوپر رہے اس لئے آپؐ کھڑے ہو گئے تھے، اس سبب کے مطابق جنازہ کے لئے آپ کا کھڑا ہونا مجبوراً تھا لہٰذا نہ تو یہ فعل مستحب تھا اور نہ اس کا عام حکم دیا جا سکتا ہے اس کا دوسرا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ کا قیام موت اور موت کا اختیار رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لئے تھا۔ یا فرشتوں کی تعظیم کے لئے تھا۔ ایسی صورت میں قیام کے لئے عام حکم دیا جا سکتا ہے (خواہ جنازہ مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا ہو) بلکہ یہ فعل مستحب ہوگا، گو بیٹھے رہنا بھی جائز ہے علاوہ ازیں کچھ علمار کی یہ رائے ہے کہ یہ قیام سنت نبویؐ کے ذریعے جاری ہوا تھا اور پھر دوسری سنت نبویؐ کے ذریعے منسوخ بھی ہو گیا۔

---

[1] اسرار الشریعۃ الاسلامیہ از ابراہیم علی

(۳) کسی ایک موضوع پر بعض اوقات مختلف احادیث مذکور ہوئی ہیں لہٰذا ہر مجتہد جس حدیث سے واقف ہوتا ہے یا جو حدیث اس کے نزدیک صحیح ہوتی ہے، اس پر عمل کرتا ہے۔

اس سلسلے میں عبدالوارث بن سعید یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

- میں مکۂ معظمہ آیا اور وہاں امام ابوحنیفہ سے ملاقات کی تو میں نے کہا آپ اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک چیز فروخت کی اور اس پر ایک شرط مقرر کی" انھوں نے فرمایا —— "بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی باطل ہے" اس کے بعد میں ابن ابی لیلیٰ کے پاس آیا تو انھوں نے فرمایا —— "بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے" اس کے بعد میں ابن شبرمہ کے پاس آیا اور ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا۔ تو انھوں نے فرمایا —— "بیع جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے" میں نے اپنے دل میں کہا۔ "سبحان اللہ! عراق کے تین عالم بھی ایک مسئلہ پر متفق نہیں ہیں" لہٰذا میں امام ابوحنیفہ کے پاس گیا اور جو کچھ ان کے دونوں ساتھیوں نے کہا تھا ان سے بیان کیا۔ انھوں نے کہا — "میں یہ جانتا ہوں کہ مجھ سے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ دادا کے سلسلۂ روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط کے ساتھ بیع سے منع فرمایا ہے" اس کے بعد میں ابن ابی لیلیٰ کے پاس گیا اور ان کو دونوں عالموں کا فتویٰ بتایا تو انھوں نے فرمایا —— "مجھے نہیں معلوم کہ کس بنا پر ان دونوں نے تم سے یہ بات کہی —— "مجھے ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کے ذریعے حضرت عائشہ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں —— "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کروں، اس کے متعلقین نے اس شرط پر فروخت کرنا منظور کیا کہ اس کی ولاء کا تعلق ان سے رہے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اسے لے لو اور ان کے لئے ولاء (حق میراث) کی شرط مان لو۔ مگر ولاء اس شخص کے لئے ہوگی جو آزاد کرے،" اس کے بعد آپ نے فرمایا — "جو شرط کتاب اللہ میں موجود نہ ہو تو وہ باطل ہے،" لہٰذا بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے"

اس کے بعد میں ابن شبرمہ کے پاس گیا اور انھیں دونوں عالموں کا قول بتایا

تو وہ کہنے لگے ــــ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں نے کس بنا پر یہ بات کہی
بہرحال مجھے مسعر بن کدام نے محارب بن دثار کے واسطے سے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث
بیان کی ہے کہ انھوں نے فرمایا ــــ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک
اونٹ فروخت کیا اور آپؐ نے میرے ساتھ یہ شرط مقرر کی کہ میں آپؐ کو اس پر بٹھا کر
مدینہ تک لے جاؤں " لہٰذا بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے [1]

اسی طرح صرف ایک ہی واقعہ میں راویوں کے درمیان اختلاف رونما ہو جاتا ہے
اس کی واضح ترین مثال یہ ہے کہ راویوں کا اس بارے میں اختلاف ہے ۔ کہ
حجۃ الوداع میں جو احرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا تھا آیا وہ صرف حج
کے لئے تھا یعنی حج مفرد تھا یا عمرہ اور پھر حج کا احرام باندھا تھا اس
صورت میں یہ حج تمتع ہوگا یا حج اور عمرہ دونوں کا احرام تھا اس
صورت میں یہ حج قران ہوگا ۔ اس اختلاف کی وجہ سے فقہا کا اس بارے میں
اختلاف ہے کہ حج مفرد ، قران اور تمتع میں سے کون سا افضل ہے؟

(۴) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک کوئی حدیث صحیح ہوتی ہے
مگر دوسری جماعت اسے صحیح نہیں تسلیم کرتی یا کوئی جماعت حدیث کے صحیح
ہونے اور اس پر عمل کرنے کے لئے بہت سی شرائط مقرر کرتی ہے اور
جب کوئی حدیث ان شرائط پر پوری نہیں اترتی تو وہ قیاس کو حدیث پر ترجیح
دیتے ہیں مگر دوسری جماعت اس قسم کی شرائط مقرر نہیں کرتی ہے اس لئے وہ
حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں اس صورت میں احکام حدیث کے بارے میں
اختلاف رونما ہو جاتا ہے ۔

(۵) کبھی کسی چیز کو مباح کرنے اور لوگوں کو سہولت دینے کے سلسلے میں بھی
اختلاف رونما ہو جاتا ہے جیسا کہ اذان اور اقامت کے الفاظ میں اختلاف اور
عیدین اور جنازہ کی تکبیروں میں بھی اختلاف ہے اس کی وجہ سے فقہاء میں ان کی
تعداد اور طریقۂ ادا میں بھی اختلاف ہو گیا ہے ۔ [2]

---

[1] الانصاف فی التنبیہ علی الاسباب الاختلاف ' از بطلیوسی صفحہ ۷۰ د حاشیہ صفحہ ۷۱
[2] الانصاف از بطلیوسی صفحہ ۱۳۰

فصل سوم

قرآن وسنت کے مشترکہ احکام میں اسباب اختلاف

قرآن وسنت کے درمیان مشترکہ احکام میں اختلاف کے کئی اسباب ہیں۔

(۱) اگر معاملات میں لین دین کے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی اور وجہ سے کوئی بات منع کی گئی ہو تو علمار کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس ممانعت کا اثر کہاں تک ہے بعض علمار ممانعت کی نص شرعی کے ساتھ ساتھ اس کے جواز کی عام نص شرعی کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ اور ان دونوں احکام کو سامنے رکھ کر ان میں موافقت پیدا کرتے ہیں، مگر دوسرے علمار صرف ممانعت کے حکم کو پیش نظر رکھتے ہیں اس لئے اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ جب نماز جمعہ کی اذان ہو جائے اس وقت بیع و فروخت کو منع کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے

یاایّھا الذین آمنوا اذا نودی	اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز
للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ	کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر
فاسعوا الی ذکر اللہ و	کی طرف دوڑ کر جاؤ اور خرید و فروخت
ذروا البیع (سورۃ جمعہ پ۲۸)	چھوڑ دو۔

اس بارے میں حنفی اور شافعی علمار کی یہ رائے ہے کہ ممانعت کے باوجود اگر کوئی بیع کی گئی تو وہ بیع بذات خود درست ہوگی کیونکہ حنفی علمار، دوسری آیت سے بھی استدلال لاتے ہیں جس میں یہ مذکور ہے، "اے ایمان والو! تم اپنا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت کی صورت میں ہو" لہٰذا آیت کے مطابق بیع صحیح ہوگی اور اس سے متعلقہ ملکیت

کے تمام احکام بھی درست ہوں گے، اس کے ساتھ ساتھ وہ مذکورہ بالا پہلی آیت پر بھی عمل کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اذان جمعہ کے وقت کوئی چیز فروخت کرنا مکروہ تحریمی ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ اذان کے وقت فروخت کی ممانعت معاملہ کی ضروری باتوں (ارکان بیع) کے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے یہ ممانعت کی گئی ہے کہ یہ خرید و فروخت انسان کو نماز کی ادائیگی سے روکتی ہے لیکن بذات خود بیع میں کوئی خرابی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح نہ ہو سکے اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ کوئی نماز کے آخری وقت میں اس طرح خرید و فروخت کرے کہ اگر وہ اس میں مشغول رہے تو نماز کے قضا ہونے کا اندیشہ ہو ایسی بیع بھی (نماز کی وجہ سے) ممنوع ہے مگر بیع درست ہو جائے گی

مگر امام مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ اذان جمعہ کے موقع پر اگر کوئی بیع کی جائے تو وہ فسخ ہو جائے گی۔ اور صحیح نہیں ہوگی، انھوں نے مذکورہ بالا پہلی آیت کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے۔ جس میں بیع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے خواہ اس کا تعلق کاروبار سے نہ ہو فرقہ ظاہریہ کی بھی یہی رائے ہے [1]

(۲) کبھی شرعی نصوص میں تعارض اور اختلاف ہوتا ہے [2] اس صورت میں بعض علماء ان سب کو ملا کر سب پر حتی الامکان عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض ان میں تاویل کرتے ہیں اور اپنی رائے اور اجتہاد سے ان میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب اس طرح ممکن نہ ہو تو ان میں سے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے، منسوخ کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور ناسخ پر عمل کیا جاتا ہے اس کی مثالیں یہ ہیں:-

(الف) محصن (شادی شدہ) زانی کے بارے میں حضرت عبادۃ بن الصامت کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ مجھ سے یہ بات معلوم کرو۔ مجھ سے یہ بات معلوم کرو کہ اللہ نے ان عورتوں کے لئے راستہ کھول دیا ہے

---

[1] حصہ سوم احکام القرآن از رازی و بدایۃ المجتہد

[2] تعارض کے قریب قریب وہ اختلاف بھی ہے جسے بطلیوسی نے اپنی کتاب الانصاف کے صفحات ۲۶ - ۲۸ میں اس طرح ذکر کیا ہے " اختلاف کے اسباب میں وہ سبب بھی ہے جسے (باقی صفحہ ۳۱۳)

کنواری کے ساتھ کنوارا (زنا کرے) تو سو کوڑے کی سزا اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ، شادی شدہ (عورت) کے ساتھ (زنا کرے)، تو ایک سو کوڑے کی سزا اور سنگساری ہے "

یہ حدیث اسلام کے ابتدائی دور میں زنا کی سزا کی طرف اشارہ کرتی ہے شروع میں بدکار عورت کی سزا یہ ہوتی تھی کہ اسے قید کیا جاتا تھا اور اسے برا بھلا کہہ کر اذیت دی جاتی تھی اور مرد کو صرف اذیت دینا ہی کافی تھا اسے قید نہیں کیا جاتا تھا[1] اس حکم پر سورہ نسار کی مندرجہ ذیل آیات کے مطابق عمل کیا جاتا تھا۔

"اگر تمھاری کچھ عورتیں بدکاری کی مرتکب ہوں تو تم ان کے برخلاف چار گواہ لاؤ اگر وہ گواہی دیدیں تو انھیں گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکالے تم میں سے وہ دونوں (مرد و عورت) جو بدکاری کے مرتکب ہوں انھیں تکلیف و اذیت پہونچاؤ اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں، تو ان دونوں سے روگردانی کرو، بے شک اللہ توبہ کو قبول کرنے والا اور مہربان ہے"

(بقیہ صفحہ ۳۱۲) افراد و ترکیب کہا جاتا ہے اس کی وجہ سے بھی بہت اختلاف پیدا ہوگیا ہے لہذا ایسی حالت میں بہت غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک حکم کے بارے میں کئی آیات و احادیث ہوتی ہیں بعض فقہار صرف ایک آیت اور ایک حدیث پر عمل کرتے ہیں، اور بعض متفرق آیات اور مختلف احادیث کو ملا کر ان کا ایک دوسرے سے تعلق قائم کرتے ہیں، یعنی وہ تمام آیات اور تمام احادیث پر مجموعی حیثیت سے عمل کرتے ہیں اس طرح ان دو جماعتوں کے مختلف طرز عمل سے احکام میں بھی اختلاف ہوجاتا ہے،

[1] کیونکہ مرد کو روزی کمانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے ہماری یہ رائے جو کتاب میں مذکور ہے علمار کے ان اقوال سے ماخوذ ہے جو انھوں نے سورہ نسار کی آیات کا سورہ نور کی آیات سے تعلق کرنے کے سلسلے میں بیان کئے ہیں ملاحظہ ہوں کتب تفسیریہ

اس کے بعد غیر شادی شدہ کی سزا کوڑے مقرر ہوئے چنانچہ سورہ نور کے شروع میں یہ مذکور ہے ـــــ بدکار عورت اور بدکار مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو"

شادی شدہ (محصن) کی سزا رجم (سنگساری) ہے جیسا کہ حضرت عبادہ کی اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے جو سورہ نسار کے قید و تکلیف کے حکم کے بعد کی ہے اور اس حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے جو سزائیں بیان کی ہیں وہ اس راہ کو ظاہر کرتی ہیں جو اللہ نے ان کے لئے نکالی ہے [1]

یہ حدیث شادی شدہ کے لئے کوڑے اور رجم دونوں سزاؤں کا ذکر کرتی ہے حالانکہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز اور غامدیہ عورت کو صرف رجم کی سزا دی تھی اور کوڑے اور رجم دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ نہیں دیا تھا، اس لئے علمار کا اس میں اختلاف ہے بعض علمار کا یہ خیال ہے کہ حضرت عبادہ کی حدیث منسوخ ہے اور شادی شدہ (محصن) زانی کی شرعی سزا صرف رجم ہے۔ فرقہ ظاہریہ کا مسلک اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ کوڑوں اور رجم دونوں سزائیں دی جائیں کیونکہ وہ مذکورہ حدیث کو منسوخ نہیں سمجھتے ہیں اور حضرت علیؓ سے بھی یہ روایت منقول ہے کہ جب انھوں نے (عورت) کو کوڑے اور رجم کی سزا دی تو فرمایا ـــــ میں نے اسے کتاب کے مطابق کوڑے مارے اور سنت نبویؐ کے مطابق اسے سنگسار کیا۔

(ب) اگر کوئی کنوارا مرد یا عورت بدکاری کرے تو ان کے بارے میں یہ یہ آیت ہے ـــــ بدکار عورت اور مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو"

---

[1] اس صورت میں سورہ نسار کا مذکورہ بالا حکم صرف خاص مدت کے لئے مقرر تھا یعنی اس وقت تک جب تک کہ اللہ دوسرا راستہ نہ نکالے اس راہ کو سورۂ نور میں بیان کیا گیا ہے اور رجم کی حدیث کے بعد یہ حکم بالکل مکمل ہو جاتا ہے اس وجہ سے قرطبی نے کہا ہے کہ اس آیت کو متقدمین نے جو منسوخ کیا ہے تو ان کا یہ اطلاق مجازی معنوں میں ہے بعض علمار نے اذیت اور ملامت کی سزا کو کوڑوں کی سزا کے ساتھ بھی باقی رکھا ہے کیونکہ ان کا اس سزا سے کوئی تعارض نہیں ہے مگر قید کی سزا باتفاق منسوخ ہے علمار اور مفسرین کی رائے حصہ پنجم تفسیر قرطبی میں ملاحظہ ہو۔

مگر مذکورہ بالا حضرت عبادۃ کی حدیث میں یہ مذکور ہے ـــ "کنوارا کنواری کے ساتھ (بدکاری کرے) تو ایک سَو کوڑے کی سزا اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔" آیت کریمہ میں محض کوڑوں کی سزا ہے اور اس میں جلاوطنی کا کوئی ذکر نہیں ہے مگر حدیث میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے اس لئے امام شافعی، احمد، ثوری اور اوزاعی کی یہ رائے ہے کہ غیر شادی شدہ کی صورت میں کوڑوں اور جلاوطنی دونوں چیزوں کی سزا دی جائیگی مگر حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ آیت کریمہ کے مطابق اس کے لئے صرف کوڑوں کی سزا ہے۔ اسے جلاوطن نہیں کیا جائے گا البتہ اگر حاکم وقت مناسب سمجھے تو وہ جلاوطن کر سکتا ہے اس صورت میں جلاوطنی تعزیرات کا ایک حصہ ہوگی، حد شرعی نہیں ہوگی، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق آیت کریمہ حضرت عبادۃ کی حدیث کو منسوخ کرتی ہے جس میں کوڑوں اور جلاوطنی کی دونوں سزائیں شامل ہیں [1]

(۳) کبھی علماء کا اختلاف اس بارے میں ہوتا ہے کہ نص شرعی کا مفہوم عام ہے یا خاص ہے کیونکہ حدیث و قرآن کی بعض عبارتوں کے عام یا خاص مفہوم میں علماء کا اتفاق ہے مگر بعض عبارتوں میں دونوں قسم کا احتمال ہے اس لئے اس میں اختلاف رونما ہوتا ہے بطلیوسی کہتے ہیں۔ ایسی مثال آیت کا یہ حصہ ہے

لا اکراہ فی الدین — مذہب میں کوئی زبردستی نہیں ہے

اس کے مفہوم کے بارے میں بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ حکم اہل کتاب کے لئے مخصوص ہے کہ جب وہ جزیہ ادا کریں تو انھیں زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔ دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم عام ہے مگر ان کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت سورہ توبہ کی اس آیت کے ذریعے منسوخ ہو گئی ہے جس میں یہ ارشاد ہے ـــ "اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو"

سب سے زیادہ واضح اور صحیح مثال یہ آیت ہے جو احکام قرآن کے فصل میں بھی بیان کی گئی ہے ـــ "وہ لوگ جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ

[1] ہدایہ فتح القدیر، نیل الاوطار اور احکام القرآن از رازی

جائیں تو وہ چار مہینے اور دس دن تک عدت اختیار کریں،" اس آیت سے بعض علمار نے عام مفہوم مراد لیا ہے لہٰذا اس میں حاملہ اور غیر حاملہ دونوں بیوہ عورتیں شامل ہیں، اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے حاملہ بیوہ عورتیں دونوں مدتوں میں سب سے زیادہ طویل مدت تک عدت میں رہیں یعنی اگر ان کا مذکورہ مدت سے پہلے وضع حمل ہو جائے تو اس صورت میں بھی وہ چار مہینے دس دن کی مدت پوری کریں گی لیکن دوسرے علمار نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا عام مفہوم برقرار نہیں رہا ہے بلکہ مذکورہ بالا آیت غیر حاملہ عورت کے لئے مخصوص ہے کیوں کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ـــ حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے" لہٰذا حاملہ بیوہ عورتوں کی عدت، وضع حمل پر ختم ہو جائے گی خواہ چار مہینے دس دن کی مدت پوری نہ ہو،

(۴) اختلاف کی ایک وجہ ناسخ منسوخ کا اختلاف بھی ہے بعض علمار نسخ کے منکر ہیں، اور بعض اس کے حامی ہیں اس طرح جو نسخ کے حامی ہیں ان میں بھی کئی باتوں میں باہمی اختلاف ہے ایک اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ آیا حدیث قرآن کریم کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں ؟ اسی طرح قرآن و حدیث کے بعض احکام کے منسوخ ہونے میں بھی اختلاف ہے اور اسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے احکام میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے[1] ایسی مثالوں کی طرف گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا جاچکا ہے،

(۵) بعض الفاظ کے بارے میں یہ اختلاف بھی ہے کہ آیا ان الفاظ سے حقیقی معنے مراد لئے جائیں یا مجازی معنے سمجھے جائیں اس قسم کا لفظ نکاح ہے بعض علمار یہ کہتے ہیں کہ یہ مشترک لفظ ہے اور اس کے دو معنے ہیں (۱) مباشرت (۲) اور شادی کرنا۔ بعضوں نے اسے مشترک معنوی قرار دیا ہے اور کچھ حضرات نے اس کے حقیقی معنی مباشرت اور مجازی معنی شادی کرنے کے مراد لئے ہیں چنانچہ حنفی علمار کی یہی رائے ہے اس لئے حنفی علمار کی کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور

---

[1] الانصاف از بطلیوسی صفحہ ۱۲۹ - ۱۳۰

ہے کہ کتاب و سنت میں نکاح کا لفظ جہاں کہیں سیاق و سباق کے قرینے کے بغیر مذکور ہو تو اس سے مراد مباشرت لی جاتی ہے[1] جیسا کہ یہ آیت ہے:-
"تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپ نے نکاح کیا ہو" لہٰذا مذکورہ بالا مفہوم کے مطابق جس عورت سے باپ نے زنا کیا ہو، وہ عورت اس مرد کے بیٹوں اور پوتوں کے لئے حرام ہو جاتی ہے کیونکہ اس نص قرآنی سے اس کی حرمت ہے، مگر فقہار نے اس سے اختلاف کیا ہے جن میں امام شافعی بھی شامل ہیں انھوں نے جائز اور ناجائز تعلقات میں فرق رکھا ہے یعنی ان کے نزدیک جائز شادی سے جو ازدواجی رشتے قائم ہوتے ہیں وہ حرام ہیں لیکن بدکاری کے ذریعے جو رشتے قائم ہوتے ہیں وہ حرام نہیں ہیں،

(۸) علمار کا سب سے بڑا اختلاف امر و نہی کے صیغوں میں ہے کہ امر اور نہی کے صیغوں سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امر کا صیغہ قرآنی کی مدد سے بہت سے معنوں میں مستعمل ہے ان کی تعداد پندرہ[۱۵] یا چھبیس[۲۶] تک پہونچ جاتی ہے امر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ وجوب کا حکم دیتا ہے جیسے "نماز قائم کرو" نیز اس سے مستحب حکم بھی ظاہر ہوتا ہے اور آداب کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے جیسا کہ آپؐ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا —— "اپنے قریب کے حصے سے کھاؤ" اس کے ذریعے ہدایات بھی دی جاتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں یہ مذکور ہے —— "اے ایمان والو! جب تم مقررہ مدت کے لئے قرض دو تو اسے لکھ لیا کرو" مباح کام کو بھی امر کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے —— "جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو" (یعنی تمھارے لئے شکار کرنا جائز ہے) اسی طرح کی یہ آیت بھی ہے،
"جب نماز ادا کرلی جائے تو تم زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو" کبھی امر دھمکانے کے لئے بھی آتا ہے جیسے فرمایا گیا ہے "جو چاہو کرو" مگر جب کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو امر کے حقیقی معنے میں اہل علم میں زبردست

---

[1] حصہ دوم ردالمختار صفحات ۲۶۶، ۲۶۷ اور فتح القدیر جلد دوم صفحات ۴۰، ۴۱، ۴۲

اختلاف ہے بعض کا یہ قول ہے کہ اس کا حقیقی مفہوم مستحب کے لئے ہے بعض کی یہ رائے ہے کہ اس کا حقیقی مفہوم مستحب اور واجب دونوں کے لئے مشترک ہے۔ بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ یہ واجب، مستحب اور مباح تینوں کے لئے مشترک معنوی ہے کیونکہ تینوں کے مشترک مفہوم میں اجازت پائی جاتی ہے وہ لوگ جو اسے واجب اور مستحب دونوں کے لئے مشترک سمجھتے ہیں وہ ان میں مطلب کے مفہوم کو مشترک خیال کرتے ہیں یعنی کوئی کام کرنے کو اس کے چھوڑنے پر ترجیح حاصل ہے،

ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ جب تک کوئی قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک اس کے کسی معنی کا پتہ نہیں چل سکتا۔ لیکن اکثر علمار کا یہ فیصلہ ہے کہ امر کے حقیقی معنے وجوب کے ہیں البتہ اگر اس کے خلاف کوئی قرینہ یا ثبوت موجود ہو تو دوسرا مفہوم مراد لیا جا سکتا ہے بہرحال ہر ایک جماعت کے دلائل اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

اسی طرح نہی کے حقیقی مفہوم میں اختلاف ہے کہ آیا اس کا اصل مفہوم حرام کو ظاہر کرتا ہے یا مکروہ کو، یا ان دونوں کے درمیان مشترک مفہوم کا اظہار کرتا ہے اکثر علمار کا مسلک یہ ہے کہ اس کا مفہوم حقیقی حرمت کے لئے ہے، دوسرے مفہوم میں وہ قرائن یا دلائل کی مدد سے مستعمل ہوتا ہے جیسے کراہیت بددعا، ہدایت یا دھمکی کا مفہوم ہے

ان اختلافات کی وجہ سے شرعی احکام و محرمات میں علمار کا اختلاف ہو گیا ہے لہٰذا وہ کسی حکم کو بعض اوقات واجب یا حرام مانتے ہیں اور بعض اوقات وہ اسے مستحب یا مکروہ تسلیم کرتے ہیں اور کبھی اسے مباح بھی قرار دیتے ہیں یہ سب باتیں وہ قرآن اور دلائل سے ثابت کرتے ہیں آخرکار کبھی ان کا کسی مسئلہ پر اتفاق ہو جاتا ہے اور کبھی اختلاف برقرار رہتا ہے، بہرحال اس کی وضاحت کے لئے ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں

(الف): اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

"اے ایمان والو! جب تم کوئی قرض مقررہ مدت کے لئے دو تو اسے لکھ لو"

اس آیت میں قرض کو لکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا بعض علمار نے یہ کہا ہے کہ یہاں امر کے حقیقی معنی مراد ہیں اس کے مطابق انھوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اس آیت کے مطابق قرض خواہوں پر قرض کا لکھنا واجب ہے خواہ اس کی صورت بیع کی ہو یا قرض کی ہو تاکہ کوئی بھول چوک یا انکار نہ ہو سکے،،

امام طبری نے یہی مسلک اختیار کیا ہے اور ابن جریج نے فرمایا ہے :-

"جو قرض دے تو وہ اسے لکھ لے اور جو فروخت کرے تو وہ گواہ لائے" فرقہ ظاہریہ بھی اسے واجب سمجھتا ہے ان کا قول ہے کہ قرضوں کا لکھنا اس طرح واجب اور ضروری ہے جس طرح مشہور احکام واجب اور ضروری ہیں،

مگر جمہور علمار کا یہ مسلک ہے کہ یہاں امر وجوب کے لئے نہیں ہے بلکہ ہدایت دینے کے لئے ہے وہ کہتے ہیں :-

"لکھنے کا حکم مال کی حفاظت اور شک وشبہ دور کرنے کے لئے مستحب ہے کیونکہ قرض خواہ اگر پرہیز گار ہے تو تحریر سے اس کو کوئی نقصان نہیں ہے اور اگر پرہیز گار نہیں ہے تو تحریر سے قرض کی حفاظت ہوتی ہے اور ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اسی آیت کے آخری الفاظ سے اس کا مستحب ہونا ثابت کرتے ہیں جن میں یہ مذکور ہے:-

"اگر تمھیں ایک دوسرے کا اعتبار ہو تو جس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس کی امانت کو ادا کرے " [1]

(ب) ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

"جب وہ عورتیں اپنی مدت کو پوری کرلیں تو انھیں بھلائی کے ساتھ روک لو یا بھلائی کے ساتھ ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنے لوگوں میں سے دو معتبر گواہ مقرر کرلو "

اس آیت میں گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر اس میں امر کے مفہوم میں اختلاف ہے عطارؒ اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ عورتوں سے رجوع

---

[1] تفسیر القرطبی و تاریخ التشریع الاسلامی از خضری

کرتے وقت گواہ مقرر کرنا واجب ہے لہٰذا اگر رجوع کرتے وقت طلاق دینے والا شوہر گواہ مقرر نہ کرے تو یہ معاملہ درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ آیت میں امر وجوب کے لئے ہے، علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب محلی میں جو فرقہ ظاہریہ کی ترجمان ہے یہ لکھا ہے :-

"طلاق اور رجعت دو معتبر گواہوں کی گواہی کے بغیر درست نہیں ہے"[1]

مگر جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں امر مستحب کے لئے لایا گیا ہے تاکہ کوئی انکار نہ کر سکے اور جب طلاق کا علم ہو اور رجوع کرنے کا علم نہ ہو تو اس سے تہمت اور بدگمانی کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے انھوں نے کہا ہے رجوع کرنے پر گواہ لانا مستحب ہے واجب نہیں ہے[2]

انہی مثالوں پر دیگر شرعی احکام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۲۸۳

[2] فتح القدیر و احکام القرآن از رازی

فصل چہارم

احکام قیاس میں اختلاف کے اسباب

جب فقہار میں کتاب وسنت کے بارے میں اختلاف ہے تو جس حکم میں نص شرعی نہ ہو تو اس میں اختلاف بہت شدید ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں رائے اور قیاس سے احکام کے اسباب معلوم کرکے اجتہاد کیا جاتا ہے یا عام مصلحتوں اور انصاف کے اصولوں کو کسی مسئلہ پر منطبق کرکے فیصلہ کیا جاتا ہے بہرحال احکام قیاسہ میں اختلاف کے مجمل اسباب یہ ہیں۔

(۱) علمار کا قیاس کے اصول کے بارے میں اختلاف ہے اور اس کے کم وبیش استعمال کرنے میں بھی فرق ہے، بعض علمار سرے سے قیاس کے منکر ہیں اکثر اس کے حامی ہیں، مگر جو قیاس کے حامی ہیں ان میں سے بعض قیاس کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور بعض قیاس کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور ایک جماعت ایسی بھی ہے جو درمیانی راہ پر گامزن ہے اس طرح احکام میں بھی اختلاف ہو گیا ہے

(۲) قیاس اور استنباط احکام کی قابلیت اور صلاحیت میں بھی فرق ہے،

(۳) ہر مجتہد اپنے ماحول کے فطری، سماجی یا سیاسی ماحول سے متاثر ہوتا ہے چنانچہ جب امام شافعی عراق میں تھے تو ان کا قدیم مسلک تھا اور جب وہ مصر میں آئے اور اسے اپنا وطن بنا لیا تو ماحول کے مطابق ان کے خیالات میں کافی تبدیلی پیدا ہوئی

(۴) قیاس کے معاملے میں اہم اختلاف احکام کی علت کو معلوم کرنے سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس علت کے مطابق ہی کوئی حکم ثابت کیا جاتا ہے ایسے اختلاف کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک جماعت ایک حکم کے لئے ایک خاص علت اور سبب مقرر کرتی ہے اور دوسری جماعت اس کی علت وسبب دوسری چیز کو قرار دیتی ہے

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ نص شرعی میں یہ مذکور ہے کہ قاتل وارث نہیں بن سکتا بعض علماء نے میراث سے اس کی محرومی کا یہ سبب بتایا ہے کہ اس نے حرام مقصد کو وقت سے پہلے جلد حاصل کرنے کے لئے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے لہٰذا اس کی سزا یہ ہے کہ اسے میراث سے محروم کیا جائے۔

اس کے بعد انھوں نے اسی علت پر قیاس کرکے یہ کہا ہے کہ جو کوئی مرض موت میں بیوی کو طلاق دے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اسے میراث سے محروم کرنا چاہتا ہے لہٰذا یہ طلاق معتبر نہیں ہوگی اور وہ بیوی میراث کی حقدار ہوگی مگر جن لوگوں نے میراث سے محروم ہونے کی علت صرف اس کا قاتل ہونا قرار دیا ہے انھوں نے اس حکم کو مذکورہ بالا طلاق کے مسئلہ پر منطبق کرنے کی کوشش نہیں کی ہے لہٰذا ان کے نزدیک ایسی طلاق بائن ہوگی اور وہ عورت میراث سے محروم رہے گی خواہ وہ طلاق مرض موت میں دی جائے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ عبادۃ بن الصامت کی روایت ہے کہ ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں میں سود کو حرام قرار دیا

آپ نے فرمایا "سونا سونے کے بدلے میں، چاندی چاندی کے بدلے میں، گیہوں گیہوں کے بدلے میں، جو جو کے بدلے میں، کھجور کھجور کے بدلے میں، نمک نمک کے بدلے میں برابر اور دست بدست ہوں، جب یہ قسمیں بدل جائیں تو جیسا تم چاہو اسے فروخت کرو بشرطیکہ وہ دست بدست ہوں"

اس حدیث کے احکام میں علماء کا اختلاف ہے، فرقہ ظاہریہ کا یہ خیال ہے کہ اس نص شرعی میں کوئی علت و سبب نہیں ہے اس لئے انھوں نے صرف انہی چیزوں میں سود کو حرام اور دوسری چیزوں میں اس حکم کو منتقل نہیں کیا کیونکہ وہ قیاس کو تسلیم نہیں کرتے مگر جمہور علماء اس حدیث میں کوئی نہ کوئی علت ضرور تلاش کرتے ہیں البتہ حرمت کی اصل علت میں اختلاف ہے حنفی علماء کی یہ رائے ہے کہ ان میں سود کی حرمت کی وجہ سے مقدار کا ہونا اور اتحاد جنس ہے اسی وجہ سے تعدا اضافہ کا سود اور ادھار کا سود دونوں حرام ہیں لہٰذا اگر کسی چیز میں صرف ایک سبب پایا جائے مثلاً جنس میں اتحاد ہو اور وہ چیز اندازے یا تول کر نہ فروخت کی جائے یا

اس کا اندازہ مقرر ہو مگر جنس میں اختلاف ہو جائے تو چیز کو بڑھا کر لینا حرام نہیں ہوگا البتہ ادھار کا سود حرام ہوگا۔ یعنی ادھار کی وجہ سے کسی چیز کی فروخت میں اضافہ نہ کیا جائے۔

شافعی اور مالکی علمار کی یہ رائے ہے کہ سونے اور چاندی میں حرمت کی علت یہ ہے کہ یہ قیمت اور زر مبادلہ ہیں اور ان میں جنس کا اتحاد بھی پایا جاتا ہے دوسری چیزوں میں شافعی علمار کی یہ رائے ہے کہ ان میں اتحاد جنس کے ساتھ غذا بننے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔

مالکی علمار کا قول ہے کہ ان میں ادھار کا سود حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشیار کھائی جا سکتی ہیں، خواہ یہ ذخیرہ کرنے اور انسانی خوراک بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں ان میں مختلف قسم کی ترکاریاں اور تروتازہ پھل بھی شامل ہیں لہٰذا ایسی چیزوں میں ادھار کا سود حرام ہے اور تبادلہ میں نقد اضافہ حرام نہیں ہے، مگر زائد لینے کے سود کی حرمت کے لئے یہ شرط ہے کہ ان میں جنس کا اتحاد ہو اور ایسی چیزیں ہوں جنھیں انسان کھا سکتا ہو، اور اس کا ذخیرہ بھی کیا جا سکتا ہو[1]

چونکہ حرمت کی علت میں اختلاف ہے اس لئے احکام میں بھی اختلاف رونما ہوگیا ہے وہ یہ ہے کہ حنفی علمائے لوہے اور تانبے کو بھی سونے چاندی پر قیاس کرکے اتحاد جنس کی صورت میں زائد لینے کا سود حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ چیزیں وزن سے فروخت کی جاتی ہیں مگر مالکی اور شافعی علمار نے اس سے اختلاف کیا ہے کیونکہ یہ خوراک کی چیزیں نہیں ہیں۔ اسی طرح حنفی عالموں کے نزدیک ایک انڈے کو دو انڈوں کے بدلے میں فروخت کرنا اور ایک خربوزے کو دو خربوزوں کے ساتھ نقد فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ ان میں ایک سبب یعنی مقدار کا ہونا باقی نہیں رہا مالکی علمار کے نزدیک تروتازہ پھلوں میں زائد لینے کے سود کی حرمت نہیں ہے کیونکہ یہ ذخیرہ کرنے کے قابل نہیں ہیں، جیسے سیب، کیلا، آڑو، لہٰذا ایک

---

[1] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ قسم المعاملات صفحات ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۹ مطبوعہ ۱۹۳۸ء ہدایۃ المجتہد (سود کی حرمت)

ہی جنس کو آپس میں زیادتی کے ساتھ نقد فروخت کیا جا سکتا ہے، مگر حنفی علماء اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمام پھل اور ترکاریاں جو وزن کے ساتھ فروخت کی جاتی ہوں، ان میں ان کی بیان کردہ علت حرمت کی وجہ سے سود شامل ہو جاتا ہے۔[1]

اختلافات کی اہمیت

بہر حال ہمیں ان اختلافات سے پریشان نہیں ہونا چاہیے اور نہ مختلف قسم کے خیالات سے خوف زدہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ شریعت جسے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ باقی رکھا ہو اور اسے سب سے آخری شریعت قرار دیا ہو۔ اس کے احکام صرف ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے نہیں رہ سکتے اور نہ اس کے احکام و مواد یکساں ہوتے ہیں، ورنہ آنے والی قومیں انھیں ناپسند کرتیں بلکہ خدا نے اس شریعت کی بنیاد اجتہاد پر رکھی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے مفادات کا خیال رکھا جائے اسی وجہ سے اس نے وہ احکام جو زمانوں کے اختلاف کے ساتھ نہیں بدلتے ہیں صاف طور پر بیان کر دیئے ہیں کیونکہ قوموں کے اختلاف کے باوجود اس کی افادی حیثیت ہمیشہ یکساں رہتی ہے ان کے علاوہ اس نے دیگر معاملات کو امت اسلامیہ کے مجتہدین پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلیں اور اس سلسلے میں وہ قوموں کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھیں۔

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ صفحہ ۲۴۰-۲۴۱ ج ۲

فصل پنجم

اجتہاد کی آزادی اور اس کے اثرات

اجتہاد کی یہ آزادی جس کا نمونہ ہم نے گذشتہ صفحات میں ملاحظہ کیا ہے اسلامی دور کی پہلی صدیوں تک برقرار رہی اور اس زمانے میں اکثر فقہاء اجتہاد کی آزادی میں مشہور تھے وہ صرف اسلامی اصول و قواعد اور عالمگیر انصاف و صداقت کی اصل روح کے پابند تھے ان کے علاوہ اور کسی چیز کے پابند نہ تھے چنانچہ ایک آزاد مجتہد پوری تحقیق کرنے کے بعد جو حق بات معلوم کر لیتا تھا اس پر قائم رہتا تھا اس کی آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف نظریات اور متعدد مکاتیب فکر پیدا ہوئے جن کے تین بنیادی اسباب ہیں:-

(۱) اسلامی شریعت کے اصول عقل پر مبنی ہیں اور اس کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی علت اور حکمت پوشیدہ ہے بلکہ خود مذہب اسلام عقل سلیم اور فکر صحیح کو استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے

(۲) اسلام کے پہلے دور میں علمی تحقیقات کرنے کا صحیح جذبہ تمام مسلم قوم میں پیدا ہوگیا تھا۔ بلکہ علم و فن اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہ روح کار فرما نظر آتی تھی چنانچہ اسی جذبہ نے علمائے شریعت کو مذہبی تحقیقات پر آمادہ کیا اور ان کی اجتہادی قوتیں کام کرنے لگیں۔

(۳) اسلامی دور کی پہلی تین صدیوں کے علماء اللہ کے مخلص بندے تھے وہ بہت ذہین اور اپنے علم کے ماہر تھے اسلامی روح سے بخوبی واقف تھے اور اس کے شرعی احکام سے ان کا بہت بڑا تعلق تھا اسی لئے انھوں نے علمی تحقیقات کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور انہی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے مختلف واقعات

اور گوناگوں مسائل کے لئے نہایت عمدہ احکام وضع کئے اور اپنے خیالات کو مدلل طریقے سے ثابت کیا گو اس طرح اختلاف بڑھتا گیا اور ہر مسئلے پر متعدد رائیں قائم ہوگئیں تاہم اس سے اسلام کے قانونی سرمایہ میں زبردست اضافہ ہوا اور مجتہد عالموں کی بدولت فرزندان اسلام کو اسلامی شریعت کے عمدہ ذخیرے دستیاب ہوئے، بلکہ ہر قوم کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ ان میں سے بہترین قوانین کو جو ان کے حالات اور زمانے کے مطابق ہوں؛ انتخاب کرسکیں،

اس قدر مکاتیب فکر قائم ہونے کے باوجود اسلامی خلفاء اور امراء نے یہ پسند نہیں کیا کہ مختلف قسم کے ان تمام قوانین واحکام میں سے کچھ پسندیدہ قوانین کا انتخاب کریں اور اس سرکاری مجموعہ قوانین کو عوام پر زبردستی نافذ کریں اور پھر وقتاً فوقتاً اس میں ترمیم و اضافہ زمانے کے حالات کے مطابق ہوتا رہے بلکہ مسلمان خلفاء اور حکام نے قاضیوں اور ججوں کو خود مختار بنا دیا تھا تاکہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کریں یا کسی خاص امام کی تقلید کریں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی شہر میں مختلف اور متضاد احکام جاری ہوگئے۔

یکساں قوانین کی ضرورت

آخرکار اہل عقل و دانش کی طرف سے اس کی شکایتیں ہونے لگیں چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب مشہور ادیب و مترجم ابن المقفع نے عباسیوں کے ابتدائی دور میں یہ صورت حال ملاحظہ کی تو اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ اجتہاد کا دروازہ تو کھلا رکھا جائے مگر حاکم وقت کے لئے یہ ضروری ہو کہ مجتہدین کے جن فیصلوں کو وہ درست سمجھے ان کا انتخاب کر کے انھیں قوانین کی شکل دے اور قاضیوں اور ججوں کے لئے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ ان کے مطابق فیصلہ کریں نیز وہ اپنے ماحول، زمانے اور ضروریات کے مطابق اسلامی اصول کو پیش نظر رکھیں چنانچہ ابن المقفع نے خلیفہ ابوجعفر المنصور کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا:۔

ابن المقفع کا خط

"عدالتوں میں بدنظمی چھائی ہوئی ہے ان میں کسی مشہور قانون کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ان میں فیصلوں کا دارومدار قاضیوں کی اپنے اور ان کے اجتہاد پر ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی شہر میں متضاد

احکام صادر ہوتے رہتے ہیں چنانچہ ایک قاضی کے حکم کے مطابق اگر کوفہ کے ایک علاقہ میں بعض لوگوں کی جان و مال اور عصمت کے خلاف فیصلہ دیا جاتا ہے تو دوسرے علاقے میں دوسرے قاضی کے فیصلہ کے مطابق ان کی حمایت میں فیصلہ صادر ہوتا ہے اس طرح ہر چیز مسلمانوں پر نافذ ہو رہی ہے لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ امیرالمومنین کے سامنے وہ مقدمات اور مسائل مع دلائل پیش کئے جائیں جن کے بارے میں مختلف اور متضاد احکام نافذ کئے گئے ہوں، اس کے بعد امیرالمومنین ان فیصلوں کو اور ان کے دلائل کو ملاحظہ فرمائیں اور جو فیصلے درست معلوم ہوں ان کا انتخاب کرکے انھیں کتابی صورت میں قلم بند کیا جائے اور اس کے نسخے مختلف شہروں کو بھیجے جائیں اور قاضیوں کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ ان کے مطابق فیصلہ کیا کریں اگر ایسے واقعات پھر پیش آئیں تو ان کے لئے بھی اسی طرح ضروری کارروائی کی جائے اس کے بعد جو خلفاء آئیں وہ ان قوانین میں ضروریات کے مطابق مناسب تبدیلی کرتے رہیں

مگر خلیفہ منصور کسی وجہ سے ابن المقفع کی تجویز پر عمل نہیں کر سکا اور انفرادی قانون سازی کا کام بدنظمی کی حالت میں رہا۔ یہاں تک کہ جو نااہل تھے انھوں نے اجتہاد کے دعوے شروع کر دیئے اور شرعی احکام میں اس قدر زیادہ اختلاف ہو گیا کہ اس زمانے کی اسلامی حکومتوں کو ان کی طرف رجوع کرنا یا ان کے صحیح حدود کو متعین

لہ پوری اسلامی مملکت کے لئے ایک عام قانون بنانے کا خیال خود خلفاء کے دماغ میں بھی گردش کرتا رہا تھا چنانچہ منقول ہے کہ خلیفہ منصور نے امام مالک سے یہ درخواست کی کہ ان کی کتاب مؤطا کو قانونی شکل دے دی جائے اور یہ بھی روایت ہے کہ جب ہارون الرشید نے مدینہ کی زیارت کی اور عراق واپس جانا چاہا تو انھوں نے امام مالک سے کہا — آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے کیونکہ میرا ارادہ ہے کہ میں لوگوں کو مؤطا پر عمل کرنے کے لئے ایسا ہی مجبور کروں گا جس طرح حضرت عثمانؓ نے لوگوں کے لئے قرآن کریم کو جمع کیا تھا۔ امام مالک نے فرمایا مؤطا پر لوگوں کو جمع کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ آپؐ کے صحابیؓ مختلف شہروں میں آپؐ کے بعد آباد ہو گئے تھے، اور وہاں اپنی حدیثیں بیان کرنے لگے تھے۔ لہٰذا ہر شہر والوں کے پاس مختلف علم ہے (احیاء العلوم وضحی الاسلام)

کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ حالت چوتھی صدی ہجری تک برقرار رہی اس کے بعد تقلید کا جذبہ ہر خاص و عام پر مسلط ہو گیا جس میں عوام اور علماء دونوں شریک ہو گئے چنانچہ یہ تقلیدی رجحانات روز بروز اس قدر بڑھتے گئے کہ عوام کے دل و دماغ پر چھا گئے۔[ے] اور مجتہدوں کی عقلیں پست ہو گئیں یہاں تک کہ اجتہاد کا دروازہ بالکل بند ہو گیا اور اسلامی تشریع میں تجدید و اجتہاد کی وہ تحریک ختم ہو گئی جس کی بدولت مذہب اسلام زمانے کے حالات اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل پیرا تھا۔

میرے خیال میں مسلم قوموں کی سماجی اور اخلاقی حالت اس وقت درست ہو سکتی ہے اور ان میں خودداری اور خود اعتمادی کا جذبہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ وہ اسلام اور اس کے احکام کی طرف رجوع کریں ایسا اسلامی ماحول پیدا کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مسلم علماء کی جماعت بنائی جائے جن میں اجتہاد کی شرائط بافراط پائی جائیں ان میں مشہور قانون دانوں کی ایک جماعت کو شامل کیا جائے تاکہ فقہاء اور قانون دانوں کی ایک ایسی مستقل انجمن تشکیل پا سکے جو ان دو مقاصد کی تکمیل کر سکے۔

(۱) اسلامی فقہ کی اس طرح تدوین و تالیف کی جائے کہ ہر شخص آسانی سے اس کی طرف رجوع کر سکے۔

(۲) مسلم قوم کو اپنی نئی نئی ضرورتوں اور معاملات کی تکمیل کے لئے جن نئے احکام و قوانین کی ضرورت ہو انہیں وضع کیا جائے تاکہ اسلامی اصولوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضوں کو پورا کیا جائے مزید اظہار خیال اجتہاد کی بحث میں کیا جائے گا۔

ے تاریخ التشریع الاسلامی مطبع الاستقامۃ صفحہ ۳۳۷-۳۷۹۔

ماخذ اور کتب حوالہ جات

برائے باب سوم

۱۔ الانصاف فی التنبیہ علی الاسباب الاختلاف از بطلیوسی

۲۔ الہدایہ وفتح القدیر

۳۔ احکام القرآن از رازی

۴۔ تفسیر القرطبی مطبوعہ دار الکتب المصریۃ

۵۔ اسرار الشریعۃ الاسلامیہ از ابراہیم علی

۶۔ التشریع الاسلامی از ابراہیم علی

۷۔ نیل الاوطار از شوکانی

۸۔ بدایۃ المجتہد از ابن رشد

۹۔ ارشاد الفحول

۱۰۔ تاریخ التشریع الاسلامی از خضری

۱۱۔ اصول الفقہ از خضری

۱۲۔ تفسیر البیضاوی

۱۳۔ ضحی الاسلام از احمد امین

۱۴۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ قسم المعاملات از عبدالرحمن الجزیری (مرحوم)

باب چہارم

اسلامی شریعت

کے

قواعد فقہیہ

اسلامی شریعت کے قواعد فقہیہ

فقہ اسلامی کے علمار نے اپنی اجتہادی تحقیقات میں ایسے کلیہ قاعدوں کو پیش نظر رکھا ہے جو اپنے اعلیٰ مقاصد اور راہبیت کے لحاظ سے عہد حاضر کے قانونی مبادیات سے کسی طرح کم تر نہیں ہیں خواہ ان کے ناموں اور اصطلاحات میں فرق ہو، یہ سب قواعد اسلامی قانون سازی کی صحیح روح کی حفاظت کرتے ہیں اور حق و انصاف اور مساوات کی اعلیٰ قدروں کی تکمیل کرتے ہیں وہ نہ صرف عوام کے مفادات کا تحفظ کرتے اور ان کی خرابیوں کو دور کرتے ہیں بلکہ وہ زمانہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہیں ان کے ذریعے معاملات کی بنیاد لوگوں کی بھلائی اور بدی سے اجتناب پر رکھی گئی ہے۔

یہ قواعد بہت اہم ہیں اور ان کے بہت سے فوائد ہیں جب کسی فقیہ اور عالم کو فروعی مسائل میں کوئی دلیل وحجت نہ ملے تو یہ قواعد مسائل کی صحیح حکمت معلوم کرنے میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں اسی لئے فقہ کے علمار نے ان قواعد پر جداگانہ کتابیں لکھی ہیں تاکہ ان کی توضیح و تشریح کا پورا پورا حق ادا کریں اس طرح انھوں نے ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے اسلامی شریعت کی اصل حقیقت واضح ہو کر اس کا اصل جوہر اور پاکیزہ عنصر نمایاں ہو جاتا ہے اسی وجہ سے فقہائے کرام نے طالبان شریعت کو اس چشمۂ شیریں سے سیراب ہونے کی دعوت دی ہے۔

ابن نجیم المصری الحنفی اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں —

"یہ قواعد دراصل فقہ کے اصول ہیں اور ان ہی کے ذریعے ایک فقیہ درجۂ اجتہاد

پر فائز ہوتا ہے [1] ان کی تدوین فقہائے کرام کے لئے باعث فخر ہے " اس کے بعد ابن نجیم فرماتے ہیں ـــ ہمارے ساتھیوں (حنفی علماء) کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں سبقت کی اور دوسرے لوگوں نے ان کی پیروی کی اور وہ خود فقہ میں امام ابوحنیفہ کے خوشہ چیں ہیں "

قرافی مالکی نے اپنی مشہور کتاب میں جو الفروق کے نام سے موسوم ہے [2] تقریباً ۵۴۸ قواعد جمع کئے ہیں اور قاعدے کو اس کے مناسب فروعی مسائل کے ذریعے واضح کیا ہے بلکہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اگر اسے مناسب ترتیب کے ساتھ شائع کیا جائے تو وہ اسلامی شریعت کے اس اعلیٰ مقام کو ظاہر کرسکتی ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرافی اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

اسلامی شریعت چند اصول و فروع پر مشتمل ہے، اس کے اصول کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم اصول فقہ ہیں، دوسری قسم وہ کلیہ قواعد فقہیہ ہیں جن کی تعداد بہت ہے اور وہ شریعت کے اسرار و رموز کے سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں ہر قاعدہ کے ماتحت بے شمار فروعی مسائل ہیں یہ قواعد فقہ میں بہت اہم اور مفید ہیں اور فقیہ جس قدر ان قواعد کا احاطہ کرسکے گا اسی قدر اس کی قدر و منزلت بڑھے گی اور فقہ کی رونق نمایاں ہوگی انہی قواعد کے ذریعے فتاویٰ کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں اور انہی کی بدولت اہل علم کی ایک دوسرے پر فوقیت ظاہر ہوتی ہے علماء کا یہ قدیم مقولہ ہے "جو اصول فقہ کو پیش نظر رکھے وہ منزل تک پہونچ سکتا ہے اور جو قواعد کو پیش نظر رکھے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتا ہے"

اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ان کلی قواعد کو بیان کر رہے تاکہ شریعت کا جاہ و جلال اور اس کے اعلیٰ اصول و مقاصد نمایاں ہوسکیں اور لوگوں کو یہ پتہ چل سکے کہ علماء اور مجتہدین کے افکار کتنے عمیق اور ان کا نقطۂ نگاہ کتنا بلند اور وسیع تھا نیز اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے کس قدر جدوجہد کی۔

---

[1] ابن نجیم نے ان میں سے ۲۵ کلیہ قواعد کا ذکر کیا ہے جس سے فروعی قواعد بھی معلوم ہوسکتے ہیں۔

[2] اس کتاب کا پورا نام "انوار البروق فی انواء الفروق" یا "الانوار السنیہ فی الاسرار الفقہیہ" ہے۔ قرافی نے ۶۸۴ھ میں وفات پائی۔

پہلا[1] قاعدہ ہر حکم ترجیحی مصلحت کے تابع ہوتا ہے، اس قاعدہ کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ بہت سے کام مثلاً عبادات، جہاد اور صدقہ میں کچھ نقصانات بھی ہیں مگر چونکہ ان کی بھلائی ان کی خرابیوں پر غالب ہے اس لئے شریعت نے ان کا حکم دیا ہے مگر بعض اوقات کسی کام میں اس کے نقصانات فوائد پر غالب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو حرام قرار دیا جاتا ہے جیسے کہ شراب، جوا، بدکاری اور ظلم ہے، ان کاموں سے بعض اوقات انسانوں کو فائدہ پہونچتا ہے مگر چونکہ ان کی خرابیاں ان کی بھلائیوں پر غالب ہیں اس لئے اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس سے منع فرمایا ہے اور یہ وہ قاعدہ ہے جسے شرعی احکام میں بہت ضروری سمجھا گیا ہے [1]

قاعدہ دوم[2] نقصان اور ضرر کو دور کیا جائے یا نہ تو نقصان پہونچانے کی ابتدا کی جائے اور نہ نقصان کے بدلے میں نقصان پہونچایا جائے " یہ قاعدہ اس حدیث کے ماتحت ہے:۔

لا ضرر ولا ضرار [2] نہ نقصان پہونچانے میں ابتدا کی جائے اور نہ اس کے بدلے میں نقصان پہونچایا جائے۔

یہ وہ قاعدہ ہے جس پر اکثر ابواب فقہ کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے اکثر مسائل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلامی شریعت افراد اور جماعتوں میں انصاف کرتی ہے اور ان سے ظلم کو دور کر کے انھیں نقصانات سے بچانا چاہتی ہے تاکہ سب لوگوں کو اپنے حقوق کے بارے میں اطمینان حاصل ہو، اس قاعدہ کے ذریعے بہت سے احکام کا استنباط ہوا ہے مثلاً بعض ائمہ کرام نے یہ جائز نہیں سمجھا ہے کہ صرف فرزندوں پر مال کو وقف کیا جائے اور بیٹیوں کو اس وقف سے خارج کر دیا جائے، اس طرح وہ وقف بھی حرام ہے

---

[1] التوسل والوسیلة از ابن تیمیہ صفحہ ۷۵ المنار کا دوسرا ایڈیشن

[2] المغرب میں اس کی تعبیر ہمارے ترجمے کے مطابق کی گئی ہے ضرار کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ضرر کے بدلے میں ضرر نہ پہونچایا جائے اس طرح حدیث میں معاف کرنے کو پسند کیا گیا ہے، یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ بدلے میں کسی کو اس کے فعل سے زیادہ نقصان نہ پہونچایا جائے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اتنی زیادتی کرو جس قدر اس نے تم پر زیادتی کی ہے "، صاحب النہایۃ نے (باقی صفحہ ۳۳۶)

جس کا مقصد قرض خواہوں کو نقصان پہونچانا ہو بلکہ اس حالت میں بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اس وقف کو توڑ دیا جائے، اسی قاعدہ کے مطابق شریک اور پڑوسی کو شفعہ کا حق دیا گیا ہے اور عیب نکلنے پر فروخت کی ہوئی چیز لوٹائی جاسکتی ہے، نیز قصاص، شرعی حدود، کفارے، چیزوں کے تباہ ہونے کا ضامن بننا یہ سب مسائل اسی قاعدے پر مبنی ہیں، اس قاعدہ کے مطابق عدل و انصاف کا یہ مسئلہ بھی کتب فقہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص درختوں کو فروخت کر دے اور اس کے بعد گاہک جب درختوں کو کاٹنے کے لئے چڑھے اور اس سے پڑوسیوں کی بے پردگی ہوتی ہو تو یہ حکم ہے کہ وہ درخت پر چڑھتے وقت پڑوسیوں کو ایک مرتبہ یا دو مرتبہ خبردار کر دے تاکہ وہ پردہ کرلیں اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو معاملہ عدالت کے سامنے پیش ہو سکتا ہے تاکہ عدالت اسے چڑھنے سے روک دے[1]

قاعدہ سوم (۳) "ضرورت ممنوع شے کو مباح قرار دے دیتی ہے" اس قاعدہ کے مطابق اگر کسی کا لقمہ حلق میں اٹک جائے اور شراب کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہ ہو تو وہ شراب کے گھونٹ سے اس لقمہ کو نیچے اتار سکتا ہے اسی طرح بھوک کے موقع پر مردار کھانا جائز ہے، نیز جان کے خوف سے کلمہ کفر بولنا بھی جائز ہے اور ضرورت پڑنے پر مال کو بھی تلف کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ بہت ساز و سامان کی وجہ سے کشتی کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہو، تو ایسے موقعہ پر مال کو نکال کر پھینکا جاسکتا ہے، لیکن اگر کسی انسان کو مجبور کیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کو قتل کرے ورنہ خود اسے قتل کر دیا جائے گا تو ایسی صورت میں اسے یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ دوسرے کو قتل کرے، کیونکہ اس صورت میں اس کی اپنی جان کا ضائع ہونا دوسرے کی جان سے کم مضر ہے، اس قاعدہ کو ثابت کرنے کے لئے بنیادی اصول قرآن کریم کی یہ آیت ہے:-

---

(بقیہ صفحہ ۳۳۵) اس حدیث کی تاویل میں کئی اقوال نقل کئے جن میں اکثر مذکورہ بالا ترجمہ اور تفسیر پر مبنی ہیں۔ ملاحظہ ہو حصہ سوم النھایۃ فی غریب الحدیث مطبوعہ ۱۳۱۱ھ

[1] الاشباہ والنظائر صفحہ ۱۱۸ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

"بے شک اس نے مردار، خون، سوّر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا دوسری چیز کا نام پکارا جائے، حرام کیا ہے مگر جو مجبور ہو جائے اور اس کا ارادہ سرکشی اور زیادتی کا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے درحقیقت اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

لہٰذا علماء نے اس آیت کو اصل بنیاد قرار دے کر اسے بہت سے احکام و مسائل میں منطبق کیا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے زنا کا اقرار کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا ــــــ "شاید وہ کوئی عذر پیش کر سکے" پھر انھوں نے اس سے پوچھا ــــ: "تمھیں بدکاری پر کس چیز نے مجبور کیا؟" اس عورت نے کہا ــــــ "میرا ایک پڑوسی تھا۔ جس کے اونٹوں کے ہاں پانی اور دودھ تھا اور میرے اونٹ میں پانی اور دودھ نہیں تھا۔ اس لئے میں پیاسی رہتی تھی، میں نے اس سے پانی مانگا تو اس نے پانی دینا اس شرط پر منظور کیا کہ میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں، اس پر میں نے تین دفعہ انکار کیا مگر جب میری پیاس اس قدر بڑھ گئی کہ جان نکلنے کا اندیشہ ہو گیا تو میں نے اس کی خواہش پوری کر دی اس وقت اس نے مجھے پانی پلایا۔" حضرت علیؓ نے فرمایا ــــــ "اللہ اکبر! جو بات مجبوری سے کی جائے اور اس کا ارادہ سرکشی اور زیادتی کا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے درحقیقت اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے[1]"

قاعدۂ چہارم (۴) "جو چیز ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے جائز ہو جائے وہ بقدر ضرورت ہی جائز ہو گی" لہٰذا ایک ضرورت مند بھوکے آدمی کو مردار کھانا صرف اسی قدر جائز ہے جس سے اس کی بھوک رفع ہو سکے، علماء یہ کہتے ہیں کہ شہید کا خون اس کی ذات کے لئے مباح ہے اور دوسرے کے لئے ناپاک ہے، کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے اس طرح طبیب کے لئے پردہ کے مقام کو دیکھنا بقدر ضرورت ہی جائز ہے،

قاعدۂ پنجم (۵) "کوئی ضرر دوسرے کے نقصان سے دور نہیں ہوتا ہے" اس کی مثال یہ ہے کہ بھوکا مجبور آدمی دوسرے مجبور اور بھوکے آدمی کے کھانے کو نہیں کھا سکتا

[1] الطرق الحکمیہ از ابن القیم صفحہ ۵۳ مطبوعہ ۱۳۱۷ھ

قاعدہ ششم (۶) عام لوگوں کے نقصان کو دور کرنے کے لئے خاص آدمی کے نقصان کو برداشت کیا جاسکتا ہے:" یہ بہت اہم قاعدہ ہے جس میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اسلامی شریعت جماعتی مفادات کو اس وقت انفرادی مفاد پر ترجیح دیتی ہے جبکہ دونوں کے مفادات کا تصادم ہوجائے یہ قاعدہ بہت سے مسائل واحکام پر منطبق ہوتا ہے مثلاً اگر کفار مسلمان قیدیوں کو ڈھال بنا کر آگے کردیں تو اس صورت میں بھی کافروں پر تیر اندازی جائز ہے اسی طرح اگر کوئی طبیب جاہل ہو، یا کوئی مفتی نااہل ہو تو انھیں ان کے کام سے روکا جاسکتا ہے اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ اپنے اس اصول سے بھی دست بردار ہوگئے ہیں۔ کہ ہر فرد کو اپنی خالص ملکیت کے اندر تصرف کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کی انفرادی ملکیت اور آزادی پر پابندی عائد نہ کی جائے خواہ دوسرے کو اس سے نقصان پہونچے مگر انھوں نے عام نقصان کے اندیشے سے یہاں اس اصول کو نظر انداز کردیا ہے کیونکہ ایسی صورت میں نااہلوں کے تصرفات سے جماعت اور قوم کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اسی طرح بعض ائمہ نے کم عقل اور بیوقوف شخص کے مال پر بھی پابندی عائد کی ہے نیز مقروض کا مال اس کے قرض کو ادا کرنے کے لئے فروخت کیا جاسکتا ہے تاکہ قرض خواہوں کو نقصان نہ پہونچے، اسی مذکورہ بالا قاعدے کے مطابق اگر اشیاء خوردنی کے بیچنے والے قیمتیں بہت بڑھادیں تو سلطان یا حاکم اس کے نرخ اور قیمتیں مقرر کرسکتا ہے بلکہ اگر کوئی غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے اور اسے فروخت کرنے سے انکار کرے تو ضرورت کے موقع پر اس کا غلہ زبردستی فروخت کرایا جاسکتا ہے

اسی قاعدہ سے یہ قاعدہ بھی نکالا گیا ہے کہ اگر دو طرح کے نقصانات جمع ہوجائیں اور ان میں سے ایک نقصان دوسرے نقصان سے شدید تر ہو تو شدید تر نقصان کے مقابلے میں کم نقصان والے کام کو اختیار کیا جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر مرنے والے شخص پر یا اس کی صغیر اولاد پر قرضہ ہو تو خود مختار وصی یا وارث کو اختیار ہے کہ وہ قرضخواہ سے قرض کے مقابلے میں مصالحت کرے جبکہ قرض خواہ منکر ہو اور کوئی گواہ موجود نہ ہو، اس صورت میں کم از کم نقصان کو برداشت کیا جائیگا کیونکہ اگر قرض کے کچھ حصے پر مصالحت درست نہ سمجھی جائے تو اس کی صغیر اولاد کو کچھ حصہ نہیں مل سکے گا، لیکن اگر قرض دار

اقرار کرے یا قرض کے سلسلے میں کوئی گواہ ہو تو اس صورت میں کم تر رقم پر مصالحت کی اجازت نہیں ہے۔

قاعدۂ ہفتم (۷) جب دو خرابیاں اکٹھی ہو جائیں تو ان میں سے کمتر خرابی کا ارتکاب کیا جائے اور جو زیادہ مضر ہو اسے ترک کیا جائے "

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی زخمی ہے اور وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے لیکن اگر وہ سجدہ کرے تو اس کا زخم بہنے لگے اور اگر سجدہ نہ کرے تو زخم نہ بہے، حنفی علماء کی اس سلسلے میں یہ رائے ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھے اور رکوع و سجود اشارہ سے کرے، کیونکہ سجدہ کا ترک کرنا بے وضو نماز پڑھنے سے کم مضر ہے،

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اگر سچ بولنے سے کسی بڑی خرابی اور فساد کا اندیشہ ہو تو علماء نے اس موقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے حموی نے اشباہ کی شرح میں اس مسئلہ کی توضیح کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے [۱]

" جھوٹ تین مقام پر جائز ہے (۱) لوگوں کی اصلاح میں (۲) جنگ میں (۳) بیوی کی اصلاح کے لئے جھوٹ بولا جائے۔ ان موقعوں پر بھی کھلم کھلا جھوٹ جائز نہیں ہے بلکہ اشاروں میں اس قسم کی بات کی جائے، یہ بھی منقول ہے کہ احیاء حق یا ظلم کے ازالے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے اور اگر انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جھوٹ بول کر ہی اس کی مخلصی اور رہائی ہو سکتی ہے تو ایسی صورت میں وہ صاف صاف جھوٹ بھی بول سکتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں جھوٹ بولنا ضروری بھی ہو جاتا ہے، مسلمان جھوٹ بولنے پر مسلمان اپنے دشمن سے نجات پا سکتے ہوں یا کوئی ظالم شخص کسی انسان کی امانت زبردستی چھین لینا چاہتا ہو، تو ایسے موقع پر ضروری ہے کہ اس کا انکار کر دیا جائے اور جھوٹ بول کر یہ کہہ دیا جائے کہ کسی کو نہیں معلوم ہے کہ وہ امانت کہاں رکھی ہوئی ہے۔

قاعدۂ ہشتم (۸) "خرابیوں کو دور کرنا جلب منفعت پر مقدم ہے" اس کی توضیح یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں بھلائی اور برائی دونوں

[۱] شرح الاشباہ والنظائر صفحہ ۱۲۶ جلد اول مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

موجود ہوں تو برائی کے دفعیہ کو حصول نفع پر مقدم کیا جائے گا، اس قاعدہ کے مطابق شراب اور جوا حرام کیا گیا کیونکہ ان دونوں چیزوں میں لوگوں کے فوائد اور منافع بھی ہیں مگر ان دونوں کا گناہ اور مضرت ان سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ قرآن کریم میں مذکور ہے،

"وہ لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فوائد بھی ہیں مگر ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے"

اس قاعدہ کے مطابق مفتی محمد عبدہ تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دینے کے قائل تھے جبکہ تعدد ازدواج اہل وعیال اور زوجین کے خاندان کے لئے بے شمار خرابیوں کا باعث بن جائے [1]

اس قاعدہ کے فروعی مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ اچھی طرح کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا مسنون ہے مگر روزہ دار کے لئے مکروہ ہے [2]

قاعدہ نہم "آسانی فراہم کی جائے اور تنگی کو دور کیا جائے"۔ اسی بنا پر علماء کا یہ مقولہ ہے "مشقت آسانی فراہم کرتی ہے" اسی قاعدہ کی بنیاد قرآن کریم کی آیات ہیں جن میں یہ فرمایا گیا ہے "اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا خواہاں ہے وہ تمھارے لئے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا ہے" اس نے تمھارے لئے دین میں حرج اور تنگی نہیں رکھی ہے"۔ نیز امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت ابو امامہ اور جابر بن عبداللہ کی یہ حدیث بیان کی ہے "اللہ کو سب سے زیادہ محبوب دین وہ ہے جو باطل سے الگ ہو اور آسان ہو"

اس قاعدہ پر بہت سے احکام مبنی ہیں جن میں انسان کی فطرت اور اس کی قوتِ برداشت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے چنانچہ اسی کے مطابق زکوٰۃ اس وقت واجب کی گئی ہے جبکہ مال خاص حد (نصاب) تک نہ پہونچ جائے اور وہ بھی مال کا قلیل حصہ یعنی چالیسواں حصہ ہے، اسی طرح حیض کی حالت میں عورت کو طلاق دینا مکروہ یا حرام

---

[1] نداء للجنس اللطیف از سید رشید رضا صفحہ ۳۹

[2] الاشباہ صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶ جلد اول مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کی عدت طویل نہ ہو جائے نیز حائضہ عورت کی دقتوں کو دور کرنے کے لئے اس پر نماز کی قضا واجب نہیں کی گئی ہے بلکہ صرف روزوں کی قضا واجب ہے اور اسی آسانی کے لئے عمر میں صرف ایک مرتبہ حج کرنا فرض کیا گیا ہے چنانچہ علامہ ابوالمسعود اس آیت کی تفسیر میں اس طرح بیان کرتے ہیں وہ آیت یہ ہے :۔

"اے ایمان والو! تم بہت سی باتیں مت دریافت کرو اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں وہ بری لگیں"

اس کی شان نزول میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں :۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا ——

"اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے" اس پر بنو اسد کا ایک شخص جسے عکاشہ بن محصن یا سراقہ بن مالک کہا جاتا تھا کھڑا ہوا اور کہنے لگا —"یارسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے؟" آپ نے اس سے اعراض کیا یہاں تک کہ اس نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —"تم پر افسوس ہے کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں "ہاں" کہدوں، خدا کی قسم! اگر میں "ہاں" کہہ دوں گا تو یہ ہر سال فرض ہو جائے گا اس وقت تم یہ کام نہیں کر سکو گے، جو بات میں نے چھوڑ دی ہے اس کو تم بھی چھوڑ دو کیونکہ تم میں سے پہلی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ممکن ہو، اس پر عمل کرو اور جس کام سے تمہیں روکوں تو اس سے پرہیز کرو۔"

اسی قاعدہ پر شریعت کی تمام سہولتیں اور آسانیاں مبنی ہیں اور چونکہ فقہ کے بہت سے مسائل و احکام اس سے متعلق ہیں اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فقہ کے اکثر ابواب کی بنیاد ہے۔

علماء کرام نے سہولت اور تخفیف کے مندرجہ ذیل اسباب بیان کئے ہیں۔

(۱) مرض :۔ کسی مرض کی وجہ سے جب جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے اور اسی وجہ سے فرض نمازیں بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہیں اور رمضان شریف میں روزوں کو چھوڑا جا سکتا ہے بلکہ حج میں بھی کئی سہولتیں دی گئی ہیں اور فدیہ کے ساتھ احرام میں بعض ممنوعہ چیزوں کو جائز رکھا گیا ہے اسی طرح بعض علماء نے نجس اشیاء اور شراب

کے ذریعے علاج کرنے کو بھی جائز کہا ہے بلکہ طبیب اور ڈاکٹر کو پردہ کے مقامات کو دیکھنے کی اجازت ہے

(۲) سفر:- سفر کی وجہ سے چار رکعتوں کی نمازیں قصر کیا جاتا ہے اور رمضان شریف کے روزے، جمعہ اور عیدین کی نمازیں معاف ہوجاتی ہیں۔

(۳) اگر زبردستی کی جائے تو اس صورت میں بھی سہولتیں دی گئی ہیں۔

(۴) نسیان:- بھول چوک بھی اللہ کے حقوق کے لئے قابل عذر ہے اور اس سے گناہ ساقط ہوجاتا ہے۔ اس طرح اگر کوئی یاد دلانے والا نہ ہو اور حالات اس کے مطابق ہوں تو بعض احکام بھی ساقط ہوجاتے ہیں جیساکہ روزہ دار بھول کر کھا لے یا کوئی ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے لیکن اگر حالت ایسی نہ ہو اور اس کو یاد دلانے والا ماحول مہیا ہو تو حکم ساقط نہیں ہوگا جیسے کوئی نمازی بھول کر کھالے۔

مگر حقوق عباد میں نسیان قابل عذر نہیں ہے لہٰذا اگر کسی نے دوسرے کا مال بھول چوک میں تلف کر دیا ہو تو وہ اس کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح بعض مسائل ایسے ہیں جہاں نسیان قابل معافی نہیں ہے مثلاً بے وضو انسان بعض اعضاء کو دھونا بھول جائے (تو وضو نہیں ہوگا) یا کوئی حاکم نص شرعی کو بھول کر قیاس کے ذریعے کوئی حکم دے (تو یہ صحیح نہیں ہوگا) اس کی پوری تفصیل حموی کی شرح اشباہ صفحہ ۱۰۶ میں ملاحظہ کی جائے۔

(۵) عام تکالیف دور کرنا:- جیساکہ قابل معافی حد تک نجاست کے ساتھ نماز درست ہوجاتی ہے اور حائضہ پر نمازوں کی قضا کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ ہر مہینے بار بار ماہواری ایام آتے ہیں اس کے برخلاف روزے (سال میں ایک دفعہ آتے ہیں) اسی طرح روزوں کو سال میں صرف ایک مہینہ کے لئے فرض کیا گیا ہے اور عمر میں ایک مرتبہ حج فرض ہے زکوٰۃ بھی مال کا صرف چالیسواں حصہ فرض کی گئی ہے تاکہ آسانی رہے (جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے) نیز یہ اجازت دی گئی ہے کہ ولی اور سرپرست یتیم کے مال سے کام کی اجرت کے مطابق فائدہ اٹھائے نیز طبیب اور گواہ پوشیدہ مقامات کو بوقت ضرورت دیکھ سکتا ہے اسی طرح منگنی کے موقع پر بھی منگیتر کو دیکھنے کی اجازت ہے اسی طرح مشروط طور پر ایک مرد کو چار عورتوں سے شادی کی اجازت دی گئی ہے، ایک عورت پر اس

لئے اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ مردوں کو سہولت حاصل ہو اور جب حالات افزائش نسل کے متقاضی ہوں تو (تعدد ازدواج کے ذریعے) قومی مفادات کو پیش نظر رکھا جائے اور جب عورتوں کی کثرت ہو جائے تو ان کے لئے بھی اس میں آسانی ہے چار کی تعداد اس لئے رکھی گئی ہے کہ اس سے زائد پر مرد کے لئے انصاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے

طلاق کا مسئلہ بھی اسی ضمن میں ہے کیونکہ جب زوجین کے اخلاق میں مغایرت ہو جاتے اور شریفانہ طور پر نباہ کرنا مشکل ہو جائے تو ازدواجی تعلقات برقرار نہیں رکھے جا سکتے۔ مرتے وقت مالی وصیت کو اس لئے جائز رکھا گیا ہے کہ اگر زندگی میں کسی نے نیکی کے کام نہ کئے ہوں تو مرتے وقت ان کی تلافی ہو سکے یہ وصیت صرف تہائی حصے میں اس لئے نافذ رکھی گئی ہے کہ وارثوں کو نقصان نہ پہونچ سکے لیکن اگر ورثا نہ ہوں تو یہ وصیت تمام مال میں نافذ ہو سکتی ہے،

قسم کے کفارہ میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ دس محتاجوں کو یا تو کھانا کھلایا جائے یا انھیں کپڑا پہنایا جائے یا ایک غلام آزاد کر دیا جائے یہ اختیار اس لئے دیا گیا ہے کہ قسم کا کفارہ بار بار دیا جاتا ہے اور باقی کفارے شاذ و نادر وقوع میں آتے ہیں، عام تکالیف (عموم البلویٰ) میں مجتہدین کی طرف سے غلطی کرنے کا گناہ آسانی سے ساقط ہو جاتا ہے اور ان کے ظن غالب ہی کو کافی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اگر انھیں یقینی بات کا پابند بنایا جائے تو وہ اس معاملے میں بہ مشکل کسی نتیجے پر پہونچ سکتے ہیں۔

(۶) نقصان پر رعایت :۔ یہ بھی مشقت کی ایک قسم ہے کہ طبیعتیں کمال پسندی کی عادی ہیں اس لئے اہل نقص کو رعایت دی گئی ہے، جیسا کہ پاگل، بچے اور عورتوں کو بعض ان ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے جو مرد کے لئے ضروری ہیں جیسا کہ فریضۂ جہاد ہے جبکہ عام اعلانِ جنگ نہ ہو لیکن جب عام اعلانِ جنگ ہو جائے تو اس وقت انھیں شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے [۱]

اس قاعدہ کے مفہوم کو امام شافعی کا یہ قول واضح کرتا ہے "کام تنگ ہونے کے بعد وسعت اختیار کرتا ہے" اس میں تنگی سے مراد مشقت اور تکلیف ہے اور وسعت سے مراد قیاس اور قاعدہ سے مستثنیٰ ہونے کی سہولت ہے

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الاشباہ اور اس کی شرح صفحہ ۱۱۷، جلد اول

حنفی علماء کا یہ قاعدہ ہے تمام تکالیف اور ضرورت کے مطابق سہولت دیجاتی ہے

قاعدہ دہم "عادت اور عام دستور کے مطابق حکم دیا جاتا ہے"۔ یعنی وہ کام جو دستور کے مطابق درست ہو شریعت کے مطابق ہے اس قاعدہ کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے — "جسے مسلمان اچھا سمجھیں اللہ کے نزدیک بھی وہی اچھا ہے" علائی کہتے ہیں — "میرے نزدیک یہ مرفوع حدیث نہیں ہے بلکہ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل وغیرہ انہی سے یہ روایت کرتے ہیں :-

"اللہ نے بندوں کے قلوب پر نگاہ ڈالی تو اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو بہترین پایا، لہٰذا انھیں اس نے اپنی پیغمبری کے لئے انتخاب کیا۔ اس کے بعد پھر اس نے بندوں کے قلوب پر نظر ڈالی تو آپؐ کے صحابیوں کے قلوب کو اس کے بعد بہترین دیکھا تو انھیں آپؐ کی صحبت کے لئے منتخب فرمایا لہٰذا جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھتے ہوں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں اللہ کے نزدیک بھی وہ بری ہے [۱]

بہرحال اس قاعدہ پر بہت عمل ہوا اور علماء فقہاء کے وردِ زبان یہ قول ہو گیا — "جو چیز بالعموم رائج ہو جائے وہ شریعت کے مطابق ہے"۔ مبسوط میں یہ منقول ہے — "جو چیز عرف اور رواج کے ذریعے ثابت ہو جائے وہ ایسی ہے جیسا کہ وہ نص شرعی سے ثابت ہو"

علامہ محمد امین الفقیہ الحنفی نے جو ابن عابدین کے نام سے مشہور ہیں ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس کا نام ہے "نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف" انہوں نے اپنے ایک منظوم قصیدہ میں بھی یہ تحریر کیا ہے [۲]

"عرف و رواج کا شریعت میں بہت اعتبار ہے لہٰذا کبھی اس پر بھی احکام کا دار و مدار ہوتا ہے"

---

[۱] حصہ اول ردالمختار صفحہ ۱۳۲ مطبوعہ ۱۳۱۸ھ

[۲] الاشباہ صفحہ ۱۲۶ و الطرق الحکمیہ صفحہ ۹۱

[۳] حصہ دوم ردالمختار صفحہ ۲۷۰ مطبوعہ ۱۳۱۸ھ

عرف وعادت کی اہمیت

ابن عابدین کی ردالمختار کے پانچویں حصے میں لڑکا اور لڑکی کے سن بلوغ کے تعیّن پر بحث کی گئی اس میں یہ مذکور ہے ـــ " ان معاملات میں جہاں نص شرعی موجود نہ ہو عادت ایک قسم کی شرعی حجت ہے "

امام شہاب الدین القرافی کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے ـــ " احکام عرف عام اور عادت کے ساتھ ساتھ نافذ ہوتے رہتے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فقیہ اور عالم بھی بدلتا رہتا ہے لہذا یہ مفتی کی جہالت ہے کہ وہ کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں پر قائم رہے اور عرف عام اور رواج کی تبدیلی کی طرف رخ نہ کرے "

البتہ عرف وعادت ان شروط کے مطابق شرعی احکام کی بنیاد بن سکتا ہے

(۱) عرف کسی صریح نص شرعی کے مخالف نہ ہو،

(۲) رسم ورواج کا وہ طریقہ عام ہو لہذا خاص قسم کے دستور اور رواج کے ذریعے کوئی عام حکم نافذ نہیں ہو سکتا جیسا کہ کوئی رواج صرف ایک شہر تک محدود ہو یا ایک علاقہ کے مخصوص لوگ اس کے پابند ہوں اور عام لوگ اس کے پابند نہ ہوں کیونکہ اس قدر تنگ دائرہ میں کسی عرف ورواج کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اگر ثابت کر دیا جائے تو عرف خاص قابل اعتبار نہیں ہے گو بعض علماء اسے بھی معتبر مانتے ہیں [۱]

احکام عرف کی مثالیں

اب ہم چند ایسے احکام کا ذکر کرتے ہیں جو عرف پر مبنی ہیں کیونکہ ایسے احکام اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا :-

(۱) جو کوئی مال وقف کرے یا قسم کھائے یا نذر ومنت مانے تو اس کے الفاظ کا مطلب عرف عام کے مطابق سمجھا جائے گا۔

(۲) قاضی کے لئے صرف ان لوگوں کے تحفے قبول کرنے جائز ہیں جو اس کے تقرر سے پہلے اسے تحفے بھیجتے تھے اس کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ تحائف معمول سے زائد نہ ہوں اگر زائد ہوں تو زائد چیز لوٹا دی جائے۔

(۳) بہتے ہوئے پانی کی لوگوں نے یہ تعریف کی ہے " اس کی صحیح ترین تعریف یہ ہے کہ جسے لوگ بہتا ہوا پانی سمجھیں وہ اس حکم میں شامل ہے۔

(۴) حیض ونفاس کے بارے میں یہ مذکور ہے "اگر حیض ونفاس کی عام مدت سے زائد خون آئے تو حیض ونفاس کی مدت عادت کے مطابق ہوگی۔

(۵) رسم ورواج کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر بچوں کو دودھ پلانے کے لئے کسی انا کو ملازم رکھا جائے تو اس کا کھانا کپڑا ملازم رکھنے والے پر ہے،

(۶) اگر باپ، اپنی بیٹی کے لئے جہیز تیار کرکے اسے دیدے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ جہیز کا یہ سب سامان عاریتاً تھا مگر اس دعوے کے ثبوت میں کوئی گواہ نہ ہو تو اس مسئلے کے بارے میں بعض علمار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر اس کا باپ امیر اور اشراف طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا قول تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اگر اس کا تعلق درمیانی طبقے سے ہو تو اس کا قول مانا جائے گا۔ مگر فتویٰ اس پر ہے کہ اگر اس زمانہ کے رسم ورواج میں یہ ہو کہ بیٹی کا جہیز عاریت کے طور پر نہیں ہوتا ہے بلکہ خود باپ کی ملکیت سے دیا جاتا ہے تو باپ کا قول تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اگر رسم ورواج دونوں طریقوں سے ہو تو باپ کا قول تسلیم کیا جائے گا۔

(۷) کوئی صنعتی چیز تیار کرانا بھی عرف عام پر مبنی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی صناع کاریگر سے یہ کہے " اگر میرے لئے فلاں چیز تیار کردو تو اس کی قیمت یہ ہوگی۔" اس کے بعد وہ مصنوعہ شے کا پورا حال بتائے اس طریقے کو حنفی علمار نے جائز قرار دیا ہے حالانکہ نص شرعی میں یہ ممانعت آئی ہے کہ وہ چیز فروخت نہ کی جائے جو انسان کے پاس نہ ہو،

(۸) دعووں کے درجے

اس قاعدہ کے مطابق اہل مدینہ نے دعووں کے تین درجے مقرر کئے ہیں۔ پہلا درجہ دعوے کا وہ ہے جس کے بارے میں عام دستور یہ فیصلہ کرے کہ وہ صحیح دعوے کے مشابہ ہو سکتا ہے اس صورت میں وہ دعویٰ قابل سماعت ہوگا لہٰذا مدعی سے ثبوت طلب کیا جائیگا اور مدعی علیہ کو حلف اٹھانا ہوگا۔

دوسرا درجہ نہ تو سچا دعویٰ بن سکتا ہے اور نہ عام دستور اس کے جھوٹا ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اجنبی شخص کے خلاف یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اس کو قرض دیا ہے یا اسے کوئی چیز مقررہ مدت کے لئے ادھار

فروخت کی ہے، ایسا دعویٰ قابل سماعت ہے اور مدعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ثبوت پیش کرے مگر علماء کی یہ رائے ہے کہ وہ مدعی علیہ سے اس وقت تک حلف نہیں اٹھوا سکتا جب تک کہ وہ یہ نہ ثابت کر دے کہ اس کے اور مدعا علیہ کے درمیان ربط وضبط تھا۔

دعویٰ کا تیسرا درجہ وہ ہے جس کے بارے میں عرف عام اور عام حالات یہ فیصلہ کر دیں کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے، لہٰذا وہ قابل سماعت نہیں ہو سکتا، اس کی بہت سی مثالیں ہیں ایک مثال یہ ہے کہ بہت عرصے کے بعد ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف یہ دعویٰ کرے کہ اس کے شوہر نے کبھی موسم گرما اور سرما میں کوئی کپڑا اسے نہیں پہنایا اور نہ اس پر کوئی حبہ صرف کیا، ایسا دعویٰ قابل سماعت نہیں ہوگا کیونکہ عرف وعادت کے لحاظ سے اس کا دعویٰ جھوٹا ہے بالخصوص جبکہ عورت غریب ہو اور شوہر خوش حال ہو۔[1]

دوسری مثال یہ ہے کہ کوئی آدمی ایک مکان پر قابض ہو اور عرصۂ دراز سے اس میں ایسا تصرف کر رہا ہو کہ اس نے اسے کرایہ پر بھی دیا ہو، اس کی تعمیر کرائی ہو اور مزید تعمیر کے لئے اسے منہدم کرایا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر اپنا قبضہ بھی ظاہر کرتا ہو، اس کے بعد ایک دوسرا آدمی آئے جو پہلے شخص کا اس مکان پر تصرف سالہا سال سے مشاہدہ کرتا رہا ہو اور اس وقت اس نے کوئی مخالفت نہ کی ہو اور نہ اس عرصے میں اس نے اپنا کوئی حق جتایا ہو اور بظاہر اس کے کے مطالبۂ حق میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو اس پر مزید طرہ یہ ہو کہ اس کی قابض کے ساتھ نہ کوئی رشتہ داری ہو اور نہ میراث وغیرہ میں کوئی شرکت ہو لیکن اس کے باوجود وہ اس گھر پر اتنے عرصے کے بعد اپنا دعویٰ ظاہر کرے اور اس کے لئے وہ گواہ اور ثبوت بھی پیش کرنا چاہے تو اس کا دعویٰ ناقابل سماعت ہوگا چہ جائیکہ اس سے گواہ طلب کئے جائیں۔

ایسے جھوٹے دعوے کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مشہور فاسق وفاجر شخص جو لوگوں کو تکلیف پہونچانے میں بدنام رہ چکا ہو۔ ایک مشہور نیک اور دیانت دار شخص کے

[1] الطرق الحکمیہ صفحہ ۸۷ - ۸۹

خلاف یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اس کے گھر میں نقب لگائی اور اس کا سامان چرالیا یا وہ کسی دین دار اور بزرگ ہستی کے خلاف یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اس کی بیوی کو چھیڑا ہے یا اس کے لڑکے کے ساتھ بدکلامی کی ہے یا برا کام کیا ہے تو ایسے دعوے ناقابل سماعت ہیں بلکہ مدعی سزا کا مستحق ہوگا کیونکہ شریعت جس کی بنیاد صداقت اور انصاف پر ہے یہی تقاضا کرتی ہے [۱]

(۹) اگر یتیم کا کوئی سرپرست یہ کہے کہ اس نے یتیم پر اس قدر رقم خرچ کی ہے تو اگر اس کی بیان کردہ رقم عرف اور عام حالات کے مطابق ہوگی تو اس کے قول کو تسلیم کیا جائے گا لیکن اگر عام دستور اور عادت سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرے تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا [۲]

(۱۰) اگر لڑکا یا لڑکی کے بلوغ کی کوئی علامت ظاہر نہ ہو صاحبین نے ان کا سن بلوغ پندرہ (۱۵) سال مقرر کیا ہے اور امام ابوحنیفہ کی ایک روایت بھی یہی ہے باقی تین ائمہ بھی اس کے قائل ہیں انھوں نے اس کا سبب یہی بیان کیا ہے کہ ان کے اہل زمانہ میں یہی عادت غالب تھی [۳]

فقہائے اسلام نے جس کثرت کے ساتھ عرف و عادت پر شرعی احکام کی بنیاد قائم کی ہے انھیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اگو انھوں نے مذکورہ بالا شرائط کے مطابق عرف و عادت کو شرعی بنیاد قرار دیا ہے تاہم ہمارا یہ تعجب اس وقت دور ہوجاتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پذیر قانون وہی ہے جس میں قوم کے سماجی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ اس کی عادات و رجحانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے بشرطیکہ ان تمام رجحانات کو پیش نظر رکھنے سے کوئی خرابی نہ پیدا ہوتی ہو یا عام مفاد کو نقصان نہ پہونچتا ہو، یا ان کے ذریعے کسی صریح نص شرعی کی مخالفت نہ ہوتی ہو بہرحال اگر عوام کی حسب معمول عادات کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور بلاضرورت ان کے قدیم رسم و رواج اور روایات کو نظر انداز کردیا جائے تو اس سے ان کے کاموں میں جو حرج واقع

---

[۱] الطرق الحکمیہ ص ۹۲

[۲] الطرق الحکمیہ ص ۲۱

[۳] حصہ پنجم ردالمختار ص ۱۰۰ مطبوعہ ۱۳۱۸ھ

ہوگا، وہ زندہ رہنے والی ترقی پذیر شریعت کے اصولوں کے خلاف جس میں ہمیشہ آسانی کو مدنظر رکھا گیا ہے اور مشکلات کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

قاعدۂ یازدہم "فتنہ وفساد اور خرابیوں کے تمام ذرائع کا خاتمہ کیا جائے" اس قاعدہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ فعل جو خرابیوں سے پاک ہو مگر خود کسی خرابی کا سبب بن سکتا ہو ممنوع ہے۔ بعض دفعہ ایسے ذرائع اور اسباب بظاہر مباح ہوتے ہیں مگر وہ ممنوع افعال کا سبب بن جاتے ہیں اس لئے اسی قاعدہ کے مطابق انھیں ممنوع قرار دیا گیا ہے مثلاً اجنبی مرد کے ساتھ عورت کی خلوت کو منع کیا گیا ہے اور فتنہ وفساد کو دور کرنے کے لئے عورت کا نامحرم کے ساتھ سفر کرنا ممنوع ہے تاکہ عورت کے اخلاق اور آبرو محفوظ رہے۔ بلکہ مالکی فقہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ذرائع فساد کا سدباب کرنا ان کے فقہ کی خصوصیت بن گیا ہے مگر یہ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ ایسے ذرائع اور وسائل کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) بعض ذرائع ایسے ہیں جن پر امت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ وہ ممنوع ہیں جیسا کہ مسلمانوں کے راستے میں کنوئیں کھودنا ممنوع ہے کیونکہ یہ ان کی ہلاکت کا سبب بنتے ہیں، اسی طرح ایسے کافروں کے سامنے بتوں کو برا بھلا کہنا منع ہے جو بتوں کی مخالفت کرنے پر اللہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۲) اسباب وذرائع کی ایک قسم ایسی ہے جس پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ انہیں ممنوع نہ قرار دیا جائے جیسا کہ شراب بنانے کے اندیشے سے انگور کی کاشت سے روکا جائے کیونکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ یا زنا کے خوف سے گھروں میں بیٹھنے سے روکا جائے۔

(۳) اسباب وذرائع کی ایک قسم ایسی ہے جس کے بارے میں علمار کا اختلاف ہے جیساکہ مالکی علمار کے نزدیک ادھار فروخت کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً کسی نے کوئی سامان ۱۰ درہم میں فروخت کیا پھر اسی کو ۷ درہم کے بدلے میں نقد خرید لیا۔ اس مسئلے میں امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ اس نے فوراً ۷ درہم اس لئے نکالے ہیں کہ مدت ختم ہونے پر وہ ۱۰ درہم لے سکے لہٰذا یہ طریقہ دس درہم کے لئے سات درہم قرض دینے کا ذریعہ بنا جس کے لئے بیع کی صورت اختیار کی گئی ہے،

مگر امام شافعی بیع کی صورت کو ملاحظہ فرماتے ہیں اور اس کی ظاہری حالت کو درست

دیکھ کر اسے جائز سمجھتے ہیں۔

اسی طرح علمار کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اگر قاضی اپنے علم کے مطابق کوئی فیصلہ کرے تو آیا یہ حرام ہے یا نہیں کیونکہ یہ برُے قاضیوں کے لئے باطل فیصلوں کا ذریعہ بن جاتا ہے [1]

دراصل انسداد ذرائع کا قاعدہ امام مالک کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس قاعدے پر سب کا اتفاق ہے البتہ امام مالک دوسروں کے بہ نسبت اس کے زیادہ قائل ہیں۔

قرطبی فرماتے ہیں ـــــ "امام مالک اور ان کے ساتھی اسد ذرائع کے قائل ہیں اور اکثر لوگ ایک اصول کی حیثیت سے اس کی مخالفت کرتے ہیں مگر اکثر فروعی مسائل میں عملی طور پر وہ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں"۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں ـــــ "وہ کام جو قطعی طور پر ممنوع اشیار کا سبب بن سکے ان کا اس قاعدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ایسی چیزوں سے پرہیز کرنے پر حرام سے نجات مل سکتی ہے لہٰذا یہ فعل بھی حرام ہے اسی طرح جن ذرائع سے فرائض کی تکمیل ہوتی ہو، وہ بھی تقریباً فرض ہیں، لیکن ان اسباب کی جو قطعی طور پر ممنوعہ اشیار کا سبب نہیں بنتے ہیں تین قسمیں ہیں یا تو ان کے بارے میں گمان یہ ہو کہ ممنوع کاموں کا سبب بن سکتے ہیں یا غالب گمان یہ ہو کہ وہ ممنوع کاموں کا ذریعہ نہیں بن سکتے ہیں تیسری قسم یہ ہے کہ نفی و اثبات کے دونوں پہلو اس میں برابر ہوں یہی تینوں قسمیں وہ ہیں جو مالکی علمار کے نزدیک ذرائع کہلاتی ہیں پہلی قسم میں تو ان کے سد باب کی ضرورت ہے مگر دوسری اور تیسری قسموں میں علمار کا اختلاف ہے [2]

مذکورہ بالا قاعدہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ثابت کیا جاتا ہے ـــــ "حلال و حرام صاف اور واضح ہیں! اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں اور مومن شک و شبہ کے مقام پر ٹھہر جاتے ہیں" دوسری حدیث ہے ـــــ "دیکھو اللہ کی (باڑیں) حدیں گناہ ہیں، جو کوئی ان کے ارد گرد گھومتا رہے تو اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ان میں گر نہ جائے"۔ ایک حدیث یہ بھی ہے ـــــ مشتبہ کاموں کو چھوڑ کر غیر مشتبہ

---

[1] قاضی کے اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنے میں علمار کی رائے کے لئے ملاحظہ ہو الطرق الحکمیۃ ص ۱۴۰-۱۷۴ و نیل الاوطار

[2] ارشاد الفحول ص ۲۱۷ مطبوعہ صبیح۔

کاموں کو اختیار کرو"

ہمیشہ ہر ذریعے کے سدباب کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ کبھی اس کا کھولنا ضروری ہو جاتا ہے اور کبھی وہ مکروہ ہو جاتا ہے اور کبھی وہ مباح یا مستحب ہوتا ہے اور جس طرح سب سے بڑے مقاصد کے ذرائع کو بھی بدترین سمجھا جاتا ہے اسی طرح بہترین مقاصد کے اسباب و ذرائع بھی بہترین ہوتے ہیں، کبھی حرام چیز کا ذریعہ حرام نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی غالب مصلحت کا سبب بنتا ہے۔

اس قاعدہ سے ایک دوسرا قاعدہ بھی نکلا ہے وہ یہ ہے ـــ "جب اصل مقصد کا اعتبار جاتا رہے تو بالعموم اس کے وسیلہ کا اعتبار بھی باقی نہیں رہتا ہے کیونکہ وہ حکم میں اس کے تابع ہوتا ہے [۱]

علامہ ابن القیمؒ نے ایک محقق عالم کی حیثیت سے اس قاعدہ پر نفیس بحث کی ہے اس لئے ہم افادۂ عام و خاص کے لئے ان کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں

علامہ ابن القیمؒ نے ذریعہ کی تعریف یہ کی ہے ـــ " ذریعہ وہ ہے جو کسی چیز کی طرف پہونچنے کا وسیلہ اور طریقہ بن سکے " اس کے بعد انھوں نے یہ خلاصہ بیان کیا ہے ـــ " چونکہ مقاصد کی طرف ہم چند اسباب اور ان کی راہوں ہی سے پہونچتے ہیں۔ لہٰذا یہ اسباب ان مقاصد کے تابع ہوتے ہیں اگر وہ اسباب و ذرائع محرمات اور گناہوں کے ہوں تو اس تعلق کی بنا پر وہ بھی ممنوع اور مکروہ قرار دیئے جاتے ہیں، مگر وہ اسباب و ذرائع جو ہمیں عبادات و قربت خداوندی کی منزل تک پہونچاتے ہیں پسندیدہ اور جائز ہیں، لہٰذا ذرائع مقاصد کے تابع ہوتے ہیں بلکہ مقاصد میں دونوں چیزیں شامل ہیں یعنی ایک منزل مقصود ہوتی ہے اور دوسری چیز اس اس کا راستہ ہوتی ہے دونوں حصول مقصد کے لئے ضروری ہیں لہٰذا جب شریعت کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی حرمت کو قائم رکھنے کے لئے اس کے تمام راستوں اور ذرائع کو بند کر دیا جائے تاکہ کوئی اس حرام چیز کے پاس تک نہ بھٹک سکے لہٰذا اگر شریعت اس کی راہوں پر پابندی نہ لگائے تو ممنوع چیز کی ممانعت قائم نہیں رہ سکتی بلکہ اس کی راہیں کھلی رکھ کر لوگوں کو ممنوع منزل تک

---

[۱] الفروق از قرافی جلد دوم ص ۳۹ - ۴۱ مطبوعہ تونس ۱۳۰۲ھ

پہونچنے کا موقع دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کے برخلاف ہے۔

وسائل وذرائع کے اقسام

ذرائع اور وسائل کی چار قسمیں ہیں :-

(۱) ایسا ذریعہ جو ہمیشہ خرابی کا باعث ہو مثلاً نشہ کی کوئی چیز استعمال کی جائے جس سے نشہ کی خرابیاں پیدا ہوجائیں یا زنا کیا جائے جس سے نسل ونسب کی خرابی پیدا ہوجائے یا ایسی بری بات کہہ دی جائے جو تہمت کی حد تک پہونچتی ہو بہر حال اس قسم کے اقوال وافعال سے ہمیشہ ایسی خرابیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ان کا بظاہر دوسرا مفہوم نہیں ہوتا ہے لہذا شریعت نے ایسے ذرائع اور وسائل کو ان کے درجوں کے مطابق حرام یا مکروہ قرار دیا ہے

(۲) ایک قسم وسائل وذرائع کی ایسی ہے جو بذات خود مباح ہے مگر اسے کسی بری بات کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے، جیسے کوئی اس مقصد سے نکاح کرے کہ اس کے ذریعے حلالہ کیا جائے یا کوئی چیز فروخت کی جائے اور سود خوری اس کا مقصد ہو۔

(۳) کوئی ذریعہ بذات خود مباح یا مستحب ہو اور اس کے ذریعے برا مقصد بھی پیش نظر نہ ہو مگر بالعموم اس کا نتیجہ برائی نکلتا ہو۔ اور اس کی برائی اس کی بھلائی پر غالب رہتی ہو جیسے کوئی شخص نماز کے ممنوعہ اوقات میں نفلی نماز پڑھے یعنی سورج کے نکلتے یا ڈوبتے وقت نماز پڑھی جائے یا کوئی مشرکوں کے دیوتاؤں کو ان کے سامنے گالی دے یا قبر کے سامنے نماز پڑھے یا بیوہ عورت عدت کے زمانے میں زیب وزینت کرے،

دوسری اور تیسری قسم کو علامہ ابن القیمؒ نے ممنوع قرار دیا ہے اور انھیں ننانوے وجوہات کے ذریعے ثابت کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں علم شریعت میں کس قدر مہارت حاصل ہے ان میں سے چند دلائل حسب ذیل ہیں

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- تم ان چیزوں کو گالی نہ دو جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں ورنہ وہ اللہ کو علم کے بغیر ناحق گالی دیں گے "

اس آیت کے ذریعے اللہ نے مشرکوں کے دیوتاؤں کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے حالانکہ اس فعل سے اللہ کی حمایت اور دیوتاؤں کی توہین ظاہر ہوتی ہے مگر چونکہ یہ اللہ کو گالی دینے کا ذریعہ ہے اس لئے یہ ممنوع ہے اور یہاں یہی مصلحت غالب ہے

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- وہ عورتیں اپنے پاؤں مار کر نہ چلیں ایسا نہ ہو کہ ان کی پوشیدہ زینت کا پتہ چل جائے " اس آیت میں پاؤں مارنے سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ بذات خود یہ فعل جائز ہے مگر اس کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے مرد عورتوں کے پازیبوں کی آوازیں سنتے ہیں اور اس سے ان میں شہوانی جذبات پیدا ہوتے ہیں

(۳) اللہ تعالیٰ نے نماز جمعہ کی اذان کے وقت خرید و فروخت کو اس لئے منع فرمایا ہے کہ لوگ تجارت میں مشغول رہیں گے اور نماز میں حاضر نہیں ہو سکیں گے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع و غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ یہ بعض مشرک، آفتاب پرستوں کے سجدہ کرنے کے اوقات ہیں لہذا اس ظاہری مشابہت کا سد باب کرنے کے لئے ان اوقات میں نماز پڑھنے کو منع فرمایا ہے کیونکہ یہ مشابہت کبھی عملی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے لہذا جب دور کا راستہ بھی بند کر دیا گیا ہو تو قریبی ذرائع بدرجہ اولیٰ ممنوع ہیں،

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو تحفہ قبول کرنے سے منع فرمایا ہے تاکہ اسے بھی وہ اپنے قرض میں شمار نہ کرے۔ اور پھر یہ تحفہ قرض کو تاخیر سے ادا کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے اس طرح اس میں سود کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔

(۶) حاکم اور قاضی کو تحفے تحائف قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے تحائف قبول کرنا جن کا پہلے یہ معمول نہ رہا ہو اس کی ضرورت کو رفع کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو اگرچہ وہ اس کا حقدار نہ ہو

(۷) محرم کے بغیر عورت کو سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ نامحرم کے ساتھ اس عورت کا سفر کرنا خرابی کا باعث بن سکتا ہے،

(۸) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کو سات لہجوں میں سے ایک لہجہ پر اس لئے مرتب کیا تھا کیونکہ اگر وہ جمع قرآن نہ کرتے تو یہ فعل قرآن کریم کے پڑھنے میں لوگوں کے اختلاف کا ذریعہ بن سکتا تھا اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ان کی حمایت کی۔

(۴) ذریعہ کی چوتھی قسم وہ ہے جو مباح کام کے لئے مقرر کی گئی ہو وہ کبھی خرابی کا باعث بھی بن سکتی ہو تاہم اس کی بھلائی اس کی برائی پر غالب رہتی ہو جیسے منگیتر عورت یا اس عورت کو جس کی گواہی دی جائے دیکھ لیا جائے یا ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے

علامہ ابن القیم نے اس قسم کو حسب مراتب مصلحت، مباح، مستحب یا واجب کہا ہے۔

اس نفیس بحث کی تفصیل ان کی کتاب اعلام الموقعین کے تیسرے حصے میں ہے؛ ابن تیمیہ کی کتاب التوسل والوسیلہ[1] میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

قاعدہ دوازدہم (۱۲) "جو کوئی اپنی طرف سے مکمل کام کو توڑنے کی کوشش کرے تو اس کی کوشش قابل قبول نہیں ہوگی" ان کی مثالیں معاملات اور دعووں کی بحث میں بہت زیادہ ہیں۔

تیرھواں قاعدہ (۱۳) "جو کوئی وقت سے پہلے کسی چیز کو لینا چاہے تو اس کی سزا اس سے محرومی ہے"، اسی مفہوم کے قریب علماء کا یہ مقولہ ہے ــ "جو کوئی حرام مقصد سے کوئی کام کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کا مقصد نہ پورا کیا جائے"۔

یہ ایک مشہور قاعدہ ہے جس کے ماتحت کئی فروعی مسائل ہیں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی عورت کو اس کی رضامندی کے بغیر مرض موت میں بائن طلاق دے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اسے میراث سے محروم کردے تو اس طلاق کے باوجود وہ اس کی وارث بنے گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے موروث کو ناحق قتل کر دے تو وہ میراث سے محروم رہے گا۔

کتاب الاشباہ والنظائر میں آٹھ مسائل کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ان میں سے چند مسائل یہ ہیں اگر کوئی دار قرض خواہ کو قتل کردے تو اس کا قرض اس کے ذمے سے ساقط نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک عورت نے حیض لانے کی دوا پی اور اس سے اس کو حیض آنے لگا تو اس کے باوجود وہ نماز قضا نہیں کرے گی۔ نیز اگر ام ولد (اولاد والی لونڈی) اپنے آقا کو قتل کردے (تو قتل کرنے کے جرم کے باوجود) وہ آزاد ہو جائیگی اور آزادی سے محروم نہیں رہے گی۔

چودھواں قاعدہ (۱۴) یقین شک وشبہ سے زائل نہیں ہوتا ہے" اس قاعدہ کا ثبوت حضرت عبداللہ بن زید کی وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں مذکور ہے وہ روایت کرتے ہیں ــ "ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] مطبوعہ المنار مصر کا دوسرا ایڈیشن ص ۱۶

کے پاس آکر یہ شکوہ کیا کہ اسے یہ وہم ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے اسے کچھ محسوس ہوتا ہے " آپؐ نے فرمایا ــــ "وہ نماز نہ توڑے جب تک کہ وہ کوئی آواز نہ سُنے یا ریح کو محسوس نہ کرے "

فقہار کرام نے اس قاعدہ کا بڑی دل چسپی سے ذکر کیا ہے بلکہ یہاں تک وہ کہتے ہیں کہ یہ قاعدہ فقہ کے تمام ابواب میں شامل ہے اور اس کے ماتحت استنباط کئے ہوئے مسائل فقہ کی تین چوتھائی مقدار سے بھی زیادہ ہیں [۱] اسی قاعدہ کے بارے میں قرافی نے الفروق میں یہ لکھا ہے ــــ "جس چیز میں شک ہو وہ اس معدوم کے مانند ہے جس کے نہ ہونے کا یقین ہو، یا یوں کہا جائے کہ ہر مشکوک بات شریعت سمجھی جاتی ہے "

اس کے باوجود الاشباہ والنظائر کے مؤلف نے چند مسائل کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کیا ہے اس قاعدہ کے ماتحت کئی ذیلی قواعد بھی شامل ہیں جن میں سے چند ایسے اہم قواعد یہ ہیں ۔

(الف) ہر چیز اپنی اصلی حالت پر برقرار رہتی ہے جب تک کہ اس کے بدلے کا یقین اور ظن غالب نہ ہو، اس قاعدہ کے ماتحت بہت سے مسائل آتے ہیں مثلاً جس کسی کو طہارت کا یقین ہو اور حدث (بے وضو ہونے) کا شک ہو تو وہ پاک و صاف ہی سمجھا جائے گا۔ مگر جسے بے وضو ہونے (حدث) کا یقین ہو اور طہارت کا شک ہو تو وہ بے وضو (محدث) ہے ۔ اسی قاعدے کے ماتحت علمار نے گلیوں کی مٹی کے پاک ہونے کا فتویٰ دیا ہے

اگر کوئی بچہ کہیں پڑا ہوا (لقیط) مل جائے تو وہ اپنے تمام احکام میں آزاد ہے کیونکہ اصل بنیاد حریت و آزادی ہے اور غلامی ایک عارضی چیز ہے ،

اس کے ماتحت ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر محمد کا ایک ہزار پونڈ قرضہ ابراہیم کے ذمے ہیں اور ابراہیم یہ ثبوت بہم پہونچادے کہ اس نے یہ قرض ادا کردیا ہے یا اس سے وہ بری الذمہ ہے اس کے بعد محمد یہ ثبوت پیش کرے کہ اس کے ذمے ایک ہزار پونڈ کا قرض باقی ہے تو اس کے ثبوت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جائے گا

[۱] شرح الاشباہ از حموی ص ۸۵ جلد اوّل مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

جب تک کہ وہ ثابت نہ کرے کہ پہلا قرض ادا کرنے یا باقی کرنے کے بعد یہ لیا گیا ہے کیونکہ پہلے ثبوت نے قرض خواہ کی ذمہ داریوں کو ختم کر دیا تھا لہٰذا احتمال وشک کی وجہ سے اب اسے عائد نہیں کیا جا سکتا۔

(ب) اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص بری الذمہ ہوتا ہے لہٰذا خلاف اصل ہونے کی وجہ سے مدعی سے ثبوت طلب کیا جاتا ہے مگر مدعی علیہ کے قول کو مان لیا جاتا ہے کیونکہ اس کا قول اصلیت کے مطابق ہے لہٰذا جب مدعی اور مدعی علیہ میں غصب کی ہوئی چیز کی قیمت پر اختلاف ہو جائے یا کسی ضائع شدہ چیز کی قیمت پر جھگڑا ہو جائے تو نقصان برداشت کرنے والے کے قول کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ وہ زائد چیز سے بری ہے

(ج) اصل قاعدہ کی بات یہ ہے کہ ہر واقعہ کو اس کے قریبی وقت کی طرف منسوب کیا جائے مثلاً ایک عورت یہ دعویٰ کرے کہ اس کے شوہر نے اسے مرض موت میں طلاق دی تھی اور اسے میراث سے محروم کرنا چاہا تھا اس لئے وہ اس کی وارث ہے مگر دیگر ورثاء یہ کہیں کہ "اس نے حالت صحت میں طلاق دی تھی اس لئے وہ وارث نہیں بن سکتی" ایسے مقدمے میں عورت کے قول کو تسلیم کر کے اسے وارث لیا جائے گا اسی طرح یہ مقدمہ ہے کہ اگر کسی نے ایک وارث کے بارے میں کچھ وصیت کی اس کے بعد وصی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنی صحت کی حالت میں وصیت کی تھی تو دیگر ورثاء کے قول کو تسلیم کیا جائے گا لہٰذا اس وصی کو کوئی ثبوت پیش کرنا ہوگا اگر وہ ثبوت نہ پیش کر سکے اور وہ ان سے حلف اٹھوانا چاہے تو اسے یہ حق بھی حاصل ہے۔

یہ مسئلہ بھی اسی قاعدہ کے ماتحت ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اس کے بعد اس نے اپنے کپڑے پر نجاست ملاحظہ کی مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ نجاست اسے کب لگی تھی تو وہ اس آخری وقت سے نماز لوٹائے گا جب کہ وہ بے وضو ہوا تھا۔

(د) استصحاب[1] بھی اسی قاعدہ سے ماخوذ ہے الاشباہ میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے "اس کام کے جو پورا ہو چکا ہو اور اس کے نہ ہونے کا کوئی گمان نہ ہو برقرار رہنے کا حکم دیا جائے"

---

[1] استصحاب کی پوری تفصیل ہم اختلافی احکام کی بحث، میں گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں یہاں قاعدہ فقہیہ کی حیثیت سے مختصر کیا جاتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح تعریف یہ کی گئی ہے :- اگر کوئی کام کسی وقت بھی ثابت ہو چکا ہو تو دوسرے وقت بھی اس کے ثبوت کا حکم دیا جائے ایسے کاموں کی دو قسمیں ہیں :- (۱) یہ کہا جائے کہ چونکہ یہ کام زمانۂ ماضی میں ثابت تھا اس لئے زمانۂ حال میں بھی اسے ثابت سمجھا جائے جیسا کہ کوئی آدمی جو گم ہو گیا ہو اس کو موجودہ زمانے میں بھی زندہ سمجھا جائے (۲) یہ کہا جائے کہ چونکہ ہر ایک چیز موجودہ زمانے میں موجود ہے اس لئے اسے زمانۂ ماضی میں بھی موجود سمجھا جائے جیسا کہ کوئی عیسائی مر جائے اور اس کی مسلمان بیوی آکر یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس کی موت کے بعد مسلمان ہوگئی تھی، اس کے برخلاف دیگر ورثار یہ کہیں کہ وہ اس کی موت سے پہلے مسلمان ہوئی تھی، تو ایسی صورت میں ورثار کے قول کو مانا جائے گا اور اس عورت کی تصدیق نہیں کی جائے گی جب تک کہ وہ ثبوت نہ پیش کرے کیونکہ اس کی میراث سے محرومی کا سبب فی الحال موجود تھا لہٰذا زمانہ حال کا حکم اس کے ماضی پر بھی منطبق ہوگا

استصحاب کو شرعی حجت ماننے میں علمار کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ ہر حالت میں شرعی حجت ہے یعنی وہ اثبات و مدافعت دونوں میں معتبر ہے بعض علمار اسے بالکل شرعی حجت نہیں تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ابن نجیم حنفی نے بھی اس قول کو ترجیح دی ہے مگر ایک تیسری جماعت اسے مدافعت کے لئے شرعی حجت تسلیم نہیں کرتی ہے یعنی یہ اصول غیر مسلم دعوے کی مدافعت کے قابل تو ہے لیکن یہ اس حق کو ثابت نہیں کر سکتا جس کی کوئی دلیل نہ ہو اس لئے یہ مدعی علیہ کو قائل کرانے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس قول کو تینوں مشہور عالم ابوزید، شمس الائمہ اور فخر الاسلام نے اختیار کیا ہے اور اسی رائے کو حنفی علمار کی کتب فقہ میں معتبر مانا گیا ہے چنانچہ ان کی کتابوں میں یہ مشہور قاعدہ پایا جاتا ہے " استصحاب مدافعت کی دلیل بن سکتا ہے مگر حق کو ثابت کرنے کی دلیل نہیں بن سکتا"

اس قاعدہ کا ایک فرعی مسئلہ حنفی علمار کے اس قول کے مطابق یہ ہے کہ اگر ایک مشترکہ گھر کا ایک حصہ فروخت ہوا ہو، اس کے بعد شریک شفعہ کی دعویٰ کرے تو اگر اس موقعہ پر نیا خریدار مدعی کی ملکیت سے انکار کردے تو اس کا قول معتبر ہوگا اور مدعی کو شفعہ کا حق اس وقت حاصل ہوگا جبکہ وہ اس کا ثبوت پیش کرے کیوں کہ

یہ دعویٰ استصحاب کے اصول پر مبنی ہے جو مدعی علیہ کے لئے حق ثابت کرنے کی دلیل نہیں بن سکتا - اسی طرح اگر کوئی شخص گم ہو جائے تو حنفی علماء کے اس قول کے مطابق وہ وارث نہیں بن سکتا اور نہ اس کے مال کا کوئی وارث بن سکتا ہے جب تک کہ اس کی وفات کے بارے میں کوئی یقینی فیصلہ نہ کر دیا جائے [۱]

پندرھواں (۱۵) قاعدہ

"ہر چیز دراصل اس وقت تک مباح سمجھی جاتی ہے جب تک کہ اس کے مباح ہونے کے خلاف کوئی ثبوت نہ پیش کیا جائے"

امام شافعی اور بعض حنفی علماء کا جن میں کرخی بھی شامل ہیں یہی مسلک ہے اس قاعدہ کی دلیل یہ آیت ہے :-

"اس نے تمہارے لئے سب کچھ پیدا کیا جو روئے زمین پر موجود ہے" اس آیت میں یہ گیا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کو پیدا کر کے ہم پر احسان کیا ہے اور احسان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھایا جائے لہذا یہ ثابت ہوا کہ تمام چیزیں مباح ہیں۔ بعض محدثین کی یہ رائے ہے کہ ہر چیز میں اصل قاعدہ ممانعت کا ہے اور کسی چیز کو مباح یا جائز قرار دینے کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے، امام شافعی نے امام ابوحنیفہ کی طرف بھی اس قول کو منسوب کیا ہے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ دراصل ہر چیز کے بارے میں توقف کرنا چاہیئے، اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز کے بارے میں حکم کی ضرورت ہے مگر عقل کے ذریعے ہر حکم نہیں معلوم ہو سکا" اس بحث کی تفصیل الاشباہ اور اس کی شرح میں ہے جو حموی نے لکھی ہے، [۲]

سولھواں (۱۶) قاعدہ

"پیداوار کا نفع اس کی ذمہ داری کی وجہ سے ہے" یا "مال غنیمت تاوان کے ساتھ ہوتا ہے" درخت کی پیداوار (خراج) اس کا پھل ہے اور حیوانات کی پیداوار ان کا دودھ اور ان کی نسل ہوتی ہے، دراصل پیداوار (خراج) سے مراد کسی چیز کے منافع ہیں، اور اس کا حق اس شخص کو حاصل ہے جس کی ملکیت میں اصل چیز ہو اس کے چند فروعی مسائل ہیں جنہیں حنفی علما فقہاء نے خیار العیب کے باب میں بیان کیا ہے کہ وہ اضافہ جو اصل سے پیدا نہ ہو اور اس سے الگ ہو جیسا کہ

---

[۱] مزید تفصیل اس کتاب کے باب دوم اور فصل چہارم میں ملاحظہ ہو۔

[۲] اس بحث کے لئے ارشاد الفحول صفحہ ۲۵۱ مطبوعہ ۱۳۲۷ھ بھی ملاحظہ ہو۔

کسب مال اور غلہ ہے، یہ چیزیں عیب کی وجہ سے فروخت کردہ شے کو واپس کرنے میں مانع نہیں ہیں، اور مدت میں اس کا فائدہ حاصل ہونے پر گاہک کو کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ اسے قیمت کے ذریعے حاصل نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ اپنی ذمہ داری پر اس کا مالک بنا ہے کیونکہ اگر کوئی چیز لوٹانے سے پہلے خریدار کی قبضے میں ضائع ہو جائے تو خریدار ہی اس کا ذمہ دار ہوگا یعنی اس کا اپنا مال ضائع ہوگا۔

مذکورہ بالا قاعدہ اس حدیث پر مبنی ہے ——"ایک آدمی نے ایک غلام خریدا جو مدت تک اس کے پاس رہا۔ پھر اس نے اس میں کوئی عیب دیکھا (اور وہ لوٹانے لگا)۔ فروخت کرنے والے نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیش کیا تو آپؐ نے اس غلام کو لوٹا دیا۔ اس شخص نے کہا ——"یا رسولؐ اللہ! اس نے میرے غلام کو استعمال کیا تھا" آپؐ نے فرمایا ——"پیداوار کا نفع ذمہ داری کی وجہ سے ملتا ہے"

سترھواں (۱۷) قاعدہ

"معاملات کا دارومدار ان کے مقاصد پر ہے" یعنی کسی چیز کے حلال و حرام ہونے کا دارومدار اس کے مقاصد اور اس کی نیتوں پر ہے اس کی مثال یہ ہے کہ حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ نہ چھوڑے رکھے مگر یہ حکم قصد و نیت پر موقوف ہے اگر اس نے کسی کو شرعی سبب کے بغیر چھوڑ رکھا ہے تو اس کا یہ فعل حرام ہے اور اگر اسے چھوڑنے کا کوئی شرعی سبب ہو تو یہ فعل حرام نہیں ہے اس طرح لقطہ کا مسئلہ ہے یعنی اگر کسی نے سڑک پر پڑی ہوئی کوئی چیز اس مقصد سے اٹھائی کہ اس کے مالک کو تلاش کرکے اسے یہ چیز واپس کی جائے تو یہ فعل اس کے لئے حلال ہے ورنہ اگر خود اپنے لئے اٹھائی ہو تو وہ غاصب اور گناہ گار ہوگا۔

اٹھارواں (۱۸) قاعدہ

اگر ناجائز کمائی ہو اور حقدار کو وہ واپس نہ کی جا سکتی ہو تو اسے خیرات کر دیا جائے" اس کی مثال یہ ہے کہ کسی آدمی نے ظلم یا رشوت سے کوئی مال جمع کیا ہو اس کے بعد وہ مر جائے تو اس کے ورثاء اس کا مال میراث میں نہ تقسیم کریں گو قانوناً میراث میں یہ مال لینا ان کے لئے جائز ہے مگر اخلاقی طور پر ان کے لئے حرام ہے بلکہ اگر اس مال کے اصل حق داروں کا پتہ چل جائے تو مال ان کو واپس کر دیا جائے ورنہ وہ مال صدقہ میں

دے دیں [1]

انیسواں قاعدہ (۱۹) جب حلال و حرام دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو حرام چیز غالب ہوگی [2] اس کی مثال یہ ہے کہ اگر شکار میں سدھائے ہوئے اور بغیر سدھائے ہوئے دونوں قسم کے کتے شریک ہوں تو شکار جائز نہیں ہوگا۔

بیسواں قاعدہ (۲۰) جب کسی مانع اور محرک کا تصادم ہو تو مانع کو مقدم رکھا جائے گا [3] اس کی مثال یہ ہے کہ اگر وقت اور پانی اتنا نہ ہو کہ طہارت کی سنتیں ادا کی جا سکیں تو ان کو ادا کرنا ممنوع ہوگا، اس طرح جو شخص رہن رکھے یا اسے کرایہ اور اجرت پر دے تو وہ اپنی ان چیزوں میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اس کی ملکیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے تصرف کو جائز قرار دیا جائے۔

اکیسواں قاعدہ (۲۱) ہر وہ فعل جس کی نیکی اس کے بار بار کرنے سے بڑھتی رہتی ہو وہ حکم عین ہوتا ہے اور جس کی نیکی اس کے بار بار کرنے سے نہ بڑھے تو وہ حکم کنایہ ہے۔

قاعدہ حکم عین کی مثال پنج وقتہ نمازیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم، مناجات، عبادات اور ادب و احترام وغیرہ اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے لہٰذا جس قدر نماز بار بار پڑھی جائے اس قدر اس کی نیکیوں اور احکام کا اعادہ ہونا جائے گا۔ یہ مثال فرض عین کی ہے لیکن عینی مستحب کی مثال صدقات ہیں۔

حکم کنایہ کی مثال ڈوبتے ہوئے کو بچانا ہے، چنانچہ اگر کوئی انسان ڈوبتے ہوئے کو نکال کرلے آئے تو اصل مقصد حاصل ہو جائے گا اس کے بعد اگر کوئی سمندر میں کود کر تیرے تو اسے کوئی بھلائی یا نیکی نہیں ملے گی۔ اس لئے شریعت نے اسے حکم کنایہ میں شامل کیا ہے اسی طرح برہنہ کو کپڑے پہنانا اور بھوکے کو کھانا کھلانا ہے سنن و مستحبات میں بھی بعض اقسام ایسی ہیں جیسے اذان ہے۔

---

[1] جلد پنجم ردالمختار ص ۲۵۵

[2] اس قاعدہ سے چند مسائل مستثنیٰ ہیں ملاحظہ ہو الاشباہ جلد اول ص ۱۴۶، ۱۴۷ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

[3] چند مستثنیٰ مسائل الاشباہ جلد اول ص ۱۵۳ میں مذکور ہیں۔

بائیسواں قاعدہ اصول حکمرانی[۲۲]

ہر شعبۂ حکومت میں اس آدمی کو مقدم کیا جائے گا جو اس کے حقوق و مفادات کا زیادہ خیال رکھتا ہو۔ چنانچہ عام حکمرانی میں اس شخص کو مقدم سمجھا جائے گا جو قوم کی سیاست اور شریعت سے زیادہ واقف ہو اور قابل آدمیوں کو مقرر کر سکے اور کمزور آدمیوں کو الگ کر کے دشمنوں کا مقابلہ کر سکے بلکہ وہ نظام مالیات سے بھی واقف ہو اور جائز مصارف میں انھیں صرف کرنا جانتا ہو۔

حاکم جنگ مقرر کرنے میں وہ آدمی مقدم ہے جو اس کی چالوں سے خوب واقف ہو اور فوجی نظم و نسق کا ماہر ہو اور دشمنوں پر بہادرانہ حملے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو محکمۂ عدالت کے لئے وہ شخص مقدم ہوگا جو احکام شریعت کا بہت بڑا عالم ہو[۱] اور مقدمہ بازوں کے دلائل اور ان کے فریب کو بخوبی سمجھتا ہو۔

ماہرین خصوصی کے اس قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مردوں کو عورتوں پر ملکی اور جنگی نظام حکومت میں مقدم رکھا گیا ہے کیونکہ مرد حکومت کے ان کاموں کو سرانجام دینے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں البتہ پرورش اور تربیت کے معاملے میں عورتوں کو مرد پر مقدم رکھا گیا ہے کیونکہ وہ بچوں کے اخلاق و عادات پر زیادہ صبر کر سکتی ہے اور ان سے رحم و شفقت زیادہ کرتی ہے بلکہ وہ بچوں کی ناپسندیدہ باتوں پر بہت کم ناک بھوں چڑھاتی ہے[۲]

تیئیسواں قاعدہ حاکم کے فرائض[۲۳]

رعایا کے معاملات میں حاکم وقت کا برتاؤ مصلحت پر مبنی ہوتا ہے[۳] اس کی اصل بنیاد حضرت عمرؓ کا یہ قول ہے: "میں اپنے آپ کو اللہ کی مال و دولت کا اسی طرح ذمہ دار سمجھتا ہوں جس طرح یتیم کا سرپرست اس کے مال کا ذمہ دار ہوتا ہے جب مجھے ضرورت ہوتی ہے تو میں اس سے کچھ لے لیتا ہوں اور جب خوش حال ہوتا ہوں تو اسے لوٹا دیتا ہوں اور جب دولت مند ہوتا ہوں تو اس سے پرہیز کرتا ہوں"

دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے اپنے ماتحت حاکموں سے یہ فرمایا: "میں اپنے آپ کو اور تمہیں اس مال کا یتیم کے سرپرست کی طرح ذمہ دار سمجھتا ہوں، جن کے

۱۔ الفروق از قرافی ۲۔ الفروق از قرافی ۳۔ الاشباہ

بارے میں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے "جو دولت مند ہو وہ اس سے پرہیز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ مناسب طریقے پر اس میں سے کچھ کھالے"

فقہائے کرام نے کئی موقعوں پر اس قاعدہ سے کام لیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں سلطان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ بیت المال کی اراضی کو صرف عام لوگوں کی بھلائی کے لئے وقف کرے ؎ اسی طرح یہ قول بھی ہے کہ سلطان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لاوارث قاتل کو معاف کردے بلکہ یا تو وہ قصاص لے یا دیت لے کیونکہ یہ حق عوام کا ہے اور چونکہ حاکم ان کا نمائندہ ہے اس لئے اسے عوام کی مجموعی بھلائی کو سب سے زیادہ پیش نظر رکھنا چاہیئے لہٰذا مفت میں ان کے حق کو نظر انداز نہ کیا جائے

بیت المال

زیلعی نے مسلمانوں کے بیت المال کے سلسلے میں حاکم کے فرائض کو نہایت مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ وہ بیت المال کی چار قسمیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

امام کے لئے یہ ضروری ہے کہ بیت المال کی ہر قسم کے لئے الگ محکمہ قائم کرے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ خلط ملط نہ کرے کیونکہ ہر قسم کے مخصوص احکام ہیں اس کے بعد انھوں نے فرمایا "حاکم وقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور مستحق کو اس کی ضرورت کے مطابق اس کا حق دے اس میں نہ اضافہ ہو اور نہ کمی ہو، ورنہ اللہ اس سے حساب لے گا"

الاشباہ میں مذکور ہے :۔ جب حاکم کا فعل عام امور میں مصلحت پر مبنی ہو تو شرعی طور پر اس کا کوئی حکم نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مصلحت کے مطابق نہ ہو، اگر اس کے برخلاف ہو تو وہ حکم جاری نہیں ہو سکتا ؎

اسی قاعدہ کو امام قرافی نے الفروق میں اس طرح بیان فرمایا ہے — "ہر وہ شخص جو خلافت یا اس سے کم درجے کے منصب پر سرفراز ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس میں عوام کی بھلائی مدنظر نہ ہو یا ان کی خرابیوں کو دور نہ کیا گیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔ تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس

؎ شرح الاشباہ از حموی

؎ الاشباہ ص ۱۵۷ - ۱۵۸ جلد اوّل مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

طرح جو بہتر ہو" نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ فرمایا ہے :- جو کوئی میری امت کے کاموں کا نگران و حاکم ہو اور پھر اس نے ان کی بھلائی کی کوشش نہ کی ہو، اور نہ ان کی خیر خواہی کی ہو تو جنت اس پر حرام ہے "

چوبیسواں (۲۴) قاعدہ

"جب حقوق کا تصادم ہو جائے تو تنگدست کو خوش حال پر اور فوری چیز کو تاخیر والی چیز پر اور فرض عین کو فرض کفایہ پر مقدم رکھا جاتا ہے"، اس کی مثال یہ ہے کہ مؤذن کے قول کے دہرانے کو تلاوت قرآن پر مقدم کیا جاتا ہے کیونکہ تلاوت تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے مگر مؤذن کی اذان کا اعادہ اذان کے ختم ہونے پر نہیں ہو سکے گا۔ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو یا نہ پڑھ رہا ہو مگر نماز کا وقت جاتے رہنے کا اندیشہ ہو اور کسی وقت کوئی ڈوب رہا ہو یا جل رہا ہو تو سب سے پہلے ڈوبتے ہوئے یا جلتے ہوئے شخص کو بچایا جائے گا اور بعد میں نماز قضا پڑھ لی جائے۔ اس وقت فوری طور پر جس کی جان بچانی ضروری ہو اسے بچایا جائے گا[۱]

پچیسواں (۲۵) قاعدہ

"کوئی اجتہاد دوسرے اجتہاد کے ذریعے منسوخ نہیں ہوتا ہے"[۲] اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا اجتہاد پہلے اجتہاد سے قوی تر ہوتا ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک اجتہاد سے دوسرا اجتہاد ٹوٹنے لگے تو کوئی فیصلہ برقرار نہیں رہ سکتا اور اس سے بہت خرابی پیدا ہو سکتی ہے

الاشباہ میں اس کی مثال یہ بیان کی گئی ہے کہ قبلہ کی صحیح سمت کے بارے میں اگر نمازی کی اجتہادی رائے میں کوئی تبدیلی آگئی ہو تو وہ اپنے دوسرے اجتہاد کے مطابق عمل کر سکتا ہے مگر اس کا پہلا اجتہاد بھی صحیح ہوگا یہاں تک کہ اگر اس نے اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق چار رکعتیں چار مختلف سمتوں کی طرف رخ کر کے پڑھی ہوں تو اس کے لئے ان کی قضا ضروری نہیں ہے،

اگر حاکم نے کوئی حکم دیا، اس کے بعد اس کی اجتہادی رائے تبدیل ہو گئی ہو پہلا حکم برقرار رہے گا مگر آئندہ وہ اپنے دوسرے اجتہاد کے مطابق حکم دیا کرے گا

---

[۱] الفروق از قرافی [۲] حموی نے جلد اول صفحہ ۱۴۱ پر لکھا ہے دوسرے اجتہاد کے ذریعے پہلا اجتہاد اس وقت رد ہو سکتا ہے جبکہ اس میں عوام کی بھلائی ہو۔

اس قاعدہ کو علماء نے اس دلیل سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند مسائل کے بارے میں حکم دیا جس کی حضرت عمرؓ نے مخالفت کی مگر انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے حکم کو منسوخ نہیں کیا بلکہ صحیح روایت میں یہ آتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس سلطنت کا کام بہت زیادہ ہوگیا تو انھوں نے عدالت کا کام حضرت ابوالاردا؟ کے سپرد کر دیا اسی عرصے میں ایک دفعہ دو آدمیوں کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا تو حضرت ابوالاردا نے ایک کے خلاف فیصلہ صادر کیا، وہ شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور ان کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کے خلاف فیصلہ ہوا ہے اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ــــ "اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو میں تمھارے حق میں فیصلہ کرتا"۔ اس نے کہا ــــ "اب آپ کو فیصلہ کرنے سے کون سی بات مانع ہے؟" آپ نے فرمایا ــــ "چونکہ اس معاملے میں کوئی نص شرعی نہیں ہے لہٰذا رائے اور اجتہاد دونوں کے برابر ہیں"

حضرت عمرؓ کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی خلافت کے پہلے سال میراث کے ایک مسئلے میں جو حجریہ یا مشترکہ کے نام سے مشہور ہے یہ فیصلہ کیا کہ سگے بھائی کو کچھ نہ دیا جائے[1] جب دوسرا سال آیا تو انھوں نے پھر ایسا فیصلہ کرنا چاہا تو سگے بھائی نے احتجاج کرتے ہو کہا کہ اخیافی بھائی اپنی والدہ کی وجہ سے جو میری بھی ماں ہے وارث بنے ہیں، فرض کرو کہ ہمارا باپ گدھا تھا یا ایک پتھر تھا جسے سمندر میں پھینک دیا گیا ہو تو کیا ہم سب کی ماں ایک نہیں ہے؟ اس پر حضرت عمرؓ نے ان بھائیوں کے ساتھ اسے بھی شریک کر دیا۔ لوگوں نے کہا ــــ "آپ نے گذشتہ سال اس کے برخلاف

[1] میراث کی وہ صورت یہ تھی کہ ایک عورت مرگئی اس نے شوہر، والدہ، اخیافی بھائی اور ایک سگا بھائی یا چند سگے بھائی بہنیں، چھوڑے۔ اس مسئلہ میں آپ نے یہ فیصلہ دیا کہ شوہر کا نصف حصہ ہوگا والدہ کا چھٹا حصہ اور اخیافی بھائیوں کو تہائی حصہ ملے گا۔ اس طرح سگے بھائیوں کو کوئی حصہ نہیں ملا۔ کیونکہ ترکہ میں کوئی حصہ باقی نہیں تھا۔ مگر آج کل شرعی عدالتوں میں حقیقی بھائیوں کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے اور یہی فیصلہ قابل ترجیح ہے کہ ان کے تہائی حصہ میں وہ بھی شریک ہوں۔

فیصلہ کیا تھا" آپ نے فرمایا ـــ" وہ مسئلہ اس فیصلہ کے مطابق ہے جو ہم کر چکے ہیں اور یہ معاملہ اس فیصلہ کے مطابق ہے جو ہم اب کر رہے ہیں۔" اس سے یہ پتہ چلا کہ آپ نے ایک اجتہاد کے ذریعے دوسرے اجتہاد کو منسوخ اور باطل نہیں قرار دیا۔

چھبیسواں قاعدہ ۲۶

نص شرعی کی صورت میں اجتہاد نہیں ہو سکتا لہٰذا کتاب وسنت کے برخلاف فتویٰ یا حکم دینا حرام ہے۔ علامہ ابن القیمؒ نے لکھا ہے کہ تمام علماء کا اسی پر اجماع ہے اور اس قاعدہ سے بھی انھوں نے اس قاعدہ کو ثابت کیا ہے۔

"کسی مومن مرد اور عورت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کرے، تو انھیں اس بات کا اختیار باقی رہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ کھلم کھلا گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے"

دوسری آیت میں یہ مذکور ہے ـــ (۱) جو اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں" (۲) جو اللہ کی وحی کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ہیں وہ ظالم ہیں" (۳) جو اللہ کی وحی کے مطابق حکم نہیں دیتے وہ فاسق اور بدکار ہیں" یعنی آگے پیچھے ایک ہی مقام پر ایسے لوگوں کو تاکیداً کافر، ظالم اور فاسق کہا گیا ہے اور اس کا بار بار اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ خدائی احکام کے خلاف فیصلہ کرنا کس قدر فساد انگیز، مضرت رساں اور عام تباہی کا موجب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص حضرت عمر بن الخطاب کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا کہ ایک عورت نے خانۂ کعبہ کی قربانی کے دن (ایام حج میں) زیارت کی اور اس کے بعد اسے ماہواری ایام آنے شروع ہوئے تو کیا وہ کوچ کر سکتی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ـــ "نہیں" اس ثقفی نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی ایک عورت کے بارے میں آپ کے فتویٰ کے برخلاف فتویٰ دیا تھا۔" اس پر حضرت عمرؓ درّہ لے کر اسے مارنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ـــ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں حکم دے دیا تھا تو مجھ سے کیوں مسئلہ دریافت کرتے ہو"

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول ہے ـــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مقابلے میں کسی کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہے"

امام شافعی فرماتے ہیں: "لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جب کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پتہ چل جائے تو وہ کسی کے قول کی وجہ سے اسے نہ چھوڑے" آپ کا یہ قول بھی بہت مشہور ہے: "جب کوئی صحیح حدیث موجود ہو تو میرے قول کو دیوار پر مار دو"[1]

ستائیسواں قاعدہ (۲۷)
اجتہادی مسائل میں حاکم کا حکم اختلاف کو دور کرتا ہے[2]

اٹھائیسواں قاعدہ (۲۸)
تابع احکام میں وہ باتیں معاف کردی جاتی ہیں جو اصل احکام میں ناقابل معافی ہیں، یعنی ضمنی باتیں معاف ہیں اور قصداً باتیں معاف نہیں ہوتیں[3]

انتیسواں قاعدہ (۲۹)
تابع مسائل کا کوئی جداگانہ حکم نہیں ہوتا ہے بلکہ تابع اصل فروع کے ساقط ہونے سے ساقط ہو جاتا ہے۔ جب اصل ساقط ہو جائے تو فرع بھی ساقط ہو جاتی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جب اصل قرضہ دار بری الذمہ ہو جائے تو اس کا ضامن بھی بری ہو جاتا ہے،

مگر یہ قواعد کلیہ نہیں ہیں بلکہ اکثر حالات پر منطبق ہوتے ہیں چنانچہ بعض فروعی مسائل ایسے ہیں جن میں دوسری باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ان پر یہ قواعد منطبق نہیں ہو سکتے[4]

تیسواں قاعدہ (۳۰)
صاحب شریعت کے کلام میں اگر دو پہلوؤں کا احتمال مساوی طریقے سے ہو تو وہ مجمل سمجھا جاتا ہے اور ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر ترجیح نہیں دی جا سکتی[5]

اکتیسواں قاعدہ (۳۱)
شک وشبہ کا احتمال لفظ کے مفہوم کو ادا کرنے میں حائل نہیں ہوتا ہے ورنہ عام الفاظ کے مفہوم میں خلل واقع ہوگا اور تخصیص کا احتمال رہے گا[6]

---

[1] حصہ دوم اعلام الموقعین ص ۲۰۸ - ۲۱۰ مطبوعہ منیریہ

[2] الفروق از قرافی [3][4] الاشباہ والنظائر [5][6] الفروق از قرافی

(۳۲) بتیسواں قاعدہ

"جہاں تک ممکن ہو کلام کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اگر ممکن نہ ہو تو اسے مہمل قرار دے دیا جائے اس قاعدہ کے مطابق علمائے اصول نے یہ کہا ہے ـــ "جب کلام کو حقیقی مفہوم پر مراد لینا ناممکن ہو تو اس کے مجازی معنے مراد لئے جائیں اور اگر حقیقی اور مجازی میں سے کوئی معنی نہ نکل سکیں تو کلام کو مہمل سمجھا جائے" مثلاً اگر کوئی قسم کھائے کہ "وہ اس آٹے کو نہیں کھائے گا" تو اگر اس نے اس آٹے سے بنی ہوئی روٹی کھالی تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی [۱]

اسی قاعدہ کے مطابق یہ قول ہے ـــ "تاسیس تاکید سے بہتر ہے" اس سے علمار کی مراد یہ ہے کہ جب کوئی بات کی جائے تو اس میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ کسی دوسری بات کی تاکید کے لئے بولی گئی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے نیا مفہوم مراد ہو اور دوسری بات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو لہذا اگر کسی لفظ میں یہ دونوں رخ پائے جائیں اور کوئی وجہ ترجیح نظر نہ آئے تو اس کلام سے نیا مفہوم مراد لینا بہتر ہے،

(۳۳) تینتیسواں قاعدہ

حرمت سے جواز کی طرف منتقل ہونے کے لئے اعلیٰ اسباب و مراتب کی شرط ہے مگر جواز سے حرمت کی طرف منتقل ہونے کے لئے معمولی سبب بھی کافی ہے"

شریعت میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو ان دونوں قاعدوں کی تائید کرتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ مسلمان کے خون کی حرمت مسلّم ہے اور اس کی یہ حرمت اس وقت جاتی رہتی ہے جب کہ وہ کسی کو ناحق قصداً قتل کرے یا شادی شدہ (محصن) ہونے کے بعد زنا کرے یا مرتد ہو جائے۔ یہ بہت بڑے اسباب ہیں (جن کے ذریعے) خون کی حرمت جواز کی طرف منتقل، لہذا جب قصاص کے ذریعے کسی کا خون مباح ہو جائے تو معاف کر دینے سے (جو ایک معمولی سبب ہے) اس کی حرمت قائم ہو جاتی ہے اسی طرح اگر مرتد ہونے سے کسی کا خون مباح ہو جائے تو توبہ کرنے سے

---

[۱] جلد اول الاشباہ والنظائر

اس کی حرمت لوٹ آتی ہے، البتہ اگر کوئی زنا سے توبہ کرے تو اس صورت میں اس کی جان بخشی میں علمار کا اختلاف ہے۔ جمہور علمار کی یہ رائے ہے کہ اسے سنگسار کیا جائے گا خواہ وہ توبہ کرے۔ لیکن اگر جنگ جو ڈاکو گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کرے تو (قرآنی حکم کے مطابق) اس پر حد شرعی جاری نہیں ہوگی [1]

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک اجنبی عورت کسی دوسرے شخص کے لئے اس وقت تک حرام رہتی ہے جب تک کہ گواہوں کی موجودگی میں اس کی اجازت سے نکاح نہ ہوجائے اور مہر نہ مقرر ہوجائے مگر جب نکاح کے بعد وہ دوسرے شخص کے لئے مباح ہوجاتی ہے تو معمولی طلاق کے الفاظ سے پھر حرام ہوجاتی ہے، تاہم بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو ان دو قاعدوں کے ماتحت نہیں آتے ہیں مگر وہ بہت تھوڑے ہیں۔

چونتیسواں قاعدہ

میراث کے اسباب تین ہیں (۱) زوجیت (۲) قرابت (۳) آزاد کرنے کا حق (ولاء) اس کا ضابطہ یہ ہے کہ سبب یا تو اس قسم کا ہو جسے ختم کیا جا سکتا ہو جیسے زوجیت ہے، یا اس سبب کو ختم نہ کیا جا سکتا ہو، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ سبب اس قسم کا ہو کہ اس کی بدولت جانبین سے میراث قائم ہو سکتی ہے یا صرف ایک جانب سے ہو اگر جانبین سے میراث کا سلسلہ قائم ہوتا ہو تو وہ قرابت اور رشتہ داری ہے اگر صرف ایک جانب سے میراث کا سلسلہ قائم ہوتا ہو تو وہ ولار ہے [2]

پینتیسواں قاعدہ ۳۵

کچھ حقوق ایسے ہیں جو وارث کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور کچھ حقوق منتقل نہیں ہوتے ہیں۔ علامہ قرافی فرماتے ہیں

"قاعدہ یہ ہے کہ وارث کو وہ حقوق حاصل ہوتے ہیں جن کا تعلق مال سے ہو یا جن سے وارث کی تکلیف اور الم میں تخفیف ہو سکے مگر جن چیزوں کا تعلق مورث کی ذات، عقل، خیالات وصفات سے ہو ان میں سے کوئی چیز وارث کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ورثار مال اور اس سے متعلق چیزوں کے وارث بنتے ہیں

---

[1] الفروق از قرافی، د القیاس فی الشرع الاسلامی از ابن القیم د ابن تیمیہ۔

[2] کیونکہ صرف اعلیٰ (آقا) وارث ہوتا ہے نچلے درجہ کا وارث نہیں ہوتا ہے۔

مگر اس کی عقل اور ذاتی اوصاف کے وارث نہیں بن سکتے، بلکہ وہ مورث کے فرائض منصبی کے وارث بھی نہیں بن سکتے، جیسے امامت خطابت اور وکالت ہے اسی طرح وہ اس کے خیالات اور مذہبی اور روحانی افعال کے وارث بھی نہیں ہیں۔

اس قاعدہ کو تقریباً تمام علماء صحیح تسلیم کرتے ہیں مگر بعض فروعی مسائل کو اس قاعدے پر منطبق کرنے میں باہمی اختلاف ہے مثلاً امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کی یہ رائے ہے کہ اگر کسی بیع کے سلسلے میں مورث نے چند شرائط کا اختیار مدت سے پہلے حاصل کیا ہو تو اب وارث کو وہ اختیار حاصل نہیں ہے، مگر امام شافعیؒ اور امام مالکؒ یہ فرماتے ہیں کہ وہ اختیار وارث کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے بھی ہے کہ حق شفعہ ورثاء کی طرف نہیں ہو سکتا، مگر امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور بعض دیگر علماء اس کے منتقل ہونے کے قائل ہیں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اختیار کے انتقال کے قائل ہیں ان کے نزدیک خیار شرط معاہدہ بیع کی صفت ہے اس لئے معاہدہ کے ساتھ یہ حق بھی منتقل ہو سکتا ہے مگر امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ دونوں معاملات میں اختیار کا حق معاہدہ کرنے والے کو حاصل تھا۔ کیونکہ اس میں اس کی مرضی اور ارادہ کا دخل تھا۔ مگر اس کی موت کی وجہ سے دیگر صفات کے ساتھ ساتھ اس کا ارادہ اور پسند کی صفات بھی ختم ہو گئیں [1]

چھتیسواں قاعدہ ۳۶

(الف) وکالت ان چیزوں میں جائز ہے جہاں اصل مؤکل کے بغیر کام کا اصل مقصد پورا ہو سکتا ہے جیساکہ نکاح ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک اجنبی عورت مرد کے لئے مباح ہو سکے یہ کام وکیل کے ذریعے بھی پورا ہو سکتا ہے لہٰذا ایسی صورت میں وکیل بنانے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور وکالت جائز ہے اس طرح تمام شرعی معاہدوں، مقدمہ کرنے اور قرض وصول کرنے کے لئے وکیل بنانا جائز ہے۔

(ب) ہر وہ فعل جس کا مقصد اصل شخص یعنی مؤکل کے بغیر پورا نہ ہو سکے اس میں وکالت جائز نہیں ہے کیونکہ وکیل بنانے سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، جیسے نماز ہے کیونکہ نماز کا مقصد یہ ہے کہ بندگی اور کمال خشوع وخضوع کا اظہار کیا

[1] الفروق از قرافی

جائے لیکن وکیل کے خشوع وخضوع کرنے سے مؤکل میں وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی، لہٰذا اس صورت میں اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قسمیں کھانے کا معاملہ ہے کیونکہ قسمیں کھانے کا اصل منشاء یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے دعوے کی صداقت کا اظہار کرے مگر دوسرے شخص کے قسمیں کھانے سے پہلے شخص کی صداقت کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ اسی طرح اشد ضرورت کے بغیر شہادت کے لئے بھی کسی دوسرے شخص کو وکیل نہیں بنایا جا سکتا البتہ بعض خاص حالات اور ضرورت کے موقع پر بعض علماء اس کے لئے بھی وکیل بنانے کے قائل ہیں اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گواہ کی صداقت کا اعتبار نہیں ہو سکتا۔ گناہ اور معاصی کی بھی وکالت نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ شریعت ہمیں گناہوں سے روکتی ہے اور ان میں وکیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ شرعی طور پر انھیں ثابت کیا جائے جو اس کے بنیادی مقصد کے خلاف ہے[1]

سینتیسواں قاعدہ ۳۷ "جس چیز کا لینا حرام ہو اس کا دینا بھی حرام ہے"۔ جیسے سود، رنڈی کی اُجرت، نجومی اور ماتم کرنے والی عورت کی اُجرت اور رشوت، الاشباہ میں مذکور ہے — اس قاعدہ سے چند مسائل مستثنیٰ ہیں ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب کسی کو اپنے جان و مال کا اندیشہ ہو تو وہ رشوت دے سکتا ہے۔ مگر رشوت لینا ہر صورت میں حرام ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ جب کوئی غاصب آدمی نابالغ بچے کے مال پر مسلط ہو جائے اور اس سے مال حاصل کرنا دشوار ہو جائے تو سرپرست کے لئے جائز ہے کہ وہ نابالغ بچے کے مال کو لینے کے لئے اسے کچھ دے دے۔

اڑتیسواں قاعدہ ۳۸ "وہ خیال جس کی غلطی ظاہر ہو گئی ہو، قابل اعتبار نہیں ہوتا ہے" یہ کلیہ قاعدہ نہیں ہے بلکہ اکثر مسائل پر اس کے احکام منطبق ہوتے ہیں، چند فروعی مسائل یہ ہیں:۔

ایک آدمی کو وضو کی ضرورت ہے اسے پانی ملا، تاہم اسے نجس خیال کرتے ہوئے اس نے اس سے وضو کر لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پانی پاک تھا تو اس کا یہ وضو جائز ہے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے جس پر زکوٰۃ واجب تھی ایک آدمی کو زکوٰۃ کا مستحق نہ

---

[1] الفردق ازقرآنی

سمجھتے ہوئے زکوٰۃ دیدی، پھر معلوم ہوا کہ وہ زکوٰۃ کا مستحق تھا تو وہ زکوٰۃ ادا ہو گئی اور وہ اس سے بری الذمہ ہو گیا۔ اس قاعدہ کے خلاف چند مثالیں یہ ہیں:۔

اگر کسی نے ایک شخص کو زکوٰۃ کا مستحق سمجھ کر زکوٰۃ دے دی، پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ شخص دولت مند تھا یا وہ اس کا فرزند تھا، جس نے وہ زکوٰۃ حاصل کرلی ہے تو اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک زکوٰۃ ادا ہو گئی اور وہ شخص اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا اس کی دلیل معن بن یزید کی روایت ہے — وہ فرماتے ہیں —: میرے باپ یزید نے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ نکالی اور اسے مسجد میں ایک آدمی کے پاس رکھوادی۔ اس کے بعد میں آیا اور میں نے اس سے زکوٰۃ لے لی (جب میرے باپ کو معلوم ہوا تو) انھوں نے کہا —: خدا کی قسم! میرا تمھیں دینے کا ارادہ نہ تھا" میں یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا تو آپ نے فرمایا —: اے یزید! جو تم نے چاہا تھا وہ پورا ہو گیا اور اے معن! جو تم نے لیا وہ تمہارا ہے [1]

امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے ہے کہ اس طرح ادا کرنے سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی غلطی یقینی طور پر ظاہر ہو چکی ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی نے ایسے پانی سے وضو کیا یا ایسے کپڑے پہن کر نماز پڑھی جن کا بعد میں یہ پتہ چلا کہ وہ نجس ہیں یا جیسے قاضی اپنی رائے اور اجتہاد سے فیصلہ کرے پھر اس کے مخالف نص شرعی کا پتہ چلے،

انتالیسواں قاعدہ ۳۹

جب اصل مرتکب (مباشر[2]) اور اس کا مددگار (متسبب) دونوں جمع ہوں تو حکم کو اصل مرتکب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

یہ قاعدہ حنفی علماء کی کتابوں میں بہت زیادہ مذکور ہے اور اس کے ماتحت انھوں نے بہت سے فروعی مسائل کا استنباط کیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کسی نے کنواں کھودا ہو، اور دوسرے آدمی نے اس میں کوئی چیز پھینک دی ہو اور وہ ضائع ہو گئی ہو تو کنواں کھودنے والے پر اس کی ذمہ داری اسی طرح اگر کسی نے چور کو ایک شخص کے مال کا پتہ

---

[1] شرح الاشباہ از حموی، جلد اول ص ۹۳ مطبع عامرہ ۱۲۹۰ھ

[2] مباشر وہ ہے کہ کوئی چیز کسی فعل مختار کے واسطے کے بغیر خود اس کے فعل سے تلف ہو جائے اور متسبب وہ ہے کہ کوئی چیز اس کے فعل سے تلف ہو، مگر درمیان میں فعل مختار کا واسطہ ہو،

بنایا ہو، اور اس نے وہ مال چرالیا ہو تو پتہ بتانے والے پر ذمہ داری نہیں ہے انھوں نے اس قاعدہ ہر جگہ حد سے زیادہ استعمال کیا ہے یہاں تک کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی آدمی کو اس کے اپنے گھر میں داخل ہونے سے روک دے یہاں تک کہ اس کے گھر کی تمام چیزیں ضائع ہو جائیں تو اس کے ضائع ہونے کی ذمہ داری روکنے والے شخص پر نہیں ہے [1] اسی طرح جو قاتل کا مددگار بنے تو اسے بھی میراث سے محروم نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ مورث کے قتل کا سبب بنا تھا۔

ہمارے خیال میں اس قاعدہ کو غیر مشروط طور پر ہر معاملہ میں منطبق کرنا ظلم کی حمایت ہے اور اس کے ارتکاب میں سہولت فراہم کرنا ہے بلکہ ہمارے خیال میں اصل مرتکب جرم پر پوری ذمہ داری اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھی کا مقصد اور ارادہ کسی کو نقصان پہونچانا نہ ہو، ورنہ اس فعل کا ذمہ دار وہ بھی اسی طرح ہے جس طرح اصل مرتکب ذمہ دار ہے، تاکہ ہر ایک کو سزا کا اس قدر حصہ ملے جس قدر اس نے کسی کو نقصان پہونچایا ہو یا حق تلفی کی ہو، یہی وجہ ہے کہ حنفی علماء بھی اس قاعدہ کو بعض واقعات پر منطبق کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ انھیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ قرار دیں اور ان کے لئے دوسرے احکام مقرر کریں چنانچہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر چور کو پتہ چل جائے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہو، وہ اس امانت کا ذمہ دار ہے وہ اس کو اس بات کا ذمہ دار اس لئے ٹھہراتے ہیں کہ اس نے اس کی حفاظت ترک کر دی تھی۔ اسی طرح ان کے متأخرین علماء کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر کسی نے ناحق کسی کی شکایت ظالم بادشاہ کے پاس کر دی ہو، اور اس نے اس سے تاوان وصول کر لیا ہو تو چغل خور اس تاوان کا ذمہ دار ہے جو اس ظالم بادشاہ نے اس سے وصول کیا ہو [2]

چالیسواں قاعدہ

ضامن ہونے کے قواعد یہ ہیں۔ قرآنی لکھتے ہیں کسی چیز کی ذمہ داری ان تین اسباب میں سے کسی ایک سبب پر موقوف ہے۔

(۱) براہ راست کسی چیز کو ضائع کر دیا جائے۔ جیسا کہ کھانے کو کھا لیا جائے

---

[1] شرح الاشباہ از حموی جلد اول ص ۱۹۶ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

[2] شرح الاشباہ از حموی ص ۱۹۷ جلد اول مطبع عامرہ ۱۲۹۰ھ

یا جانور کو قتل کیا جائے یا کپڑے کو جلا دیا جائے۔

(۲) زبردستی قبضہ کیا جائے جیسا کہ کوئی چیز غصب کر لی جائے اس میں امانت کا قبضہ شامل نہیں ہے

(۳) تباہ کرنے کا سبب اور ذریعہ بننا، جیسے کھیت کے قریب آگ جلا دی جائے۔ یا کھانے میں زہر ملا دیا جائے اور کنواں کھودا جائے یا نامناسب مقام پر تکلیف پہونچانے والی چیزیں رکھ دی جائیں، اس صورت میں ذمہ داری اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے سبب سے کوئی چیز ہلاک یا تلف ہو جائے مثلاً کسی نے کنواں کھودا اور اس میں کوئی جانور وغیرہ گر جائے (تو کنواں کھودنے والا اس کا ذمہ دار ہے) لیکن اگر ان جانوروں کو کسی اور نے گرایا ہو تو اصل مجرم پر ذمہ داری ہے، کنواں کھودنے والے پر نہیں ہے کیونکہ اصل فاعل کو اس کے مددگار پر مقدم رکھا جاتا ہے۔

اس قاعدے کے ماتحت یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی مالک کی اجازت کے بغیر پنجرہ کھول دے اور اس میں سے پرندے اڑ جائیں تو کھولنے والا اس کا ذمہ دار ہے کیونکہ مالک پرندوں کو واپس نہیں لا سکتا۔ اسی طرح وہ شخص بھی ذمہ دار ہے جو کسی ایسے جانور کو جو کسی مقام پر بندھا ہوا ہو، کھول دے اور وہ بھاگ جائے، ایسے لوگ اپنے ساتھی کے مال کو ضائع کرنے کے ذمہ دار ہیں، امام مالکؒ انھیں ہر حالت میں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں خواہ وہ کھولنے سے پہلے بھاگ جائیں یا کھولنے کے بعد بھاگیں۔

مگر امام شافعیؒ اس میں فرق کرتے ہیں وہ کہتے ہیں —"کہ اگر کھولنے کے بعد بھاگیں تو ان کی ذمہ داری ہے ورنہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ کھولنے سے پہلے ممکن ہے جانور اپنے ارادے سے بھاگا ہو"

اس معاملہ میں امام مالکؒ کی رائے زیادہ مضبوط ہے، کیونکہ بالعموم ایسی باتوں سے اشیاء تلف ہو جاتی ہیں لہٰذا اس کے نقصانات کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے اور یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ پرندہ اپنی مرضی سے اڑا ہو بلکہ یہ ممکن ہے کہ شکاری جانوروں اور شکاری پرندوں کے خوف سے وہ پنجرہ میں رہنا پسند کرتا ہو، یا کھانے کا انتظار کرتا ہو، مگر کھولنے والے کے خوف سے پہلے ہی اڑ گیا ہو، جب اس بات کا احتمال ہو تو اس آدمی پر جو اس کے پاس آیا ہو، ہر حالت میں ذمہ داری ہے، علاوہ ازیں پنجرہ کھولنا

محض سبب نہیں ہے بلکہ اصل ارتکاب فعل ہے ، کیونکہ پرندوں کی گھٹی میں آدمیوں سے نفرت پائی جاتی ہے ، نیز پرندہ کا ارادہ آدمی کے ارادہ کی طرح مستحکم نہیں ہوتا ہے بلکہ کمزور ہوتا ہے لہٰذا آدمی کے فعل کی موجودگی میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

" بے زبان (جانوروں) کا زخم معاف ہے "

اکتالیسواں قاعدہ

شرعی حدود شک و شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں " یہ قاعدہ بہت مشہور ہے اور اس کے فروعی مسائل فقہ کی کتابوں میں اور بالخصوص حنفی کتب فقہ میں بکثرت ہیں یہاں تک کہ ہدایہ کے شارح صاحب فتح القدیر نے یہ کہا ہے ۔ یہ حکم یعنی شک و شبہ سے حد شرعی کا رفع ہونا ، اجماعی مسئلہ ہے اور شبہ وہ ہے جو قطعی الثبوت نہ ہو ، تاہم ثبوت کے مشابہ ہو "

شبہات کی اقسام

حنفی علماء نے حد زنا میں شبہات کی تین قسمیں بیان کی ہیں :-

(۱) شبہۃ الاشتباہ یعنی فعل میں شک و شبہ ہو ، یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ کسی شخص کو حلال و حرام میں شبہ ہو ، اور وہ غیر دلیل کو دلیل سمجھنے لگے ۔ مثلاً وہ یہ سمجھے کہ جس عورت کو تین طلاقیں دی جائیں اس کے پاس وہ عدت میں جا سکتا ہے اسی طرح اس کی بیوی یا اس کے باپ دادا کی لونڈی اس کے لئے حلال ہے " تو اس پر حد شرعی جاری نہ ہو گی لیکن اگر وہ یہ کہے ـــ " مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ پر حرام ہے " تو اس پر حد شرعی واجب ہے "

(۲) موقع و محل میں شک و شبہ ہو ، اس قسم کا شبہ چھ مقامات پر ہوتا ہے ان میں ایک صورت یہ ہے کہ اسے اس عورت کے بارے میں جسے کنایات میں طلاق بائن دی گئی ہو ۔ شبہ ہو جائے یا اپنے بیٹے پوتے یا فروعی رشتہ داروں کی لونڈی کے بارے میں شبہ ہو جائے ۔ ایسی صورتوں میں حد شرعی واجب نہیں ہے خواہ وہ یہ کہہ دے کہ ـــ " مجھے معلوم تھا کہ یہ مجھ پر حرام ہے " ، کیونکہ اصل حکم میں شک و شبہ کرنا حد شرعی سے مانع ہے ،

(۳) عقد میں شک و شبہ ہو ، لہٰذا اگر کوئی محرم عورت سے عقد کر کے اس سے مباشرت کرلے تو امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک خواہ اسے حرمت کا علم ہو اس پر حد شرعی واجب

نہیں ہے مگر صاحبین (امام محمدؒ و امام ابو یوسفؒ) کا یہ قول ہے اگر اس نے یہ کہا: "مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ حرام ہے" تو اس پر حد شرعی واجب ہے اور انہی کے قول پر فتویٰ ہے شبہ عقد کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اس عورت سے مباشرت کی جائے جس کے نکاح کے صحیح ہونے میں اختلاف ہو۔

شرعی حدود میں حلف نہیں اٹھوائی جاتی ہے کیونکہ حلف اٹھوانا انکار کے شبہ کو دور کرنے کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا اگر شبہ کا احتمال ہو جائے، تو حد ساقط ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اگر تہمت لگانے والا تہمت لگانے سے انکار کر دے اور اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو تو قسم کھلوائے بغیر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی زنا کا اقرار کر کے اس سے منکر ہو جائے تو اس کے انکار کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر گواہ زانی کو سنگسار کی ابتدا کرنے سے پہلے رک جائیں تو اس سے بھی معاملہ مشتبہ ہو جائے گا اور شبہ کی وجہ سے حد شرعی ساقط ہو جائے گی۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان اپنے بزرگوں یا اپنی اولاد کے مال کو چرا لے یا میاں بیوی میں سے کوئی دوسرے کے مال کو چرائے تو ان میں سے کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا شبہ کا فائدہ ملزم کو دینے میں انھوں نے یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں، اگر کسی نے اس گھر سے چوری کی ہو جہاں اس کو داخل ہونے کی اجازت ہو یا چور اشیاء مسروقہ کی ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے۔ خواہ اس کی ملکیت ثابت نہ ہو اور چوری، ثبوت یا اقرار سے ثابت ہو چکی ہو تو ایسی صورت میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ کیوں کہ شک و شبہ نے شرعی حد کو ساقط کر دیا ہے، اور محض ملکیت کا دعویٰ کرنے سے شبہ واقع ہو گیا ہے یہ مسئلہ اسی طرح صحیح ہے جس طرح اقرار کرنے کے بعد کوئی انکار کرے تو اس کے انکار کو درست سمجھا جاتا ہے

حنفی علماء نے اس قسم کے جو فروعی مسائل پیش کئے ہیں، وہ نقد اور اعتراض سے خالی نہیں ہیں تاہم مجموعی طور پر ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان مسلمان فقہاء نے شرعی حدود کو نافذ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے بلکہ انھیں جاری نہ کرنے کے لئے حد سے زیادہ عذر نکالے ہیں اور ایسے احکام جاری کئے ہیں جو عقل کے معیار پر پورے نہیں اترتے ہیں اسی وجہ سے شافعی علماء ایسی صورت میں معمولی شبہ کو کافی نہیں سمجھتے ہیں

بلکہ ان کی شرط یہ ہے کہ شبہ قوی ہونا چاہیئے

اس قاعدہ کو ثابت کرنے کے لئے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ـــ تم شرعی حدود کو دور کرو جب تک کہ تم ان کے دور کرنے کا موقع پاؤ " حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ـــ شرعی حدود کو مسلمانوں سے دور رکھو جب تک کہ تم سے ہو سکے اگر کسی کے نکلنے کا کوئی راستہ ہو، تو اس کی راہ چھوڑ دو کیونکہ اگر حاکم معاف کرنے میں غلطی کرے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں لغزش کھائے " یہ حدیث موقوف بھی روایت کی گئی ہے۔ بلکہ موقوف روایت زیادہ صحیح ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ـــ " اگر میں شبہات کی وجہ سے شرعی حدود کو ساقط کرنے میں غلطی کروں تو مجھے یہ اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں شبہات کی وجہ سے شرعی حدود کو قائم کردوں [۲]

تعزیر کا معاملہ شرعی حدود کے برعکس ہے وہ شک وشبہ کے باوجود قائم ہے، تعزیر کے بارے میں علماء کا یہ قول ہے ـــ جس چیز سے مال کا ثبوت ملتا ہو اس سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے، اور اس میں حلف اٹھائی جا سکتی ہے اور اس سے انکار کرنے پر اس کے برخلاف فیصلہ صادر ہو سکتا ہے [۳]

بیالیسواں قاعدہ ۴۲

اصل قاعدہ یہ ہے کہ عام اور اکثر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو معتبر سمجھا جاتا ہے،، بلکہ وہ شاذ ونادر حالات پر مقدم ہوتے ہیں، اکثر احکام اور فروعی مسائل میں شریعت کا یہی طریقہ ہے چنانچہ سفر میں چار رکعت والی نمازوں کا قصر اور روزہ نہ رکھنے کی سہولت، عام حالات کو دیکھتے ہوئے دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عام مسافروں کو تکلیف اور مشقت نہ ہو، اسی طرح حریفوں اور دشمنوں کی شہادت کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کی اکثریت سے ناانصافی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایسے واقعات شریعت میں بکثرت ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ، اسلامی شریعت، انسانوں پر رحم اور شفقت کا لحاظ کرتے ہوئے عام حالات، کو نظر انداز کر دیتی ہے اور شاذ ونادر واقعہ کا اعتبار کر لیتی ہے جیسا کہ ایک عورت کی شادی ہو اور نکاح کے چھ۶ مہینے کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو گیا ہو تو

---

[۱] جلد اول الاشباہ والنظائر [۲] نیل الاوطار [۳] الاشباہ والنظائر

عام حالات کے اندازے کے مطابق یہ بچہ نکاح سے پہلے کے تعلقات سے پیدا ہوا ہے شاذ و نادر حالت میں اسے نکاح کے بعد کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ عام طور پر بچوں کی پیدائش نو مہینے کے بعد ہوتی ہے مگر اس صورت میں شریعت نے غالب حالات کو نظر انداز کر کے شاذ و نادر حالت کے مطابق حکم دیا ہے اور اس کا نسب بھی موجودہ نکاح کے مطابق درست رکھا ہے تاکہ لوگوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان کا عیب پوشیدہ رہے۔[1]

تینتالیسواں قاعدہ ۴۳

کسی بات کی شہادت اسی وقت جائز ہو سکتی ہے جبکہ وہ کسی ایسے طریقے سے معلوم ہو جس سے علم کامل حاصل ہو سکے "

علم حاصل کرنے کے ذرائع چار ہیں (۱) عقل (۲) حواس پنج گانہ میں سے کوئی ایک حس (۳) نقل متواتر (۴) استدلال۔ نظر و استدلال کی شہادت حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ شہادت ہے جبکہ ایک شخص نے قے کی اور اس میں سے شراب نکلی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ۔۔۔ "کیا تم شہادت دے سکتے ہو کہ اس نے شراب پی ہے؟" انھوں نے کہا ۔۔۔ "میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اس نے شراب کی قے کی ہے" حضرت عمرؓ نے فرمایا ۔۔۔ "اس گہرائی کا کیا مطلب ہے؟ ایسی بات نہیں ہے، تمھارے پروردگار کی قسم! اس نے شراب پی کر یہ قے کی ہے"

شہادت کی اصل بنیاد علم و یقین پر ہے، کبھی ضرورت کے موقع پر ظن غالب اور سماع کی شہادت بھی جائز ہو جاتی ہے، مالکی علماء نے سماع کی شہادت کو بہت وسعت دی ہے یہاں تک کہ انھوں نے اسے پچیس ۲۵ مقامات پر قبول کیا ہے جس کا ذکر قرافی نے بھی کیا ہے جن میں قدیم ملکیت، نسب، موت، حاکم مقرر کرنا اور اسے معزول کرنا، حمل، ولادت، رضاع، نکاح، طلاق اور وصیت کے مسائل شامل بعض چیزیں ایسی ہیں جو اس سے ثابت نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان کے لئے حالات پر غور کر کے باطنی فہم و ذکاوت سے معلوم ہوتی ہیں لہٰذا شہادت کے لئے وہ ظن غالب بھی کافی ہے جو درجہ یقین کے قریب ہو۔[2]

---

[1] الفروق از قرافی [2] الفروق از قرافی

چوالیسواں قاعدہ ۴۴

کسی فرعی مسئلہ میں اصل حکم کے متضاد حکم کو اس وجہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اس کی علت کے مخالف چیز ثابت ہے" اس کا تعلق قیاس عکس جلی سے ہے اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — "تمہاری جائز شہوت رانی میں بھی تمہارے لئے صدقہ ہے" لوگوں نے کہا — "یارسول اللہ! اگر ہم میں سے کوئی اپنی شہوت رفع کرے تو کیا اس میں بھی اس کو اجر و ثواب ملتا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا — "اگر وہ اسے حرام مقام میں استعمال کرے تو کیا اس پر گناہ نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا — "ہاں" آپؐ نے فرمایا — "اسی طرح اگر کوئی حلال جگہ کو استعمال کرے تو اسے اجر و ثواب ملتا ہے [1]"

پینتالیسواں قاعدہ ۴۵

تمام علماء کا اتفاق ہے کہ کسی حکم کو ثابت کرنے والے کے لئے دلیل لانے کی ضرورت ہے مگر جو شخص کسی حکم کی نفی کرے تو اس صورت میں بعض علماء اور متکلمین نے کہا ہے کہ نفی پر حکم کے لئے بھی دلیل لانے کی ضرورت ہے ماوردی نے کہا کہ یہ امام شافعیؒ اور جمہور فقہاء اور متکلمین کا مسلک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (منکرین قرآن سے) کہا ہے "کہہ دیجئے تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو"

اس رائے کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ کسی حکم کی نفی کرنے والا مدعی نہیں ہوتا ہے وہ ثبوت سے بری الذمہ ہوتا ہے اور دلیل کا منتظر رہتا ہے تاکہ وہ دلیل اسے عمل کرنے پر مجبور کرے۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ نفی عقلی کے لئے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے اور نفی شرعی کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر کسی نے صرف اپنے ذاتی علم کی نفی کی ہو تو اس کے لئے ثبوت لانا ضروری نہیں ہے، جیسے یہ کہا ہو "مجھے اس حکم کے ثبوت کا علم نہیں ہے" اور اگر اس نے مطلق نفی کی ہو تو اسے دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ حکم کی نفی بھی ایک قسم کا حکم ہے" جیسا کہ اثبات حکم ہے اسی طرح نفی بھی حکم ہے۔

اس قاعدہ کے سلسلے میں ایک چوتھا قول بھی ہے جسے امام شوکانی نے اپنی کتاب

[1] حصہ اول اعلام الموقعین ص ۱۷۳ مطبع منیریہ

ارشادالفحول میں قابل ترجیح سمجھا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسے دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمام اشیاء کی اصل، نفی اور عدم ہے لہٰذا جو کسی حکم کی نفی کرتا ہے تو وہ استصحاب کو کافی سمجھتا ہے اور اصل حالت کی پابندی کرتے ہوئے وہ بری الذمہ ہے اس لئے اس کو دلیل کی ضرورت نہیں ہے، فرقہ ظاہریہ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ سوائے ابن حزم کے جنہوں نے پہلے مسلک کو ترجیح دی ہے [1]

چھیالیسواں قاعدہ ۴۶

حنفی علماء اور ان کے حامیوں کا یہ قول ہے — "شرعی حدود کو قیاس کے طریقہ سے ثابت کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کے ثابت کرنے کا طریقہ توقیفی اور نص شرعی ہے [2]

سینتالیسواں قاعدہ ۴۷

"نصوص شرعیہ میں دراصل کوئی نہ کوئی علت اور سبب ضرور ہوتا ہے" اس قاعدہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ مفہوم جو عقل میں آسکے وہ منقولی (تعبدی) مفہوم سے افضل ہے، تاہم اس میں بعض علماء کا اختلاف ہے چنانچہ کتب فقہ میں فرائض وضو کا ذکر کرتے ہوئے یہ مذکور ہے —

"عبادت کے کاموں میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ان کے احکام اللہ کی کسی ایسی مصلحت اور حکمت پر مبنی ہیں، جو ہم سے پوشیدہ ہو یا حکمت سے خالی ہیں؟ اکثر علماء حکمت کے قائل ہیں، کیونکہ غور و فکر اور تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرعی نظام کو انسانوں کی فلاح و بہبودی کے لئے مقرر کیا ہے اور اس کے ذریعے ان کی خرابیاں بھی دور کی جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر احکام کی کوئی حکمت ہمیں معلوم ہو جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ معقول ہے ورنہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تعبدی (محض عبادت کے لئے) ہے [3]

اڑتالیسواں قاعدہ ۴۸

معاہدہ کی اصل شرط یہ ہے کہ وہ لازم ہو کیونکہ معاہدہ اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ فریقین کے مقاصد اور ان کی ضروریات پوری ہوں اس لئے معاہدہ کو لازم کرنے سے مقصد اور ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے، اس قاعدہ کے باوجود معاہدہ کی دو قسمیں ہیں (۱) لازم معاہدات جیسا کہ نکاح، بیع اور اجارہ ہیں (۲) دوسری قسم وہ ہے جس میں معاہدات پانچ ہیں [4] جن میں وکالت

---

[1] ارشاد الفحول [2] اس کا ذکر قیاس کی بحث میں اس کے مخالفوں کی رائے کے ضمن میں آچکا ہے [3] حصہ اول الدرالمختار ۲۱۲ [4] الفروق میں ایسے ہر معاہدہ کے لازم نہ ہونے کی اصل حکمت بیان کی گئی ہے۔

اور حاکم بننے سے پیشتر کسی کو ثالث بنانا بھی شامل ہیں۔ ان معاہدات کو لازم قرار دینے سے بہت نقصان کا اندیشہ رہتا ہے اور اس کی وجہ سے اصل مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً وکالت کے کام پورے نہیں ہوسکتے اور ان کی تکمیل میں نقصان ہوتا ہے اس لئے ایسے غیر لازم معاہدہ کو جائز قرار دیا گیا ہے اسی طرح حاکم کو ثالث بنا کر اس معاہدہ کو لازم قرار دینے سے فریق مخالف کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور بعض اوقات دونوں فریق برے انجام کو بری طرح محسوس کرتے ہیں اس لئے ان کے ضرر کو دور کرنے کے لئے وہ معاہدات لازم نہیں کئے گئے بہرحال تمام غیر لازم معاہدات بالعموم اس مفہوم میں شریک ہیں کہ حصول مقصد کے لئے معاہدہ کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہے، اس لئے لازم نہ ہونے کے باوجود اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔[1]

یہ مشہور قواعد ہیں، ان کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ایسے مختصر مگر جامع کلمات ادا ہوئے ہیں جو شرعی احکام کے لئے کلیہ قواعد بن سکتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) ہر نشیلی چیز حرام ہے (۲) ہر وہ عمل جس کے لئے ہمارا حکم نہ ہو مردود ہے (۳) ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو، سود ہے (۴) ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں موجود نہ ہو، باطل ہے (۵) ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو مسلمان کے لئے قابل حرمت ہے (۶) ہر شخص اپنی اولاد، والد اور سب لوگوں سے زیادہ اپنے مال کا حقدار ہے، (۷) ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے[2] ۔(۸) خالق کی نافرمانی کے لئے کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاتی ہے[3]

قرآن کریم میں بھی کئی آیات اس قسم کی ہیں مثلاً:۔

(۱) وہ دریافت کرتے ہیں ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے، کہہ دیجئے ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں (۲) برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے (۳) حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے میں ہے اور حرمات کا بدلہ ہوتا ہے، جو تم پر زیادتی

---

[1] فرق نمبر ۲۱ جلد چہارم کتاب الفروق از قرافی صفحہ ۱۵ — ۱۶ مطبوعہ تونس۔

[2] حصہ اول اعلام الموقعین صفحہ ۲۹

[3] التوسل والوسیلۃ از ابن تیمیہ صفحہ ۱۰۵ المنار کا طبع کردہ دوسرا ایڈیشن

کرے، تو تم بھی اس کی زیادتی کے برابر زیادتی کرو" اس قاعدہ کے ماتحت مختلف جرائم اور ان کی سزائیں آجاتی ہیں اسی طرح یہ آیت ہے (۷) ان عورتوں کے بھی اچھے دستور کے مطابق وہی حقوق ہیں جو مرد کے ان پر ہیں" اس قاعدہ میں عورتوں کے تمام حقوق و فرائض شامل ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا معیار اس اچھے دستور اور رواج کے مطابق ہوتا ہے جو عام طور پر لوگوں میں مشہور رہو اور وہ معیار ایسا ہو جسے لوگ برا نہ سمجھیں بلکہ اچھا سمجھیں [1]

یہ فقہ اسلامی کے اہم قواعد ہیں جو شریعت کے ایسے مکمل اصول وضوابط ہیں کہ تمام مسائل واحکام ان سے ماخوذ ہو سکتے ہیں اور موجودہ مغربی قوانین ان سے افضل نہیں ہیں۔ مگر ہمارے قانون دان حضرات انہی پر فریفتہ ہیں اور وہ اسلامی قانون پر قدامت اور جمود کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ جمود اور کوتاہی کے ہم ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے ورنہ اسلامی شریعت بالکل صحیح وسالم حالت میں ہے اور اسی کے اصول و قواعد عقل کے مطابق ہیں اور عدل و انصاف پر ان کی بنیاد قائم ہے وہ قواعد ایسے لچک دار ہیں کہ اگر فرعی احکام اور اجتہادی مسائل کو ان پر منطبق کیا جائے تو ان کے اندر ہر دور میں قوموں کے حالات کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت موجود ہے جیسا کہ ہم نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے لہٰذا جو صاحبِ دل ہو اور ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے اس کے لئے اس میں بہت بڑی نصیحت ہے۔

---

[1] حصہ اوّل اعلام الموقعین

ماخذ و کتب حوالہ جات

برائے

بحث قواعد فقہیہ

(۱) الفروق از قرافی مطبوعہ تونس سنہ ۱۳۰۲ھ (۲) الاشباہ والنظائر از زین العابدین ابراہیم
معروف بہ ابن نجیم المصری الحنفی مطبوعہ مطبعہ عامرہ سنہ ۱۲۹۰ھ (۳) غمز البصائر شرح الاشباہ والنظائر ـــ از
احمد بن محمد الحنفی الحموی مطبعہ عامرہ سنہ ۱۲۹۰ھ (۴) اعلام الموقعین......از ابن القیم
(۵) رد المختار علی الدر المختار مطبعہ میمنیہ سنہ ۱۳۱۸ھ (۶) نیل الاوطار طبعہ الحلبی ......سنہ ۱۳۴۷ھ
(۷) فتح القدیر شرح الہدایۃ .... (۸) الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیۃ۔
(۹) النہایۃ فی غریب الحدیث از ابن الاثیر (۱۰) نداء للجنس اللطیف.... از علامہ رشید رضا
(۱۱) قاعدہ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ از ابن تیمیہ (۱۲) ارشاد الفحول........ از شوکانی

باب پنجم

اسلامی شریعت

کے

محاسن اور خصوصیات

اسلامی شریعت کے محاسن اور خصوصیات

اسلامی شریعت کے محاسن اور خصوصیات ایسی ہیں جن کی بدولت اسلامی قوانین تمام قوانین سے زیادہ مکمل ہوگئے ہیں اور وہ افراد اور جماعتوں کی ضروریات کو بدرجہ اکمل پورا کرتے ہیں بلکہ وہ سب سے زیادہ قوموں کے امن و امان، ان کی کامیابی، قوت اور عزت کے ضامن ہیں اور اگر ان کے ساتھ ساتھ اسلامی آداب اور اس کی دوسری ہدایات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو وہ ایک ایسے مثالی معاشرہ کی تخلیق کر سکتے ہیں، جس میں انصاف پسند طاقتوں کے عناصر جمع ہوں اس طرح نہ صرف صالح زندگی اور اعلیٰ تمدن مہیا ہوسکتا ہے بلکہ اس کی تہذیب و ترقی کے اعلیٰ اسباب بھی فراہم ہوسکتے ہیں، ایسی صورت میں یہ معاشرہ روئے زمین میں اللہ کی خلافت کا مستحق بن کر دنیا کو عدل و انصاف، امن و امان اور رحم و محبت سے معمور کر سکتا ہے۔

اسلامی قوانین کی خوبیاں اس کثرت سے ہیں اور ان میں اس قدر تنوع ہے کہ ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس وقت ہمارے ذہن میں جو محاسن اور خصوصیات آئی ہیں۔ ہم انہی کا تذکرہ کر رہے ہیں تاکہ وہ مثال اور نمونہ کا کام دے سکیں اور ان کے ذریعے خالص عدل و انصاف اور اعلیٰ اغراض و مقاصد کا اظہار ہو سکے، اب ہم اس کے مختلف محاسن اور خصوصیات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں

آسانی اور سہولت

اسلامی قوانین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آسان ہیں اور ان میں کوئی تنگی اور دقت نہیں ہے یہ اسلامی شریعت کی سب سے نمایاں اور مشہور خصوصیت ہے کہ اس کے احکام بہت سادہ اور سہل ہیں اور لوگوں کو مشقت اور تکلیف نہیں دی گئی ہے اور اگر کہیں تنگی ہے تو وہاں سہولت بھی دی گئی ہے اس طرح اس کے تمام احکام انسانی فطرت کے مطابق ہیں ان میں نہ کوئی

ناخوشگوار آلائش ہے۔ اور نہ اس کا کوئی حکم شاق اور ناگوار معلوم ہوتا ہے اس بات کی وجہ یہ ہے کہ یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی شریعت ہے اور تمام احکام علم و حکمت والے خدا کی وحی اور ہدایت پر مبنی ہیں۔ اور ان کی تفصیل خدا کے اس صادق اور امین رسولؐ نے بیان کی ہے جو مومنوں کا بہت بڑا مشفق اور محسن ہے۔

آسانی اور سہولت کی اس خصوصیت کو قرآنی آیات میں بھی جا بجا بیان کیا گیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــــ "اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ہے" دوسرے مقام پر ارشاد ہے ـــــ "اللہ تمھارے لئے آسانی مہیا کرنا چاہتا ہے اور وہ تمھیں تکلیف دینی نہیں چاہتا ہے"

ایک دوسرے مقام پر جب پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کرنے کا حکم نازل فرمایا تو اس میں اسی سہولت اور آسانی کی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ سورۃ مائدہ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

"اگر تم بیمار ہو، یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت سے فارغ ہوا ہو یا تم عورتوں کے پاس گئے ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو تم پاکیزہ مٹی سے تیمم کرو اور اس سے اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مسح کرو۔ اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمھیں کوئی حرج واقع ہو، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ وہ تمہیں پاکیزہ بنا کر تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کرے تاکہ تم شکر گزار بن سکو"

آگے چل کر سورۃ حج میں ارشاد ہے:۔

"اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہو، اس نے تمھیں برگزیدہ بنایا ہے اور دین کے بارے میں تمھارے لئے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے"

احادیث میں بھی اس مفہوم کو بکثرت بیان کیا گیا ہے ایک روایت یہ ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں نقل کی ہے ـــــ "اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ مذہب وہ ہے جو باطل مذاہب سے الگ ہو اور رواداری اور سہولت پر مبنی ہو"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل (خصائل) میں یہ مذکور ہے ـــــ "جب کبھی آپ کو دو کاموں میں سے کسی ایک کام کا اختیار دیا گیا ہو تو اگر وہ گناہ نہ ہو تو آپ دونوں میں سے آسان کام کو اختیار فرماتے تھے، روایت ہے:۔ ایک اعرابی مسجد میں آیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں بیٹھے ہوئے تھے، اس نے نماز پڑھی

اور یہ دعا مانگی ـــــ "اے اللہ! تو مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کر اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ـــــ "تم نے وسیع چیز کو تنگ کر دیا" بعد ازاں اس نے مسجد کے ایک گوشہ میں پیشاب کیا تو لوگ اس کی طرف لپکے مگر آپ نے انھیں منع کرتے ہوئے فرمایا ـــــ "تم اس لئے بھیجے گئے ہو کہ تم آسانی فراہم کرو اور اس لئے نہیں بھیجے گئے ہو کہ دوسروں کو تکلیف پہونچاؤ لہٰذا اس پر پانی کا بھرا ہوا ڈول بہا دو"[1]

فقہائے کرام نے اس خصوصیت کو ایک اصول کے طور پر تسلیم کیا ہے اور اس کے ماتحت بہت سے احکام بیان کئے ہیں چنانچہ ہم نے قواعد فقہیہ کے قاعدہ نمبر ۶ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

عقل کے مطابق

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے احکام عقل اور صحیح قیاس کے مطابق ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا بعد میں ان کی خواہشوں نے ان کی صحیح فطرت کو بگاڑ دیا ہے اور سرکش بنا دیا، چنانچہ کتاب و سنت کے تمام احکام عقل پر مبنی ہیں اور ان میں بڑی بڑی حکمتیں اور اعلیٰ راز پوشیدہ ہیں یہاں تک کہ عبادات میں بھی ایسے اخلاقی، تہذیبی، نفسیاتی اور سماجی فوائد موجود ہیں جو عقل سلیم سے مخفی نہیں رہ سکتے، چنانچہ ہم نے احکام قرآنی کی بحث میں اس کے فوائد بیان کئے ہیں تاہم اگر شریعت کی بعض باتوں کے فوائد اور حکمت ہم سے پوشیدہ رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ ان کے پوشیدہ رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں درحقیقت کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ ممکن ہے کہ عبادات میں خدا کی یہ حکمت مضمر ہو کہ وہ بندوں کی ایمانی طاقت، اپنی اطاعت اور تعمیل حکم کا امتحان لینا چاہتا ہو، وہ احکام جن کے لئے نص شرعی نہ ہو بلکہ وہ رائے اور قیاس پر مبنی اجتہادات کے مطابق ہوں تو ان کا سرچشمہ بھی عقل اور آزادی رائے ہے، جس میں لوگوں کی بھلائی اور عدل و انصاف کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، اور شرعی اجتہاد کے اصول و قواعد کی پابندی کی جاتی ہے

اسلامی شریعت، عقل و فطرت کی شریعت ہے، اس میں کوئی چیز صحیح قیاس کے

---

[1] مفتاح السنۃ از مرحوم شیخ عبدالعزیز الخولی بحوالہ سنن ابن داؤد

خلاف نہیں ہے اس لئے وہ کو حکمت، رحم، مصلحت اور برکت بن کر آئی ہے چنانچہ ابن القیم الجوزیہ نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ[1] میں فرمایا ہے:-

"اللہ اور رسولؐ نے کوئی حکم نہیں بیان کیا ہے جو عقل و حس کے خلاف ہو بلکہ یہ تمام احکام بہترین عدل و انصاف پر مبنی ہیں، اور عقل و فکر اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔ کہ یہ احکام اپنے حسن و کمال میں اپنی نظیر آپ ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ان سے بہتر کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔"

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ اپنی کتاب القیاس فی الشرع الاسلامی" میں فرماتے ہیں:-

"ایک صحیح اور معتدل قیاس کی یہ شرط نہیں ہے کہ ہر ایک آدمی اس کی صحت سے واقف ہو، اگر کوئی شخص شریعت کی کسی چیز کو قیاس کے مخالف دیکھتا ہو تو درحقیقت وہ حکم اس قیاس کے مخالف ہے جو اس نے اپنے دل میں قائم کر رکھا ہے نہ کہ وہ اس قیاس کے مخالف ہے جو حقیقت کے مطابق اور صحیح ہے، لہٰذا جب ہمیں یہ بات معلوم ہو کہ کوئی نص شرعی خلاف قیاس ہے تو ہمیں قطعی طور پر سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا قیاس فاسد ہے، کیونکہ شریعت میں کوئی چیز صحیح قیاس کے خلاف نہیں ہے البتہ ہمارے ناقص اور فاسد قیاس کے خلاف کچھ احکام ہیں جنہیں لوگ اپنے ناقص علم اور قیاس کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتے

مصلحت پسندی

اسلامی شریعت کا ایک مقصد یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں انسانوں کو فائدہ پہونچایا جائے اور ان کے نقصان اور خرابیوں کو دور کیا جائے اور ان میں مکمل عدل و انصاف قائم کیا جائے ہر حکم میں خواہ وہ نص شرعی کے مطابق ہو یا اجتہادی رائے پر بنی ہو، یہی مقصد پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

ابن القیم اپنی کتاب مذکور (الطرق الحکمیہ) میں ارشاد فرماتے ہیں[2]
جو شخص اسلامی شریعت کا صحیح ذوق رکھتا ہو اور اس کے کمالات سے واقف ہو اسے بخوبی معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد دنیا اور آخرت میں لوگوں کو فائدہ پہونچانا اور

[1] الطرق الحکمیہ ص ۲۰۵، ۲۰۶ مطبوعہ ۱۳۱۷ھ

[2] الطرق الحکمیہ ص ۴، ۵

مخلوق میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے، بلکہ اسلامی انصاف سے بڑھ کر کوئی مصلحت نہیں ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ "سیاست عادلہ" اس کا ایک لازمی حصہ ہے اور جسے اس کے مقاصد سے آگاہی حاصل ہو اور شریعت کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس کو اس کے ہوتے ہوئے دوسروں کی سیاست معلوم کی ضرورت نہیں ہے"

موجودہ زمانے کے ایک بڑے عالم رقمطراز ہیں [۱]

"وہ شرعی احکام جو مسلمان فقہاء نے گیارہ سو برس پہلے وضع کئے تھے وہ اپنے انصاف پسندانہ اصول، اعلیٰ معیار کے لحاظ سے اور فطری حقوق کے مطابق ہونے میں ان تمام انسانی قوانین سے بڑھ چڑھ کر ہیں جو ابتدا سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک مدون ہوئے ہیں" آگے چل کر مقالہ نگار لکھتا ہے :- "مسلمان علماء نے غلامی، حقوق نسواں، یتیم اور فقراء، برسرپیکار اور معاہدہ کرنے والی قوموں، اجنبیوں، ذمیوں، دیوانی اور فوجداری اور جرم و سزا کے بارے میں جو قوانین بنائے ہیں اگر کوئی ان سب پر غور کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ اسلامی قوانین کو بیسویں صدی عیسوی کے مغربی قوانین پر نمایاں فوقیت حاصل ہے"۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ وہ شریعت جو پہلی شریعتوں کے نقائص اور کوتاہیوں کو دور کرے اور مکمل حالت میں موجود ہو اس کے قوانین ایسے ہی ہونے چاہئیں کیونکہ شریعت اسی زمانے میں جاری ہوئی جبکہ انسانی قومیں اس قابل ہو گئی تھیں کہ وہ مکمل قوانین پر عمل کریں اور اعلیٰ مقاصد اور اصولوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں اس سے پہلے جو شریعتیں آئی تھیں وہ ایک خاص قوم اور محدود زمانے کے لئے مخصوص ہوا کرتی تھیں مگر اسلامی شریعت تمام عالم انسانیت کے لئے ہے،

اس نکتہ کی طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حدیث میں اشارہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے۔ "میرا پہلے پیغمبروں کے ساتھ مقابلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص نے گھر بنا کر اسے مکمل کر دیا ہو مگر ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھی ہو، چنانچہ جو کوئی اس گھر میں آتا، تو وہ اسے دیکھ کر بہت پسند کرتا اور یہ کہتا :- یہ گھر کتنا اچھا

---

[۱] مجلہ الازھر کا ایک مقالہ

ہے۔ بشرطیکہ اس اینٹ کی جگہ خالی نہ ہوتی" وہ اینٹ میں ہوں مجھ پر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں اور رسولوں کا سلسلہ ختم کر دیا ہے

عزائم و رخصت

اسلامی فرائض کی دو قسمیں کی گئی ہیں عزائم و رخصت۔ عزائم وہ کام ہیں جن میں عزم و ہمت کو اختیار کیا جائے اور سہولت کا خیال نہ رکھا جائے اور رخصت وہ کام ہیں جن میں اللہ کی طرف سے دی ہوئی سہولت کو پیش نظر رکھا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ عزائم کو اختیار کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ رخصت کی صورت کو پسند فرماتے تھے، اس لئے احکام پر عمل کرنے کے سلسلے میں مستعدی، اعتدال اور کوتاہی اختیار کرنے کے لحاظ سے لوگوں کے کئی درجے ہیں [1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے "پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جو ہمارے برگزیدہ بندے تھے ان میں سے کچھ اپنی ذات پر ظلم کرتے تھے اور کچھ اعتدال پسند ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اللہ کی اجازت سے نیکی کے لئے سبقت کرتے ہیں، یہ بہت بڑی فضیلت ہے"

زیب و زینت کی اجازت

اسلام نے پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرنے اور زیب و زینت کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ ان میں اسراف اور غرور و گھمنڈ سے کام نہ لیا جائے اس نے دین میں حد سے آگے بڑھنے کو منع کیا ہے اور اسے نفس مارنے کا ذریعہ بنانے سے روکا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"اے فرزندان آدم! ہر نماز کے وقت زیب و زینت اختیار کرو، کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔ کیونکہ وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے (اے پیغمبر) کہہ دیجئے کہ اللہ کی زیب و زینت اور پاکیزہ رزق جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کئے ہیں کس نے حرام کئے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ خالص ایمان والوں کے لئے قیامت کے دن تک ہیں اسی طرح ہم تفصیل کے ساتھ آیات ان لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں [2]

روحانیت اور مادیت کا اعتدال

اسلام نے جسم اور روح کے کاموں کو حدود اعتدال میں رکھا ہے اس نے جسم اور روح دونوں کے

[1] [2] - الوحی المحمدی ترجمہ رشید احمد ارشد مطبوعہ کتاب منزل شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور

حقوق اعتدال کے ساتھ پورے کئے ہیں اور دنیا اور آخرت دونوں کے مفادات کا خیال رکھا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے "اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی قوم بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور رسول ص تم پر گواہ بن سکے"۔ اسی وجہ سے اسلام نے اپنی تعلیمات اور ہدایات اور قوانین کے لحاظ سے مسلمانوں کو ان لوگوں کی درمیانی راہ میں رکھا ہے جن پر مادی اور جسمانی مفادات کا غلبہ ہو یا ان پر روحانی تعلیمات اس قدر غالب ہوں کہ وہ جسم کو تکلیف پہونچا کر نفس کشی کرتے ہوں[1] گذشتہ صفحات میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

احکام میں مساوات

اسلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے فرائض و احکام، عدالتی فیصلوں اور ان کے نافذ کرنے میں کامل مساوات برقرار رکھی ہے اس کے تمام احکام اور ان کی ذمہ داریاں مساوات کے اصول پر مبنی ہیں اسی وجہ سے ان میں افراد اور جماعتوں کا کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے احکام اور اس کی سزاؤں سے نہ کوئی دولت مند مستثنیٰ ہے اور نہ کسی صاحب جاہ و جلال حاکم کو رعایت دی گئی ہے یہاں تک کہ خلیفہ اعظم بھی، جس کی تمام مخلوق مطیع و فرمان بردار ہوتی ہے، اسلامی قانون سے بالاتر نہیں ہے چنانچہ تمام مسلمان، حقوق و فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے میں برابر ہیں، اس معاملہ میں عربی، عجمی، کالے، گورے اور حاکم و محکوم کی کوئی تفریق نہیں ہے یہ اصول اس وقت سے قائم ہے جبکہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تھا اور نور محمدی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

اسلامی مساوات کو ثابت کرنے کے لئے دلائل و شواہد بکثرت ہیں ہم ان میں سے صرف چند دلائل پیش کرتے ہیں

(۱) اسلامی فقہ کا یہ اصول ہے کہ نص شرعی کے مفہوم کا خطاب تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے جب تک کہ کسی ثبوت سے اس کا مفہوم مخصوص نہ ہو جائے اصول فقہ کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ ذمہ داری کے کاموں میں کسی کے لئے خصوصیت نہ رکھی جائے۔

(۲) صاحب شریعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو مقرر فرما کر اسے

[1] الوحی المحمدی۔

عملی اور قدرتی طور پر برقرار رکھا ہے اور اپنی قوم کو مستعدی کے ساتھ اس کا پابند بنایا ہے چنانچہ روایت ہے کہ آپؐ نے اس اعرابی کو بلایا جس کو آپؐ سے بلاقصد وارادہ کوئی تکلیف پہونچی تھی، اور اس سے فرمایا — تم مجھ سے بدلہ لے لو۔ اس اعرابی نے کہا — میں نے آپؐ کو معاف کیا۔ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں اگر آپؐ میری جان بھی لے لیں تو میں کبھی آپؐ سے بدلہ نہیں لوں گا۔ اس پر آپؐ نے اس کے لئے دعائے خیر کی۔

آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں مسلمانوں کو جاہلیت کی بعض باتوں سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ یہ تمام مسلمانوں کے لئے ممنوع ہیں بالخصوص آپؐ نے اپنے رشتہ داروں کو اس طرف متوجہ کیا کہ ان احکام کا اطلاق ان پر بھی ہے تاکہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ انھیں دوسروں پر کوئی خصوصیت حاصل ہے چنانچہ آپؐ نے فرمایا

"جاہلیت کا سود ساقط کر دیا گیا ہے اور سب سے پہلا سود جس کو میں سب سے پہلے ساقط کرتا ہوں، وہ میرے چچا عباس بن عبد المطلب کا ہے، نیز جاہلیت کے تمام خون معاف کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلا خون جو میں معاف کرتا ہوں وہ عامر بن ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب کا ہے"

ایک مرتبہ مرض الموت کے زمانے میں آپؐ باہر نکلے اور لوگوں سے یوں فرمانے لگے "اے لوگو! اگر کسی کی پشت پر میں نے کوڑے مارے ہوں تو میری پشت حاضر ہے۔ وہ آئے اور مجھ سے بدلہ لے اور اگر میں نے کسی بے عزتی کی ہو تو وہ آکر اپنی بے عزتی کا مجھ سے بدلہ لے اور اگر میں نے کسی کا مال لیا ہو تو یہ میرا مال موجود ہے وہ آکر اس کے بدلے میں مال لے لے، اسے میری دشمنی کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ میری شان کے خلاف ہے"[1]

آپ کے عدل و مساوات کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جو حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں —— ربیعؓ بنت النضر نے ایک لونڈی کا دانت توڑ دیا اس پر مجرمہ کے گھر والوں نے اس لڑکی کے گھر والوں سے معافی مانگی مگر انھوں نے معافی نہ دی۔ اس کے بعد انھوں نے دیت پیش کی تو وہ بھی انھوں نے قبول نہیں کی اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے مگر وہ قصاص پر مصر رہے لہٰذا آپؐ نے

---

[1] حیاۃ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام

قصاص لینے کا حکم دے دیا۔ حضرت انس بن نضر نے فرمایا:۔

"یا رسول اللہؐ! کیا رُبیع کے دانت توڑ دیئے جائیں گے؟ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو صداقت پر مبعوث کیا ہے اس کے دانت نہیں ٹوٹیں گے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اے انس! اللہ کی کتاب میں قصاص کا حکم ہے" آخر کار وہ لوگ رضامند ہو گئے اور انھوں نے اسے معاف کر دیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ "اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ قسم کھائیں تو اللہ ان کی قسم کو پوری کرتا ہے[1]"

اس سے زیادہ قابل ذکر واقعہ اس مخزومیہ عورت کا ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زیور چرالیا تھا۔ وہ عورت نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی لہذا جب آپؐ نے اس پر حد شرعی جاری کرنے کا ارادہ کیا تو یہ بات مہاجرین کو بہت شاق گزری وہ کہنے لگے ۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس عورت کی سفارش کرے گا۔ کچھ لوگوں نے کہا اسامہ بن زیدؓ رسول اللہؐ کے چہیتے ہیں وہی اس کی سفارش کر سکتے ہیں" چنانچہ حضرت اسامہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں گفتگو کی تو آپؐ غضب ناک ہو کر فرمانے لگے۔

"کیا تم اللہ کی حد شرعی کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ حالانکہ تم میں سے پہلی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان کا کوئی شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تھا۔ تو اسے سزا دیتے تھے خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹتا۔"

(۳) تاریخ میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے حاکم تھے تو ان کے صاحبزادے محمدؐ گھوڑ دوڑ کراتے تھے، ایک دفعہ ایک مصری نے گھوڑ دوڑ میں آگے بڑھنے میں ان سے اختلاف کیا۔ اس پر وہ غضب ناک ہو گئے اور مصری کو کوڑے لے کر مارنے لگے اور کہنے لگے ۔۔ "شریف ترین انسان کے فرزند کی طرف سے یہ ضرب حاصل کرو" وہ مصری خلیفہ اعظم حضرت عمرؓ کے پاس شکایت کے لئے آیا۔ اس واقعہ کے راوی حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں ۔۔ "حضرت عمرؓ نے اس سے اتنا ہی کہا

---

[1] یہ حدیث ترمذی کو چھوڑ کر باقی صحاح ستہ کی پانچوں کتابوں میں موجود ہے ملاحظہ ہو حصہ ہفتم نیل الاوطار از شوکانی ص ۲۰ مطبوعہ حلبی۔

کہ بیٹھ جاؤ۔" اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص اور ان کے صاحبزادے کو مصر سے بلوایا گیا۔ جب وہ دونوں آئے تو قصاص کی عدالت میں انھیں کھڑا کیا گیا اور حضرت عمرؓ نے پکار کر فرمایا ــــ "مصری" کہاں ہے؟ تم کوڑا لے کر شریف ترین آدمی کے فرزند کو مارو" چنانچہ اس مصری نے انھیں اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ راوی بیان کرتے ہیں ــ "ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ انھیں مارتا رہے یہاں تک کہ جب اس نے انھیں اتنا مارا کہ اب ہم بھی چاہنے لگے کہ وہ اس سے باز آجائے حضرت عمرؓ ابھی تک اس سے یہ فرما رہے تھے ــ شریف ترین شخص کے فرزند کو مارو" اس کے بعد آپؓ نے فرمایا ــــ "عمرو بن العاصؓ کی بھی خبر لو کیونکہ اس کے فرزند نے اس کی حکومت کے گھمنڈ میں مارا تھا"۔ اس پر حضرت عمرو بن العاصؓ گھبرا کر کہنے لگے ــ "اے امیر المومنین! آپؓ نے پورا بدلہ لے کر تسکین حاصل کر لی ہے"۔ مصری بھی معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا ــــ "اے امیر المومنین! میں نے اسے مار لیا ہے جس نے مجھے مارا تھا" حضرت عمرؓ فرمانے لگے ــــ "خدا کی قسم! اگر تم انھیں بھی مارتے تو ہم تمھارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے یہاں تک کہ تم خود نہ باز آجاتے"۔ اس کے بعد آپؓ نے حضرت عمروؓ کی طرف متوجہ ہو کر یہ غیر فانی کلمات ارشاد فرمائے ــــ "اے عمروؓ! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا ہے"۔

(۴) اس قسم کا یہ واقعہ بھی ہے کہ خاندان غسان کے آخری بادشاہ جبلہ بن الایہم نے مسلمان ہو کر ایک دفعہ حج کیا وہ اپنی پوشاک کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک قبیلہ فزارہ کے ایک شخص نے اس کی پوشاک کو پاؤں سے روند دیا۔ اس پر جبلہ نے اس زور سے اسے طمانچہ مارا کہ اس کی ناک اور دانت توڑ دیئے اس فزاری شخص نے اس کی زیادتی کی شکایت حضرت عمرؓ سے کی تو آپؓ نے اس سے فرمایا ــــ "یا تو وہ فزاری تمھیں معاف کرے ورنہ تم سے قصاص لیا جائے گا"۔ اس پر جبلہ کہنے لگا۔ "کیا وہ مجھ سے قصاص لے سکتا ہے حالانکہ میں بادشاہ ہوں اور وہ رعیت ہے"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ــــ "اسلام لانے کے بعد تم اور وہ برابر ہیں تمھیں اس پر تقویٰ اور پرہیزگاری کے علاوہ اور کسی چیز کی فضیلت نہیں ہے

جبلہ کہنے لگا ـــــ میں تو یہ خیال کرتا تھا کہ اسلام لانے کے بعد مجھے دورِ جاہلیت سے زیادہ عزت حاصل ہوگی " آپؓ نے فرمایا ـــــ تم یہ خیال اپنے دل سے نکال دو" جب جبلہ نے یہ دیکھا کہ حضرت عمرؓ قصاص لینے پر مصر ہیں تو اس نے کہا ـــــ میں صرف ایک رات کی مہلت چاہتا ہوں " اس کے بعد وہ راتوں رات اپنا ساز و سامان اور گھوڑے لے کر روانہ ہوگیا اور شام چلا گیا وہاں سے وہ قسطنطنیہ پہونچ کر عیسائی ہوگیا۔ اور قیصر روم کے پاس رہنے لگا۔ بعد میں وہ اپنے فعل پر بہت شرمندہ اور نادم ہوتا رہا۔

یہ مساوات کی چند مثالیں ہیں اور بالعموم اکثر احکام میں مساوات کی پابندی کی جاتی ہے لیکن بعض احکام میں اور شرعی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مساوات قائم نہیں رکھی گئی جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے مثلاً بعض معاملات میں مرد اور عورت میں مساوات نہیں ہے، عورت نان نفقہ کی حقدار ہے اور مرد اس سے نان نفقہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کی پرورش کرنے کا حق صرف عورت کو ہے مگر تعدد ازدواج میں عورت مرد کے مساوی نہیں ہے اور میراث کے حصے میں بھی فرق ہے۔ یہ تفریق فطری اور طبعی حالات کے مطابق کی گئی ہے جس کی تفصیل ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

بہرحال کامل مساوات کا یہ وہ عظیم اصول ہے جس کی بدولت اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں میں عزت نفس اور خودداری کا جذبہ پیدا ہوا ان کی ہمت بلند ہوئی اور ان کی ہمت بلند ہوئی اور ان کے اخلاق اعلیٰ ہوگئے، ان کی پوشیدہ قوتیں بیدار ہوئیں اور ان میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے مسلمان قوم کو تہذیب و ترقی کے بام عروج تک پہونچایا۔ اور دنیا میں رحم و ہمدردی اور عدل و انصاف کا ڈنکا بجا دیا یہی وہ اسلامی روح تھی جس کی بدولت لوگ جوق در جوق مسلمان ہوگئے اور اسلام کے زبردست حامی اور مددگار بن گئے کیونکہ قرآن کریم نے یہ اعلان کر دیا تھا۔

" اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، ہم نے لئے قبائل اور خاندان صرف اس لئے مقرر کئے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ درحقیقت تم میں سے شریف ترین انسان وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو حقیقت

ہیں اللہ بہت جاننے والا خبردار ہے"

عرف و عادت کی اہمیت

اسلامی شریعت کی آٹھویں خوبی یہ ہے کہ اس نے عرف و عادت کو شریعت کا ایک بنیادی اصول قرار دیا بشرطیکہ وہ دیگر شرائط کے ساتھ ساتھ صریح نص شرعی کے خلاف نہ ہو۔ عرف و عادت اور اس کے اثرات کو قواعد فقہیہ کے قاعدہ نمبر دس میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی شریعت کی نویں خوبی یہ ہے کہ اس میں عبادات کا ظاہر دار و مدار کتاب و سنت کے احکام کی پیروی پر ہے اور اس میں کسی کی ذاتی رائے اور اس کی حکومت کا دخل نہیں اور اس کا باطنی دار و مدار نیک نیتی اور خلوص پر ہے [۱]

نیک نیتی

اسلامی شریعت میں نیک نیتی اور عمل کے حقیقی اسباب کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور انسان کے ظاہری اعمال کافی نہیں سمجھے گئے ہیں جیسا کہ دنیاوی قوانین کا طریقہ ہے کہ ان میں قانون کی صرف ظاہری پابندی کو کافی سمجھا جاتا ہے مگر اسلام میں کام کرنے والے کی نیت اور اس کے اصل منشا اور اسباب پر بھی غور کیا جاتا ہے اسی لئے آخرت کے ثواب و عذاب کو اس کی نیک نیتی اور باطنی ارادوں پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک مکمل شریعت کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقی معنوں میں اصلاح ہو سکے یعنی ظاہری اصلاح سے زیادہ اس کے دل اور نفس کی اصلاح کی جائے تاکہ لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات خلوص قلب کے ساتھ عدل و صداقت کی بنیادوں پر قائم رہیں۔

اسلامی شریعت کے مطابق انسان اپنے اعمال و اقوال میں دو قسم کی نگرانی میں رہتا ہے سب سے پہلے اس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے اپنے ضمیر کا دباؤ ہوتا ہے اس کے بعد اسے قانون کے احکام کا خوف ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی توضیح کے لئے ہم نکاح کی مثال پیش کرتے ہیں جب نکاح کے تمام شرائط اور ارکان پورے ہو جائیں تو اس وقت نکاح کے دو احکام پیش نظر ہوتے ہیں، پہلی چیز وہ حقوق و فرائض ہیں، جو نکاح کے بعد زوجین پر عائد ہوتے ہیں، دوسری چیز وہ ہے جس کا تعلق نکاح کرنے والے

---

[۱] الوحی المحمدی مطبوعہ کتاب منزل لاہور

کی نیت اور اس کے اصل مقصد سے ہے نیت اور اصل مقصد کے لحاظ سے یہ نکاح حرام بھی ہو سکتا ہے مثلاً اگر نکاح کرنے سے شوہر کا مقصد یہ ہو کہ وہ اپنی بیوی پر ظلم وستم کرے یا اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ بیوی اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی کرے تو اس مقصد کے مطابق عمل کرنے سے وہ آخرت میں سزا کا مستحق ہوگا کیونکہ نکاح کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی عفت وعصمت کو محفوظ رکھ سکے، اس کی نسل باقی رہے اور اسے اس قدر ثواب حاصل ہو، مگر اس ظلم وستم کی بدولت نکاح باطنی طور پر حرام ہو جاتا ہے اور اس کا وہ ثواب چلا جاتا ہے جس کے حصول کے لئے نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کا نکاح گو ظاہری طور پر درست ہو لیکن باطنی حکم کے لحاظ سے حرام ہے۔

کبھی نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے، جبکہ مرد ازدواجی فرائض کو پورا کر سکتا ہو اگر وہ نکاح نہ کرے اور یہ یقین ہو جائے کہ وہ زناکاری میں مبتلا ہو جائے گا۔ تو اس صورت میں اس کے لئے نکاح کرنا فرض ہے۔ اس کے چھوڑنے پر اس کو عذاب ہوگا۔ اور نکاح کرنے پر ثواب ملے گا تاہم اعتدال کی حالت میں نکاح سنت مؤکدہ ہے اور اگر پاک دامنی اور اولاد حاصل کرنے کے مقصد سے نکاح کیا جائے تو ایسا شخص ثواب کا مستحق ہے اور اگر نکاح نہ کرے تو گناہ گار ہوگا[1]

اعلیٰ اخلاق پر بنیاد

اسلامی شریعت کی ایک خصوصیت جس کی بدولت وہ دیگر دنیاوی قوانین سے ممتاز ہے یہ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق ومحاسن تقویٰ اور محاسبہ اور ضمیر ووجدان پر قائم ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے "کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ آمادہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو۔ بلکہ عدل وانصاف کرو۔ کیونکہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو تمام کتب حدیث میں موجود ہے "تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو اور شاید تم میں سے کوئی اپنے دلائل کو مؤثر طریقے سے میرے سامنے پیش کرے اور میں انھیں سن کر کوئی فیصلہ کر دوں تو اسے وہ حق نہیں لینا چاہیئے کیونکہ میں اس صورت میں اس کے دلائل سے متاثر ہو کر

[1] فتح القدیر شرح الھدایۃ ورد المختار

آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں"[1]

اس وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو ایسی چیزوں سے دور رکھتے تھے جن سے ان کے دلوں میں حسد اور دشمنی پیدا ہوتی ہو، اسی لئے وہ فرماتے تھے —" مقدمہ بازوں کو لوٹا دو تاکہ وہ صلح کرلیں کیونکہ عدالتی فیصلے ان میں حسد اور کینہ پیدا کرتے ہیں"

مکروفریب کی مذمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں پر بہت سختی کرتے تھے جو مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دیں، آپ فرمایا کرتے تھے —" جو ہمیں دھوکا دیتا ہے وہ ہماری جماعت میں سے نہیں ہے" یہ بھی فرماتے تھے —" تین قسم کے لوگوں کی طرف اللہ قیامت کے دن نہیں دیکھے گا اور نہ انھیں پاکیزہ بنائے گا۔ بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس کے پاس سفر کے راستے میں فالتو پانی ہو اور وہ ضرورت مند مسافر کو نہ دے۔ دوسرا وہ ہے جو اپنے حاکم کے ہاتھ پر بیعت صرف دنیا طلبی کے لئے کرتا ہے چنانچہ اگر وہ اس پر بخشش کرتا ہے تو وہ اس سے خوش رہتا ہے اور اگر اسے کچھ نہیں دیتا ہے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے تیسرا شخص وہ ہے جو عصر کے بعد اپنے سامان کی دوکان لگاتا ہے اور کہتا ہے —" اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے مجھے اس کی قیمت میں اتنی قدر دیا گیا ہے" اس پر کچھ لوگ اس کو سچ مان لیتے ہیں" بعد ازاں آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

" بے شک ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے ذریعے تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں۔ آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اللہ نہ تو ان سے کلام کرے گا۔ اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نگاہ بھر کر دیکھے گا اور نہ انھیں پاکیزہ بنائے گا۔ بلکہ انھیں دردناک عذاب ہوگا"

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو افلاطون کے قوانین اور نہ اہل روما کے قدیم قوانین اور نہ مغرب کے جدید قوانین اسلامی شریعت کے اعلیٰ اخلاقی معیار کا مقابلہ کرسکتے ہیں، یہ وہ اعلیٰ اخلاق ہیں جن پر شریعت نے تمام معاملات اور تصرفات کی بنیاد رکھی ہے بلکہ انسان کا ہر قول و فعل اسی اخلاقی معیار کے مطابق صادر ہوتا ہے۔

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۰۰ مطبوعہ الآداب والمؤید

اسلامی تعزیرات کی وسعت

اسلامی تعزیرات کا دائرہ بہت وسیع ہے اسلام میں سزا کے قوانین کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم وہ ہے جسے شرعی حدود کہا جاتا ہے جس میں بعض جرائم کی سزا شریعت نے مقرر کر دی ہے جیساکہ ہم قرآن و سنت کے احکام میں بیان کر چکے ہیں مثلاً زنا - تہمت، شراب نوشی، چوری اور ڈاکہ زنی کے لئے سزائیں مقرر ہیں۔ مگر وہ سزائیں جو شریعت کی طرف سے مقرر نہ ہوں، انھیں تعزیرات کہا جاتا ہے یعنی اگر کوئی مذکورہ بالا جرائم کے علاوہ کسی اور جرم کا ارتکاب کرے مثلاً جھوٹی گواہی دے، یا کسی مسلمان یا ذمی کو اپنے قول یا فعل سے تکلیف پہونچائے یا کسی کو گالی دے اور اس کی توہین کرے۔ یا وہ اجنبی عورت کی طرف دیکھے اور خلوت میں اس کے ساتھ پکڑا جائے یا اس قسم کی چوری کرے جس میں ہاتھ کاٹنا ضروری نہ ہو تو یہ ایسے جرائم ہیں جن کی شریعت کی طرف سے کوئی خاص سزا مقرر نہیں ہے،

ایسے جرائم اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی سزا فقہاء کرام کے مشورہ سے حکام وقت مقرر کرتے ہیں۔ ان جرائم کی سزا ان کے حالات، جرم کی نوعیت بلکہ خود مجرم کے حالات کو پیش نظر رکھ کر بدلتی رہتی ہے، اسی طرح اسلامی تعزیرات کی حدبندی میں مجتہدین کرام کا بہت بڑا اختلاف ہے تاہم ان اختلافات سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت نہایت سہل پسند، زوردار اور زرخیز ہے بلکہ آزادئ رائے و اجتہاد نے اس کی بنیادوں اور اصولوں کو اس قدر مستحکم کر دیا ہے۔ کہ اس میں تمام مناسب ضروریات کے لئے قوانین موجود ہیں۔

مجرم کو جھڑکنا اور دھمکانا بھی تعزیرات میں شامل ہے تعزیر میں کسی کو قید بھی کیا جا سکتا ہے اور کبھی جلاوطن کر دیا جاتا ہے اسی طرح اس میں زدو کوب اور کوڑوں کی سزا بھی دی جاتی ہے اور اگر فتنہ و فساد بڑھ جائے اور معمولی سزا سے اس کا رفع ہونا ممکن نہ ہو تو قتل کی سزا بھی دی جاتی ہے، مثلاً کوئی شخص مسلمانوں میں تفریق پیدا کرے، یا کتاب و سنت کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دے یا مسلمان ہو کر دشمنوں کے لئے جاسوسی کرتا ہو تو اس صورت میں ایسے مجرموں کو قتل کر دیا جاتا ہے، البتہ مسلم جاسوس کے قتل میں اختلاف ہے، امام مالکؒ اور

امام احمدؒ کے بعض ساتھیوں نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا ہے اور ابن عقیل نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

مالی تاوان

تعزیر میں مالی تاوان اور جرمانوں کی سزا بھی شامل ہے، امام مالکؒ امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ نے اپنے قول میں خاص موقعوں پر اسے جائز قرار دیا ہے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے بھی بعض مواقع پر اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا تھا چنانچہ منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا "وہ شخص جو زکوٰۃ دینے سے انکار کرے، تو اس کا نصف مال ضبط کرنا پروردگار تبارک و تعالیٰ کے عین منشا کے مطابق ہے" نیز ایسے چور سے جس پر حد شرعی جاری نہ ہوسکے۔ دوگنا تاوان وصول کیا جاتا تھا۔ بلکہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اس مقام کو نذر آتش کر دیا تھا جہاں شراب فروخت کی جاتی تھی، اسی طرح یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن وقاصؓ کے اس محل کو جلوا دیا تھا جہاں وہ رعایا سے پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہے تھے۔

ابن رشد کتاب البیان میں فرماتے ہیں: محتسب کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جو کوئی مسلمانوں کی منڈیوں میں فریب دہی کر کے روئی، شہد یا دوسرے سامانِ تجارت میں ملاوٹ کرے تو اس کو سزا دے۔ چنانچہ المدونہ میں امام مالکؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ ملاوٹ والے دودھ کو سزا کے طور پر زمین پر گرا دیتے تھے۔ امام مالکؒ یہ فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ ایسی چیز خیرات کر دی جائے۔ اس طرح دھوکے باز کو سزا بھی مل جائے گی اور غریبوں کو بھی فائدہ پہونچے گا لہٰذا دودھ وغیرہ کو ایسی صورت میں گرایا نہ جائے۔

تعزیر کی کم و بیش حدود مقرر کرنے میں علماء کی یہ چار مختلف رائیں ہیں۔

(۱) امام احمدؒ وغیرہ کے ایک قول کے مطابق دس کوڑوں سے زیادہ تعزیر نہ ہو۔

(۲) امام شافعی کے بعض ساتھیوں اور امام ابوحنیفہ و امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ تعزیر کو حد شرعی کی قریبی حد تک نہیں پہونچنا چاہیے جو چالیس یا اسّی کوڑے ہیں

(۳) کسی جرم و گناہ کی سزا حد شرعی کی مقدار تک نہ پہونچنے پائے لہٰذا کسی اجنبی

عورت کو دیکھے اور اس کے ساتھ اختلاط کرنے کی سزا زنا کی حد شرعی کے برابر نہ ہو، اور نہ اس مال کی چوری کی سزا جس کی حفاظت نہ کی جائے ہاتھ کاٹنے کی سزا کے برابر ہو اور اگر کسی کو تہمت لگائے بغیر گالی دی جائے تو اس کی سزا بھی تہمت کی حد شرعی کے برابر نہ ہونی چاہیئے۔ یہ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے بعض ساتھیوں کا قول ہے،

(۴) بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ (اس کی کوئی حد بندی نہیں ہو سکتی) تعزیرات جرم کی نوعیت اور مصلحت وقت کے مطابق ہوتی ہیں اور ان کا دارومدار ارباب حل وعقد کی رائے اور اجتہاد پر ہوتا ہے ہمارے نزدیک یہی رائے سب سے زیادہ منصفانہ اور قابل تسلیم ہے۔

مسلم حکام کا فرض

بہرحال شرعی حدود کو چھوڑ کر باقی سزاؤں میں اسلامی شریعت نے بہت وسعت رکھی ہے اور ان کا تعین بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے حالات پر موقوف رکھا ہے۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانے میں اسلامی حکومتیں، مغربی قوانین کے مطابق اپنے قوانین وضع کرتی ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلامی شریعت ناقص ہے۔ اور وہ لوگوں کے مفادات کی تکمیل نہیں کر سکتی ہے اور نہ قوموں کی موجودہ سیاست کا ساتھ دے سکتی ہے اسی خیال خام کے مطابق وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں۔ اور اس کے اکثر احکام کی خلاف ورزی کر رہی ہیں حالانکہ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے احکام کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ شریعت کے اصولوں کے مطابق عدل و انصاف کو قائم کریں کیونکہ اس کے احکام ہمیشہ کے لئے حق وصداقت پر مبنی ہیں اور ہر دلیل کے مطابق صحیح ہیں جیسا کہ علامہ ابن القیم نے مفصل بیان کیا ہے[1]

اسلامی حکومتوں کے ارباب حل وعقد اور ان کے علماء کرام کو اس پر غور وخوض کرنا چاہیئے اور انھیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ شریعت اسلامیہ میں عدل و انصاف کے ہر اصول کی گنجائش موجود ہے لہٰذا مسلم عوام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی حکومتوں اور ارباب وعقد کو اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ قوانین وضع کرنے میں خواہ وہ دیوانی ہو یا فوجداری اسلامی شریعت کو اپنا سنگ بنیاد بنائیں اگر اجتہادی احکام میں جدید قوانین سے استفادہ

[1] تعزیرات اور جرم وسزا کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الطرق الحکمیہ صفحات ۱۰۵، ۱۰۶، ۲۲۴، ۲۴۷ مطبوعہ ۱۳۱۷ھ

کیا جائے تو ہم اسے ممنوع قرار نہیں دیتے ہیں بشرطیکہ وہ ہمارے اخلاق اور ماحول کے مطابق ہوں اور ہمارے شرعی اصول کے خلاف نہ ہوں،

اجتہادی احکام کی وسعت

اسلام نے سیاسی، فوجی اور عدالتی احکام میں ارباب اقتدار، حکام، خلفاء و امراء اور سپہ سالاروں کو پورے اختیارات دیئے ہیں تاکہ وہ شریعت کے بنیادوں اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب احکام و قوانین نافذ کریں۔ ان چیزوں کا تعلق عوامی مفادات سے ہے جو زمانے، مقام اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں،

امام مالک کا بھی یہی مسلک ہے علامہ محمد رشید رضا فرماتے ہیں ــــ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگی مہموں کے سپہ سالاروں کو پورا اختیار دیتے تھے کہ وہ مصلحت وقت کے مطابق جیسا چاہیں، حکم نافذ کریں۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک سالار لشکر کو یہ فرمایا تھا ــــ "جب تم قلعہ والوں کا محاصرہ کرو اور وہ یہ چاہیں کہ تم ان کے ساتھ خدائی فیصلہ کے مطابق عمل کرو تو ان کی یہ بات نہ تسلیم کرو بلکہ انھیں خود اپنے فیصلے کو ماننے کے لئے آمادہ کرو کیوں کہ تمھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ ان کے بارے میں خدائی حکم نازل ہوتا ہے یا نہیں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام کو اجتہاد کرنے کا پورا اختیار دیا تھا چنانچہ آپؐ کا فرمان ہے ــــ "اگر کوئی اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے اور وہ صحیح ہو تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔ لیکن اجتہاد کے بعد اس کا فیصلہ غلط ثابت ہو تو اسے ایک گنا ثواب ملے گا[1]

لچک دار قوانین

اسلام نے صرف ان احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو قوموں اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔ مگر جو ایسے جزئی واقعات اور فروعی احکام جو حالات اور قوموں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تو ان کے لئے صرف کلیہ قاعدے اور عام اصول مقرر کئے ہیں تاکہ ہر نسل اور ہر زمانے میں مجتہدین کرام کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے اور وہ ایسے احکام مستنبط کر سکیں جو لوگوں کے مفادات اور ان کی ضروریات

[1] الوحی المحمدی۔ کتاب منزل لاہور

کی تکمیل کر سکیں۔

اسلامی شریعت کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آغاز اسلام سے اجتہاد کی بنیاد پر قائم ہے۔ اجتہاد کا یہ سلسلہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہو کر صحابہؓ اور تابعین اور ان کے بعد کے زمانے میں قائم رہا۔ اسلامی اجتہاد کی یہی وہ خصوصیت ہے جو ہر زمانے میں اسلامی قوانین میں لچک پیدا کر کے اسے زندہ اور تر و تازہ رکھتی ہے اور اس کی بدولت وہ ہر زمانے اور ہر نسل میں اس کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکتا ہے بلکہ اس میں یہ قابلیت موجود ہے کہ وہ جدید تقاضوں اور ضروریات کے مطابق نئے احکام وضع کر سکے اس کی مزید تفصیلات اجتہاد کی بحث میں بیان کی جائیں گی۔

وسیع قانونی نظام

اسلام میں حق کو ثابت کرنے اور اس کا فیصلہ کرنے کے متعدد طریقے موجود ہیں۔ جن میں بہت وسعت رکھی گئی ہے۔ یعنی اسلام میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے اس قدر متعدد طریقے موجود ہیں کہ حکام اور قاضیوں کو انصاف اور امن و امان قائم کرنے اور لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے میں ان سے بہت مدد مل سکتی ہے ان کے ذریعے افراد اور جماعتوں کے حقوق کو بھی اچھی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے، یہ وہ خصوصیت ہے کہ اگر اس پر گہری نظر سے غور کیا جائے تو اس سے شریعت کا یہ کمال ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ہر نسل اور ہر قوم کے مزاج اور طبیعت کے مطابق کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہے۔ یہ ایسے وسیع نظام قانون کی بدولت ہر صورت میں عدل و انصاف کو قائم کر کے لوگوں کو ان کا حق دلا سکتی ہے اور ہر قوم اس کے متعدد طریقوں میں سے کوئی طریقہ اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق اختیار کر سکتی ہے بلکہ حکام اور قاضی ہر مقدمہ میں ان میں سے کسی طریقے پر مناسب حالات اور مناسب ثبوت و علامات کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ اسلامی شریعت نہ تو کسی کی حق تلفی کرتی ہے اور نہ کسی مسلّم حقیقت کو جھٹلاتی ہے اور نہ صحیح علامات اور دلائل کو باطل کرتی ہے بلکہ شریعت کی اصطلاح میں وہ دلائل اور ثبوت جن کے ذریعے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا ہے حق و صداقت کے ترجمان

ہیں [1] خواہ وہ گواہوں کی گواہی ہو یا دوسرے دلائل ہوں اسی طرح دلیل شرعی بھی اقرار و شہادت، قرائن اور حلف سے انکار کی صورت میں جو فیصلہ کرتی ہے وہ بھی حق و صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔

گواہوں کی تعداد حقوق کو ثابت کرنے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے میں جو ثبوت طلب کیا جاتا ہے وہ کبھی چار گواہوں کی صورت میں ہوتا ہے جیسا کہ زناکاری کی صورت میں ہے اور کبھی وہ دو مرد گواہ ہوتے ہیں، اور کبھی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوتی ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک کبھی تین گواہ بھی پیش ہوتے ہیں اور یہ اس صورت میں پیش ہوتے ہیں جب کہ کوئی مالدار شخص اپنے مفلس اور دیوالیہ ہونے کا اعلان کردے جیسا کہ قبیصہ بن مخارق کی حدیث میں مذکور ہے کہ وہ فرماتے ہیں :-

"ایک دفعہ مجھ پر بھاری تاوان ڈالا گیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر سوال کرنے لگا آپ نے فرمایا "توقف کرو یہاں تک کہ ہمارے پاس صدقات آجائیں اس وقت ہم تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔" بعد ازاں آپ نے فرمایا "اے قبیصہ! سوال کرنا صرف ان تین میں سے کسی ایک کے لئے جائز ہے، (۱) کسی پر کوئی بوجھ یا تاوان ڈال دیا جائے تو اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے تاکہ وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے اس کے بعد وہ سوال کرنے سے باز آجائے۔ (۲) کسی پر کوئی ایسی ناگہانی آفت آجائے جس سے اس کا تمام مال تباہ ہو جائے تو اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کا ذریعہ معاش درست ہو جائے (۳) وہ شخص جو فقر و فاقہ میں مبتلا ہو اور اس کی قوم کے تین معتبر آدمی یہ کہہ دیں کہ یہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہے تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے لئے کوئی ذریعہ معاش مہیا ہو جائے ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے سوال کرنا حرام ہے اور جو سوال کرے وہ حرام کھاتا ہے [2]

---

[1] الطرق الحکمیہ از ابن القیم ص ۲۴

[2] علامہ ابن القیم فرماتے ہیں "اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا کہ مفلسی کی صورت میں تین گواہوں سے کم تعداد نہیں قبول کی جا سکتی اور یہی صحیح ہے اور ہمارے علماء نے بھی اس کو پسند فرمایا ہے (باقی ص ۴۰۵)

کبھی ایک گواہ اور مدعی کی قسم کے ذریعے بھی ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ علمار کی ایک بڑی جماعت کی یہی رائے ہے جن میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بھی شامل ہیں کبھی صرف ایک گواہ کافی ہوتا ہے جبکہ مدعی کی قسم کے بغیر اس کی صداقت معلوم ہو جائے۔ سلف صالحین کے قاضیوں کا اس پر عمل تھا جیسے قاضی شریح اور زرارہ بن ابی الاوفی تھے بہرحال قاضی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ حلف اٹھوا کر اس صورت میں مزید تائید حاصل کرے۔[1]

ان معاملات میں جن سے مرد باخبر نہیں ہوتے ہیں۔ ایک عورت بھی گواہ بن سکتی ہے یہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کی رائے بھی ہے جیسے پیدائش عورت کا کنوارپن اور عورتوں کے عیوب ہیں۔ ضرورت کے موقع پر ایک مرد بھی گواہ میں کافی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر چوٹ اور زخموں کے مقدمات میں دو طبیب اور ڈاکٹر نہ ملیں تو ایک طبیب کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے اسی طرح اگر جانوروں کی بیماری کے سلسلے میں اور گواہ نہ ملیں تو ایک بیطار (معالج حیوانات) کی گواہی کافی ہے

بعض دفعہ کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے پچاس قسمیں کھانی پڑتی ہیں جیساکہ قسامۃ[2] میں کیا جاتاہے، کبھی چار دفعہ قسمیں کھائی جاتی ہیں جیسا کہ لعان کا طریقہ ہے لیکن اگر مدعی علیہ قسم کھانے سے انکار کردے تو اس کے برخلاف فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ کبھی ثبوت فراہم کرنے کے لئے مدعی کی طرف حلف لوٹا دی جاتی ہے اور کبھی قاضی کے علم سے ثبوت فراہم ہوتاہے مگر اس میں علمار کا اختلاف اختلاف ہے بعض علمار نے قاضی کو اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت

(بقیہ صفحہ ۴۰۴) ملاحظہ ہو الطرق الحکمیہ ص ۶۷، ۹۶ و تفسیر القرطبی جلد ۸ ص ۱۸۴

[1] الطرق الحکمیہ ص ۷۵

[2] قسامۃ کی تشریح میں اختلاف ہے امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک مقتول کے ورثار میں سے پچاس آدمیوں میں سے ہر ایک قسم کھا کر خون کا کسی کے برخلاف دعویٰ کرتا ہے اسے قسامہ کہتے ہیں مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قسامۃ کا مفہوم یہ ہے کہ جس محلہ میں قتل ہو وہاں کے اہل محلہ کے پچاس آدمی قسمیں کھا کر قتل کے الزام سے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرتے ہیں یہ اہل محلہ مدعی علیہم ہوتے ہیں اور ان پر مقتول کے سرپرست شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں ہر صورت میں اگر پچاس (باقی صفحہ ۴۰۶)

دمی ہے اور بعض نے اس کی مخالفت کی ہے [1]

کبھی کسی مقدمہ کا ثبوت یقینی قرائن اور واضح نشانات و علامات یا قاضی کی فراست اور دانائی کے ذریعے فراہم ہوتا ہے شریعت نے نہ صرف ان چیزوں کو بھی قابلِ اعتبار سمجھا ہے، بلکہ ان کے ذریعے احکام کو ثابت بھی کیا گیا ہے چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔

"بے شک اس میں پہچاننے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں"

دوسری آیت میں ہے — "اگر ہم چاہتے تو ضرور تمھیں (اے پیغمبر) اس کا مشاہدہ کرا دیتے اور تم ان کی پیشانی سے انھیں ضرور پہچان جاتے"

جامع ترمذی میں یہ حدیث مذکور ہے "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور کے ذریعے دیکھتا ہے" پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی — "بے شک اس میں پہچاننے والوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں"

فہم و فراست

حضرت عمر بن الخطابؓ صحابہؓ میں تاڑنے والوں کے استاد تھے ان کی فراست کبھی غلطی نہیں کرتی تھی اس کے علاوہ شرعی عدالتوں کی تاریخ ان واقعات سے بھری ہوئی ہے جن میں مسلمان حکام اور قاضیوں کو اپنی فراست، قرائن اور واضح علامت کے ذریعے کوئی حق بات معلوم ہوتی تھی تو وہ اس کے مخالفانہ اقرار اور شہادت کو اس پر مقدم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ فقہائے کرام نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر حاکم کو گواہوں کے بارے میں شک و شبہ ہو جائے تو وہ ان سے الگ الگ کرکے پوچھ گچھ کرے کہ انھوں نے کیسے شہادت حاصل کی اور کہاں حاصل کی؟ اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے اور اگر وہ اسے اختیار نہ کرے تو گناہ گار ہوگا۔ اور اس کا فیصلہ غیر منصفانہ ہوگا لہٰذا حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے قرائن اور حالات کا پتہ چلائے جن سے مقدمہ کا صحیح فیصلہ کرنے کا راستہ واضح اور روشن ہو سکے کیونکہ اگر حاکم اور قاضی اس قسم کے اسباب و علامات اور صحیح قرائن و حالات کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو تو وہ بہت سے حقداروں کی حق تلفی کرے گا اور ایسے فیصلے کریگا

(بقیہ صفحہ ۴۰۵) آدمی پورے نہ ہوں تو وہ دوبارہ قسمیں کھا کر تعداد پوری کرتے ہیں۔ مترجم [1] نیل الاوطار۔ الفرق

جو عام لوگوں کے نزدیک بھی غلط ہوتے ہیں۔

علامہ ابن القیم کے خیال کے مطابق حاکم اور قاضی میں دو طرح کی فہم و ذکاوت ہونی چاہیے۔

(۱) وہ ان مقدمات کے احکام سے بخوبی واقف ہو جو اس کے سامنے پیش کئے جائیں

(۲) وہ اصل واقعات اور لوگوں کے حالات اور ان کی نفسیات سے باخبر ہو اور جھوٹے اور سچے میں تمیز کر سکے۔ چنانچہ جب کسی آدمی نے ایاس بن معاویہ سے کہا ــ "مجھے قاضی بننے کا فن سکھا دیجئے"۔ تو انھوں نے فرمایا ــ "قاضی کا فن اور اس کا پیشہ سیکھنے سے نہیں آتا۔ بلکہ یہ تو فہم و ذکا اور بصیرت کا کام ہے البتہ تم مجھ سے یہ کہہ سکتے ہو "مجھے علم سکھاؤ"۔"

فراست اور قرائن کے ذریعے فیصلہ کرنے کی مثال میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جبکہ دو عورتوں نے ایک بچّے کی ماں بننے کا دعویٰ کیا۔ اس سے پیشتر حضرت داؤد علیہ السلام بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے تاہم جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئیں۔ تو آپؑ نے فرمایا ــ "چھری لاؤ تاکہ ان دونوں کے درمیان اسے کاٹ کر تقسیم کر دوں"۔ بڑی عورت تو اس پر رضامند ہو گئی مگر چھوٹی عورت نے کہا ــ "اللہ آپؑ پر رحم کرے آپؑ ایسی بات نہ کیجئے یہ بچّہ اسی کو دے دیجئے"۔ یہ دیکھ کر آپؑ نے چھوٹی کے حق میں قرائن سے اندازہ لگا کر فیصلہ کر دیا۔ (کیونکہ اس نے اصل ممتا کی وجہ سے بیٹے کو کاٹنے سے بچا لیا)

حضرت عمر بن الخطابؓ اور صحابہؓ نے ایک دفعہ اس عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا تھا جس کا حمل نمودار ہو گیا تھا اور نہ تو اس کا کوئی شوہر تھا اور نہ اس کا کوئی آقا تھا، چنانچہ ایسے مسئلے میں امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا صحیح مسلک یہی ہے۔ کیونکہ اس میں زناکاری کا قرینہ بالکل واضح ہے [۱]

اسی طرح فقہاء نے یہ کہا ہے کہ اگر یتیم کا کوئی سرپرست عرف و عادت کے مطابق یتیم پر اپنے اخراجات کا دعویٰ کرے تو اس کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے گا۔

---

[۱] الطرق الحکمیہ ص ۵-۶

لیکن اگر وہ معمول سے زیادہ خرچ کا دعویٰ کرے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی

سراغ رسانی

ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس ایک عورت پیش ہوئی وہ ایک انصاری نوجوان پر فریفتہ تھی اور اس سے بہت محبت کرتی تھی مگر جب اس نوجوان نے اس کی محبت کا جواب نہیں دیا تو اس عورت نے اس کے بر خلاف ایک سازش کی، وہ یہ تھی کہ اس نے ایک انڈے کو توڑ کر اس کی زردی پھینک دی، اور اس کی سفیدی اپنے کپڑوں اور رانوں پر مل لی۔ بعد ازاں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس فریاد کرتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ "اس نوجوان نے میرے ساتھ زبردستی کی اور میرے گھر والوں میں مجھے ذلیل و رسوا کیا اور اس کی بداعمالی کے یہ اثرات ہیں" حضرت عمرؓ عورتوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اس کے بدن اور کپڑوں پر منی کے اثرات ہیں" اس پر آپؓ نے اس نوجوان کو سزا دینے کا قصد کیا تو وہ فریاد کر کے کہنے لگا۔ "اے امیر المومنین! کیا آپؓ اس معاملہ کو صحیح سمجھتے ہیں، خدا کی قسم! میں نے نہ کوئی برا کام کیا ہے اور نہ اس کا ارادہ کیا، بلکہ اس عورت نے مجھے بہت ورغلایا مگر میں پاک دامن رہا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے ابوالحسنؓ تم ان دونوں کے معاملے پر غور کرو" چنانچہ حضرت علیؓ نے کپڑے کے نشان کو غور سے دیکھا اس کے بعد آپؓ نے کھولتا ہوا گرم پانی منگوایا اور اسے کپڑے پر ڈالا تو وہ سفیدی جم گئی پھر آپؓ نے اسے لے کر سونگھا اور چکھا تو انڈے کا مزہ معلوم ہوا اس پر آپؓ نے اس عورت کو بہت دھمکایا تو اس نے اپنے جھوٹے بہانے کا اعتراف کر لیا[1]

اس قسم کے واقعات، اپنی حقیقت اور غرض و غایت میں جدید سراغ رسانی کے اصول اور اس کی کوششوں کے مطابق ہیں اسی قسم کا واقعہ ایک یہ بھی ہے کہ حضرت ایاس بن معاویہ کے پاس چار عورتیں آئیں آپ نے انھیں دیکھتے ہی یہ کہہ دیا" ان میں سے پہلی عورت حاملہ ہے۔ دوسری دودھ پلانے والی ہے تیسری شادی شدہ ہے اور چوتھی کنواری ہے۔" لوگوں نے کہا آپ نے کیسے

[1] الطرق الحکمیہ ص ۷۴

پہچانا؟ تو آپ نے فرمایا ۔ "حاملہ عورت جب مجھ سے بات کر رہی تھی تو وہ اپنے پیٹ پر سے اپنے کپڑے کو اٹھا رہی تھی۔ اس لئے مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ حاملہ ہے دودھ پلانے والی عورت اپنی چھاتیوں پر ہاتھ مار رہی تھی تو اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ بچوں کو دودھ پلانے والی ہے۔ شادی شدہ عورت مجھ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی اس طرح مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ شادی شدہ ہے، مگر کنواری عورت جب مجھ سے بات کر رہی تھی تو اس کی نظریں نیچے زمین کی طرف گڑی ہوئی تھیں اس لئے مجھے پتہ چلا کہ وہ کنواری ہے"

شرعی سیاست

اسلامی شریعت کے وسیع قانونی نظام کو ثابت کرنے کے لئے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ ابن القیم جیسے محقق عالم نے اس مقصد کے لئے ایک مخصوص کتاب تحریر کی ہے جس کا نام الطرق الحکمیۃ فی السیاستہ الشرعیۃ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حقوق کو ثابت کرنے کے تمام ذرائع کا تذکرہ کرکے انھیں واضح کیا ہے اور ان کے لئے مذہبی دلائل بھی پیش کئے ہیں اور سلف صالحین میں سے خلفاء۔ قضاۃ اور حکام کے عملی نمونے سے انھیں ثابت کیا ہے لہٰذا اسلامی شریعت کا یہ وہ کارنامہ ہے جس سے ہمارے دور کے قانون داں حضرات بھی اس طرح مستفید ہوسکتے ہیں جس طرح گذشتہ زمانے کے مسلمان قاضیوں اور حکام نے فائدہ اٹھایا تھا۔ انھیں چاہیئے کہ وہ اس آزاد شریعت کو خراج تحسین پیش کریں جو عدل و انصاف کی تکمیل کے علاوہ اور کسی چیز کی پابند نہیں ہے۔ ہماری شریعت انصاف حاصل کرنے کے لئے کسی خاص طریقہ کی پابند نہیں ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا چھوڑ دیا جاتا ہے اس لئے یہ قانون داں حضرات اس سے ہر حالت میں مناسب طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اثبات حق کے لئے جو طریقہ وہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔

اس قسم کا ایک اصول وہ ہے جو سیاست شرعیۃ کے نام سے مشہور ہے اس سے مراد ہر وہ فعل یا طریقہ ہے جس کے ذریعے لوگ بھلائی کے زیادہ قریب آجائیں اور فتنہ و فساد سے زیادہ دور ہو سکیں خواہ وہ طریقہ کتاب و سنت میں مذکور نہ ہو۔ کیونکہ علامہ ابن القیم کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور کتابیں اس لئے نازل فرمائیں تاکہ لوگ انصاف قائم کرسکیں کیونکہ اسی عدل و انصاف

سے زمین و آسمان قائم ہیں، لہٰذا جہاں کہیں بھی عدل وانصاف کی علامات نمودار ہوں اور جس طریقے سے اس کی جلوہ نمائی ہو، وہی اللہ کی شریعت اور دین کا طریقہ ہے کیونکہ انصاف پسند سیاست کبھی شریعت کی مخالف نہیں ہو سکتی وہ اس کی ہمیشہ موافق ہوتی ہے بلکہ وہ شریعت کا لازمی جزو ہے اور اس کے بنیادی مقاصد میں داخل ہے

فقہ اسلامی کی وسعت

اسلامی شریعت کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بہت وسیع اور قانونی معلومات سے مالا مال ہے یہ آزادی رائے کو تسلیم کرتی ہے اس لئے اجتہادی مسائل میں مجتہدین کرام نے خوب موشگافیاں کی ہیں ۔ اسلامی شریعت کی طرف سے ان پر صرف ایک ہی پابندی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ حق وانصاف کے اس مقام پر ٹھہر جائیں جہاں ظلم انسداد ہوتا ہو، لوگوں کے لئے آسانی فراہم ہو اور ان کی مشقت اور تکالیف دور ہوں،

اگر ہم مذکورہ بالا دعوے کو ثابت کرنا چاہیں تو ہمیں بکثرت دلائل ملیں گے جب ہم کتب فقہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران اور ششدر رہ جاتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں فقہار کرام کس قدر دقت نظر اور قوت استدلال کا اظہار کرتے ہیں ۔

ذیل میں ہم بعض مسائل میں علمار کے اختلاف اور ان کے زور استدلال کا کچھ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ فقہ اسلامی کی وسعتوں اور گہرائیوں کا پتہ چل سکے۔

حلف اٹھانے سے انکار

جب مدعی ثبوت پیش کرنے سے عاجز ہو جائے اور اپنا دعویٰ نہ ثابت کر سکے تو مدعی علیہ اس بات کا حلف اٹھائے گا۔ کہ مدعی کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لیکن اگر وہ حلف نہ اٹھا سکے تو کیا اس کے انکار پر فیصلہ اس کے خلاف ہوگا یا نہیں ؟ یہ ایسا معرکہ آرا مسئلہ ہے جس کے بارے میں فقہائے کرام کی چار مختلف رائیں ہیں

(۱) پہلی رائے یہ ہے کہ حلف سے انکار کی صورت میں مدعی علیہ کے خلاف فیصلہ ہوگا یہی حضرت عثمان بن عفان رضؓ کا قول ہے اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی اسی قائل ہیں اور امام احمدؒ بن حنبل کے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی ہے،

حنفی علماء اور ان کے حامی اس سلسلے میں کئی دلائل پیش کرتے ہیں، ایک دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کے ہاتھ اپنا غلام آٹھ سو درہم میں فروخت کیا، فروخت کرتے وقت انھوں نے غلام کے بے عیب ہونے کی ضمانت دی اس کے بعد جس شخص نے اسے خریدا تھا اس نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ کہا — "غلام کو ایک مرض لاحق ہے جس کا آپ نے ذکر نہیں کیا تھا۔" حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا — "اس کو فروخت کرتے وقت میں اس سے بالکل بری الذمہ ہوگیا تھا" مگر حضرت عثمانؓ نے یہ حکم دیا کہ "ابن عمرؓ قسم کھاکر یہ کہیں کہ جب انھوں نے فروخت کیا تھا تو ان کے علم کے مطابق اسے کوئی بیماری نہ تھی" چونکہ حضرت ابن عمرؓ نے حلف اٹھانے سے انکار کیا اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان کے انکار پر ان کے خلاف فیصلہ دیا اور ان کا غلام انھیں لوٹا دیا پھر بھی حضرت ابن عمرؓ نے ان کے فیصلے کو ناپسند نہیں کیا۔

علامہ ابن القیمؒ اس روایت کو بیان کرکے فرماتے ہیں، "ان دونوں حضرات سے بڑھ کر سنت نبویؐ سے کوئی واقف ہو سکتا ہے؟"

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ قسم کے انکار پر آخری فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ مدعی کی طرف قسم لوٹا دی جائے۔ اگر وہ قسم کھائے تو اس کے حق میں فیصلہ ہوگا اور اگر وہ بھی انکار کرے تو اس کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت مقداد بن اسود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، امام اوزاعی، قاضی شریح، ابن سیرین اور امام نخعی اسی کے قائل ہیں [۱] اور یہی امام مالک اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

(الف) مدعی علیہ کے لئے حلف اٹھانا شروع میں اس لئے ضروری ہے کہ ظاہری حالات اس کی تائید کرتے ہیں لیکن جب وہ حلف سے انکار کرتا ہے تو حالات مدعی کے موافق ہوجاتے ہیں اسی لئے اس سے حلف اٹھوایا جاتا ہے کیونکہ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وہ منکر بن گیا ہے۔

---

[۱] الطرق الحکمیہ ص ۱۱۵ و ما بعد

اس کی تردید پہلے مسلک والے اس طرح کرتے ہیں کہ یہ قابل تسلیم نہیں ہے کہ مدعی منکر بن جائے کیونکہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدعی اور منکر متعین نہیں ہیں اور جب تک اس بات کا تعین نہ ہو، اس وقت تک کسی کا حلف اٹھانا ضروری نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ حلف کو مسلسل لوٹایا جائے جو صحیح قاعدہ نہیں ہے،

(ب) یہ ممکن ہے کہ مدعی علیہ حلف اٹھانے سے اس لئے انکار کر رہا ہو کہ وہ حالات اس پر مشتبہ ہو گئے ہوں یا یہ وجہ ہو کہ وہ جھوٹی قسم کھانے سے بچنا چاہتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سچی قسم کھانا بھی پسند نہ کرے لہٰذا ان احتمالات کی وجہ سے قسم سے انکار اس کے خلاف ثبوت نہیں بن سکتا اور محض انکار کی بنا پر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

اس کی تردید میں یہ کہا جاتا ہے کہ مدعی علیہ کے لئے حلف اٹھانا ضروری ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔" جو انکار کرے اس کے ذمے حلف اٹھانا ہے" لہٰذا جو عاقل اور دین دار ہوتا ہے، وہ واجب کو ترک نہیں کرتا ہے، بلکہ اس طریقے سے اپنے آپ کو نقصان سے بچاتا ہے لہٰذا وہ مذکورہ بالا انکار کی وجوہات کی بنا پر اپنی ذاتی نقصان کی مدافعت کو ترک نہیں کر سکتا۔

(ج) امام دار قطنی نے حضرت ابن عمر کی روایت سے یہ بیان کیا ہے ۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کو حقدار کی طرف لوٹا دیا تھا۔" اسی طرح امام شعبی نے یہ روایت کی ہے کہ حضرت مقداد نے حضرت عثمانؓ سے سات ہزار درہم قرض لئے۔ جب انھوں نے اس کا تقاضا کیا تو وہ کہنے لگے ۔" وہ چار ہزار ہیں" اس پر انھوں نے حضرت عمرؓ کے پاس مقدمہ پیش کیا تو حضرت مقداد نے کہا ۔" آپؓ قسم کھا لیجئے کہ وہ سات ہزار ہیں" مگر انھوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ۔" جو اس نے تمھیں دیا ہے وہ لے لو" اس روایت میں حضرت عمرؓ نے حلف کو لوٹانے کا حکم دیا ہے اور حضرت مقداد کی بھی یہ رائے تھی ۔ بلکہ حضرت عثمانؓ نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی،

حنفی علماء اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضرت مقداد پورا دینے کا

دعویٰ کرتے تھے اور حضرت عثمانؓ اس سے انکار کرتے تھے لہٰذا حلف منکر کو پیش کی گئی تھی نہ کہ مدعی کی طرف لوٹائی گئی تھی۔ مگر یہ بعید تاویل ہے،

(۵) شریعت نے ایک گواہ کے ساتھ بھی حلف اٹھانے کا طریقہ مقرر کیا ہے کیونکہ اس نے مدعی کے حق میں صرف ایک شاہد کو کافی نہیں سمجھا ہے بلکہ اس گواہ کی تقویت کے لئے اسے حلف اٹھانی ہوگی اور چونکہ مدعی علیہ نے انکار کر کے مدعی کے گواہ کو کمزور کر دیا ہے اس لئے یہ ضرورت پیش آئی کہ مدعی سے حلف اٹھوا کر اس کے مقدمہ کو تقویت پہونچائی جائے لہٰذا جب مدعی حلف اٹھا لیتا ہے تو مدعی علیہ کے انکار کی وجہ سے اس کا پہلو مضبوط ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی حلف ایک گواہ کے ساتھ مل کر دو گواہوں کے قائم مقام بن جاتی ہے، مگر ان کی یہ دلیل حنفی علماء تسلیم نہیں کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک گواہ اور قسم کے اصولاً قائل نہیں ہیں۔

(۳) تیسری رائے یہ ہے کہ نہ تو انکار حلف پر فیصلہ ہو اور نہ حلف کو مدعی کی طرف لوٹایا جائے بلکہ مدعی علیہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ حلف اٹھائے خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو بلکہ حلف اٹھوانے کے لئے اسے زدوکوب اور قید بھی کیا جا سکتا ہے۔ ابن حزم اور ان کے ساتھیوں نے اس کی تائید کی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نہ تو قرآن وسنت میں اور نہ اجماع کی رو سے یہ بتایا گیا ہے کہ حلف کے انکار پر یا مدعی کی طرف حلف کو لوٹا کر کوئی فیصلہ کیا جائے مگر ان لوگوں کی یہ دلیل کمزور ہے کیونکہ اس کے خلاف مذکورہ بالا دلائل موجود ہیں۔ دوسری وجہ بھی ہے کہ اگر حلف کے انکار پر لوگوں کے مقدمات ملتوی کر دیئے جائیں تو اس سے عوام کی حق تلفی ہوگی اور انھیں قید وبند کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں گی۔ لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ چونکہ مدعی علیہ نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا ہے اس لئے اس کے بری الذمہ ہونے کا پہلو کمزور ہو گیا اور مدعی کا پہلو مضبوط ہو گیا ہے لہٰذا یا تو پہلی رائے کے مطابق انکار حلف پر مدعی علیہ کے خلاف فیصلہ کیا جائے یا دوسری رائے کے مطابق مدعی کی طرف حلف کو لوٹا دیا جائے

(۴) چوتھا قول شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کا ہے اس میں پہلے دونوں

مسلکوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور فریقین کے دلائل کے باہمی اختلاف کو رفع کیا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔" صحابہؓ سے جو روایات انکار حلف اور اعادۂ حلف کے سلسلے میں منقول ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ایک کا جداگانہ محل استعمال ہے۔ یعنی اگر مدعی کو اپنی دعویٰ کردہ معاملہ سے اچھی طرح واقفیت ہو۔ تو مدعی اس کی طرف قسم کو لوٹائے گا۔ تاکہ وہ حلف اٹھا کر اس کا حقدار بن جائے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت مقداد کے مقدمہ میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس موقع پر حضرت مقداد نے حضرت عثمانؓ سے یہ کہا تھا۔ تم قسم کھالو کہ تم نے مجھے سات ہزار دیئے تھے۔ اس کے بعد انھیں وصول کرلو۔" ایسے موقعوں پر مدعی معاملہ سے واقف ہوتا ہے۔ وہ کیسے علم نہ ہو جبکہ اس نے اس بات کا دعویٰ کیا ہو لہٰذا اس حالت میں اگر وہ حلف نہ اٹھائے تو گواہ یا اقرار کے بغیر اس کے حق میں فیصلہ نہ ہوگا مگر ایسے موقع پر جب کہ مدعی اپنے دعوی سے اچھی طرح واقف نہ ہو بلکہ صرف مدعی علیہ ہی سے واقف ہو تو اس صورت میں اگر وہ حلف اٹھانے سے انکار کردے تو فیصلہ اس کے برخلاف ہوگا اور مدعی کی طرف حلف کا اعادہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ غلام کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر اور ان کے حریف کا مقدمہ تھا۔ کیونکہ اس مقدمہ میں حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ حلف اٹھوانی چاہی تھی کہ وہ حلف اٹھا کر یہ کہیں کہ انھوں نے جب غلام کو فروخت کیا تھا۔ تو اس وقت اسے کوئی بیماری نہ تھی یہ بات فروخت کرنے والے کو معلوم ہو سکتی ہے۔ اور ان سے حلف بھی اس بات کی اٹھوائی گئی ہے۔ کہ وہ یہ کہہ دیں کہ انھیں معلوم نہیں ہے لہٰذا جب انھوں نے اس سے بھی انکار کردیا۔ تو ان کے انکار حلف پر ان کے برخلاف فیصلہ کیا گیا[1]

امام احمد بن تیمیہ کی یہ رائے صائب ہے اور اس میں دقیق تفصیلات کو بیان کیا

---

[1] الطرق الحکمیہ ص ۸۶

کیا گیا ہے۔

حمل کی انتہائی مدت

حمل کی انتہائی مدت میں بھی علمار کا اختلاف ہے۔ چنانچہ کوفی علمار یعنی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی یہ کہتے ہیں کہ حمل کی انتہا مدت دو سال ہے، امام لیث بن سعد کے نزدیک تین سال ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک پانچ سال ہے

محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم المصری کا قول ہے کہ حمل کی انتہائی مدت ایک سال ہے [1] اور شیخ داؤد کا قول ہے کہ یہ مدت نو مہینے ہے،

حقیقت یہ ہے کہ حمل کی انتہائی مدت کا ذکر نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنت نبوی میں ہے۔ اس کی مدت کے تعین میں فقہار کرام نے جو کچھ کہا ہے وہ عورتوں کی معلومات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ البتہ حنفی علمار نے اپنی رائے کی بنیاد حضرت عائشہ کے قول پر رکھی ہے انھوں نے یہ فرمایا تھا "بچہ اپنی ماں کے رحم میں دو سال سے زیادہ نہیں رہ سکتا"۔ بہرحال علمار کرام کی دقت نظر اور صحیح مشاہدہ کا ثبوت اس بات سے چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے ایک بڑے عالم ابن عبدالحکیم المصری نے جو انتہائی مدت بتائی تھی اس کی تائید ایک شرعی طبیب نے بھی کی تھی۔ کہ حمل کی مدت ۳۶۵ ایام ہونی چاہیئے تاکہ اس میں شاذ و نادر معاملات بھی شامل ہو سکیں اسی وجہ سے ۱۹۲۹ء کے قانون نمبر ۲۵ کی دفعہ نمبر ۱۵ میں جو احوال شخصیہ کے احکام کے لئے مخصوص ہے اسی مدت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ [2]

ثبوت رضاع میں اختلاف

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ایک عورت پر ثبوت رضاع (دودھ پلانے) کی شہادت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور نہ اس کی وجہ

---

[1] یہ اقوال ابن رشد کی بدایۃ المجتہد میں مذکور ہیں مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آیا قمری سال مراد ہے یا شمسی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قمری سال مراد ہے۔

[2] حصہ دوم بدایۃ المجتہد۔ السراجیہ نیز ملاحظہ ہو قانون مذکور کا تشریحی نوٹ۔

سے انہوں نے زوجین میں تفریق پیدا کی تھی۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے میاں بیوی کے خلاف یہ شہادت دی کہ اس نے ان دونوں کو دودھ پلایا تھا۔ آپؓ نے فرمایا ــــ شہادت اس وقت قبول کی جائے گی جب کہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں،، آپؓ نے مزید فرمایا ــــ اگر ہم یہ دروازہ کھول دیں تو ہر عورت، جو میاں بیوی میں تفریق پیدا کرنی چاہے یہ کام کر سکتی ہے "

حنفی علماء کی بھی یہی رائے ہے کیونکہ ان کے نزدیک اکیلی عورت کی گواہی رضاع میں معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ رضاعی تعلقات قائم ہونے کے بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے اہم معاملات مردوں کی گواہی سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس معاملہ کی اطلاع مردوں کو بھی ہو سکتی ہے۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں ــــ " میری رائے میں نکاح سے پہلے ایک عورت کی شہادت پر رضاعی تعلق ثابت ہو سکتا ہے اور اس کی وجہ سے نکاح کو رد کیا جا سکتا ہے۔ مگر نکاح کے بعد ایک عورت کی شہادت سے نکاح باطل نہیں ہوگا[۱]

امام شافعی کے نزدیک اس صورت میں چار عورتوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت مانی جائے گی۔ امام مالک کے نزدیک صرف دو عورتوں کی شہادت کافی ہے، کیونکہ رضاعت کا ثبوت عورتوں کی چھاتیوں کے نمودار ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ جو اجنبی مردوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ امام احمد کی طرف دو طرح کی روایات منسوب کی جاتی ہیں۔ ایک روایت میں وہ امام مالک کے ہم خیال ہیں۔ اور دوسری مشہور روایت میں وہ فرماتے ہیں۔ کہ رضاعت ایک عورت کی شہادت سے ثابت ہو جاتی ہے اسی لئے ایک دفعہ جب ان سے دریافت کیا گیا ــــ " کیا صرف ایک عورت کی شہادت جائز ہے تو انھوں نے فرمایا ــــ ایسے معاملات ہیں جن سے مرد واقف نہیں ہوتے ہیں جیسے رضاعت اور ولادت ہیں۔ ایک عورت کی شہادت کافی ہے،، انھوں

---

[۱] الطرق الحکمیہ ص ۱۳۸

نے مزید فرمایا "میں ایک عورت کی شہادت کو جائز سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ ثقہ ہو، اور اگر وہ ایک سے زائد ہوں تو میرے نزدیک یہ بہتر صورت ہے"۔[1]

ایک کے بدلے میں جماعت کا قتل

اگر ایک آدمی کو کئی آدمیوں نے مل کر قتل کیا ہو تو کیا اس کے بدلے میں پوری جماعت کو قتل کر دیا جائے۔ یا نہیں؟ اس مسئلے میں بھی علماء کا اختلاف ہے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے کہ اگر ایک جماعت نے مل کر کسی کو جان بوجھ کر قتل کیا ہو یا مسلح ہو کر اس کے قتل پر تعاون کیا ہو تو پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا[2] امام احمدؒ اور صحابہؓ و تابعین کی ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ ان پر دیت واجب ہو گی۔ امام زہری اور دیگر علماء کا یہ مسلک ہے کہ ان میں سے ایک کو قتل کیا جائے گا[3] اور باقی لوگ دیت کے حصوں میں شریک ہوں گے۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ قصاص، مساوات پر مبنی ہے اس لئے ایک کے بدلے میں بہت سے لوگوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "آزاد کے بدلے میں ایک آزاد کو قتل کیا جائے"۔ نیز دوسری آیت میں یہ مذکور ہے "ہم نے ان پر فرض کیا ہے کہ ایک جان کے بدلے میں جان ہے"۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب اوصاف میں تبدیلی ہو جائے تو قصاص نہیں ہوتا ہے جیسے آزاد اور غلام ہوں، لہٰذا تعداد میں اضافہ کی وجہ سے بدرجۂ اولیٰ قصاص نہیں ہو گا۔

پہلا فریق جو ایک کے بدلے میں پوری جماعت کو قتل کرنے کا حامی ہے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتا ہے،

(۱) جب حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کے بدلے میں اہل صنعاء کے سات

---

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۳۸، ص ۸۰، ۱۴۳، وص ۸۷

[2] شیخ داؤد اور فرقہ ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل نہیں کیا جائے گا ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد۔

[3] یعنی اس شخص کا قتل کیا جائے گا جس کے ذریعہ اس کی جان نکلی ہو ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد۔

آدمیوں کو قتل کیا تھا تو فیصلہ صحابہؓ کے اجماع سے ہوا تھا بلکہ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا تھا کہ —" اگر صنعاء کے تمام باشندے مل کر قتل کرتے تو میں ایک کے بدلے میں سب کو قتل کرنے کا حکم دیتا"

حضرت علیؓ نے بھی ایک کے بدلے میں تین آدمیوں کو قتل کرایا تھا۔

(۲) یہ سزا بھی تہمت کی حد شرعی کی طرح ہے (لہٰذا اسی کے مطابق اس کا حکم بھی ہے)۔

(۳) قصاص کی صورت میں دیت نہیں لی جاسکتی۔ کیونکہ دیت قصاص کے بدلے میں ہوتی ہے۔

(۴) (سب سے بڑی دلیل ان کی یہ ہے کہ) اگر مل کر قتل کرنے سے قصاص ساقط ہو جائے تو یہ رعایت، قتل و غارت کا بہت بڑا ذریعہ بن سکتی ہے اور لوگ جان بوجھ کر اکیلے آدمی کو قتل کر دیا کریں گے۔ [۱]

ذمی کے بدلے میں مسلمان کا قتل

کیا ذمی کے بدلے میں ایک مسلمان کو قتل کیا جاسکتا ہے؟ اس بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد کا قول یہ ہے کہ ذمی کے بدلے میں کسی مسلمان کا قتل نہیں ہوگا۔ اس کے ثبوت میں وہ بخاری شریف کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ جس میں یہ مذکور ہے —" کافر کے بدلے میں کوئی مسلمان قتل نہیں ہوگا۔

بدایۃ المجتہد میں مذکور ہے —" امام مالک اور لیث بن سعد فرماتے ہیں۔ ذمی کے بدلے میں کوئی مسلمان قتل نہیں ہوگا۔ بجز اس صورت کے کہ جب وہ اسے ناگہانی طور پر مار ڈالے"

حنفی علماء یہ کہتے ہیں کہ ذمی کے بدلے میں مسلمان واجب القتل ہے، اس کے ثبوت میں وہ کئی دلائل پیش کرتے ہیں، ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے —" جو مظلوم قتل کیا جائے گا تو اس کے سرپرست کو قصاص لینے کا اختیار حاصل ہے۔ دوسری آیت میں بھی یہ ارشاد فرمایا ہے —" ہم نے ان پر فرض

---

[۱] حصہ چہارم الفروق از قرافی ص ۱۸۳ مطبوعہ تونس

کردیا ہے کہ جان کے بدلے میں جان ہو" اسی طرح دیگر آیات میں عام حکم ہے۔
پہلی رائے والے ائمہ کرام، حنفی علماء کے ان دلائل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جن آیات سے انھوں نے استدلال کیا ہے ان میں عام حکم ہے اور یہ لوگ اپنے ثبوت میں جو حدیث پیش کر رہے ہیں وہ خاص ہے اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ خاص کو عام پر مقدم کیا جاتا ہے، [۱]

قاتل کا مددگار

اگر کوئی شخص مقتول کو پکڑے رکھے اور دوسرا آدمی اسے قتل کرے تو کیا روکنے والے کو قتل کیا جائے گا یا نہیں؟
اس بارے میں امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک ہے کہ پکڑنے والا واجب القتل نہیں ہے، بلکہ صرف قاتل کو قتل کیا جائے گا۔
امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ پکڑنے والے کو بھی مار ڈالا جائے گا اس بارے میں ان کے دلائل وہی ہیں جو اوپر جماعت کے قتل کے بارے میں مذکور ہوتے ہیں۔ بالخصوص حضرت عمرؓ کا یہ قول قابل حجت ہے ــــ "اگر تمام اہل صنعاء اس کے قتل میں شریک ہوتے تو میں اس کے بدلے میں ان سب کو مار ڈالتا نیز انھوں نے اس پر بھی قیاس کیا ہے کہ اگر کوئی حرام شکار کو صرف پکڑے تو اس پر بھی سزا ہے [۲]
حضرت علیؓ کا مسلک یہ تھا کہ پکڑنے والے کو عمر قید کی سزا دی جائے، یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ امام احمدؒ اسی کے قائل ہیں چنانچہ کتاب "الطرق الحکمیۃ" کے صفحہ ۵۰ میں یہ مذکور ہے:-
"ایک شخص نے کسی آدمی کو قتل کرنا چاہا تو وہ اس کے پاس سے بھاگ نکلا مگر دوسرے آدمی نے اسے پکڑ کر روکے رکھا، یہاں تک کہ قاتل نے آکر اسے قتل کر دیا۔ اس کے قریب ایک آدمی انھیں دیکھ رہا تھا اور وہ مقتول کو چھڑا سکتا تھا مگر وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے قتل کا نظارہ کرتا رہا۔ جب حضرت علیؓ کے پاس یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپؓ نے حکم دیا کہ قاتل کو قتل کر دیا جائے اور پکڑنے

---

[۱] حصہ چہارم الفروق از قرافی ص ۱۸۴

[۲] الفروق از قرافی جلد چہارم ص ۱۸۴

والے کو ہمیشہ کے لئے قید کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ مرجائے اور وہ شخص جو صرف تماشائی کی حیثیت سے کھڑے ہو کر دیکھتا رہا اور اس نے اس فعل کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھ پھوڑ دی جائے۔ لہٰذا امام احمد بن حنبل وغیرہ اس فیصلہ پر صاد کرتے ہیں مگر وہ تماشائی کی آنکھ پھوڑنے کے قائل نہیں ہیں غالباً حضرت علیؓ نے مفاد عامہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ سزا دی تھی۔

مرض موت میں طلاق

جب کوئی بیمار آدمی اپنی بیوی کو طلاق بائن دے اور پھر اسی بیماری کی حالت میں مرجائے تو کیا ایسی حالت کی مطلّقہ عورت، میراث کی حقدار ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں امام شافعیؒ اور ان کی جماعت کی یہ رائے ہے کہ وہ وارث نہیں ہو سکتی. کیونکہ طلاق واقع ہو گئی۔ اس لئے اس کے تمام احکام اس پر منطبق ہوں گے۔ چنانچہ اگر وہ عورت شوہر سے پہلے مرجائے تو شوہر بھی اس عورت کا وارث نہیں بن سکتا لہٰذا جب طلاق کے تمام احکام اس پر منطبق ہوتے ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شریعت میں ایک خاص نوعیت کی طلاق ایسی ہے جس میں بعض احکام طلاق کے پائے جاتے ہیں اور بعض احکام زوجیت کے بھی اس پر منطبق ہوتے ہیں چونکہ یہ جماعت قواعدِ فقہیہ کے قاعدہ "انسداد ذرائع" کو تسلیم نہیں کرتی ہے اور اس کی رائے میں طلاق ہر حالت میں واقع ہو جاتی ہے اس لئے خواہ مرض موت میں ہی طلاق بائن دی جائے۔ مطلّقہ عورت کسی حالت میں بھی میراث کی حق دار نہیں ہو سکتی۔ مگر اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی مطلّقہ عورت، میراث کی حقدار ہے کیونکہ وہ سدّ ذرائع کے قاعدہ پر عمل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں یعنی جب مریض نے مرض موت میں اپنی بیوی کو طلاق دی ہو تو اس پر یہ الزام لگ سکتا ہے کہ اس نے اس لئے طلاق دی ہے کہ اسے میراث کے حصے سے محروم کیا جائے ان لوگوں میں بھی آگے چل کر اس مسئلہ کی تفصیلات میں اختلاف ہے اور میراث کے سلسلے میں ان کی تین رائیں ہو گئی ہیں۔

(۱) امام ابو حنیفہؒ ان کے ساتھی اور امام ثوری یہ کہتے ہیں کہ جب تک وہ عدت میں ہو میراث کی حقدار ہے کیونکہ عدت کی وجہ سے زوجیت کا تعلق باقی رہتا ہے

اس طرح انھوں نے ایسی مطلقہ عورت کی طلاق کو طلاق رجعی کے مشابہ قرار دیا ہے یہی رائے حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی ہے۔

(۲) امام احمد بن حنبل اور ابن ابی لیلیٰ کا یہ قول ہے کہ جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے اس وقت تک وہ میراث کی حقدار ہے۔

(۳) امام مالک اور لیث بن سعد کا یہ مسلک ہے کہ وہ ہر حالت میں وارث ہوگی خواہ وہ عدت میں ہو یا نہ ہو یا وہ شادی دوبارہ کرے یا نہ کرے۔

مالکی علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ ایسی مطلقہ عورت کے وارث ہونے پر صحابہؓ کا اجماع ہے مگر یہ دعویٰ قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ اس بارے میں حضرت زبیر کا اختلاف مشہور ہے [۱]۔

شراب کی حد شرعی

قرآن کریم نے کھلم کھلا شراب کو حرام قرار دیا ہے اور سورہ مائدہ میں تاکیداً اس کی حرمت بیان کی ہے اور اس سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، مگر شرابی پر کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی گئی ہے، جیسا کہ زنا، تہمت اور سرقہ کی سزا مقرر ہے۔ البتہ سنت نبویؐ اور اقوال صحابہؓ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء راشدین کا اس بارے میں طرز عمل بتایا گیا ہے۔ بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے شراب نوشی پر کوئی خاص حد شرعی نہیں مقرر فرمائی۔ [۲]

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے شرابی کو کھجور کی شاخوں اور جوتیوں سے مارا۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے چالیس [۴۰] کوڑوں کی سزا دی [۳]۔ یہ روایت بھی مذکور ہے کہ آپؐ کے پاس ایک شرابی کو لایا گیا تو اسے آپؐ نے کھجور کی دو شاخوں سے چالیس [۴۰] مرتبہ مارا اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا بھی یہی طرز عمل رہا جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے لوگوں سے مشورہ کیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا:—

---

[۱] حصہ دوم بدایۃ المجتہد از ابن رشد ص ۷۲ مطبوعہ ۱۳۳۹ھ

[۲] نیل الاوطار جلد ۷ ص ۱۱۹ - فتح الباری جلد ۱۲ ص ۵۸ مطبوعہ ۱۳۴۸ھ

[۳] نیل الاوطار جلد ہفتم ص ۱۱۲ - فتح الباری جلد ۱۲ ص ۵۲۔

"سب سے ہلکی سزا اسی کوڑے ہیں" لہٰذا حضرت عمرؓ نے اسی پر عمل کیا[1]
کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے شراب نوشی کی سزا میں اس لئے اضافہ کیا کہ انہی کے عہد خلافت میں حضرت خالد بن ولید نے یہ تحریر کیا تھا ـــــ "لوگ شراب نوشی میں مشغول ہو گئے ہیں اور وہ اس کی سزا کو بہت معمولی سمجھتے ہیں" اس لئے آپؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد اس کی سزا اسی کوڑے مقرر فرمائے"
حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ ـــــ "شراب نوش اگر چوتھی یا پانچویں دفعہ اس جرم کا ارتکاب کرے، تو اسے مار ڈالا جائے کہتے ہیں کہ ابتدا میں قتل کا حکم دیا گیا تھا بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔
ان تمام روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شراب نوشی کی حد شرعی کے بارے میں مجتہدین کرام کی چھ مختلف رائیں ہو گئی ہیں[2] جو مندرجہ ذیل ہیں۔
(۱) بعض اہل علم کی یہ رائے ہے کہ شراب نوشی کے لئے کوئی خاص حد شرعی مقرر نہیں ہے بلکہ اس کی سزا تعزیرات کے ماتحت ہے (جو حاکم وقت کی رائے کے مطابق بدلتی رہتی ہے) ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے کوئی حد شرعی مقرر نہیں فرمائی تھی بلکہ آپؐ شرابی کے حالات کے مطابق سزا دیتے تھے۔ جیسا کہ امام زہری کی روایت ہے ـــــ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی کے لئے کوئی حد شرعی مقرر نہیں فرمائی بلکہ آپؐ حاضرین کو حکم دیتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں اور جوتیوں سے اسے ماریں۔ یہاں تک کہ آپؐ پھر یہ حکم دیتے تھے ـــــ مارنا بند کردو" جب حضرت عمرؓ کے عہد میں شراب نوشی کی کثرت ہو گئی تو انھوں نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی سزا مقرر ہوتی تو سب لوگ اس پر قائم رہتے۔ جس طرح وہ تہمت کی حد شرعی کے پابند رہے خواہ تہمت لگانے والوں کی کثرت ہو جائے اور وہ فحش گوئی میں حد سے زیادہ مبتلا ہو جائیں۔ اس دلیل کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ شرابی کو کوڑے مارنے کی سزا پر تمام صحابہؓ کا اجماع تھا۔ لہٰذا کوڑے مارنے

---

[1] فتح الباری جلد ۱۲ ص ۵۲
[2] فتح الباری جلد ۱۲ ص ۶۱ ـ ۶۲ ، نیل الاوطار جلد ہفتم ص ۱۱۹ ـــ ۱۲۰

کی مطلق سزا پر اتفاق کرنے کے بعد ان کا اختلاف محض کوڑوں کی تعداد میں تھا۔

(۲) امام احمد بن حنبل، امام داؤد ظاہری اور امام شافعی کی مشہور رائے یہ ہے کہ شراب نوشی کی حد شرعی چالیس کوڑے ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یہی سزا مقرر تھی اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت علیؓ نے اس کی طرف رجوع کر لیا تھا۔

(۳) تیسری رائے بھی دوسری رائے کے مطابق ہے مگر اس میں یہ ترمیم کی گئی ہے، کہ حاکم وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس تعداد کو اسّی کوڑوں تک پہونچا دے،

(۴) امام مالکؒ، لیث بن سعدؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی نیز ایک روایت کے مطابق امام شافعیؒ کا یہ مسلک ہے کہ نشہ باز کی حد شرعی اسّی کوڑے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد اسّی کوڑے مقرر کئے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

(۵) پانچویں رائے بھی چوتھی رائے کی مانند ہے مگر اس میں اس قدر اضافہ کیا گیا ہے کہ تعزیر کے طور پر اسّی کوڑوں سے زیادہ مارنا بھی جائز ہے،

پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا زدوکوب کوڑوں سے کیا جائے یا لکڑی کھجور کی شاخوں، جوتیوں یا کپڑوں کے اطراف سے زدوکوب کیا جائے

(۶) بعض اہل ظاہر کی یہ رائے ہے کہ وہ شخص جو تین مرتبہ شراب نوشی کا مرتکب ہو اور اسے تینوں مرتبہ کوڑوں کی سزا دی گئی ہو اور پھر وہ چوتھی مرتبہ اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کا قتل کرنا واجب ہے بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اگر پانچویں مرتبہ اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس صورت میں اس کا قتل کرنا واجب ہے، ابن حزم نے بھی اس کی تائید کی ہے اور انھوں نے قتل نہ کرنے پر اجماع کے دعوے کی تردید کی ہے (یہ لوگ اپنے دعوے میں وہ حدیث پیش کرتے ہیں جو مذکور ہو چکی ہے

جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ شراب نوش کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ قتل کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم میں اس مسئلے پر کوئی

---

[1] فتح الباری

اختلاف نہیں ہے [1]

زیور کی زکوٰۃ میں اختلاف

زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں بھی اختلاف ہے چنانچہ امام مالکؒ اور ان کے ساتھیوں امام احمدؒ اسحاق، ابوثور اور ابوعبید کی یہ رائے ہے کہ زیور میں زکوٰۃ نہیں ہے جب تک امام شافعیؒ عراق میں رہے ان کی بھی یہی رائے تھی مگر جب وہ مصر چلے گئے تو انھوں نے اس مسئلے میں توقف فرمایا۔ اور کہنے لگے " میں اس مسئلہ میں اللہ سے استخارہ کروں گا "

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں ثوریؒ، اور امام اوزاعیؒ کی یہ رائے ہے کہ زیور میں بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ لیث بن سعدؒ نے زیور کی قسموں میں فرق رکھا ہے انھوں نے ان زیوروں پر زکوٰۃ واجب رکھی ہے جو زکوٰۃ سے بچنے کے لئے بنوائے جائیں۔ اور وہ زیور جو عام طور پر پہنے جاتے ہوں یا پہننے کے لئے مستعار دیئے جاتے ہوں ان میں وہ زکوٰۃ کو واجب نہیں سمجھتے۔

امام مالکؒ اور ان کے ہم خیالوں کی دلیل یہ ہے کہ جہاں نشو و نما اور بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہاں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لیکن جب سونے چاندی کے زیور بنوالئے تو ان میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رہتی ہے امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ سونے اور چاندی میں زکوٰۃ کو فرض قرار دینے کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ عام ہیں ان میں زیورات کو مستثنیٰ نہیں قرار دیا گیا ہے۔ [2]

مذکورہ بالا مسائل میں علماء کے اختلاف سے ان کے زور بیان اور استدلال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان فقہاء اجتہاد کی آزادی کے انتہائی درجے تک پہونچ گئے تھے اگر اسلامی شریعت جامد اور تنگ نظر ہوتی تو اس قدر اظہار خیال کی آزادی نہ ہوتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی شریعت

---

[1] نیل الاوطار جلد ہفتم ص ۱۴۴

[2] الجامع احکام القرآن از قرطبی جا ہشتم ص ۱۰۲ مطبوعہ دار الکتب المصریۃ
مزید تفصیل کے لئے کتب فقہ ملاحظہ فرمائی جائیں۔

نے عقل کو آزاد کیا اور اسے توہمات کی غلامی سے چھڑایا

اسلام اور حقوق نسواں عورتوں کے حقوق و معاملات میں اسلامی شریعت نے ہمہ گیر اصلاح کی ہے۔ اس سے پیشتر عورت ظلم و استبداد، جور و ستم اور جہالت کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھی اسلام نے آکر اسے اس بارگراں سے نجات دی اور اس کے لئے ایسے حقوق و فرائض مقرر کئے جس سے اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور نہ صرف وہ قوم کے جسم کا کارآمد عضو بن گئی بلکہ سماجی تعمیر کے لئے بھی مستحکم ستون ثابت ہوئی

اس باب میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ نسوانی معاملات میں اسلام کی ہمہ گیر اصلاحات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے اور نہ یہاں ایسے تمام حقوق کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو اسلام نے اسے عطا کئے ہیں اور جو اس سے پیشتر اس کو کسی قانون یا شریعت نے عطا نہیں کئے تھے۔ چونکہ خاص اسی موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں[1] لہٰذا ہم اسلام کی اس اہم خصوصیت کو واضح کرنے کے لئے صرف ضروری باتوں پر اکتفا کرتے ہیں

اسلام سے پہلے عورت کی حالت صحیح تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کی تمام قوموں میں عورت کی حالت ناقابل برداشت تھی، وہ جور و ستم اور غلامی کے ایسے خطرناک مصائب برداشت کرتی تھی جو اس کی انسانیت کے قطعی منافی تھے، اور سماج میں اس کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ جانوروں اور تجارتی سامان کی طرح فروخت کی جاتی اور خریدی جاتی تھی۔[2] بلکہ میراث ہی میں منتقل ہوتی تھی، مگر خود کسی چیز کی وارث نہیں بنتی تھی۔ اسے شادی اور بدکاری پر مجبور کیا جاتا تھا وہ دوسروں کی ملکیت میں منتقل ہو جایا کرتی تھی مگر خود اس کی ملکیت میں کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی قوم اسے ملکیت کا حق بھی دے دیتی تھی تو وہ اس پر یہ پابندی لگاتی تھی کہ وہ مرد

---

[1] اس موضوع پر یہ کتب قابل مطالعہ ہیں۔ (۱) نداء للجنس اللطیف از سید محمد رشید رضا علاء الدین الاسلامی از مولف کتاب (حسن) محمد المجذوب۔) یہ کتاب انھوں نے اپنے شاگردوں کے لئے لکھی ہے۔

[2] ترجمہ الوحی المحمد مطبوعہ کتاب منزل لاہور

کی اجازت کے بغیر اپنی ملکیت میں تصرف نہ کرے لیکن شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ بیوی کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرسکتا ہے، اس زمانے کا بڑے سے بڑا قانون بھی باپ کو یہ اجازت دیتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو فروخت کر سکتا ہے، اسی طرح عرب کے بعض قبائل کا یہ خیال تھا کہ باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو قتل کر دے۔ یا اسے زندہ زمین میں گاڑ دے، بلکہ بعض لوگوں کی یہ رائے بھی تھی کہ اگر مرد، عورت کو قتل کردے تو نہ تو اس سے قصاص لیا جائے اور نہ اس پر دیت دینی واجب ہے بلکہ روم کے ایک مجمع نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ عورت، ناپاک حیوان ہے اور اس کے اندر روح نہیں ہے اور نہ وہ ہمیشہ رہ سکتی ہے لہٰذا اس کا فرض یہی ہے کہ وہ خدمت کرتی رہے بلکہ اونٹ اور دیوانے کتے کی طرح اس کا منہ باندھ دیا جائے تاکہ وہ نہ تو ہنس سکے اور نہ بول سکے کیوں کہ وہ شیطانی جال ہے۔

جب اسلام آیا تو اس نے عرب اور عجم کے ان تمام مظالم کا خاتمہ کیا جو جہالت کی وجہ سے عورتوں کو غلام بنا کر ان پر روا رکھے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور سنت نبوی کے ذریعے اسے وہ تمام حقوق دیئے جو مردوں کو عطا کئے گئے تھے۔ البتہ وہ کام جو نسوانی فطرت اور اس کے مزاج کے خلاف تھے مردوں کے لئے مخصوص رہے۔ لیکن اس کے باوجود عورتوں کی عزت و احترام اور ان سے حسن سلوک کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

اسلامی حقوق نسواں

اس زمانے میں جبکہ دنیا اور یورپ کے لوگ عورت کو بے زبان جانور یا شیطان سمجھتے تھے اور اسے انسانی جنس سے الگ خیال کرتے تھے۔ قرآن کریم نے آکر یہ واضح کیا کہ عورت اور مرد ایک ہی جنس سے ہیں۔ بلکہ انسانیت کی تکمیل ان دونوں کے تعاون کے بغیر نہیں ہوسکتی چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے،

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبائل میں اس لئے تقسیم کیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (ورنہ) درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے شریف ترین انسان وہی ہے جو تم میں سب سے

زیادہ پرہیزگار ہو" دوسری آیت میں مذکور ہے
"اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس میں سے ان کا جوڑا بنایا اور ان دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتوں کا اضافہ کیا" حدیث میں بھی مذکور ہے کہ عورتیں مردوں کا لازمی حصہ ہیں۔

مذہبی مساوات

(۲) یورپ وغیرہ میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کا کوئی صحیح دین وایمان نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ اسے مقدس کتابوں کے مطالعہ سے محروم رکھتے تھے۔ بلکہ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کی روح غیر فانی نہیں ہے اس لئے وہ بہشت میں مومن مردوں کے ساتھ رہنے کی مستحق نہیں ہے۔ مگر اسلام نے آکر مرد اور عورتوں کو مساوی حیثیت سے خطاب کیا تاکہ وہ دونوں مذہبی فرائض کی یکساں پابندی کریں۔ اور یہ بھی واضح کردیا کہ فریقین میں سے ہر ایک کو یکساں عذاب وثواب ہوگا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے
"مرد یا عورت میں سے جو کوئی مومن ہو اور نیک کام کرے تو ہم ضرور اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔ اور ہم انہیں اس کا ثواب اس سے بہتر دیں گے جس قدر وہ کام کرتے تھے"
"اللہ نے مومن مرد اور مومن عورتوں کے لئے بہشت کا وعدہ کیا ہے جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جنت میں ان کے لئے پاکیزہ گھر ہوں گے اور اللہ کی رضامندی بھی حاصل ہوگی جو سب سے بڑی بات ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے"
"نہ تمہاری آرزو (پوری) ہوگی اور نہ اہل کتاب کی آرزو (پوری) ہوگی، جو برا کام کرے گا۔ اسے اس کا بدلہ ملے گا۔ اور وہ اللہ کے علاوہ اور کسی کو اپنا سرپرست اور مددگار نہیں پائے گا اور مرد و عورت میں سے جو کوئی مومن اور مومنہ نیک کام کرے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا جائیگا"

فرائض میں مساوات

(۳) اللہ نے مذہبی فرائض میں جیسا کہ عبادات ہیں مرد و عورت میں مساوات قائم کی ہے البتہ نسوانی فطرت کے خلاف جو احکام ہیں ان میں فرق رکھا ہے نیز جو بری چیزیں مردوں کے

لئے حرام ہیں وہی چیزیں عورتوں کے لئے بھی حرام ہیں، اور مردوں کی طرح ان کے لئے بھی ثواب و عذاب کا وعدہ ہے، کیونکہ دونوں انسانیت میں برابر ہیں اور ایک کو دوسرے پر صرف اپنے اخلاق اور نیک اعمال کی وجہ سے برتری دی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی (اور کہا) میں تم میں سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا ہوں۔ تم میں سے ہر ایک یکساں ہے"
دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے ـــــ "بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں، مومن مرد اور مومن عورتوں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتوں، سچے مرد اور سچی عورتوں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتوں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتوں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتوں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتوں، پاک دامن مرد اور پاک دامن عورتوں، اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا ذکر کرنے والی عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور بہت ثواب مقرر کیا ہے"۔

عورتیں مذہبی شعائر اور اجتماعی عبادتوں میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی ہیں جیسا کہ باجماعت نماز، جمعہ کی نماز اور عیدین کی نماز ہے، شریعت میں ان کے لئے ان مذہبی اجتماعات میں شرکت کی اجازت دی گئی ہے مگر ان کی سہولت کے لئے یہ شرکت ان کے لئے واجب نہیں البتہ مردوں کی طرح حج کے اجتماعی مراسم میں شرکت کرنا ان کے لئے ضروری ہے۔

قومی کاموں میں شرکت

(۴) اسلام نے عورتوں کو سماجی اور سیاسی کاموں میں حصہ لینے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ انھیں حکم دیا ہے کہ وہ مومنوں کے ساتھ مل کر تبلیغ اسلام کریں نیک کام کا حکم دیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روکیں۔ مردوں کے سماجی اور مالی کاموں میں تعاون کریں نیز سیاسی اور جنگی کاموں میں ان کی مدد کریں [۱] البتہ شریعت نے ان کے لئے جنگ کرنا ضروری نہیں رکھا ہے مگر جب ملک پر دشمن حملہ کرے تو ان کا کام یہ ہوگا کہ وہ پانی

[۱] ندا اللجنس اللطیف۔ از رشید رضا

پلائیں، کھانا تیار کریں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے
"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار رہیں، وہ نیک کام کا حکم دیتے ہیں۔ اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ نیز اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا بے شک اللہ عزت والا اور حکمت والا ہے"

ان تبلیغی احکام میں خلفاء راشدین، بادشاہوں اور حکام پر تنقید کرنا بھی شامل ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے جب یہ مشاہدہ فرمایا کہ عورتوں کے مہر بہت زیادہ باندھے جا رہے ہیں تو آپؓ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اس لئے آپؓ نے منع کیا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر نہ بڑھایا جائے۔ اس پر قریش کی ایک عورت نے اعتراض کیا اور وہ کہنے لگی :۔

"کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے ۔۔۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک کو خزانہ دیدو تو اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لو۔" حضرت عمر رضؓ نے یہ سن کر فرمایا ۔۔۔ "اے اللہ معاف فرما! ہر آدمی عمرؓ سے زیادہ سمجھدار ہے" ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں ۔۔۔ "ایک عورت نے صحیح بات کہی اور عمرؓ نے غلطی کی" یہ کہہ کر اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

تعلیم نسواں

(۷) خواتین کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیم حاصل کرنے میں عورتیں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، یہاں تک کہ بہت سی خواتین احادیث اور آثار نبویؐ کی روایت کرتی تھیں اور ان میں بہت سی خواتین ادیبہ اور شاعرہ بھی ہوتی تھیں نیز دیگر علوم و فنون میں بھی مسلم خواتین مشہور ہوئیں۔ بلکہ شرعی احکام کی پابندی میں نیز حدیث اور شعر و ادب کے فنون میں وہ بے شمار خواتین اور مردوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔

ایک حدیث میں یہ مذکور ہے ۔۔۔ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے" گو اس حدیث میں مسلمہ کا لفظ نہیں ہے لیکن علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اس حکم میں مسلمان خواتین بھی شامل ہیں۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

تعدد ازدواج کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی ازواج مطہراتؓ خواتین کے لئے تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دے سکیں۔ بلکہ مرد بھی مشکل شرعی احکام معلوم کرنے کے ان کی طرف رجوع کرتے تھے بالخصوص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو اس کام کے لیئے مخصوص تھیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواتین کی تعلیم و تربیت کا خیال اس قدر دامن گیر تھا۔ کہ آپؐ لونڈیوں کی تعلیم و تربیت دینے کے لئے بھی اسی طرح لوگوں کو توجہ دلاتے تھے جس طرح آپؐ انھیں آزاد کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے ــــ "جس آدمی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے۔ اس کے بعد اسے آزاد کرکے اس کے ساتھ نکاح کرلے تو اسے دوہرا ثواب ملے گا۔

نکاح کی آزادی

خواتین کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق جس سے چاہے نکاح کریں اور جس کو پسند نہ کریں، اس کی درخواست کو رد کردیں۔ بلکہ وہ اپنے سرپرستوں کو اس شخص کے ساتھ شادی کرنے سے روک سکتی ہیں۔ جنھیں وہ پسند نہ کرتی ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہم پلہ خاندان ہی میں نکاح کریں۔ اور اس سے باہر نکاح نہ کریں خواہ ان کے سرپرستوں کی مرضی کیوں نہ ہو تاکہ یہ بے جوڑ شادی خاندانوں میں دشمنی اور عداوت کا سبب نہ بن سکے۔ تاہم سرپرستوں کو بلکہ خود والد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اگر کوئی لڑکی اپنے ہم پلہ مرد سے شادی کرنا چاہتی ہو تو وہ اسے نکاح سے روک دیں۔

اس حکم کی اصل دلیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے۔

"بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے مشورہ نہ کرلیا جائے اور کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ حاصل کرلی جائے" لوگوں نے کہا ــــ "یا رسول اللہؐ! اس کی اجازت کیسے حاصل کی جائے" آپؐ نے فرمایا ــــ "خاموشی (اس کی اجازت ہے)" دوسری حدیث میں مذکور ہے۔

"بیوہ عورت اپنے سرپرست سے زیادہ اپنی ذات کی مختار ہے بلکہ کنواری عورت

سے بھی اجازت حاصل کی جائے۔ اور اس کا خاموش رہنا ہی اس کی اجازت ہے۔"

اگر کسی کی زبردستی شادی کردی جائے اور اس میں اسے فریب نظر آئے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ رشتۂ زوجیت کو توڑ دے، چنانچہ یہ روایت مذکور ہے کہ خنساء بنت خذام الانصاریہ کے باپ نے اس کی شادی کی جبکہ وہ بیوہ تھی۔ اس نے اس رشتہ کو ناپسند کیا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، آپؐ نے اس کا نکاح فسخ کردیا۔

ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ بھی ہے کہ ایک نوجوان عورت آپؐ کے پاس آئی اور کہنے لگی "میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کردیا ہے تاکہ میرے ذریعے وہ اپنی کمتری کو دور کرے" آپؐ نے اس عورت کو اپنے معاملے کا اختیار دے دیا، اس پر اس نے کہا "میرے باپ نے جو کچھ کیا ہے میں نے اسے منظور کرلیا ہے، لیکن میں عورتوں کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ان کے والدین کو اس بارے میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے (وہ عورتوں کی مرضی کے بغیر زبردستی ان کی شادی نہیں کرسکتے)

اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کو بہت بڑی نشانی اور بہت بڑی نعمت قرار دیا ہے۔ اور اپنی آیات میں اس کی حکمتوں اور فوائد کی طرف اشارے کئے ہیں چنانچہ فرمایا گیا:-

"اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تم میں سے تمہاری بیویاں تمہارے لئے پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کی۔

میراث میں حق

(۷) اسلام نے میراث میں خواتین کا حق قائم کیا اور انھیں میراث سے محروم رکھنے کے مظالم کا خاتمہ کردیا گیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"مردوں کا اس (مال) میں حق ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور خواتین کا بھی اس میں حق ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ مقرر ہے" ہم نے قرآنی احکام کی بحث میں تفصیل سے

ساتھ بیان کیا ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے آدھے حصے کے برابر مقرر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

خواتین کے مالی حقوق

(۸) ایک ہوش مند عورت کو اسلامی احکام کے مطابق ہر قسم کی ملکیت کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر یا اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کی اجازت کے بغیر اپنے مال اور مہر میں سے ہر قسم کا جائز تصرف کر سکتی ہے۔ معاملات میں بھی خواتین کو وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں، اسی طرح ان پر بھی مردوں کے دوش بدوش فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں یہ مالی حقوق و فرائض مسلم خواتین کو چودہ سو ۱۴۰۰ برس سے حاصل ہیں حالانکہ ابھی تک بہت سے ممالک اور قوموں کی خواتین یہ حقوق حاصل نہیں کر سکیں چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں خواتین کو ملکیت اور تصرف کا حق قریبی زمانے میں عطا ہوا ہے۔ مگر فرانسیسی خواتین ابھی تک اپنے مالی تصرفات اور قانونی معاہدات میں شوہر کی اجازت کے پابند ہیں۔

مردوں کی قیادت

زوجین کو اپنے حقوق و فرائض میں مساوات حاصل ہے تاہم مردوں کو ایک درجۂ فضیلت حاصل ہے جو ان کا درجۂ قیادت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:۔

"عام طریقے کے مطابق عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کے حقوق ہیں، اور مردوں کا ان عورتوں پر ایک درجہ ہے" یہ آیت ایک کلیہ قاعدہ ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک خاص درجے کو چھوڑ کر باقی تمام امور میں خواتین حقوق میں مردوں کے مساوی ہیں۔ اس مساوات سے مراد یہ نہیں ہے کہ حقوق کی مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے پوری مشابہت پائی جاتی ہو بلکہ مساوات کے مفہوم کو پورا کرنے کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہر ایک کے جس قدر فرائض ہیں اسی کے مطابق اس کے حقوق بھی ہیں۔ اور ان حقوق میں تبادلہ ہوتا رہتا ہے یعنی ہر ایک شریعت کے مقرر کردہ احکام کے مطابق مذہبی حدود کے اندر کسی کے زبردستی دباؤ یا حکومت کے بغیر اپنے فرائض کو

انجام دیتا ہے اور ہر ایک حسن معاملہ اور نیک سلوک میں دوسرے کے برابر ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہر ایک کے ذمے ایک ہی نوعیت کے حقوق و فرائض ہیں۔ مثلاً جس طرح شوہر کے لئے اپنی بیوی اور بچوں کو نان نفقہ دینا ضروری ہے اسی طرح عورت کو اپنے شوہر اور اولاد کو نان نفقہ دینا ضروری ہو، یا یہ کہ میراث میں بھی مرد کے برابر حصہ کی حقدار ہو۔ یا مرد کو بھی پرورش کا ویسا ہی حق ہو جیسا کہ عورت کو حق حاصل ہے، یا عورت کو متعدد شوہر کرنے کی اجازت دی جائے جس طرح مردوں کو تعدد ازدواج کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا ایسی تمام باتوں میں کامل مساوات کو برقرار رکھنا انسانی مصلحت اور انصاف کے خلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں جنسوں کی فطرت اور ان کی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیت میں نمایاں فرق ہے اس فطری اور جنسی اختلاف کی وجہ سے مرد کو عورت پر کوئی خاص برتری حاصل نہیں ہے اور نہ اس سے عورت میں کوئی ایسی کمی پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کی قدر و منزلت کم ہو جائے نہ درجہ جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں عطا فرمایا ہے، خاندان کی قیادت کا درجہ ہے کیونکہ ازدواجی زندگی بھی ایک قسم کی اجتماعی زندگی ہے اور ہر جماعت کا ایک سردار مقرر ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اہم کاموں اور باہمی جھگڑوں میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے لہٰذا خاندانی قیادت کے کام کے لئے زیادہ موزوں مرد کو مقرر کیا گیا۔ کیونکہ وہی جماعت کی بہبودی کا زیادہ علم رکھتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو غور و فکر، بصیرت ارادہ اور تکالیف برداشت کرنے کی جو توفیق عطا فرمائی ہیں ان کے مطابق کام کرنے کی صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہیں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مرد نان نفقہ اور مہر کا ذمہ دار ہے اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔ "مرد عورتوں کے نگہبان ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں"

گھر کی حکومت

اسلام نے خواتین کو اپنے شوہروں کے گھروں کا محافظ بنایا ہے انھیں اس میں ایک حاکم کے حقوق حاصل ہیں اور اسی طرح کے

ان پر فرائض اور ذمہ داریاں بھی عائد ہیں۔ اسی طرح انھیں یہ ایسا درجہ ملا ہے جس میں عزت واحترام، اعتماد اور قدر دانی کے تمام معانی پوشیدہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ــــ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے ــ "تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے حکمراں بھی حاکم و نگہبان ہے اور اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے اور مرد بھی اپنے گھر والوں کا محافظ و حاکم ہے اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے اور عورت بھی اپنے شوہر کے گھر کی حاکم ہے اور اپنی رعایا کی ذمہ دار ہے اور خادم بھی اپنے آقا کے مال کا محافظ ہے اور اس سے بھی اس کے کام کے بارے میں باز پرس ہوگی" راوی کہتا ہے ــــ "میرا خیال ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ــــ " مرد اپنے باپ کے مال کا محافظ ہے اور اس سے باز پرس ہوگی لہٰذا تم میں سے ہر ایک حاکم و محافظ ہے اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے [1]

خواتین سے حسن سلوک کی ہدایت (۱) اسلام نے خواتین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی جو ہدایات دی ہیں وہ بے شمار ہیں اس نے ان کے ساتھ نیکی، احسان اور ہمدردی کرنے کی ہدایات دی ہیں اور ان پر ظلم اور بدسلوکی کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ماؤں کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایات کتاب اللہ اور احادیث نبویؐ میں مذکور ہیں، وہ بے شمار ہیں، اسی طرح بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایات بھی بہت ہیں [2] بیوی کے بارے میں بھی ہدایات بکثرت ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے ــــ "ان عورتوں کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرو اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ کی طرف سے اس میں بہت بڑی بھلائی ہو" دوسری جگہ ارشاد ہے ــ "جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو شرافت کے ساتھ انھیں روک لو یا خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔"

---

[1] الادب النبوی از استاد محمد عبدالعزیز الخولی۔

[2] نداء للجنس اللطیف مطبوعہ ۱۳۹۳ھ ص ۱۱۸، ۱۱۹

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ خواتین کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور پسلی کا اعلیٰ حصہ زیادہ ٹیڑھا ہوتا ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو تم اسے توڑ دوگے اور اگر تم اسے اسی حالت پر چھوڑے رکھوگے تو وہ بدستور ٹیڑھی رہے گی [۱]

دوسری حدیث میں مذکور ہے ـــــ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہترین ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے بہترین انسان ہوں " آپؐ نے مزید فرمایا۔

" ایک شریف انسان ہی خواتین کی عزت کرتا ہے اور وہ شخص کمینہ ہے جو ان کی توہین کرتا ہو "

جب حضرت عمرؓ نے سونا چاندی کو جمع کرنے پر وعید کی آیت کے بارے میں آپؐ سے کچھ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا ـــــ کیا میں تمھیں بہترین خزانہ سے باخبر کروں ؟ وہ بہترین خزانہ نیک عورت ہے جب مرد اس کی طرف دیکھتا ہے تو خوش ہو جاتا ہے اور جب وہ اسے حکم دیتا ہے تو وہ اس کی اطاعت کرتی ہے اور جب وہ غائب ہوتا ہے تو وہ اس کی حفاظت کرتی ہے "

صحیح ترمذی و دیگر کتب حدیث میں حضرت ثوبانؓ کی روایت سے یہ حدیث مذکور ہے کہ صحابہؓ کرام کہنے لگے ـــــ اللہ تعالیٰ نے چاندی سونے کی مذمت کی ہے کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ کون سا مال اچھا ہے تاکہ ہم اسے حاصل کرتے "

حضرت عمرؓ نے فرمایا ـــــ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات تمھارے لئے پوچھ کر آتا ہوں " جب انھوں نے یہ بات دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا " (ایسا مال) ذکر کرنے والی زبان ، شکرگزار قلب اور وہ بیوی ہے جو مرد کی دینداری پر اس کو مددگار ہو ، [۲]

دوسری حدیث میں مذکور ہے ـــــ سب سے کامل مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو اور گھر والوں کے ساتھ سب سے زیادہ نرمی اختیار کرے "

---

[۱] نداء للجنس اللطیف ص ۲۷ مطبوعہ ۱۳۵۱ھ

[۲] الجامع لاحکام القرآن از قرطبی جلد ہشتم ص ۱۲۶ - ۱۲۷ مطبوعہ دار الکتب المصریہ

آپؐ نے اپنے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں بھی خواتین کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے :۔

"اے لوگو! تمھاری خواتین کے تم پر حقوق ہیں اور تمھارے بھی ان پر حقوق ہیں ان پر تمھارے حقوق یہ ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو تمھارے فرش کو نہ روندنے دیں اور جنہیں تم ناپسند کرتے ہو انھیں تمھارے گھروں میں تمھاری اجازت کے بغیر نہ داخل ہونے دیں۔ وہ کوئی برا کام نہ کریں اگر وہ ایسا کریں تو اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے کہ تم انھیں اس کام سے منع کرو اور انھیں خواب گاہوں سے الگ کردو اور مناسب طریقے سے انھیں زدوکوب کرو اگر وہ باز آجائیں، اور تمھاری اطاعت کریں، تو تم دستور کے مطابق انھیں نان نفقہ اور کپڑا مہیا کرو، خواتین کے معاملات میں اللہ کا خوف کرو اور ان سے اچھا سلوک کرو، کیا میں نے پیغام پہونچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہ"

کیا کوئی آسمانی یا انسانی شریعت قدیم عہد یا جدید عہد کی ایسی ہے جس نے خواتین کے معاملات کو اس قدر قابل اعتنا سمجھا ہو جس قدر اسلام نے اسے اہم سمجھا ہے اسلام نے ان کے حقوق و فرائض کی بنیاد عدل و انصاف، ہمدردی اور مساوات پر قائم کی ہے۔ ہمارے خیال میں ایسی مثال کسی شریعت میں میں نہیں ملتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے اور طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں رکھا ہے جس سے خواتین کو بہت تکلیف پہونچتی ہے۔ یہ اعتراضات یا تو تعصب پر مبنی ہیں یا تعدد ازدواج اور طلاق کے اسلامی احکام سے جہالت اور ناواقفیت کا نتیجہ ہیں کیونکہ اسلام نے ان دونوں احکام میں جو اصول و قواعد مقرر کئے ہیں وہ ظلم وستم سے بچنے کی ضمانت دیتے ہیں اور افراد و جماعت کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں اور ان اصول کی تشریح اور تفصیل ہم احکام القرآن کی بحث میں بیان کر چکے ہیں

غلاموں سے حسن سلوک

تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ تقریباً چودہ سو برس پہلے اسلام نے غلاموں پر ظلم وستم کا خاتمہ کیا اور

اعلان کیا کہ غلام اپنے آقا اور مولیٰ کا بھائی ہے لہٰذا اس کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنا ضروری ہے جس کا تانا بانا عدل و انصاف اور رحم و ہمدردی سے بنا ہوا ہو، بعد ازاں اسلام نے بتدریج غلامی کے انسداد کے لئے احکام نافذ کئے

مصر و بابل، ایران، ہندوستان، یونان، روم و عرب کی قدیم اقوام میں غلام بنانے کا رواج تھا۔ یہ قومیں غلاموں سے ناقابل برداشت کام لیتی تھیں، اور ان سے ان کا سلوک نہایت سنگدلانہ تھا۔ غلامی کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا۔ جس کے اسباب متعدد تھے۔ عام طور پر لوگوں کو قید کر کے اور چرا کر غلام بنا لیا جاتا تھا۔ یا کوئی طاقت ور کمزور پر غالب آ کر اسے غلام بنا لیتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ فقر و فاقہ اور مفلسی سے تنگ آ کر اپنی اولاد کو فروخت کر دیتے تھے۔ چنانچہ چین اور دیگر ممالک میں جہاں غربت بہت ہوتی تھی لوگ اپنی اولاد کو فروخت کر دیا کرتے تھے،

یہودیت اور عیسائیت نے غلامی کو برقرار رکھا اور یورپ میں بھی آخر وقت تک غلامی قانوناً جائز رہی، یہاں تک کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان نے تمام دنیا میں غلامی کے انسداد کے لئے مناسب تدابیر اختیار کیں [1]

مگر اس سے پیشتر ساتویں صدی عیسوی میں اسلام نے غلاموں کی اصلاح و ترقی کے لئے تین اہم تدابیر اختیار کیں [2]

جنگی قیدی

(۱) اس نے غلامی کے وہ اسباب و ذرائع مسدود کر دیئے جو روئے زمین کی تمام قوموں میں رائج تھے اس نے صرف ایک ذریعہ باقی رکھا وہ یہ ہے کہ اگر مسلمان ایسی قوم سے جنگ کریں جو کھلم کھلا مسلمانوں کو تکلیف پہونچاتی ہو اور اس مدافعانہ جنگ کا مقصد ظلم و تعدی

---

[1] الوحی المحمدی از رشید رضا ترجمہ رشید احمد ارشد کتاب منزل لاہور (مترجم)

[2] مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الرق فی الاسلام از احمد شفیق پاشا

اور فتنہ و فساد کو دور کرنا ہو اور وہ جنگ دنیا میں امن و امان قائم کرے نیز اسلام کی حمایت اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے لڑی جائے تو ایسی جنگ میں قیدیوں کو غلام بنا لیا جا سکتا ہے مگر اس طریقے سے قیدیوں کو غلام بنانا مسلمانوں کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ مسلم حاکم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ احسان کرکے انھیں چھوڑ دے یا قومی مفاد کے پیش نظر ان سے مالی فدیہ حاصل کرے۔

اس طرح اسلام نے لوگوں کو روکا کہ طاقت ور افراد کمزور لوگوں کو ظلم وستم اور ہر قسم کے ناجائز ذرائع سے غلام نہ بنائیں چنانچہ منصفانہ مذہبی جنگ کے قیدیوں کے علاوہ دیگر آزاد انسانوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔ میں قیامت کے دن تین آدمیوں کے خلاف رہوں گا اور جس کے خلاف میں ہو جاؤں وہ لامحالہ مغلوب ہوگا، پہلا شخص وہ ہے جو میرے نام پر دے کر غداری کرے دوسرا وہ ہے جو کسی آزاد انسان کو فروخت کرکے اس کی قیمت کھا جائے اور تیسرا وہ شخص ہے جو کسی آدمی سے اجرت پر پورا کام لے اور اسے اس کی اجرت نہ دے" دوسری روایت میں یہ ہے کہ ایسے تین شخصوں کی اللہ نماز قبول نہیں کرے گا [1]

اسلام نے غلامی کا صرف ایک ذریعہ باقی رکھا ہے حالانکہ یہ ممکن تھا کہ تمام حالات میں غلامی کا انسداد کیا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ ظہور اسلام کے زمانے میں غلامی ہر قوم میں اور ہر جگہ رائج تھی، لہٰذا اس دور میں غلامی کا بالکل انسداد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں ان میں سے سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ صدیوں سے لوگ غلام بنانے کے عادی ہو چکے تھے، اور یہ عادت ان کے سماج اور معاشرہ کا لازمی حصہ بن چکی تھی جس کا ازالہ

---

[1] الوحی المحمدی مطبوعہ کتاب منزل لاہور

بہت مشکل تھا۔ اور چونکہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا ایک قسم کا بین الاقوامی قانون بن چکا تھا۔ لہذا اگر مسلمان، کافروں کے قیدی چھوڑ دیتے اور کفار ہمارے قیدیوں کو اپنے دستور کے مطابق غلام بنائے رکھتے تو اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر اس کے بُرے اثرات نمایاں ہوتے، اس لئے اسلام نے یہی مناسب سمجھا کہ غلامی کو تنگ دائرے میں محدود کر دیا جائے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسے احکام نافذ کئے جس سے بتدریج اس کا انسداد اور خاتمہ ہو سکے۔

غلاموں سے مساوی سلوک

(۲) اسلام نے غلاموں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کا خاتمہ کیا اور ان کے ساتھ احسان اور نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ بلکہ انھیں پستی سے نکال کر انسانیت کے مرتبے تک پہونچایا، اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے معرور بن سوید فرماتے ہیں — "میں نے حضرت ابوذر غفاری رضؓ کو دیکھا کہ وہ اور ان کے غلام دونوں عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے جب میں نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگے — میں نے ایک آدمی کو گالی دی تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا — کیا تم نے اسے اس کی ماں کی گالی دی ہے؟ تم ایسے انسان ہو جس کے اندر جاہلیت کا اثر ہے بعد ازاں آپؐ نے فرمایا — تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جنہیں تمہارا ماتحت بنایا گیا ہے لہٰذا جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو تو وہ اسے وہی کھلائے جو وہ کھاتا ہو اور وہی پہنائے جو وہ پہنتا ہو، اور ان سے حد سے زیادہ کام نہ کراؤ اگر تم حد سے بڑھ کر ان سے کوئی کام کراؤ تو اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤ"[۱]

اس ارشاد پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خادم و مخدوم، مالک و مملوک کے درمیان کامل مساوات رکھی گئی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکم منصفانہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپؐ نے اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ آقا اپنے غلام اور

[۱] الادب النبوی

لونڈی کو انہی الفاظ سے پکارے۔ آپؐ کا یہ حکم ہے کہ وہ انھیں اپنا لڑکا یا لڑکی کہہ کر پکارا کرے۔

اللہ اور رسولؐ نے غلام کے ساتھ یہ رعایتیں رکھی ہیں کہ ان کے فرائض میں تخفیف کردی گئی ہے، اور آزاد کے مقابلے میں ان کے لئے نصف سزا مقرر کی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ غلاموں سے بھی اچھا سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے ــــ "اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ نیز والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی اجنبی پڑوسی، ہم پہلو دوست، مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کیونکہ اللہ مغرور اور شیخی باز کو پسند نہیں فرماتا ہے۔"

اسلام میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک طریقہ یہ رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی اپنے غلام کو سخت سزا دے یا اس کا کوئی عضو کاٹ دے تو اس کا گناہ کا کفارہ یہی رکھا گیا ہے کہ اسے آزاد کردیا جائے، اسی طرح اس سے بھی کم، غلام کو تکلیف دینا حرام اور گناہ قرار دیا گیا ہے۔ جس کا کفارہ غلام کی آزادی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریاد کرتا ہوا آیا آپؐ نے اس سے پوچھا ــــ "تمھیں کیا ہوگیا ہے؟" اس نے کہا۔ "میرے آقا نے مجھے اس کی ایک لونڈی کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھ لیا تو اس نے میرا آلۂ تناسل کاٹ دیا۔" آپؐ نے فرمایا "اس آدمی کو میرے پاس لاؤ۔" مگر وہ آدمی نہیں مل سکا تو آپؐ نے فرمایا ــــ "جاؤ تم آزاد ہو۔" دوسری حدیث میں فرمایا ہے ــــ "جو کسی غلام کا کوئی عضو کاٹے تو وہ اس پر آزاد ہو جاتا ہے۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ــــ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے" جو کوئی اپنے غلام کو تھپڑ مارے یا اسے زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کردے[1]

[1] الوحی المحمدی از رشید رضا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ۔۔۔ ایک شخص آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا اور کہنے لگا ۔۔۔" میرے دو غلام ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں ۔ اور خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے رہتے ہیں، میں انھیں گالیاں دیتا ہوں اور انھیں مارتا رہتا ہوں تو میرا ان سے یہ سلوک کیسا ہے ؟" آپؐ نے فرمایا۔ "جب قیامت کا دن ہوگا تو ان کی نافرمانی، خیانت اور جھوٹ کے مقابلے میں تمھاری سزا کا حساب لگایا جائے گا اگر تمھاری سزا ان کے گناہ کے مطابق ہوگی تو تم برابر رہو گے نہ تو تمھیں ثواب ہوگا اور نہ عذاب ہوگا ۔ اگر تمھاری سزا ان کے گناہوں سے زیادہ ہوگی تو جس قدر وہ سزا زائد ہوگی اس کے مطابق تم سے بدلہ لیا جائے گا۔" اس پر وہ آدمی ایک کونے میں جا کر رونے اور چلانے لگا، تو آپؐ نے فرمایا کیا تم نے اللہ کا یہ کلام نہیں پڑھا ہے ۔۔ "ہم قیامت کے دن انصاف ترازو میں رکھیں گے اور اس وقت کسی پر کچھ ظلم نہیں ہوگا اگر ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو ملاحظہ کریں گے اور ہمارا حساب کرنا کافی ہوگا۔" یہ سن کر اس شخص نے کہا ۔۔۔ یا رسول اللہؐ ! میرے لئے اور ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ میں ان سے الگ ہو جاؤں ۔ میں آپؐ کو گواہ بنا کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ وہ سب آزاد ہیں[1]

یہی وجہ ہے کہ دور اول کے مسلمان، غلاموں کی عزت کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ شفقت اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں غلاموں کے ساتھ سراسر عدل و انصاف اور رحم و ہمدردی کا سلوک ہوتا تھا۔

بتدریج غلامی کا انسداد

(۳) اسلام نے ایسا تدریجی نظام قائم کیا کہ اگر اس کے مطابق اسلامی ہدایات پر عمل کیا جاتا تو غلامی کا جلد خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے طریقے مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) اسلام نے مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ غلاموں کو آزاد کیا کریں چنانچہ سب سے پہلے رسول اکرمؐ نے خود اس کی ابتداء کی اور اپنے غلام زید بن حارثؓ

---

[1] امام احمد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے ملاحظہ ہو مجلہ لواء الاسلام شمارہ ۳ ص ۲۰

کو آزاد کر دیا۔ بعد ازاں دیگر صحابہؓ نے بھی آپؐ کی پیروی کی کچھ لوگوں نے اپنے غلام اور لونڈیوں کو آزاد کر کے اللہ کی اطاعت کو دنیا کے مال و نعمت پر مقدم رکھا۔ اور کچھ صحابہؓ دولت مند اشخاص سے ان کے غلام اور لونڈیوں کو خرید کر انھیں محض اللہ کی خوشنودی کے لئے آزاد کر دیتے تھے کیونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے غلام آزاد کرنے کو بہت بڑی عبادت اور بنیادی نیکی قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا رخ مشرق و مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ، روز قیامت، کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لایا جائے اور مال کی محبت کے باوجود اسے رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں، فقیروں اور غلام آزاد کرنے میں صرف کیا جائے (نیک وہ ہیں) جو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور جب کوئی عہد کر لیں تو اسے پورا کریں، مصیبت، تکلیف اور لڑائی میں صبر کریں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں" دوسری جگہ ارشاد ہے۔

"اس نے گھاٹی کو طے نہیں کیا ہے، تمھیں کیا معلوم ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ غلاموں کی گردنوں کا چھڑانا (آزاد کرنا) ہے یا فاقے والے دن، رشتے دار یتیم کو یا خاک آلود فقیر کو کھانا کھلانا ہے۔ پھر وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی ہدایت کرتے رہے، یہی لوگ داہنے ہاتھ والے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ "جو کوئی، مسلمان شخص کو آزاد کرے تو اللہ، غلام کے ہر عضو کے بدلے میں اس کے ہر عضو کو آگ سے بچائے گا" آپؐ نے مزید فرمایا

"جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسے اچھی تعلیم و تربیت دے اور اسے آزاد کر دے، اس کے بعد وہ اس سے نکاح کرے تو اسے دوہرا ثواب ملے گا۔"

مکاتبت

(ب) اللہ نے غلام کے لئے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ اپنے مالک کو کچھ مال دے کر اپنے آپ کو خرید سکتا ہے شریعت میں اسے مکاتبت کہتے ہیں۔ چنانچہ آقا کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ

اس میں بھلائی کے آثار دیکھے اور یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کما کر مقررہ رقم دے سکتا ہے تو وہ اس سے یہ معاملہ کرلے ۔ بلکہ مالک اور دوسرے حضرات کو غلام کی مالی مدد کرنی چاہیئے تاکہ وہ جلد اپنے آپ کو آزاد کرائے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

" اور تمھارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتبت (مال کے بدلے میں آزادی کی تحریر لکھوانی) چاہیں تو تم انھیں یہ معاملہ لکھ کر دیدو اگر تمھیں ان میں بھلائی معلوم ہو، اور اللہ کے مال میں سے جو اس نے تمھیں دیا ہے، انھیں بھی کچھ دو"

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کو سخت سزا دینا یا اس کے اعضاء کو کاٹنا بھی غلامی سے آزاد ہونے کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے جو ہم ابھی بیان کرچکے ہیں

(د) اُم ولد

وہ لونڈیاں جو آقا کی اولاد کی ماں بن جائیں وہ بھی آزاد ہو جاتی ہیں جبکہ اس کا آقا مر جائے ۔ وہ ورثاء کی ملکیت میں شامل نہیں ہوتی ہیں اور نہ وہ آقا کی زندگی میں فروخت کی جاسکتی ہیں، اس مسئلہ پر جمہور علماء کا اتفاق ہے چنانچہ امام مالکؒ نے اس کے ثبوت میں حضرت عمرؓ کا یہ قول پیش کیا ہے :" اگر آقا سے کسی لونڈی کے اولاد ہو جائے تو وہ نہ تو اسے فروخت کرسکتا ہے اور نہ اسے ہبہ کرسکتا ہے اور نہ اسے وارث بنا سکتا ہے اور وہ اس سے (زندگی میں) فائدہ اٹھاتا رہے گا جب وہ مر جائے تو وہ آزاد ہے [1]"

(ھ) اگر کوئی اپنے رشتہ دار (محرم) کا مالک بن جائے تو وہ رشتہ دار بھی آزاد ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت سمرہ بن جندب کی مرفوع حدیث ہے "جو کوئی اپنے محرم رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ آزاد ہے"

(و) کفارہ میں آزادی

اسلام نے غلاموں کی آزادی کو ایک ایسا خالص ثواب کا کام قرار دیا ہے ۔ جس سے گناہ دُھل جاتے

---

[1] مؤطا امام مالکؒ ص ۶۳۲ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی (مترجم)

ہیں۔ اس لئے کئی گناہوں کا کفارہ غلاموں کو آزاد کرنا رکھا گیا ہے، مثلاً اگر کوئی خطا سے قتل کر دے، قسم توڑ دے، یا جان بوجھ کر روزہ توڑ دے یا بیوی کو اپنی والدہ کے ساتھ تشبیہ دے (ظہار) تو ان سب کے کفارہ میں ان شرائط کے مطابق جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، غلاموں کو آزاد کرنا بھی شامل ہے۔ چنانچہ قتل کے کفارہ میں ارشاد خداوندی ہے ——— جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن غلام کو آزاد کرے اور (مقتول کے) گھر والوں کو پوری دیت ادا کرے بجز اس صورت کے کہ وہ معاف کر دیں

ظہار (ماں کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینا) کے کفارہ میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:-

"وہ لوگ جو اپنی بیویوں کو ماں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوں اور پھر اپنے قول سے رجوع کریں تو صحبت سے پہلے ایک غلام کو آزاد کریں یہ وہ بات ہے جس کی تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے۔ اور جس کسی کو (غلام) میسر نہ ہو تو وہ صحبت سے پہلے لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلایا جائے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا سکو، یہ اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے"

قسم کے کفارہ میں اس طرح ارشاد خداوندی ہے ——— "اللہ لغو قسموں پر تمھیں نہیں پکڑتا ہے مگر وہ ان قسموں پر ضرور تمھارا مواخذہ کرتا ہے جس کا تم نے عہد و پیمان کیا ہو، اس کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس اوسط کھانے کے مطابق جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو دس غریبوں کو کھانا کھلاؤ یا انھیں کپڑا پہناؤ یا ایک غلام کو آزاد کیا جائے۔ جس شخص کو یہ میسر نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم حلف اٹھاؤ لہٰذا تم اپنے قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمھیں اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم شکر کر سکو۔

آزادی بذریعۂ زکوٰۃ	(د) اسلامی شریعت میں زکوٰۃ کے مصارف میں غلام

کو آزاد کرانے کے لئے بھی ایک حصہ رکھا ہے تاکہ غلام اپنے آپ کو آزاد کرانے میں مالی مدد حاصل کر سکے۔ غلاموں پر اسلام کا یہ بہت بڑا احسان ہے بلکہ نیکی اور رفاہ عام کے کاموں میں یہ اسلام کی ایک جدت ہے جو صرف اس الہامی مذہب میں ہو سکتی ہے جس کی ہدایت، علم و ہدایت والے خدا نے کی ہو، اگر زکوٰۃ کے بارے میں اسلام کا یہ حکم نافذ ہو جاتا تو وہ اسلامی ممالک کے تمام غلاموں کی آزادی کا ضامن بن جاتا لہٰذا اس حکم کے لئے قرآن کریم کی اس آیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے

"صدقات ان لوگوں کے لئے ہیں، وہ لوگ جو محتاج اور غریب ہوں، صدقات کی وصولی پر کام کرتے ہوں۔ اور وہ لوگ جن کے تالیف قلب کی ضرورت ہو اس سے غلاموں کو آزاد کیا جائے۔ قرض خواہوں کی اور اللہ کی راہ میں دیا جائے نیز مسافر کو دیا جائے یہ اللہ کی طرف سے مقرر حصہ ہے اور اللہ بڑے علم و حکمت والا ہے"

ذمیوں کی حفاظت

(۱۹) اسلامی شریعت کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ان غیر مسلم رعایا کی حفاظت کی ذمہ دار ہے جو مسلمانوں کی سلطنت کو تسلیم کر لیں اور جزیہ ادا کرتے ہوں یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں اور اپنے مذہب کے مطابق اسلامی حکومت کی حفاظت میں زندگی بسر کرتے ہیں، جہاں انھیں ہر قسم کی تکلیف اور مظالم سے بچایا جاتا ہے یہ اصول بھی اسلامی محاسن اور اس کی رواداری کی زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ جب ذمی جزیہ ادا کر دیتے ہیں تو مسلمانوں پر ان کی حفاظت اور اعانت کی ذمہ داری آجاتی ہے اور جزیہ کی شرائط کے مطابق انھیں مذہبی آزادی حاصل ہو جاتی ہے اس کے بعد مسلمانوں کی طرح ان کے ساتھ عدل و مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے۔ انھیں تکلیف دینا اور بہت سخت کاموں کو سرانجام دینے پر مجبور کرنا اسی طرح ممنوع ہے جس طرح مسلمانوں کے لئے ممنوع ہے۔ انھیں ذمی اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھیں یہ حقوق اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذمہ داری پر حاصل ہوئے ہیں (بقیہ صفحہ ۴۴۶)

(بقیہ صفحہ ۴۴۶)

ان پر جزیہ مقرر کیا گیا ہے مگر اس کی مالی مقدار بہت قلیل ہے جو ان کے لئے تکلیف اور مشقت کا باعث نہیں ہے، دراصل وہ کمانے والے آزاد مرد پر مقرر کیا گیا ہے [۲] لہذا بچے، عورت اور کام نہ کرنے والے محتاج پر جزیہ نہیں ہے۔

حنفی علماء کے نزدیک ایک دولت مند شخص پر ۴۸ درہم سالانہ جزیہ ہے اور متوسط درجہ کے مرد پر ۲۴ درہم اور معمولی درجے کے فرد پر ۱۲ درہم سالانہ ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جزیہ کی کم از کم مقدار متعین ہے اور وہ ایک دینار ہے مگر زیادہ سے زیادہ جزیہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے کیونکہ وہ ان کی مصالحت اور معاہدہ کے مطابق ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ جزیہ کی کوئی مقرر مقدار نہیں ہے بلکہ وہ مسلم حاکم کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہوتی ہے [۳]۔

ذمیوں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے [۴]

---

(۱) حاشیہ صفحہ ۲۴۵) الوحی المحمدی۔ مطبوعہ کتاب منزل لاہور

[۲] جزیہ واجب ہونے کے لئے بالغ اور آزاد مرد ہونا باتفاق رائے مشروط ہے ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد

[۳] بدایۃ المجتہد از ابن رشد

[۴] امام شافعی کا قول یہ ہے کہ جزیہ اس لئے واجب ہے کہ یہ ان کے جان و مال کی حفاظت اور حق بشریت کا معاوضہ ہے اور مالکی علما کا یہ قول ہے کہ کفر کی وجہ سے قتل سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ذمی مسلمان ہو جائے تو گذشتہ ایام کا جزیہ اس پر سے ساقط ہو جاتا ہے خواہ وہ سال گزرنے سے ایک دن پہلے یا ایک دن کے بعد مسلمان ہوا ہو۔ یہ مسئلہ امام مالک کے مسلک کے مطابق ہے مگر امام شافعی کے نزدیک جزیہ اس پر ہمیشہ کا قرض ہے جیسا کہ مکان کا کرایہ ہے لہذا مسلمان ہونے سے پہلے یہ ساقط نہیں ہو سکتا بعض حنفی علماء مالکی مسلک کے حامی ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جہاد اور فوجی خدمت کی معافی میں جزیہ لیا جاتا ہے ملاحظہ ہو الجامع لاحکام القرآن از قرطبی ربانی

مگر بہترین اور قابل ترجیح رائے وہ ہے جو ہمارے محقق عالم محمد رشید رضا نے بیان کی کہ جزیہ ذمیوں کی مدافعت اور حفاظت کا ٹیکس ہے تاکہ کوئی شخص ان پر زیادتی نہ کرسکے [1] جیسا کہ صحابہ کرام کے طرز عمل سے اس کا پتہ چلتا ہے اس کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو حضرت خالد بن ولید نے صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کو لکھا تھا۔ جس میں یہ مذکور ہے

"میں نے تم سے جزیہ لے کر تمہاری حفاظت کرنے پر تم سے معاہدہ کیا ہے۔ اور اگر ہم تمہاری حفاظت کریں تو ہم جزیہ وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں ورنہ ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے"

نیز بلاذری کی فتوح البلدان اور ازدی کی فتوح الشام میں یہ مذکور ہے کہ صحابہ کرام جب یرموک کی جنگ کی وجہ سے اہل حمص کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے اہل حمص کا جزیہ واپس کر دیا تھا کیونکہ وہ اس وقت ان کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ لہٰذا جب مسلمانوں نے ان کا مال واپس کر دیا تو حمص کے یہود و نصاریٰ نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا کہ فاتح قوم نے مال واپس کر دیا۔

اسلام نے ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے اور ان پر ظلم کرنا یا ناحق ان سے کوئی چیز چھیننا حرام قرار دیا ہے۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کو اس بات سے بھی منع نہیں کیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کریں خواہ وہ ذمی نہ ہوں مگر یہ شرط ہے کہ ان کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و تعدی نہ ہوئی ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"وہ لوگ جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہ کی ہو اور تمہیں گھر

(بقیہ صفحہ ۴۴۶) جلد ہشتم ص ۱۱۳، ۱۱۴ مطبوعہ دار الکتب المصریہ

[1] قرطبی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جزیہ کے لغوی معنی احسان کے بدلہ کے ہیں چونکہ مسلمانوں نے انہیں امن و امان دیا ہے اس لئے یہ اس کا بدلہ ہے ملاحظہ ہو حصہ ہشتم تفسیر قرطبی ص ۱۱۲ مطبوعہ دار الکتب المصریہ

سے نہ نکالا ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا ہے کہ تم ان سے اچھا سلوک کرو اور ان سے انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، درحقیقت اللہ تمہیں ان لوگوں سے روکتا ہے کہ جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہو، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہارے نکالنے پر لوگوں کی مدد کی ہو، ایسے لوگوں سے تم دوستی نہ رکھو اور جو ان سے دوستی رکھتے ہیں وہ ظالم ہوتے ہیں"

امام ابوداؤد نے حضرت صفوان بن سلیم کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ "جس نے کسی معاہدہ کرنے والے شخص پر ظلم کیا ہو یا اسے نقصان پہونچایا ہو یا اس کی طاقت سے زیادہ اسے تکلیف دی ہو، یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز چھین لی ہو، تو میں قیامت کے دن اس سے جھگڑوں گا۔[1]

نیل الاوطار کے حصہ ہفتم میں یہ حدیث مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا "جو کوئی ایسے معاہدہ کرنے والے شخص کو قتل کرے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ذمہ لیا ہو، تو وہ اللہ کی ذمہ داری کو توڑتا ہے اس لئے وہ جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا۔

ابوداؤد میں یہ حدیث مذکور ہے :-

"جو کوئی ذمی شخص کو قتل کرے وہ بہشت کی خوشبو کو نہیں پائے گا حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی مسافت سے معلوم ہو جاتی ہے"[2]

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاص حاکم مصر کو اپنے خط میں یہ تحریر فرمایا ـــــ "تمہارے ساتھ ذمی لوگ بھی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں ہدایات دی ہیں" اس کے بعد حضرت عمرؓ نے قبطیوں کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی ـــــ "قبطیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ

---

[1] جلد ہشتم تفسیر قرطبی ص ۱۱۵ مطبوعہ دار الکتب

وہ ذمی بھی ہیں اور رشتہ دار بھی ہیں، ان سے رشتہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ان کی نسل سے تھیں، نیز رسول اکرمؐ نے بھی یہ فرمایا ہے،

"جو کسی معاہدہ کرنے والے شخص پر ظلم کرے یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے، تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا" لہٰذا اے عمروؓ! اس بات سے بچو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے خلاف ہو جائیں کیونکہ جس کے خلاف آپؐ ہوں، تو اللہ بھی اس کے خلاف ہو گا۔"

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے نام اپنے نامۂ مبارک میں ذمیوں کے بارے میں اس طرح تحریر فرمایا — "مسلمانوں کو منع کرو کہ وہ ذمیوں پر ظلم نہ کریں اور نہ انھیں نقصان پہونچائیں، اور ان کا مال ناحق طریقے سے نہ کھائیں، اور ان تمام چیزوں کے شرائط جو تم ان سے مقرر کرو معاہدہ کے مطابق پورے کرو" ۱؎

حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ان کے فوجی ساتھیوں کو اپنے نامۂ مبارک میں اس طرح تحریر فرمایا — "تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر جمعہ ایک دن اور ایک رات قیام کرو تاکہ وہ اس دن آرام کریں اور اپنے آپ کو تازہ دم کر کے اپنے ہتھیار اور سامان کو درست کر سکیں ان کے گھر ذمیوں کی بستیوں سے دور رکھا کرو تاکہ کوئی ان میں سے کسی کو ذرہ بھر نقصان نہ پہونچا سکے کیونکہ تمھیں ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے، اور وہ بھی اپنی ذمہ داری کو پورا کریں گے لہٰذا جب تک کہ وہ تمھارے ساتھ نباہ کریں تو تم ان سے اچھا سلوک کرو، اور اہل صلح پر ظلم کر کے اہل جنگ پر غالب آنے کی کوشش نہ کرو" ۲؎

پہلے زمانے کے مسلمانوں نے اس قسم کی ہدایات سے اسلامی رحم و ہمدردی کا اندازہ لگا لیا ہے کہ اسلام اپنے مخالف ذمی رعایا کے ساتھ بھی ہمدردی کی تلقین کرتا ہے اس لئے انھوں نے ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی اور نہ انھیں ان کے حقوق سے محروم رکھا۔ بلکہ اموی اور عباسی خلفاء نے انھیں خراج کے

۱؎ السیاسۃ الشرعیۃ

۲؎ مجلہ الازہر جلد ۱۷ ص ۳۶۴

دفاتر کی تنظیم اور یونانی علوم کا ترجمہ کرنے کے لئے ملازم رکھا بلکہ ان غیر مسلموں میں سے جو ذہین اور قابل افراد تھے انھیں مقرب بارگاہ بنایا اور اپنی بیماریوں کے علاج میں ان پر اعتماد کیا۔ اس طرح مسلمان اپنے سماجی نظام میں انھیں اپنا سرکردہ ممبر تسلیم کرتے تھے، اور ان کی ایسی حفاظت کرتے تھے جیسی کہ اپنی جان کی حفاظت کیا کرتے تھے غیر مسلموں کے ساتھ ان کی سیاست انصاف اور نرمی پر مبنی تھی اور ذمیوں کے بارے میں ان کا نعرہ یہ تھا — " وہ ہمارے نفع و نقصان میں شریک ہیں "۔ ان کی ایسی ہی انصاف پسند اور مشفقانہ سیاست نے مشہور سماجی مورخ گوستاف لیبان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

" حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کو عربوں جیسا ہمدرد اور روادار فاتح نہیں مل سکا "[1]

تبلیغی مذہب

(۷) اسلامی شریعت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے سماج کی اصلاح کرنے اور اسے شر و فساد سے پاک و صاف کرنے میں ایک اہم ذریعہ سے کام لیا ہے وہ ذریعہ یہ ہے کہ لوگوں کو نیکی کی دعوت دی جائے اور انھیں بُرے کاموں سے روکا جائے، یہ کام فرض کفایہ ہے کہ اگر مسلم قوم کے چند افرا۔ اس فرض کو اپنے ذمے لے لیں تو قوم کے دیگر افراد سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر کسی نے بھی اس فرض کو سر انجام نہیں دیا تو تمام قوم پر اس کی ذمہ داری عائد ہو جائے گی۔ اور سب گناہ گار ہوں گے تبلیغ کا یہ فریضہ فرض عین نہیں ہے اور نہ سب پر فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

" تمام مسلمانوں کا نکلنا ضروری نہیں ہے مگر ان کی جماعت میں سے ایک حصہ کیوں نہیں نکلتا۔ کہ وہ دین کی سمجھ پیدا کریں اور جب وہ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آئیں تو انھیں (دین سے) آگاہ کریں کہ وہ (بُرے کاموں سے) بچتے رہیں "۔

چونکہ تبلیغ کا کام ایسا اہم کام ہے کہ اسے وہی سرانجام دے سکتا ہے جو اس کا اہل ہو، اور اس کی قابلیت حاصل کرنے میں چند شرطیں ہیں، جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مبلّغ کو احکامِ شرعیہ اور مراتبِ احتساب سے واقفیت ہو اور جو کوئی

[1] تمدن عرب از لیبان

تبلیغ کرے وہ اس فرض کو انجام دینے کے سب طریقوں سے واقف ہو، بلکہ مختلف حالات اور ہر حالت کے مناسبات کو اچھی طرح سے جانتا ہو، کیونکہ اگر وہ ان باتوں سے واقف نہیں ہوگا تو یہ ممکن ہے کہ وہ الٹا طریقہ اختیار کرے یعنی بری بات کی تلقین کرے اور اچھی بات سے روکے اور جہاں نرمی کا موقع ہو وہاں سختی کرے اور جہاں سختی کا موقع ہو وہاں نرمی اختیار کرے، کیونکہ نیک کام کی نوعیت کے مطابق اس کی ہدایت کرنا کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب ہوتا ہے البتہ بری بات سے روکنا ہر حالت میں واجب ہے کیونکہ شریعت جن چیزوں کو برا سمجھتی ہے وہ سب حرام ہیں

تبلیغی کاموں کو سرانجام دینے کے لئے کچھ شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مبلّغ میں اس فرض کو انجام دینے کی پوری صلاحیت اور قدرت ہو اور جس بری بات سے روکا جائے وہ ایسی ہو کہ باتفاق رائے حرام ہو اور اس کو منع کرنے سے کسی بڑے فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، نیز برائی کھلم کھلا معلوم ہوئی ہو، کوئی اسے پوشیدہ طور پر نہ کر رہا ہو کیونکہ برائی کی ٹوہ لگانا اچھا نہیں ہے اور نہ لوگوں کے پوشیدہ کاموں کو کریدنے کی ضرورت ہے،

تبلیغ کی اہمیت

شریعت نے تبلیغی فرائض ہم پر اس لئے مقرر کئے ہیں کہ مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی اصلاح ہو، بلکہ روئے زمین سے جرائم اور فتنہ و فساد کا انسداد اس فریضہ کو انجام دیئے بغیر ممکن نہیں ہے، کیونکہ ظالم اور مفسدوں کو اگر کھلی چھٹی دیدی جائے تو ان کا شر و فساد بڑھتا جائے گا، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا، اس طرح قوم ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گی، جس سے نجات پانا ممکن نہیں ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم پر خدا کا غضب اور عذاب نازل ہوگا جو سب سے بڑی تباہی ہے،

تبلیغی فریضہ کے ثبوت میں کتاب و سنت کی بہت سی آیات و احادیث کو پیش کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک آیتِ کریمہ یہ ہے —— تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیک کام کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

چونکہ یہ تبلیغی کام ایک بہت بڑا فریضہ ہے اور سماجی اصلاح پر اس کے اثرات دُور رس ہیں اس لئے اللہ نے تبلیغ کرنے والے مرد اور عورتوں کی تعریف کی، بلکہ اس صفت کا نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ ذکر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے،

"مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں وہ نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں نماز کو قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں، نیز اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا درحقیقت اللہ عزت اور حکمت والا ہے"

چونکہ مسلمان قوم اس تبلیغی فریضہ کو انجام دیتی ہے، اس وجہ سے ان میں خیر و صلاح کی صفت سب سے زیادہ پائی جاتی ہے چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے —— "تم بہترین اُمّت ہو جو لوگوں کے سامنے نمودار ہوئی ہو، تم نیک کام کا حکم دیتے ہو اور بُرے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"

تبلیغی کوتاہی کا انجام

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ بعض قومیں اس وجہ سے لعنت کی مستحق ہوئیں کہ وہ ایک دوسرے کو بُرے کام سے نہیں روکتی تھیں چنانچہ ارشاد ہے —— "بنو اسرائیل میں سے جو کافر تھے ان پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت بھیجی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کو بُرا کام کرنے سے نہیں روکتے تھے اور وہ بہت ہی بُرے کام کیا کرتے تھے"

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متنبہ کیا ہے کہ ہم بنو اسرائیل کی طرح تبلیغی فرائض کو نہ چھوڑ بیٹھیں مبادا کہ ہمارا انجام بھی خراب ہو اور ہم بھی اللہ کے غضب اور لعنت کے مستحق بن جائیں کیونکہ اس فریضہ کو چھوڑنے سے یا بری بات پر سکوت اختیار کرنے سے نہ صرف لوگوں کی حق تلفی ہوگی بلکہ عام لوگ حرام کاموں میں مشغول ہو جائیں گے اور روئے زمین پر ظلم و فساد کا دور دورہ ہوگا۔

ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے یہ حدیث مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— "بنو اسرائیل میں سب

سے پہلے برائی کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ جب کوئی آدمی کسی سے ملتا تھا تو وہ کہتا تھا ــــ "اے شخص! اللہ سے ڈرو اور جو تم کرتے ہو اسے چھوڑ دو، کیونکہ یہ کام تمھارے لئے جائز نہیں ہے"، بعد ازاں جب دوسرے دن اس کی یہی حالت دیکھتا تھا تو اسے ٹوکتا نہیں تھا کیونکہ وہ اس کا ہم مشرب اور ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوتا تھا۔ بہرحال جب وہ یہ طریقہ مسلسل اختیار کرنے لگے تو اللہ نے ان کے دلوں کو مسخ کر دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی ــــ "بنو اسرائیل میں سے جو کافر تھے، ان پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت بھیجی گئی کیونکہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے وہ ایک دوسرے کو برا کام کرنے سے بالکل نہیں روکتے تھے اور جو کام کرتے تھے وہ بہت ہی بُرا ہوتا تھا" بعد ازاں آپؐ نے فرمایا ــــ "خدا کی قسم! تمھیں نیک کام کی ہدایت کرنی ہوگی اور بُرے کام سے لوگوں کو منع کرنا ہوگا۔ اس کے بعد تم ظالم کے ہاتھ کو روکوگے اور اسے حق کی طرف موڑ کر لاؤ گے تاکہ وہ اپنے آپ کو حق و صداقت میں محدود رکھے ورنہ اللہ تمھارے دلوں کو بھی مسخ کردے گا اور جس طرح ان پر لعنت بھیجی تھی اسی طرح وہ تم پر بھی لعنت بھیجے گا"۔

آپؐ نے فرمایا ــــ "تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے، تو اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کرے اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنی زبان سے برا کہے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے دل میں اسے برا سمجھے، مگر یہ سب سے کمزور ایمان ہے"۔

ایک دن آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ بہترین شخص کون ہے تو آپؐ نے فرمایا "وہ ہے جو سب لوگوں سے زیادہ نیک کام کی ہدایت کرے اور سب سے زیادہ بُرے کاموں سے لوگوں کو روکے اور سب سے زیادہ پرہیزگار اور صلہ رحمی کرنے والا ہو" بلکہ یہ بھی منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا ــــ "جو نیک کاموں کی ہدایت کرتا ہو اور بُرے کاموں سے روکتا ہو وہ روئے زمین پر اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے"

حدیث شریف میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ جو قوم تبلیغی فریضہ میں کوتاہی کرے تو وہ اسے بُرے عذاب میں مبتلا کرتا ہے اور اگر اس قوم

کے بزرگ بری باتوں پر خاموش رہیں تو وہ ان کی دعا بھی قبول نہیں کرتا ہے چنانچہ ابوداؤد میں حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی یہ روایت مذکور ہے وہ فرماتے ہیں ۔
"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے ۔" جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو اللہ اس ظالم کی طرف سے انھیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے" دوسری حدیث شریف میں آپ نے فرمایا۔
"تم نیک کام کی ضرور ہدایت کرو اور برے کاموں سے قطعی طور پر روکو، ورنہ جلد اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے عذاب نازل کرے گا اس وقت اگر تم دعائیں مانگو گے تو تمھاری کوئی دعا قبول نہیں ہوگی [۱]

حضرت علیؓ کا قول ہے :- بہترین جہاد یہ ہے کہ نیک کاموں کا حکم دیا جائے اور برے کاموں سے روکا جائے اور جو فاسقوں سے نفرت کرے اور اللہ کے لئے غضب ناک ہو تو اللہ بھی اس کی حمایت میں غضب ناک ہوگا [۲]

چونکہ ہم اس فریضہ کو ادا کرنے میں کوتاہی کر رہے ہیں، اس لئے ہمارے اندر وہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جن سے ہمارے اسلامی اخلاق، سماجی آداب اور پسندیدہ عادات کا خاتمہ ہوگیا ہے ، ہم کب ہوش میں آئیں گے اور کب اپنے شرعی احکام کو نافذ کریں گے ؟ کب ہمارے اندر وہ مسلمان پیدا ہوں گے جو ظلم و باطل کا خاتمہ کریں اور سنت نبویؐ کے مٹے ہوئے آثار کو زندہ کر کے دینی رشتوں کو استوار کریں ۔

جہاد کی اہمیت

(۲) اسلام میں جہاد اس وقت فرض ہے جبکہ باطل پرستوں ظالموں اور سرکشوں کا ظلم انتہائی درجے تک پہونچ جائے اس موقع پر جہاد کے ذریعے حق و صداقت کی حفاظت کی جاتی ہے اور مسلمانوں کی عزت کو ظالموں اور جابروں کے ہاتھوں سے محفوظ کیا جاتا ہے ، جہاد اس

---

[۱] دوسری روایت میں یہ مذکور ہے :- تم ضرور نیک کام کا حکم دو اور برے کام سے روکو ورنہ اللہ تمہارے بدترین افراد کو تم پر مسلط کردے گا پھر اگر تمھارے بزرگ بھی دعائیں مانگیں گے تو ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی ۔"

[۲] ملاحظہ ہو تفسیر ابوالسعود و بیضاوی

لئے فرض کیا گیا ہے کہ اسلام کا بول بالا ہو، مسلمانوں کی جان، مال، عزت و آبرو اور ان کا وطن محفوظ رہے، اور مسلمانوں کو آزادانہ اسلام کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہو۔

نہ کسی الہامی شریعت نے اور نہ کسی جدید قانون اور جدید تحریک نے جہاد کو اس قدر اہمیت دی ہے جس قدر اسلام نے جہاد کو جو ایک مقدس مدافعانہ جنگ ہے اہم قرار دیا ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں جہاد مسلمانوں کا بہت بڑا قومی شعار تھا، اسی کے ذریعے ان کی شیرازہ بندی ہوئی، ان کی شان و شوکت بڑھی اور اسلام کا بول بالا ہوا۔ جہاد کے ذریعے انھوں نے بت شکنی کرکے بت پرستی کا خاتمہ کیا۔ نہ صرف عرب میں توحید کا ڈنکا بجایا بلکہ تمام روئے زمین کو نورِ ہدایت سے منور کیا چونکہ انھوں نے اللہ کے دین کی حمایت کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں عظیم فتوحات عطا فرمائیں،

ابتداء میں جہاد طاقت ور، تندرست اور آزاد مسلمان مردوں کے لئے فرض کفایہ ہے، وہ بیماروں اور اپاہجوں پر فرض نہیں ہے لیکن اگر دشمن اچانک حملہ کردے اور جنگ کے بغیر مدافعت کی کوئی صورت نہ ہو تو ہر مسلمان کے لئے جہاد کرنا فرض عین ہے، ایسے موقع پر ایک غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکل سکتا ہے اور عورت کو بھی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر جہاد کرنے کا حکم ہے،

مصنف نیل الاوطار تحریر فرماتے ہیں[1]

"عام طور پر یہ مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جہاد فرض کفایہ ہے مگر ضرورت کے وقت یہ فرض عین ہوجاتا ہے مثلاً دشمن اچانک حملہ کرے، اس وقت حاکم جس کام پر کسی کو مقرر کرے، اس کو بجالانا ضروری ہوجاتا ہے"

حضرت سعید بن المسیب کا قول ہے :- یہ فرض عین ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا — "تم پر جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے، بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لئے بہترین ہو اور جس چیز

---

[1] نیل الاوطار جلد ہفتم ص ۱۷۴، ۱۷۸

کو تم پسند کرو، وہ تمہارے لئے بدترین ہو، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو"[1]

دوسری آیت کریمہ یہ ہے ———— "تم ہلکے اور بوجھل ہو کر نکلو اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو"[2]

قرطبی نے اپنی تفسیر میں یہ مفہوم اس طرح واضح کیا ہے[3]

۔ کبھی ناگہانی حالت میں سب لوگوں کا جنگ کے لئے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے یہ صورت اس وقت رونما ہوتی ہے کہ جب دشمن ملک کے کسی حصہ پر قابض ہو جائے یا کسی اہم مقام پر اُتر جائے، اس وقت مقامی آدمیوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر ایک حسب حیثیت جنگ کے لئے نکلے، خواہ مسلح ہو یا غیر مسلح، جوان ہو یا بوڑھا ہر ایک اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکل سکتا ہے، اس وقت کوئی شخص میدان جنگ سے پیچھے نہ رہے، اگر اس شہر کے لوگ دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو جائیں، تو اس شہر کے قریبی باشندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی مدد کریں، اس طرح جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایک علاقے کے مسلمان دشمن پر غالب نہیں آرہے ہیں اور وہ ان کی مدد کرسکتے ہوں تو ان سب کے لئے جہاد ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ غیر مسلموں کے مقابلے میں سب مسلمان ایک دوسرے کے مددگار ہیں، لہٰذا اگر اس علاقے کے مسلمان دشمن کو اپنے علاقے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو باقی تمام مسلمانوں سے جہاد کا فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن اگر دشمن دارالاسلام کے قریب پہونچ جائے اور اسلامی علاقے میں داخل نہ ہوا ہو، تو اس وقت بھی مسلمانوں کے لئے مقابلے کے لئے نکلنا ضروری ہے تاکہ دین الٰہی غالب رہے، اسلامی سرحدیں محفوظ رہیں، اور دشمن ذلیل و خوار ہو جائے۔

جہاد کا اصل مقصد

جہاد کا صرف یہ مقصد ہے کہ اسلامی مذہب کی حفاظت کی جائے اور مسلمان اور ان کے ممالک کو دشمنوں کے حملے سے بچایا جاسکے لہٰذا کسی حالت میں بھی اسلام نے یہ اجازت نہیں دی ہے

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۱۶ [2] سورہ بقرہ آیت ۴۲

[3] الجامع لاحکام القرآن جلد ہشتم ص ۱۵۱ مطبوعہ دار الکتب المصریہ

کہ غیر مسلموں پر مظالم برپا کرنے کے لئے جنگ کی جائے، یا جنگ کرکے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا جائے۔ بلکہ ہمیشہ ظلم و تعدی کی جنگ سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے —— "ان لوگوں کے لئے جو مظلوم ہوں اور دوسرے لوگ ان کے خلاف جنگ کریں (جنگ کرنے کی) اجازت دی گئی ہے اور حقیقت میں اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں (ان کا جرم صرف اتنا ہے کہ) وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، اور اگر اللہ ایک کو دوسرے سے دوسرے کے ذریعے دور نہ کرتا۔ تو خانقاہیں، گرجے، عبادت خانے اور مساجد جہاں بکثرت اللہ کا ذکر ہوتا ہے، منہدم ہو جاتیں، اور جو اللہ کی مدد کرے، اللہ ضرور اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ طاقتور اور عزت والا ہے" [۱] دوسری آیت بھی ملاحظہ فرمائی جائے [۲]

"اور وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہوں، ان سے تم بھی اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ اور زیادتی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے"، "ان سے جنگ کرو تاکہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے اگر وہ (جنگ سے) رک جائیں تو کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو مگر ان لوگوں پر جو ظلم کریں"

جب جہاد کی ضروری شرائط موجود ہوں اور اس کے شرعی اسباب مہیا ہو جائیں تو ایک حالت میں وہ فرض کفایہ ہے اور دوسری حالت میں وہ فرض عین ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

جہاد بھی اسلام کی اہم خصوصیت ہے کیونکہ کسی الہامی یا دنیاوی قانون میں مذکورہ بالا مخصوص شرائط و اسباب مہیا ہونے کی صورت میں جہاد اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے کی فضیلت پر اس قدر زور نہیں دیا گیا ہے جس قدر اسلام میں اس کی تاکید آئی ہے کیونکہ اسلام عزت و خودداری کا وہ طاقتور مذہب ہے جو حق کی منصفانہ طریقے سے حفاظت کرتا ہے۔ اسلام شریفانہ اور غیرت مند زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے اس لئے وہ اور ذلت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ گو اسلام صلح پسند مذہب ہے، اور صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے، مگر وہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ مسلمان

---

[۱] سورۂ حج آیات ۳۹-۴۰ [۲] سورہ بقرہ آیات ۱۹۰ — ۱۹۳

ذلت وخواری کی زندگی بسر کریں، بلکہ ان پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ ظلم و تعدی کو دور کریں اور باعزت اور طاقت ور زندگی بسر کرنے کے ممکن ذرائع مہیا کریں تاکہ ان کے دشمنوں کو کبھی جرأت نہ ہو سکے کہ وہ ان کے ملک پر حملہ کر سکیں، یا دعوتِ اسلام کی راہ میں حائل ہو سکیں چنانچہ ارشاد باری ہے —— "عزت صرف اللہ اس کے رسول اور مومنوں کو حاصل ہے" [۱] مسلمانوں کے ان دشمنوں کے بارے میں جنہوں نے بار بار عہد شکنی کی تھی، اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے۔[۲]

"درحقیقت کفار اللہ کے نزدیک سب جانوروں سے بدتر ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ تم ان سے معاہدہ کرتے ہو، تو وہ ہر مرتبہ عہد شکنی کرتے ہیں اور ڈرتے نہیں ہیں، اگر تم جنگ میں ان پر غالب آجاؤ تو انھیں سزا دے کر ان کے پیچھے کے لوگوں کو منتشر کر دو شاید کہ وہ عبرت حاصل کریں، اگر تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو تم بھی ان کا عہد منسوخ کر دو، کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے، وہ کفار جو بھاگ گئے ہیں یہ خیال نہ کریں کہ وہ اللہ کو عاجز کر سکیں گے، جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے اپنی طاقت کو ان کے مقابلے کے لئے بڑھاؤ اور گھوڑوں کو پالو، تاکہ تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن اور ان کے علاوہ دوسر لوگوں کو مرعوب کر سکو، تم انھیں نہیں جانتے ہو (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو چیز تم صرف کرو گے تو اس کا اجر تمھیں پورا ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں، تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو کر اللہ پر بھروسہ کرو کیونکہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں مرد مجاہد کے اعلیٰ مقام اور ثواب عظیم کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے —— "کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور خانہ کعبہ کی تعمیر کو اس شخص کے (کام کے) برابر سمجھ رکھا ہے، جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے، اللہ کے نزدیک وہ برابر نہیں ہو سکتے، اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے، وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی، نیز انھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال کے ذریعہ جہاد کیا ہو وہ اللہ کے نزدیک عظیم ترین

[۱] سورہ منافقون آیت ۸ ، [۲] سورۃ انفال آیت ۵۶ - ۶۱

درجہ رکھتے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں، ان کا پروردگار انھیں اپنی رحمت، رضامندی اور بہشت کی خوشخبری دیتا ہے جس میں لازوال نعمتیں عطا ہوں گی اور وہاں ہمیشہ رہیں گے درحقیقت اللہ کے پاس بہت بڑا ثواب ہے"[1]

جہاد کا اعلیٰ مقام

اللہ تعالیٰ نے جہاد کو بلند ترین مقام عطا فرمایا ہے، اور دین اسلام میں اس کا مرتبہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد سب سے بلند ہے، بلکہ اللہ نے ہر مسلم کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی محبت اور اس کے راہ میں جہاد کرنے کو اہل وعیال اور بزرگوں کی محبت پر مقدم رکھے، نیز اسے مال وتجارت اور جائیداد پر بھی ترجیح دے، اس طرح اس نے ایک مومن صادق اور مخلص مسلمان کو قربانی، ایثار اور نفس کشی کے اعلیٰ مقام پر پہونچا دیا ہے تاکہ وہ ان پسندیدہ اعلیٰ قدروں کو حاصل کرنے کے لئے سب کچھ قربان کردے،

مگر جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کے آرام وعیش کو آخرت پر ترجیح دے اور اپنے مال، اہل وعیال اور خاندان کی محبت کو، جہاد کے ذریعے، اسلام کا بول بالا کرنے پر مقدم رکھے تو اسے اللہ نے دردناک عذاب کی دھمکی دی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کی پچیسویں (۲۵) آیت میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

"(اے پیغمبرؐ) کہہ دیجئے کہ اگر تمھارے آباؤ اجداد، فرزند، بھائی، بیویاں تمھارا خاندان، وہ مال جو تم نے کما رکھا ہو نیز تجارت، جس کی کساد بازاری کا تمھیں اندیشہ ہو، اور وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو انھیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہوں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور بے شک اللہ فاسق قوموں کو ہدایت نہیں دیتا ہے"

اسی سورۂ توبہ میں ذیل کی آیات میں مسلمانوں کو ترک جہاد پر بہت زجروتوبیخ کی گئی ہے اور وہ لوگ جو جہاد کے لئے نہیں نکلے تھے ان پر عتاب نازل ہوا ہے بلکہ ان لوگوں پر جو جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے دنیاوی محبت کا الزام لگایا گیا ہے[2]

---

[1] سورہ توبہ آیات ۲۰-۲۳ [2] یہ واقعہ جنگ تبوک کا ہے جبکہ بعض لوگ سستی کی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔

"اے ایمان والو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین کی طرف بوجھل ہو جاتے ہو، کیا تم نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر مقدم کر رکھا ہے۔ حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کا لطف بہت تھوڑا ہے، اگر تم جہاد کے لئے نہیں نکلو گے تو وہ تمھیں دردناک عذاب دے گا اور تمھارے بجائے دوسری قوم لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ [۱]

شہادت کی فضیلت

جب جہاد کے اسباب و شرائط مہیا ہو جائیں تو جہاد اور شہادت کی ترغیب کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ نے شہدار کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا ہے بشرطیکہ اللہ کی راہ میں جنگ کی جائے اور اس کا مقصد اعلائے کلمۂ حق ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے —— تم ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوں، مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اور خدا کے ہاں انھیں رزق پہونچایا جاتا ہے اور اللہ نے ان پر جو فضل کیا ہے، اس پر وہ خوش ہیں، اور وہ ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان سے نہیں ملے ہیں اس بات کی بشارت دیتے ہیں کہ ان پر کسی قسم کا خوف نہیں ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہیں وہ اللہ کے فضل و نعمت کی بشارت دیتے ہیں اور اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے [۲]

سورۃ توبہ میں ارشاد فرماتا ہے —— اللہ نے مومنوں کے جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں۔ یہ خدا کا سچا وعدہ تورات، انجیل اور قرآن کریم میں ہے، اور اللہ سے زیادہ کون اپنے عہد کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لئے تم اس معاملے پر خوش ہو جاؤ، جو معاملہ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے [۳]

سنتِ نبویؐ میں بھی جہاد اور شہادت کی فضیلت بہت جگہ مذکور ہے ان میں سے چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اللہ کی راہ میں صبح کے وقت یا شام کے وقت نکلنا دنیا اور اس کی تمام

---

[۱] سورہ توبہ آیات ۳۹-۴۰ [۲] سورہ آل عمران آیات ۱۶۹-۱۷۱ [۳] سورہ توبہ آیت ۱۱۲

چیزوں سے بہتر ہے "

(۲) جس کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوں ، اس پر اللہ دوزخ کی آگ حرام کرتا ہے

(۳) جنت کے دروازے تیغوں کے سایوں کے نیچے ہیں "

(۴) اللہ کی راہ میں صبح کے وقت یا شام کے وقت نکلنا ہر اس چیز سے بہتر ہے ، جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہو ،

(۵) جو اللہ کی راہ میں تھوڑے عرصے کے لئے بھی جہاد کرے ، اس کے لئے جنت واجب ہے ،

(۶) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ـــ " میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ـــ " دو طرح کی آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں چھو سکتی (۱) وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے رونی ہو (۲) وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں رات بھر حفاظت کے لئے جاگتی رہے "

(۷) حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں ـــ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ـــ " ایک شخص بہادری کی وجہ سے جنگ کرتا ہے ، دوسرا شخص عزت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے اور تیسرا شخص ریاکاری کے لئے جنگ کرتا ہے تو ان میں سے کونسا اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے " آپؐ نے فرمایا ـــ " جو شخص محض اس لئے جنگ کرے کہ کلمۂ حق بلند ہو تو وہی اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے "

(۸) ایک شخص آپؐ کے پاس آکر کہنے لگا ـــ " ایک شخص ثواب اور نیک نامی کے لئے جنگ کرتا ہے ، آپ کی رائے میں اسے کیا ملے گا ؟ " آپؐ نے فرمایا ـــ اس کے لئے کچھ نہیں " اس شخص نے تین مرتبہ اس سوال کو دہرایا اور آپؐ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا ـــ " اس کے لئے کچھ نہیں " ـــ آپؐ نے پھر فرمایا ۔

" اللہ ہر وہ عمل قبول کرتا ہے جو اس کے لئے خالص ہو اور اس کے ذریعے اس کی رضامندی حاصل کی جائے " ۔ [۱]

---

[۱] مذکورہ بالا احادیث کے لئے ملاحظہ ہو حصہ ہفتم نیل الاوطار مطبوعہ حلبی ۔

(۹) دوسری صحیح حدیث یہ ہے [۱] کہ آپؐ نے فرمایا — "شیطان فرزند آدم کی گھات میں تین مقامات پر بیٹھتا ہے (سب سے پہلے) وہ اسلام کی راہ میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے — "تم کیوں اپنے اور آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑتے ہو" پھر جب وہ اس کی مخالفت کرکے مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ اس کی ہجرت میں حائل ہو کر کہتا ہے۔ کیا تم اپنا مال اور اہل وعیال کو چھوڑ دوگے" پھر جب وہ اس کی مخالفت کر کے ہجرت کر لیتا ہے تو وہ اس کے جہاد کی راہ میں حائل ہو کر کہتا ہے — "اگر تم جہاد کروگے تو مارے جاؤ گے، تمھاری بیوی کا کسی دوسرے سے نکاح ہو جائے گا اور تمھارا مال وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا مگر وہ اس بات کی بھی مخالفت کر کے جہاد کرتا ہے تو اللہ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے۔"

(۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا — "اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر کیا کام ہے؟" آپؐ نے فرمایا — "تم اسے نہیں کر سکوگے" لوگوں نے دو یا تین مرتبہ یہ سوال دوہرایا اور ہر موقع پر آپؐ یہ فرماتے تھے "تم نہیں کر سکوگے۔" بعد ازاں آپؐ نے فرمایا — "اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک روزہ دار شب بیدار ہو کر اللہ کی آیات خشوع وخضوع کے ساتھ تلاوت کرتا رہے اور وہ نماز اور روزے کو لگاتار انجام دینے میں سستی نہ کرے یہاں تک کہ اللہ کا مردِ مجاہد واپس آجائے۔"

سلف کا جذبۂ جہاد

مسلمانوں کے صف اول نے اللہ کی آیات اور احادیث نبویؐ کو غور سے سُنا اور جہاد کے بارے میں اللہ کے احکام کو معلوم کیا۔ ان کے دلوں میں ایمان راسخ تھا اور ان کے سینے صحیح عقائد سے معمور تھے اور ان کے چہرے نورِ یقین سے جگمگا رہے تھے، اللہ اور اس کے دین کی محبت ان کے سینوں میں رچی ہوئی تھی۔ اسی لئے اللہ کے آگے انھوں نے سرِ تسلیم خم کر رکھا تھا قرآن وسنت کے آداب عالیہ کی روح ان میں سرایت کر چکی تھی اور ہدایت کی کرنوں نے انھیں روشن کر رکھا تھا چونکہ انھوں نے قرآن

[۱] حصہ ہشتم تفسیر قرطبی ص ۹۷ مطبوعہ دارالکتب المصریہ

نازل ہوتے دیکھا تھا اس لئے وہ دین اسلام کے مخلص اور جاں باز سپاہی تھے ان کی
شجاعت اور بہادری ضرب المثل تھی چنانچہ جب انھیں میدان جنگ کی طرف بلایا جاتا
تھا تو وہ دوڑ کر صدائے لبیک بلند کرتے تھے اور نہایت مستعدی کے ساتھ مسلح ہو
کر یا نہتے ہر حالت میں جنگ کے لئے نکل پڑتے تھے۔ وہ اپنے جان و مال سے اللہ
کی راہ میں جہاد کرتے تھے وہ کبھی نہ انکار کرتے تھے اور نہ پیٹھ موڑتے تھے بلکہ یا تو
فتح عظیم حاصل کرتے یا جام شہادت نوش فرماتے تھے، انھوں نے اپنا نصب العین
قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کو بنا رکھا تھا۔

"اے ایمان والو! جب کسی حملے میں تمھارا کافروں سے مقابلہ ہو جائے تو انھیں پیٹھ
نہ دکھاؤ اور جو کوئی انھیں اس دن اپنی پیٹھ دکھائے اور وہ لڑائی کا پینترا بدلنے یا
جماعت میں شامل ہونے کے لئے نہ ہو۔ تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہے اور
اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو بہت برا ٹھکانہ ہے [1]

ہمارے اسلاف کی ایک حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے مذہبی کاموں کے سخت پابند
تھے اور ہر حالت میں اس پر ڈٹے رہتے تھے۔ یعنی جب وہ دین کا کوئی کام شروع
کر لیتے تھے، خواہ وہ برے کام سے لوگوں کو روکنا ہو یا اچھے کام کا حکم دینا ہو یا اللہ
کی راہ میں جہاد کرنا ہو تو وہ اس پر پہاڑ کی طرح جم جاتے تھے اس وقت کسی کہنے والے
کا قول یا ملامت کرنے والے کی ملامت انھیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور باطل
کی کوئی ظالمانہ طاقت انھیں اپنے کام سے نہیں روک سکتی تھی وہ لوگ اللہ
کی اس آیت کے مصداق تھے۔

اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو آگے چل کر
اللہ ایسی قوم کو نمودار کرے گا [2] جس سے اللہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے

---

[1] سورۃ انفال آیات ۱۵-۱۶

[2] اس آیت میں کونسی قوم مراد ہے اس کے بارے میں صاحب کشاف نے متعدد رائیں
پیش کی ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ قبیلہ نخع کے دو ہزار مسلمان اور قبیلہ کندہ وبجیلہ
کے پانچ ہزار مسلمان تھے، اور ان کے علاوہ تین ہزار وہ مسلمان بھی مراد ہیں جنھوں نے
جنگ قادسیہ میں جہاد کیا۔ بعض اس سے انصار مراد لیتے ہیں ملاحظہ ہو کتب تفسیر۔

محبت کریں گے وہ مومنوں کے لئے نرم ہوں گے اور کافروں پر غالب رہیں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے اسے عطا فرماتا ہے اور اللہ وسعت رکھنے والا اور جاننے والا ہے۔"[1]

مجاہدانہ کارنامے

وہ اللہ کی راہ میں موت سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ موت انھیں زندگی سے محبوب تر تھی، کتب سیر میں اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکۂ بدر کے آغاز سے پہلے صحابہؓ سے مشورہ کیا جبکہ آپؐ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ قریش کا لشکر اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے پہونچ رہا ہے سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اظہار خیال کیا اس کے بعد حضرت مقداد بن عمروؓ کھڑے ہو کر کہنے لگے۔

"یارسول اللہؐ! اللہ تعالیٰ جو آپؐ کو حکم دے اس پر عمل کیجئے، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم! ہم آپ سے اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے یہ کہا تھا ـــ "تم اور تمھارے پروردگار دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں" بلکہ ہم یہ کہتے ہیں، آپؐ اور آپؐ کے پروردگار کے ساتھ ہم بھی جہاد کر رہے ہیں، اُس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو رسول برحق بنا کر بھیجا۔ اگر آپؐ ہمیں یمن یا دنیا کے انتہائی گوشے کی طرف بھی لے جائیں گے تو ہم آپؐ کے ساتھ مستقل مزاجی سے روانہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ آپؐ منزل مقصود پر پہونچ جائیں"

باقی لوگ خاموش رہے تو آپؐ نے فرمایا ـــ "اے لوگو! مجھے مشورہ دو" اس سے آپؐ کی مراد انصار تھے اس وقت حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا ـــ "یارسول اللہؐ! کیا آپؐ ہماری طرف اشارہ کر رہے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا ـــ "ہاں" اس پر حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا ـــ "ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ حق کا پیغام لائے ہیں اور

[1] سورہ مائدہ ۵۷ - ۵۸ آیات

ہم نے آپؐ سے یہ عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ ہم آپؐ کا حکم سن کر ہمیشہ اس کی اطاعت کریں گے ۔ جو آپؐ کا ارادہ ہو اسے عمل میں لائیے ہم آپؐ کے ساتھ ہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسولؐ برحق بنا کر بھیجا ہے اگر آپؐ سمندر میں ہمیں لے کر گھسیں گے تو ہم اس میں بھی آپؐ کے ساتھ کود پڑیں گے اور ہمارا کوئی آدمی پیچھے نہیں رہے گا ۔ ہم کل دشمن کا مقابلہ کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے بلکہ ہم لڑائی میں ثابت قدم رہنے والے ہیں اور سچے جواں مردوں کی طرح مقابلہ کریں گے توقع ہے کہ اللہ آپؐ کو ہمارے وہ کارنامے دکھائے گا جس سے آپؐ کی آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو گی آپؐ اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جائیں "

اس غزوۂ بدر میں آپؐ زرہ پوش تھے اور پھرتی کے ساتھ چلتے ہوئے یہ فرما رہے تھے ـــ " عنقریب جماعت کو شکست ہو گی اور وہ پیٹھ موڑیں گے ۔ پھر آپؐ نے صحابہؓ کو آمادہ کرتے ہوئے فرمایا ـــ " اس ذات کی قسم ! جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے آج کے دن جو کوئی ان سے جنگ کرے اور پیٹھ نہ موڑے بلکہ پیش قدمی کرے اور صبر و احتساب کی حالت میں شہید ہو جائے تو اللہ ضرور اسے جنت میں داخل کرے گا " اس وقت قبیلہ بنو سلمہ کے حضرت عمیرؓ کے ہاتھ میں پھل تھے جسے وہ کھا رہے تھے، یہ سنتے ہی انھوں نے پھل پھینک دیئے اور کہنے لگے ـــ " بس، بس، میرے لئے یہی کافی ہے کہ اگر یہ کافر مجھے قتل کر دیں تو میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا " یہ کہہ کر وہ تلوار لے کر کافروں سے جنگ کرنے لگے یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے شہادت کے وقت وہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے :-

ہم اللہ کی طرف جا رہے ہیں، ہمارے توشہ میں پرہیز گاری اور عمل آخرت کے سوا کچھ نہیں ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے وقت ہم نے صبر اختیار کر رکھا ہے اور تقویٰ ہمارا سب سے بڑا وسیلہ ہے "[1]

[1] ص ۲۰۶ جلد ۱۸ مجلۃ الازہر

جنگِ موتہ

صحابہؓ کے مجاہدانہ کارنامے جنگِ موتہ[1] میں نہایت شاندار اور لافانی ہیں ۸ھ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی اور دشمن کی تعداد ایک لاکھ یا دو لاکھ تھی اس لئے مسلمانوں نے کہا ــــ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ کر انہیں دشمن کی تعداد سے مطلع کریں گے یا تو وہ ہمیں امدادی فوج بھیجیں یا کوئی اور حکم دیں تاکہ ہم اس کی تعمیل کریں، اس پر حضرت عبداللہ بن رواحہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ــــ "اے لوگو! کیا تم جس چیز کو حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے، اسے ناپسند کرتے ہو؟ اصل چیز شہادت ہے، ہماری ان لوگوں سے ساتھ تعداد، طاقت اور کثرت کے بل بوتے پر جنگ نہیں ہے، بلکہ ہم تو اس دین کے بل بوتے پر جنگ کر رہے ہیں جس میں داخل ہونے کا شرف اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ تم جنگ کرو کیونکہ اس میں دو فائدوں میں سے ایک فائدہ ضرور حاصل ہوگا، یا تو فتح حاصل ہوگی یا شہادت نصیب ہوگی" اس پر لوگ کہنے لگے ــــ "خدا کی قسم! ابن رواحہ سچ کہتا ہے" بعد ازاں انھوں نے اللہ کی راہ میں جنگ شروع کی اور کافروں کو قتل کر کے شہید ہونے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کا پہلا سردار زید بن حارثؓ کو بنایا تھا کہ اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالبؓ کو سالارِ لشکر مقرر کیا تھا ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ کے سالارِ لشکر بننے کا نمبر تھا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو زید بن حارثؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم لے کر جنگ کرنے لگے یہاں تک کہ شہید ہو گئے ان کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے اپنے دائیں ہاتھ میں علم لیا جب دایاں ہاتھ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ میں لے لیا اور جب بایاں ہاتھ کٹ گیا تو انھوں نے اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا اور اسی حالت میں جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہؓ علم بردار ہوئے اور جنگ کرنے لگے۔ اس جنگ میں ان کی انگلی کٹ گئی تو انھوں نے رجزیہ انداز میں یہ اشعار پڑھے

---

[1] حیاتِ محمد از محمد حسین ہیکل و مجلہ لواء الاسلام شمارہ ۱۱ سال سوم

(۱) تو محض ایک انگلی ہے جو زخمی ہو گئی اور تو نے اللہ کی راہ میں یہ تکلیف برداشت کی ہے

(۲) اے جان! اگر تو قتل نہیں ہو گی تو تجھے مرنا ضرور ہے تو موت کے حوض میں گھس گئی ہے۔

(۳) اور جس چیز کی تجھے آرزو تھی، وہ مل گئی ہے، اگر تو بھی ان دونوں (صحابہؓ) جیسے کام کرے تو تیرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ اس کے بعد اسی طرح جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

معذوروں کا جہاد

صحابہؓ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کو اس طرح پسند کرتے تھے کہ بعض معذور حضرات معذوری کے باوجود جہاد کے لئے کمربستہ ہو جاتے تھے، گو حق تعالیٰ نے انھیں معاف کر رکھا تھا۔ تاہم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ــــ "ایک آدمی کو دو آدمیوں کے سہارے سے میدان جنگ میں لایا گیا اور وہ جنگ کے مورچے پر کھڑا ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (جو اندھے صحابی تھے) جنگ احد میں شریک ہوئے اور جھنڈا دیے گئے۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیر نے جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا تو ایک کافر نے آکر ان کے اس ہاتھ پر تلوار ماری جس میں جھنڈا تھا اور اسے کاٹ دیا۔ لہٰذا انھوں نے دوسرے ہاتھ سے اسے پکڑ لیا اس نے دوسرے ہاتھ پر بھی تلوار ماری تو انہوں نے جھنڈے کو اپنے سینے سے روک لیا اور یہ آیت پڑھی ــــ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہیں، آپؐ سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں"۔

حضرت عمرو بن الجموح انصار کے نقیبوں میں سے تھے وہ پہلے لشکر میں جنگ کے لئے نکلے جبکہ وہ لنگڑے تھے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا۔ "اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے" وہ کہنے لگے ــــ "خدا کی قسم! میں اپنے اس لنگڑے پن کی حالت میں بہشت کی طرف جاؤں گا"[۱] بہرحال اس دور کی ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

[۱] حصہ ششم الجامع لاحکام القرآن از قرطبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ ص ۲۶۶

سلف کی قربانیاں

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو ایسے موقعوں پر دشمنان خدا کے لئے سخت اور مسلمانوں کے لئے بے حد رحم دل تھے وہ اپنی جان و مال اللہ اور حق کی تائید میں قربان کرتے تھے اور دشمن کا لشکر جرار اور اس کی کثرت انھیں خوف زدہ نہیں کرتی تھی اور نہ ان کے آہنی اور آتشیں ہتھیار انھیں مرعوب کرسکتے تھے۔ نیز جنگ کے موقع پر وہ گھبراتے بھی نہیں تھے۔ بلکہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے خواہ دشمن تعداد اور ساز و سامان میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو۔ بہرحال جب وہ کوئی عزم کر لیتے تھے تو وہ عزم ان کا نصب العین ہوتا تھا۔ چونکہ وہ موت کے خواہاں تھے اس لئے انھیں باعزت زندگی اور حیات جاوید عطا کی گئی۔ وہ خدا کی حمایت کرتے تھے اس لئے اللہ نے ان کی مدد فرمائی انھیں ثابت قدم رکھا، انھیں عزت بخشی اور ان کا بول بالا کیا کیوں کہ مومنوں کی مدد کرنا اللہ کے لئے ضروری ہے۔ ایسے موقع پر ان کا ہر مجاہد زبان حال سے پکار پکار کر یہ کہا کرتا تھا۔

اگر میں مسلمان ہو کر شہید ہو جاؤں تو پھر مجھے یہ پرواہ نہیں ہے کہ کس کروٹ پر مجھے گرایا گیا ہے چونکہ یہ کام اللہ کے لئے سرانجام دیا گیا ہے لہٰذا اگر وہ چاہے تو وہ کٹے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں میں بھی برکت عطا کرسکتا ہے،

جہاد کی تلقین

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ خلافت کی بیعت مکمل ہو گئی تو آپؓ نے اثنائے خطبہ میں یہ فرمایا۔ "تم میں سے کوئی جہاد کو نہ چھوڑے کیونکہ جب کوئی قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے تو اللہ اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے"

جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مرتدوں سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا تو اس موقع پر انھوں نے یہ لکھا ۔۔۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کی نظریں تمھیں دیکھ رہی ہیں اور تمھاری حفاظت کر رہی ہیں۔ جب تم دشمن سے ملو تو موت کی خواہش کرو تاکہ تمھیں زندگی عطا ہو، اور شہیدوں کے بدن سے ان کا خون نہ دھوؤ۔ کیونکہ شہید کا خون قیامت کے دن نور بن کر چمکے گا"

حضرت خالد بن الولید نے جو اللہ کی ایسی شمشیر بے نیام تھے جو مشرکوں کے

کے لئے وقف ہوا کرتی تھی، وفات کے وقت یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"میں بہت سی جنگوں میں شریک ہوا اور میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو تلوار، تیر یا نیزے سے گھائل نہ ہوا ہو، مگر اب میں اپنے بستر پر اس طرح طبعی موت مر رہا ہوں جس طرح اونٹ مرتا ہے، بزدلوں کی آنکھیں کبھی نہ سوئیں، میں جنگ کے موقعوں پر شہادت کا طلب گار رہا، مگر میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ میں بستر مرگ پر مروں، بہر حال کلمۂ توحید کے بعد میری نظر میں کوئی عمل اس سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے کہ میں سخت خنک رات میں مہاجرین کے ایک فوجی دستے کے ساتھ رات گزاروں، آسمان سے بارش برس رہی ہو اور میں صبح کا انتظار کروں تاکہ صبح ہوتے ہی میں کافروں پر حملہ کر سکوں لہٰذا تم جہاد کو ضروری سمجھو[1]"

خواتین کا شوق جہاد

اسلام کے ابتدائی دور میں خواتین بھی جہاد میں مناسب حصہ لیتی تھیں وہ فوجیوں کو پانی پلاتی تھیں ان کے لئے کھانا تیار کرتی تھیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں اور بوقت ضرورت جنگ بھی کرتی تھیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جہاد کے موقع پر وہ اچھے کارنامے سرانجام دیتی تھیں وہ مجاہدین کی ہمدرد و غم خوار اور تیمار دار ہوتی تھیں میدانِ جنگ میں وہ مردوں کی حوصلہ افزائی کرکے ان سے اظہار ہمدردی کرتی تھیں رُبیع بنت معوذ فرماتی ہیں —— "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتی تھیں، لوگوں کو پانی پلاتی تھیں اور ان کی خدمت کرتی تھیں ہم زخمیوں اور مقتولوں کو مدینہ واپس لے جاتی تھیں۔" حضرت ام عطیہ انصاریہ فرماتی ہیں:—

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات جنگوں میں شریک ہوئی، میں لشکر کے پچھلے حصے میں رہتی تھی اور ان کے لئے کھانا تیار کرتی تھی، نیز زخمیوں کی مرہم پٹی اور اپاہجوں کو سہارا دیا کرتی تھی۔"

---

[1] مجلہ الازھر جلد ۱۷

حضرت انس فرماتے ہیں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلیم اور انصار کی متعدد خواتین کو جنگ میں شریک رکھتے تھے، وہ پانی پلاتی اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ زخمیوں کے معاملہ میں ان خواتین کا ایک پسندیدہ کارنامہ یہ تھا کہ مسجد میں افیدہ کا ایک خیمہ ہوتا تھا جہاں زخمی صحابہؓ کا علاج کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذؓ کو تیر لگا تو آپؐ نے ان کے گھر والوں سے یہ فرمایا — انھیں افیدہ کے خیمے میں رکھو تاکہ عنقریب میں ان کی عیادت کرسکوں"

بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض خواتین جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور جان و مال سے جہاد کرنے کی ان میں عمدہ استعداد تھی، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت انس کی یہ روایت مذکور ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے اپنے پاس جنگ حنین میں ایک خنجر رکھا ہوا تھا۔ وہ فرماتی تھیں کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آئے تو میں اسے اسی کے پیٹ میں بھونک دوں گی" حضرت ام سعدؓ فرماتی ہیں :-

"میں ام عمارہؓ کے پاس آئی اور ان سے کہا — خالہ جان! آپ اپنا واقعہ بیان کیجئے" وہ فرمانے لگیں — میں جنگ احد کے دن صبح ہوتے ہی نکلی تاکہ میں دیکھوں کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ میرے پاس پانی کی ایک مشک تھی جس سے میں زخمیوں کو پانی پلانے لگی جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچی تو آپؐ اپنے صحابیوں کے ساتھ تھے اور مسلمانوں کے لئے فتح یقینی تھی مگر جب انھیں شکست ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئی اور کھڑے ہو کر بذات خود جنگ کرنے لگی۔ میں تلوار کے ذریعے آپؐ کی حفاظت کرنے لگی یہاں تک کہ میں بھی زخمی ہو گئی"

حضرت ام سعدؓ فرماتی ہیں — "میں نے ان کے کندھے پر بہت گہرا زخم دیکھا تو میں نے پوچھا — کس نے تمھیں زخمی کیا" وہ فرمانے لگیں — "ابن قمئہ نے" کیونکہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے منتشر ہو گئے تھے تو وہ آکر کہنے لگا — مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پتہ بتاؤ اگر وہ بچ گئے تو میں نہیں بچوں گا" اس پر میں اور مصعب بن عمیر اور وہ لوگ جو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے تھے اس کے مقابلے کے لئے آئے تو اس نے مجھے تلوار مار کر زخمی کر دیا میں نے بھی اس پر تلوار سے کئی حملے کئے مگر وہ دشمن خدا دو زرہیں پہنے ہوئے تھا، اس لئے بچ نکلا۔

کمزوروں پر رحم

جہاد اسلام کا ایک رکن ہے اور اس کے اصول حق و انصاف پر مبنی ہیں اس لئے اسلام کمزوروں اور صلح پسند شہریوں کو جنگ کے مصائب و آلام سے محفوظ رکھتا ہے وہ صرف جنگ جو افراد اور ان کے مددگاروں کے خلاف اعلان جہاد کرتا ہے اس نے جنگ کو نہایت ہی تنگ دائرہ میں محدود کر دیا ہے تاکہ بے گناہ اور معصوم شخص نہ مارا جائے اور جنگ صرف انہی لوگوں سے کی جائے جو جنگ کی ابتداء کریں اور بلا ضرورت فتنہ و فساد نہ برپا کیا جائے اور نہ جنگ میں جذبہ انتقام کارفرما ہو، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جہاد میں عورتوں، بچوں اور بہت بوڑھے انسان کو قتل نہ کیا جائے اور نہ اعضا کاٹے جائیں اور نہ غداری اور مال غنیمت میں خیانت کی جائے۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "اللہ کے نام اور ملت رسول پر روانہ ہو جاؤ، کسی بہت بوڑھے شخص، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔ مال غنیمت میں چوری نہ کرو۔ مال غنیمت کو یکجا رکھو۔ اصلاح اور احسان کرو۔ کیونکہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کو روانہ کرتے وقت فرماتے تھے ـــــ اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ، جو اللہ کا انکار کریں، ان سے اس کی راہ میں جنگ کرو، غداری نہ کرو۔ نہ مال غنیمت میں خیانت کرو۔ نہ اعضا کاٹو۔ اور نہ بچوں اور اہل خانقاہ کو قتل کرو۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گامزن رہے اور جب وہ اپنی فوجوں کو روانہ کرتے تھے تو اس قسم کی حکیمانہ ہدایات دیتے تھے روایت ہے کہ جب انہوں نے شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو اس کے ایک چوتھائی حصے کے امیر یزید بن ابی سفیان تھے اس لئے حضرت ابوبکرؓ تھوڑی دیر حضرت یزید بن ابی سفیان کے ساتھ پیدل چلتے رہے اور انہیں ہدایات

دیتے رہے ہیں۔

"میں تمھیں دس ہدایات دیتا ہوں، تم نہ تو کسی عورت اور نہ بچے اور نہ بوڑھے آدمی کو قتل کرو۔ پھلدار درخت کو نہ کاٹو اور نہ آباد مقام کو ویران کرو۔ کسی بھیڑ بکری اور اونٹ کو صرف کھانے کے لئے ذبح کرو، کسی کھجور کے درخت کو نہ کاٹو اور نہ اسے جلاؤ اور نہ مال غنیمت میں خیانت کرو۔"[1]

یہ اسلامی جہاد اور اس کے مقاصد ہیں جو بیان کئے گئے ہیں جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کی عزت کو محفوظ رکھنا اور انھیں دشمنوں کی زیادتیوں سے بچانا ہے تاکہ دشمن، تبلیغ اسلام اور اعلاء کلمۃ حق کی راہ میں حائل نہ بن سکیں۔ مگر جب مسلمانوں نے فریضۂ جہاد کو چھوڑ دیا تو وہ کمزور اور ذلیل وخوار ہو گئے، وہ سست اور آرام طلب ہو گئے تھے، اس لئے انھوں نے عافیت پسندی اور گوشہ نشینی کو جہاد اور قومی عزت پر مقدم رکھا۔ انھوں نے اسلامی شریعت میں جو خوبیاں رکھی گئی ہیں۔ اور جن کی بدولت انھیں طاقت اور عزت حاصل ہو سکتی ہے قطعی طور پر نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ اسلام کا یہ حکم تھا کہ مسلمان جہاد کا ساز و سامان تیار رکھیں اور اپنی جان و مال سے جہاد کیا کریں، تو کیا مجاہد اور نکمی قوم ایک دوسرے کے برابر ہو سکتی ہیں؟ جب کہ خدا خود یہ فرماتا ہے "وہ مومن جو کسی عذر کے بغیر جہاد کرنے سے بیٹھ جائیں اور وہ لوگ جو اپنی جان و مال کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں، برابر نہیں ہو سکتے" اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کی جہاد نہ کرنے والوں پر بہت فضیلت رکھی ہے، ہر ایک کے ساتھ اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے، مگر مجاہدین اسلام کے لئے غیر مجاہدوں کے مقابلے میں اللہ نے بہت بڑا ثواب، اعلیٰ مراتب، مغفرت اور رحمت عطا فرمائی ہے کیونکہ اللہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[2]

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد کی بہت بڑی اہمیت ہے اسی کے ذریعے اسلامی شان وشوکت اور مسلمانوں کی آزادی اور عزت برقرار رہ سکتی ہے

---

[1] حصہ ہفتم نیل الاوطار ص ۲۰۶ - ۲۰۸ - مطبوعہ حلبی ۱۳۴۷ھ

[2] سورہ نساء آیات - ۹۴ - ۹۵

نیز دعوت اسلام اور صحیح عقائد کی حفاظت اور کمزوروں کی حمایت بھی اسی کی بدولت ممکن ہے، بلکہ دنیا میں حق و انصاف اور حریت و مساوات کی ان اعلیٰ قدروں کو بھی جہاد ہی کے ذریعے محفوظ رکھا جاسکتا ہے جن کی بدولت حاکم و محکوم اور عرب و عجم کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا ہے۔

اگر اسلامی جہاد کے تمام اسباب و شرائط مہیا ہو جائیں تو اس صورت میں اسلامی جہاد کی دو خصوصیات ہیں:-

(۱) جب دشمن حملہ کر دے اور اس کی مدافعت تمام قوم کے تعاون کے بغیر ممکن نہ ہو تو جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور قوم کا کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ بوڑھے اور عورتیں بھی اس میں حصہ لیتی ہیں۔

(۲) جہاد ایسا عام فریضہ ہے جو امت اسلامیہ کے کسی ایک طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ قوم کے معمولی فرد سے لیکر بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس میں شریک ہوتی ہے اس میں حاکم و رعایا، جاہل اور تعلیم یافتہ اور امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لئے قوم کا ہر فرد اپنی اجتماعی اور قومی ذمہ داری کے احساس میں مساوی طور پر شریک ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جہاد کے ذریعے قوم کے ہر فرد میں عزت و خودداری، بلند ہمتی، خود اعتمادی اور اعلیٰ اخلاقی صفات ابھرتی ہیں۔

اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہم اس فریضہ کو کہاں تک انجام دے رہے ہیں؟ اسلام حق کی حمایت اور باطل کا قلع قمع کرنے کی ہمیں دعوت دے رہا ہے مگر ہماری ہمتیں کب متحرک ہوں گی تاکہ ہم اس کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کریں اور روئے زمین کے فتنہ و فساد کا خاتمہ کریں؟

یہ کام بہت اہم ہے جسے دنیا کی بہترین قوم ہی سرانجام دے سکتی ہے اور بہترین قوم کے لقب کی مستحق صرف مسلمان قوم ہو سکتی ہے۔

اسلام کا نظام حکومت

(۲۲) اسلام میں دو بنیادی اصول، نظام حکومت کے لئے مقرر ہیں،

(۱) قوم کسی حاکم کو مقرر کرنے اور اس کو معزول کرنے میں با اختیار ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے مفکرین اور علمائے اسلام نے یہ تصریح کی ہے کہ اسلام میں حکومت کے اختیارات صرف عوام کو حاصل ہیں۔ اور وہ حکومت کے ان اختیارات کو ارباب حل وعقد کے سپرد کرتے ہیں جو ان کی طرف سے ایسے خلفاء اور حکام کو مقرر کرتے ہیں جو حکومت کرنے کے اہل ہوں مگر جب حکام سیدھے راستے سے بھٹک جائیں اور عوامی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ انھیں معزول کر دیا جائے تو وہ انھیں معزول بھی کر سکتے ہیں۔ لہذا حکام اور امراء قوم کے سامنے جواب دہ ہیں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کی بیعت کے بعد اپنی پہلی تقریر میں یہ ارشاد فرمایا تھا۔

"بعد حمد وثنا کے معلوم ہو کہ اگرچہ میں تم میں سے بہترین نہیں تاہم میں تمھارا حاکم بنا دیا گیا ہوں، اگر میں صحیح راستے پر چلوں تو میرے ساتھ تعاون کرو اور اگر میں بھٹک جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو"

بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد گرامی پر بھی غور کیا جائے، "تم میں سے جو کوئی مجھ میں ٹیڑھا پن دیکھے تو وہ اسے سیدھا کر دے"

اس پر ایک اعرابی کہنے لگا ——— "اگر ہم تمھارے اندر کوئی ٹیڑھا پن دیکھیں گے تو ہم ضرور اپنی تلواروں کے ذریعے اسے سیدھا کر دیں گے" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ——— خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ باقی رکھے ہیں جو عمرؓ کے ٹیڑھے پن کو تلوار کے ذریعے سیدھا کر سکتے ہوں"

مشورہ کی حکومت

(۲) دوسرا بنیادی اصول حکومت یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد مشورہ پر رکھی گئی ہے، خواہ حکومت کی شکل وصورت کیسی ہو، اور قوم کی مرضی کے مطابق خواہ کسی قسم کی حکومت ہو (مگر اس کی بنیاد مشورہ پر رکھی جائے یعنی وہ شورائی حکومت ہو) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا ہے ——— "تم کام میں ان سے مشورہ کیا کرو" یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جنگی، سیاسی اور مالی معاملات میں جن کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہوتا تھا مگر ان کا تعلق مفاد عامہ سے ہوتا تھا اپنے صحابہؓ سے

مشورہ لیا کرتے تھے۔ تاکہ آنے والے مسلمانوں کے لئے آپ کا طرز عمل نمونہ بن سکے لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے رسول کے لئے مشورہ کرنا ضروری قرار دیا ہو تو دوسرے مسلمانوں کے لئے اس کی پابندی کرنی بدرجہ اولیٰ ضروری ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفات کا اس طرح تذکرہ کرتا ہے،

" یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے احکام کو مانتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انھیں دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔"

خلفاء راشدین نے سنت نبویؐ کا اتباع کیا چنانچہ وہ اہل علم اور اہل رائے صحابہؓ کو جمع کرکے ان معاملات میں جن کا صریح ذکر کتاب و سنت میں نہیں ہوتا تھا۔ ان سے مشورہ کیا کرتے تھے،

شورائی نظام حکومت کے فوائد بہت واضح ہیں کیونکہ مشورہ کے ذریعے تمام مشکل معاملات کی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں بالخصوص اہم امور اور مشکل معاملات میں مشورہ کرنا بہت ضروری ہے، مشورہ کے ذریعے نہ صرف قومی اتحاد و اتفاق باقی رہتا ہے بلکہ حکومت بہت سی غلطیوں اور ندامتوں سے بچ جاتی ہے اور بالکل صحیح رائے سے واقف ہوتی ہے

اس زمانے میں جبکہ عوام ظالمانہ اور استبدادی حکومتوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انھوں نے عوام کو دین و دنیا کے تمام کاموں میں اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ اسلام نے دو عظیم ترین اصولوں پر نظام حکومت قائم کرکے عالم انسانیت میں ایسا زبردست انقلاب برپا کیا جس سے انسانیت کی اصلاح ہوئی اور صالح حکومت کی بنیاد قائم ہوئی کیونکہ اسلام نے دنیا میں سب سے پہلے حکومت کے اختیارات کا مرکز عوام کو قرار دے کر امراء اور حکام کو عوام کے سامنے جواب دہ ٹھہرایا۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ حکومت کی بنیادوں کو مشورہ پر قائم کیا۔ [1]

[1] اسلامی نظام حکومت کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو الوحی المحمدی ترجمہ رشید احمد ارشد مطبوعہ کتاب منزل

حکّام کے فرائض

(۲۳) اسلام نے خلیفہ یا حاکم کے فرائض یہ مقرر کئے ہیں کہ وہ کوئی کام ایسا نہ کرے جس میں قومی مفاد مضمر نہ ہو، یا قومی خرابی کو دور نہ کیا گیا ہو، وہ فلاح عام کے کاموں کا نگران ہے اور اللہ کے حدود و احکام کو نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد ہے، لہٰذا اگر وہ راہ استقامت سے بھٹک جائے یا فتنہ وفساد برپا کرے اور قومی مفاد کے خلاف کام کرتے ہوئے قومی مال وحقوق کو تباہ وبرباد کرے تو وہ معزول ہونے کا مستحق ہے اسے معزول کرکے ایسے حاکم کو مقرر کیا جائے جس میں صحیح فرائض کو ادا کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت موجود ہو[1]

اسلامی نظام حکومت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حاکم کے لئے اپنی رعایا سے کوئی امتیازی فرق روا نہیں رکھا ہے، سوائے اس کے کہ شرعی حدود و قوانین کے نافذ کرانے میں اس کی اطاعت کی جائے۔ لہٰذا اس مشروط اطاعت کے علاوہ دیگر معاملات میں اس کے حقوق رعایا کے ایک معمولی فرد کے مساوی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ رعایا کا خادم اور اس کے حقوق کا محافظ ہے، نیز رعایا کے مفادات کا امین بھی وہی ہے اور اللہ کے احکام اور اس کی شریعت کو بھی وہی نافذ کرتا ہے،

حکام کے ان فرائض کو ثابت کرنے کے لئے صرف سیرت رسولؐ اور آپؐ کے ارشادات کا مطالعہ ہی کافی ہے کیونکہ آپؐ کے احکام انصاف پر مبنی ہیں اور آپؐ اپنی امت کے لئے باعث رحمت بن کر آئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے

"تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسولؐ آیا ہے جس پر تمہاری تکالیف شاق گزرتی ہیں، وہ تم سے بہت محبت کرنے والا ہے اور مومنوں کا مشفق و ہمدرد ہے"

(آپؐ کے بارے میں دوسری آیت میں) یہ ارشاد ہے:-

"اور اگر آپؐ بدخلق اور سنگدل ہوتے تو آپ کے پاس سے وہ منتشر

[1] قواعد فقہیہ کے قاعدہ نمبر ۲۳ میں اسے بیان کیا جاچکا ہے،

ہو جاتے، لہٰذا آپؐ ان سے درگذر کریں اور ان کے لئے طلب مغفرت کریں اور اہم کاموں میں ان سے مشورہ لیا کریں"

اسی طرح خلفاء راشدین کی سیرت و اقوال سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی آپؐ کے اسوۂ حسنہ پر کاربند رہے، اس لئے اسلام کی صحیح روح اور اس کی صحیح ہدایات پر عامل ہونے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے مخلص بھائی، صحیح رہنما اور منصف حکام ثابت ہوئے۔ یہ اسلامی حکام غرور و تکبر سے ناآشنا تھے اور اپنے لئے کسی امتیازی سلوک کے روادار نہ تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو اس حالت میں رخصت کیا کہ خلیفہ اولؓ ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے اور حضرت اسامہ بن زیدؓ سپہ سالار لشکر بن کر سوار تھے حضرت اسامہؓ نے کہا — "اے خلیفۂ رسول اللہؐ! آپ بھی سوار ہو جائیں ورنہ میں اُتر جاؤں گا۔" حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! تم نہیں اُترو گے اور نہ میں سوار ہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں تھوڑی دیر کے لئے میرے قدم بھی غبار آلود ہو جائیں"

یہ حضرت ابو بکرؓ تھے جنہوں نے خلیفہ ہوتے ہی اپنے پہلے خطبہ میں منصفانہ جمہوریت کے اعلیٰ اصول مقرر فرمائے اور ایک ایسی صالح حکومت کی بنیاد ڈالی جس کے اختیارات کا سرچشمہ عوام تھے۔ اور اس کے قوانین کتاب و سنت پر مبنی تھے۔ اور اس حکومت کا اہم مقصد عوام کے مفادات کا تحفظ اور رفع مظالم تھا۔ اس کا اندازہ حضرت ابو بکرؓ کے اس خطبہ کے الفاظ سے ہو سکتا ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے اور جس میں انھوں نے یہ فرمایا تھا — "میں تمھارا حاکم بنایا گیا ہوں مگر میں تم سے افضل نہیں ہوں اگر میں اچھے کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں بُرے کام کروں تو مجھے درست کر دو"

ان الفاظ کے ذریعے حضرت ابو بکرؓ نے یہ اعلان کیا کہ وہ بھی قوم کے ایک فرد ہیں اور انھیں کسی موروثی شرافت یا مفروضہ مراتب کی بنا پر دوسروں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے اور نہ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ امراء اور بادشاہوں کی نسل سے ہیں۔

ہر زمانے اور ہر عہد کے امراء اور حکام فخر کرتے چلے آئے ہیں بلکہ انھوں نے یہ بتایا کہ وہ قوم کے امین و محافظ ہیں اور انہی کی طرف سے انہیں حکومت کے اختیارات حاصل ہوئے ہیں اور ان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو نافذ کرائیں اگر وہ اچھے کام کریں گے تو انھیں قوم سے تعاون کی امید ہے اور اگر برے کام کریں تو قوم سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ان کی کجروی کو درست کریں اس طرح خلیفہ اول نے حاکم و محکوم کے تعلقات کی تنظیم کے لئے نہایت ترقی یافتہ اصول وضع کئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی طرز عمل تھا وہ بھی اپنے پیشرو کے طریقے پر گامزن رہے۔ وہ بھی یہ فرمایا کرتے تھے — "تم میں سے جو کوئی مجھ میں کج روی دیکھے تو وہ اسے درست کردے" آپؓ اپنے حکمرانوں کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ بھی رعایا کے دیگر افراد کی طرح ہیں اور حقوق و فرائض میں ان کے شریک ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے مخصوص حصہ مقرر نہیں ہے چنانچہ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کو ایک خط تحریر فرمایا۔

"تم بیمار مسلمانوں کی عیادت کیا کرو اور ان کے جنازوں میں شریک ہوا کرو اور بذات خود ان کا کام کیا کرو۔ کیونکہ تم بھی انہی کے ایک فرد ہو فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارا بار، ان سے گراں تر ہے۔ امیر المومنین کو یہ اطلاع ملی ہے کہ تم اور تمھارے گھر والوں نے اپنے لباس کھانے اور سواری میں عام مسلمانوں سے مختلف طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اس لئے اے عبداللہ! تم اس چوپائے کی طرح نہ بن جاؤ جو ایک زرخیز وادی میں سے گزرے تو وہ اپنے آپ کو فربہ کرنے کی پوری کوشش کرے حالانکہ اس فربہی میں اس کی موت ہے تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حاکم کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے اگر حاکم کجرو ہوگا تو اس کی رعایا بھی کجرو ہو جائے گی۔ لہٰذا سب سے زیادہ بدبخت انسان وہ ہے جس کی بدولت اس کی رعایا بدنصیب ہو جائے۔"

آپؓ نے اپنے ایک ماتحت حاکم سے یہ فرمایا — "اللہ کا کسی کے ساتھ رشتہ ناتہ نہیں ہے اس لئے شریف و رذیل اس کے لئے سب برابر ہیں" آپؓ کو

اسلامی بیت المال کی حفاظت کا بے حد خیال تھا۔ اس لئے آپؓ فرمایا کرتے تھے "میں یتیم کے سرپرست کی طرح اللہ کے مال کا محافظ ہوں جب مجھے ضرورت ہوتی ہے تو میں اس میں سے کچھ لے لیتا ہوں مگر جب خوشحال ہوتا ہوں تو وہ مال لوٹا دیتا ہوں۔" [۱]

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں اپنی قومی مالی پالیسی کو اس طرح واضح کیا ہے:۔

"میرے خیال میں اس مال کے سلسلے میں صرف تین باتوں کی ضرورت ہے مال کو حق کے مطابق حاصل کیا جائے اور حق کے کاموں میں صرف کیا جائے اور ناحق باتوں سے مال کو بچایا جائے، میں تمہارے مال کا ایسا ہی نگران ہوں جیسا کہ یتیم کا سرپرست ہوتا ہے اس لئے جب خوشحال ہوتا ہوں تو اس سے ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔ اور جب مجھے ضرورت ہوتی ہے تو مناسب طریقے پر اس میں سے کھاتا ہوں اس لئے میں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ کوئی کسی پر ظلم و تعدی کرے، ایسی صورت میں اس کے ایک رخسار کو خاک آلود کردوں گا اور دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھوں گا۔ (ذلیل و خوار کروں گا) تاآنکہ وہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے حاکم کو یہ خط لکھا:۔

"تمہاری نگاہ میں خراج وصول کرنے سے زیادہ زرعی اراضی کی سرسبزی اور زرخیزی مقدم ہونی چاہیئے۔ کیونکہ خراج اس وقت وصول ہو سکتا ہے جبکہ زمین قابل کاشت ہو لہٰذا جو اس کی زرخیزی کا لحاظ کئے بغیر خراج کا مطالبہ کرے تو وہ ملک کو ویران کردے گا۔ اور عوام کو تباہ و برباد کردے گا۔ اور اس کا معاملہ نہیں درست ہو سکتا۔"

بہرحال انصاف پسند حکمرانوں کا یہی طریقہ تھا کہ وہ رعایا کے مفادات کا ہر وقت خیال رکھیں اور ان کی بھلائی اور خوشحالی میں اضافہ کرنے میں مشغول رہیں

---

[۱] اسلامی شریعت کے قاعدہ نمبر ۲۳ میں بھی اس کا تذکرہ آچکا ہے۔

اسلامی دستور کی پابندی

(۲۴) قوم پر کسی مسلمان حاکم یا افسر کی اطاعت اس وقت واجب ہے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، کیونکہ اسلام نے اسلامی حکومتوں کے لئے ایک دستور مقرر کر دیا ہے اور وہ دستور قرآن کریم اور سنت نبویؐ ہے اگر کوئی حکومت اس دستور کی مخالفت کرے اور کسی گناہ کے کام کا حکم دے تو اس صورت میں اس کی اطاعت واجب نہیں ہے،

قرآن کریم میں مذکور ہے ـــــ "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی اور جو تمھارے ارباب اقتدار ہوں ان کی اطاعت کرو۔ اگر تمھارا کسی چیز میں اختلاف ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو، بشرطیکہ تمھارا اللہ اور روز قیامت پر ایمان ہو، یہ طریقہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے صحیح تر ہے" اس آیت کے مطابق اگر مومن ان احکام میں اپنے حاکموں کی اطاعت کریں جن کے ذریعے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہوتی ہو تو اسی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیسے ہوگی جبکہ آیت کے شروع میں ان کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

سنت نبویؐ میں یہ مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا ـــــ "مسلمان شخص پر اس کی اطاعت واجب ہے۔ خواہ اس حکم کو پسند کرے یا ناپسند کرے جب تک کہ اسے کسی گناہ کا حکم نہ دیا جائے اور جب کسی بری بات کا حکم دیا جائے تو پھر اطاعت واجب نہیں ہے۔"

دوسری آیت میں یہ مذکور ہے ـــــ "مسلمان پر اس کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ تنگی میں ہو یا خوش حالی میں ہو، خوشی کی حالت میں ہو یا ناراضگی کی حالت میں ہو، بشرطیکہ اسے اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، اگر اللہ کی نافرمانی کا حکم ہو تو پھر نہ تو اس بات کو سنا جائے گا اور نہ اس کی اطاعت کی جائے گی۔" آپؐ نے یہ بھی فرمایا "خالق کی نافرمانی پر مخلوق کی اطاعت واجب نہیں ہے"[1] ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں ـــــ "اللہ کی

[1] کتاب التوسل والوسیلۃ از ابن تیمیہ ص ۱۰۵ المنار کا دوسرا ایڈیشن،

نافرمانی کے لئے کسی کی اطاعت نہیں کی جاتی ہے بلکہ نیک کام میں اطاعت کی جاتی ہے "۔ [۱]

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنے ایک خطبے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

" جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو تم بھی میری اطاعت کرو۔ اور جب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔"

لہٰذا ان الفاظ کے ذریعے حضرت ابوبکر رضؓ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کا حکم دیں تو رعایا کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان کی بیعت کو توڑ کر ان کی اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے۔"

حکام کا محاسبہ

(۲۵) اگر حاکم نے اپنے عہد حکومت میں اپنے لئے مال جمع کر لیا ہو تو اسلام نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ اس کا محاسبہ کیا جائے۔ اس اصول سے بھی اسلامی شریعت کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے عوام کی فلاح و بہبودی کا کس قدر خیال ہے۔ ابوحمید السعدی فرماتے ہیں:۔

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنوسلیم کے صدقات وصول کرنے کے لئے ایک آدمی مقرر کیا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ نے اس کا محاسبہ کیا تو اس نے کہا۔" یہ مال آپؐ کا ہے اور یہ مال مجھے تحفے کے طور پر دیا گیا ہے " آپؐ نے فرمایا۔" اگر تم سچے ہو تو تم اپنے والدین کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھے رہے تاکہ تمھارے پاس تمھارا یہ تحفہ آجاتا۔" یہ کہہ کر آپؐ کھڑے ہو گئے اور اپنے خطبہ میں حمد و ثناء کے بعد اس طرح ارشاد فرمایا۔ میں اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کے مطابق کچھ لوگوں کو حاکم بناتا ہوں تو تم میں سے کوئی آکر یہ کہتا ہے۔ " یہ تمھارا مال ہے اور یہ مجھے تحفہ میں موصول ہوا ہے۔ اگر وہ حق و صداقت پر ہے تو اپنے والدین کے گھر میں بیٹھ کر اس نے یہ تحفہ کیوں وصول نہیں کیا؟

[۱] حصہ ہفتم نیل الاوطار مطبوعہ حلبی

خدا کی قسم! تم میں سے جو کوئی ناحق مال حاصل کرے گا۔ تو وہ قیامت کے دن اسے اٹھائے ہوئے آئے گا۔ میں تم میں سے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں، جو اللہ کے سامنے اس حالت میں ہوں گے کہ وہ کوئی اونٹ یا گائے یا بھیڑ کو اٹھائے ہوئے ہوں گے اور وہ جانور چلا رہے ہوں گے" بعد ازاں آپؐ نے اپنے ہاتھ اس قدر بلند کئے کہ آپؐ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور فرمانے لگے —— "دیکھو کیا میں نے پیغام حق پہونچایا؟"

حضرت عمر بن الخطابؓ نے عتبہ بن ابی سفیان کو قبیلہ کنانہ کا حاکم بنایا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ مال تھا حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے عقبہ! یہ کیا ہے؟" انھوں نے کہا۔" میں اپنے ساتھ مال لے کر گیا تھا اور اس کے ذریعے میں نے تجارت کی تھی،" آپؓ نے فرمایا —"تم اس حالت میں اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟" بعد ازاں آپؓ نے اس مال کو لیکر بیت المال میں شامل کر دیا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اپنے کچھ ماتحت حکام کو معزول کیا اور ان کے نصف مال کو جو انھوں نے اپنے اقتدار حکومت کے اثر سے کمایا تھا ضبط کر لیا۔ اور وہ مال عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا اس کے بعد آپؓ نے فرمایا۔ اسلام کا یہی طریقہ ہے اور یہی اسلامی انصاف کا تقاضا ہے کہ حاکم و محکوم کے مابین تفریق نہ ہو، اس طرح حکام اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کر سکیں گے اور حد سے متجاوز نہیں ہوں گے۔[1]

چونکہ مسلمانوں نے صالح حکومت کے اصول چھوڑ دیئے ہیں اور اسلامی شریعت کے ان خصوصی احکام و اصول کو نظر انداز کر دیا ہے جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں، بالخصوص انھوں نے جہاد، تبلیغ اسلام، اور اسلامی حکومت کے اصولوں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لئے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ ایک دوسرے پر ظلم و استبداد کرنے لگے اور

---

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۶ مطبعۃ الآداب المواید

خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساکھ جاتی رہی اور اجنبی حکومتوں نے انہیں مطیع کر لیا۔ لہٰذا امام مالکؒ کے قول کے مطابق امت اسلامیہ کے آخری دور میں بھی وہی علاج کارگر ہو سکتا ہے جو پہلے دور میں مفید تھا۔

باب پنجم کے ماخذ وکتب حوالہ جات

(۱) اعلام الموقعین ...... (۲) الطرق الحکمیہ .....
(۳) قاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ (۴) الوحی المحمدی مصنفہ رشید رضا
(۵) نداء للجنس اللطیف (۶) الادب النبوی ....
(۷) الدین الاسلامی از مؤلف کتاب .... حسن احمد الخطیب
(۸) التشریع الاسلامی ... (۹) بدایۃ المجتہد .....
(۱۰) نیل الاوطار...... (۱۱) الجامع لاحکام القرآن ... (تفسیر قرطبی)
(۱۲) تفسیر ابی السعود ..... (۱۳) تفسیر البیضاوی......
(۱۴) النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر....
(۱۵) الرق فی الاسلام .... از احمد شفیق پاشا و ترجمہ احمد زکی پاشا
(۱۶) مفتاح السنۃ از شیخ خولی (۱۷) شرح السراجیہ فی فرائض الحنفیہ
(۱۸) ترجمہ تمدن عرب از محمد عادل زعیتر (۱۹) القیاس فی الشرع الاسلامی از ابن تیمیہ و ابن القیم
(۲۰) فتح الباری بشرح صحیح البخاری از ابن حجر مطبوعہ ۱۳۴۸ھ
(۲۱) قصص القرآن از محمد جاد المولی وغیرہ (۲۲) حیاۃ محمد از ہیکل پاشا

باب ششم

تشریع اسلامی
اور
آزادیٔ اجتہاد

تشریع اسلامی اور آزادی اجتہاد

اسلامی شریعت میں اجتہاد کی جو آزادی ہے وہ کسی دوسری الہامی اور غیر الہامی شریعت میں موجود نہیں ہے مگر اسلامی شریعت کے ان احکام میں جہاں کتاب وسنت کی نص شرعی نہ ہو، رائے اور اجتہاد کی بہت آزادی ہے جیسا کہ ہم گذشتہ ابواب میں بیان کر چکے ہیں،

یہی آزادیٔ رائے اور اجتہاد تھی جس نے اسلامی شریعت کو بہت طاقتور بنا دیا تھا۔ اور اس کی بدولت وہ ہر زمانے اور ہر مقام میں قابل عمل بنی رہی۔ مگر جب ہم نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تو ہم نے اس کے مستحکم نظام کو کمزور کر دیا اور اس کے حسن وجمال کو داغدار کر کے اس کے محاسن پر پردہ ڈال دیا۔ لیکن اگر ہم آزادیٔ اجتہاد کو برقرار رکھتے اور اسلامی شریعت کے ایک اصول کی حیثیت سے وہ لوگ اسے اختیار کرتے جو اس کی صلاحیت رکھتے تھے تو آجکل کوئی مخالف شخص اسلامی قوانین کی راہ میں حائل نہ ہوتا، بلکہ موجودہ دور میں ہمارے ہی ہمارے قوانین خواہ وہ دیوانی ہوں یا تجارتی اور فوجداری، اسلامی اصول کے مطابق نظر آتے، اس طرح آزادی اجتہاد کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک مستقل بین الاقوامی فقہی انجمن قائم ہو جاتی جو سابق فقہائے کرام کے ان احکام کا انتخاب کرتی جو عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق ہوتے۔ اور ان میں ان مسائل اور وقتی احکام کا اضافہ ہوتا رہتا جو زمانے کے مختلف حالات اور مختلف ماحول کے تقاضوں کو پورا کرتے، اسی طرح ہمارا اسلامی قانون

ایسی منظم حالت میں ہوتا کہ اس سے خدا اور رسولؐ بھی خوش ہوتے اور حق و انصاف کی آنکھیں بھی ٹھنڈی ہوتیں اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کا احیار ہوتا۔

یہ فریاد جو ہمارے دل کی پکار ہے، نئی نہیں ہے اور آزادی اجتہاد کا یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے، لہٰذا ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں اجتہاد کے مفہوم کی تشریح اور اس کی تاریخ بیان کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کیسے اجتہاد کرتے تھے، اور ان کے بعد دیگر علمائے کرام کے اجتہاد کا طریقہ کیا تھا؟ نیز فتوی نویسی اور مجتہد کے کیا شرائط و فرائض ہیں۔؟ یہ سب باتیں ہم اجتہاد کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے بیان کر رہے ہیں۔
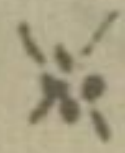
فصل اوّل

اجتہاد

اجتہاد کی تعریف اجتہاد کی تعریف یہ ہے کہ فقیہ شرعی احکام کو معلوم کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرے، آمدی نے اس کی یہ تعریف کی ہے کہ کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے ایسی انتہائی کوشش کی جائے کہ اس سے زیادہ کوشش کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہو۔

محلِ اجتہاد اجتہاد ہر اس حکم شرعی میں ہو سکتا ہے جس کی کوئی قطعی دلیل نہ ہو، لہٰذا ان متفقہ مسائل میں اجتہاد نہیں ہو سکتا جو قطعی دلائل سے ثابت ہو چکی ہوں جیسے پنجگانہ نماز۔ زکوٰۃ وغیرہ

اجتہاد کے شرائط مجتہد میں مندرجہ ذیل دو[۲] اوصاف کا ہونا ضروری ہے[۱]

(۱) وہ نیک اور قابل اعتبار انسان ہو، یہ شرط اس کے فتویٰ کو قابل اعتبار بنانے کے لئے رکھی گئی ہے، ورنہ بذاتِ خود مسائل میں اجتہاد کرنے کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔

(۲) وہ تمام شرعی علوم سے واقف ہو، اور شریعت کے بنیادی ماخذ سے احکام کا استنباط کر سکے[۲]

شرعی احکام کے بنیادی اصول کتاب وسنت، اجماع اور قیاس ہیں لہٰذا ایک مجتہد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کے ان احکام سے بخوبی واقف ہو جو فتویٰ دینے کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہوں کیونکہ صحیح طور پر

---

[۱] اصول الفقہ از خضری

[۲] ارشاد الفحول ص ۲۲۱ مطبوعہ صبیح۔

مجتہد بننے کے لئے تمام قرآن کا جاننا ضروری نہیں ہے بلکہ متعلقہ احکام کا علم کافی ہے اس طرح یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کا حافظ بھی ہو، بلکہ یہ کافی ہے کہ وہ احکام کے مقامات سے واقف ہو تاکہ ضرورت کے وقت اپنی مطلوبہ آیت کو نکال سکے۔

اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ احادیثِ احکام سے بھی واقف ہو مگر احادیث کا حافظ ہونا اس کے لئے شرط نہیں ہے، بلکہ یہ کافی ہے کہ کتب احکام کی تمام احادیث سے صحیح طریقے سے واقف ہو اور ہر باب کا موقع محل جانتا ہو تاکہ فتویٰ دینے کے وقت وہ اس کی طرف رجوع کر سکے۔

اجماعی مسائل سے بھی واقف ہونا ایک مجتہد کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ اجماع کے برخلاف فتویٰ نہ دے سکے۔ اس کے لئے بھی یہ شرط نہیں ہے کہ اجماع اور اختلاف کے تمام مسائل اسے محفوظ ہوں بلکہ صرف اتنا علم کافی ہے کہ اس کا فتویٰ اجماع کے برخلاف نہ ہو [1] ارشاد الفحول کے مصنف فرماتے ہیں ـــــ: مجتہد کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اجماع کے مسائل سے واقف ہو تاکہ وہ اجماع کے برخلاف فتویٰ نہ دے سکے، بشرطیکہ وہ اجماع کی حجیت کا قائل ہو۔ اور اسے دلیل شرعی تسلیم کرتا ہو، ایسا شاذ و نادر ہی اتفاق ہوا ہے کہ وہ شخص جو درجۂ اجتہاد تک پہونچا ہوا ہو اس پر اجماعی مسائل مشتبہ ہو جائیں ـــــ [2]۔

مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قیاس کے ذریعے نصوص شرعیہ سے احکام کے علل و اسباب کا استنباط کر سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اصول اور عام قواعد سے واقف ہو جس پر اسلامی شریعت کی بنیاد قائم ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں جزئی واقعات کے اسباب و علل کو معلوم کر سکے نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عربی زبان اور علوم ادب سے اس قدر واقف ہو کہ عربوں کے محاورہ اور روزمرہ کے استعمال

---

[1] اصول الفقہ از خضری

[2] ارشاد الفحول ص ۲۲۱ مطبوعہ حلبی

کو بخوبی سمجھ سکے [۱] اسی طرح کتاب وسنت کے ناسخ ومنسوخ سے واقفیت بھی ضروری ہے لہٰذا جب مجتہد کسی مسئلہ میں کسی آیت یا حدیث کی رو سے فتویٰ دینے کا ارادہ کرے تو اسے یہ معلوم ہونا چاہیے۔ کہ وہ صحیح اور مستند ہوں مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صحیح وضعیف، مقبول ومردود احادیث کے طریقۂ روایت کا عالم بھی ہو اس سلسلے میں اسے ان اصولوں پر اعتماد کرنا کافی ہے جو محدثین نے مقرر کئے ہیں۔ امام شاطبی نے مجتہد کے مناسب اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے ــــ درجۂ اجتہاد اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے اندر یہ دو ۲ اوصاف موجود ہوں :-

(۱) وہ شریعت کے مقاصد کو پوری طرح سمجھتا ہو۔

(۲) اپنے فہم کامل کے مطابق وہ استنباط احکام کر سکتا ہو [۲]

امام احمد حنبلؒ بروایت صالح بن احمد فرماتے ہیں ــــ اس آدمی کے لئے جو فتویٰ نویسی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کے تمام طریقوں سے واقف ہو، اور وہ سنن نبویؐ کا صحیح اسناد کے ساتھ علم رکھتا ہو۔"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں ــــ "فتوی دینے کا وہ شخص اہل ہے جو کتاب اللہ کا عالم ہو اور اس کے ناسخ ومنسوخ محکم اور متشابہ آیات، ان کی تفسیر اور شانِ نزول اور مکی اور مدنی آیات سے واقف ہو، اس کے ساتھ ساتھ وہ احادیث نبویؐ اور ان کے ناسخ ومنسوخ میں بھی کامل بصیرت رکھتا ہو۔ نیز وہ علم لغت شعر وادب اور ان علوم کا ماہر بھی ہو جن کی قرآن وحدیث میں ضرورت پیش آتی ہو، اور انھیں حق وانصاف کے ساتھ استعمال کرے ان تمام معلومات کے بعد وہ اختلافی مسائل سے بھی واقف ہو اور اس کی طبیعت میں جولانی ہو (تیز فہم اور ذہین ہو) اگر اس میں یہ اوصاف ہوں تو وہ حلال وحرام کے بارے میں

---

[۱] عبد اللہ البطلیوسی نے اپنی کتاب الانصاف میں یہ کہا ہے کہ علم فقہ، علم ادب کا محتاج ہے کیونکہ اس کی بنیاد کلام عرب کے اصول پر ہے،

[۲] حصہ چہارم الموافقات ص ۵۶ ومابعد مطبوعہ ۱۳۴۱ھ

فتویٰ دے سکتا ہے، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اسے فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں ہے"۔ [1]

حضرت ابن المبارک سے دریافت کیا گیا۔ "انسان کب فتویٰ دے؟" انھوں نے فرمایا۔ "جب وہ منقولات کا عالم ہو اور صحیح قیاس کا ماہر ہو یعنی وہ ان صحیح علل و اسباب کو جانتا ہو جن پر شرعی احکام کا دار و مدار ہے۔"

مجتہد خصوصی

بعض علمائے اصول کی رائے یہ ہے کہ اجتہاد کی بھی تقسیم ہو سکتی ہے یعنی ان کے نزدیک مجتہد کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام مسائل و احکام کا عالم ہو بلکہ یہ جائز ہے کہ کوئی فقیہ علم فقہ کے کسی شعبہ کو اپنے لئے مخصوص کرے۔ اور اس میں مہارت حاصل کر کے اس کا ماہر یا مجتہد خصوصی بن جائے۔ چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں

"تمام علوم سے واقف ہونا اس مجتہد مطلق کے لئے ضروری ہے جو شریعت کے تمام مسائل میں فتویٰ دیتا ہو تاہم میرے خیال میں اجتہاد ایسا منصب نہیں ہے جس کی تقسیم نہ ہو سکتی ہو بلکہ یہ جائز ہے کہ بعض احکام و معاملات میں ایک عالم کو درجۂ اجتہاد حاصل ہو جائے اور دوسرے شعبۂ فقہ میں اسے یہ درجہ نہ حاصل ہو" آگے چل کر امام موصوف فرماتے ہیں :-

"مفتی کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ ہر مسئلہ کا جواب دے سکے کیوں کہ ایک دفعہ امام مالکؒ سے چالیس مسائل دریافت کئے گئے تو انھوں نے ان میں چھتیس ۳۶ مسائل میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ امام شافعی بلکہ خود بعض صحابہ کرام نے کئی مسائل میں توقف کیا۔ لہٰذا مجتہد کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں جن کا وہ فتویٰ دے، مہارت تامہ رکھتا ہو"۔ [2]

امام غزالی کے اس خیال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کے لئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ فرائض میں تمام صحابہؓ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور معاذ بن جبلؓ کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ وہ

---

[1] حصہ اول اعلام الموقعین ص ۳۸ الطبعتہ المنیریہ

[2] اصول الفقہ از خضری ص ۴۵۶ — ۴۵۷

حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم ہیں " اس طرح حضرت ابو بکرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:۔

" اے لوگو! جو فرائض کے بارے میں دریافت کرنا چاہے تو وہ (حضرت) زید بن ثابتؓ کے پاس آئے، اور جو فقہ کا مسئلہ دریافت کرنا چاہے، تو وہ (حضرت) معاذ بن جبلؓ کے پاس آئے، اور جو مال لینا چاہے تو وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا خازن اور تقسیم کرنے والا بنایا ہے"

ان علماء میں جو جزوی اجتہاد کے قائل ہیں، علامہ ابن القیم بھی شامل ہیں ان کے خیال کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک شخص علم فقہ کے ایک شعبہ میں مجتہد ہو اور دوسرے شعبہ میں مقلد ہو، یا وہ فقہ کے کسی ایک باب میں درجۂ اجتہاد رکھتا ہو۔ مثلاً وہ جہاد یا حج یا علم میراث و فرائض کا بہت بڑا ماہر ہو اور ان کے دلائل اور طریقۂ استنباط سے بخوبی واقف ہو، مگر وہ دوسرے فقہی مباحث کا ماہر نہ ہو، بہر حال ایسے خصوصی مجتہد کے بارے میں متفقہ رائے یہ ہے کہ اسے ان مسائل میں فتویٰ دینے کا حق نہیں ہے، جس میں اسے درجہ اجتہاد حاصل نہ ہو، مگر اس شعبہ کے بارے میں جس کا وہ مجتہد ہو، تین قسم کی رائیں ہیں،

(۱) پہلی رائے یہ ہے کہ جزوی مجتہد کو حق اجتہاد نہیں ہے کیونکہ شریعت کے تمام احکام و مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں، لہٰذا بعض مسائل سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص مجتہدانہ مسائل میں بھی کوتاہی کرے۔

(۲) بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ علم فرائض و میراث میں حق اجتہاد دیا جاسکتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ میراث کے احکام اور میراث کے حصوں کی تقسیم ایک جداگانہ اور مستقل علم بن گیا ہے جس کا تعلق فقہ کے دوسرے مسائل مثلاً بیع، اجارہ رہن وغیرہ سے بالکل نہیں ہے۔ بلکہ میراث کے اکثر احکام قطعی ہیں اور کتاب وسنت سے ثابت ہیں (لہٰذا اس میں اجتہاد کی ضرورت کم پیش آتی ہے اور اس فن کے لئے دیگر احکام کا جاننا ضروری نہیں ہے)

(۳) بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ خصوصی مجتہد کو حق اجتہاد حاصل ہے اور تینوں

رایوں میں یہی رائے زیادہ صحیح ہے - ابن القیمؒ فرماتے ہیں، یہی رائے صحیح اور باصواب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا مجتہد بھی اصل دلائل کے ذریعے حق وصداقت سے واقف ہوتا ہے اور صحیح مسئلہ کو معلوم کرنے میں اپنی انتہائی کوشش صرف کرتا ہے، لہٰذا وہ اپنے خاص شعبہ میں مجتہد مطلق کا درجہ رکھتا ہے[1]

اجتہاد کی اجازت

اگر نصوص شرعیہ کی طرف رجوع کیا جائے جن میں سے اکثر کا تذکرہ قیاس کی بحث میں کیا جاچکا ہے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے علماء کو دعوت غور وفکر دی گئی ہے تاکہ وہ عبرت حاصل کریں۔ اور استنباط احکام کرسکیں - چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو"۔ اس کے علاوہ حضرت معاذ والی حدیث بھی بہت معروف ومشہور ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کو ایک خط میں لکھا ہے --
- وہ حکم جو کتاب وسنت میں موجود نہ ہو اور اس کے بارے میں تمہارے دل میں کوئی خیال گزرے تو اسے اچھی طرح سمجھو بلکہ اس کے مشابہ احکام کو معلوم کرو، اور انھیں پر قیاس کرو"

حضرت عمرؓ نے قاضی شریح سے فرمایا - کتاب اللہ میں سے جو حکم تمھیں معلوم ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر کتاب اللہ کے تمام احکام معلوم نہ ہوں تو رسول اللہؐ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرو، اگر ان کے تمام فیصلے معلوم نہ ہوں تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اہل علم وخیر سے مشورہ کرو[2]

اجتہاد نبویؐ

بعض متکلمین نے یہ کہا ہے کہ احکام شرعیہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اجتہاد جائز نہیں تھا - کچھ علماء کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف جنگوں میں اجتہاد کرسکتے تھے۔

اجتہاد نبوی کے مخالفین کئی دلائل پیش کرتے ہیں - جن میں یہ آیات بھی شامل ہیں ---- "وہ ذاتی خواہش سے گفتگو نہیں کرتے ہیں بلکہ یہ وحی ہے جو ان پر

---

[1] حصہ چہارم اعلام الموقعین ص ۱۸۸ مطبع منیریہ

[2] حصہ اول اعلام الموقعین

نازل ہوتی ہے"۔ مگر ان کا یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ پیغمبر علیہ السلام گفتگو کرتے ہیں، وہ بعینہٖ وحی اور قرآن ہے۔ لہٰذا آیت کے مفہوم اور اجتہاد کی اجازت میں تضاد نہیں ہے تاہم اگر اس آیت کا مفہوم عام رکھا جائے۔ اور آپؐ کی گفتگو میں وحی اور غیر وحی دونوں کو شامل کر لیا جائے۔ تو ایسی صورت میں بھی اجتہاد کے ذریعے کوئی بات کہنا ذاتی خواہش پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق بھی وحی اور نص سے ہے، جس کی اللہ نے اجازت دی ہے اور اجتہاد بھی انہی سے ماخوذ ہے۔

بہرحال علمائے اصول کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اجتہاد کا اختیار حاصل تھا۔ البتہ حنفی علماء یہ کہتے ہیں کہ آپؐ وحی کا انتظار کرتے تھے اور جب وحی سے ناامیدی ہو جاتی تھی اور موقع کے نکل جانے کا اندیشہ ہوتا تھا تو اس وقت آپ کے لئے اجتہاد کرنا ضرور ہو جاتا تھا۔ اور آپؐ کا وہ اجتہاد قیاس پر مبنی ہوتا تھا اور چونکہ نصوص شرعیہ کا مفہوم آپ پر واضح تھا اس لئے ان میں تعارض اور اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اجماع کی صورت آپؐ کے بعد شروع ہوئی تھی۔

اکثر علمائے اصول کی رائے یہ ہے کہ آپؐ وحی کا انتظار کئے بغیر اجتہاد کر سکتے تھے اور آپؐ کے اجتہاد میں خطا اور غلطی کا امکان بھی ہے مگر آپ کی خطا برقرار نہیں رہتی تھی بلکہ جلد وحی کے ذریعے آپ کو صحیح بات معلوم ہو جاتی تھی۔ جو اجتہاد کے حکم کو منسوخ کر دیتی تھی۔ بہرصورت آپؐ کے اجتہاد کی مخالفت جائز نہیں ہے، اسی طرح دیگر مجتہدین کی مخالفت کرنی درست نہیں ہے خواہ وہ کسی مقام پر غلطی کے مرتکب ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک صحیح مسلک یہی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اجتہاد فرماتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو اس طرح خطاب کیا ہے جس طرح اپنے دیگر بندوں کو خطاب کیا ہے اور آپؐ کو بھی غور و فکر کرنے اور عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے یہی وجہ ہے کہ آپؐ اللہ کی آیات پر سب سے زیادہ غور فرماتے تھے۔ اور سب سے زیادہ عبرت حاصل کرتے تھے۔ نیز یہ امر

بھی قابلِ غور ہے کہ جب بالاتفاق رائے، علماء کو اجتہاد کرنے کی اجازت حاصل ہو جو غلطی کر سکتے ہیں، تو اس ہستی کو بدرجۂ اولیٰ اجتہاد کا حق حاصل ہے جو غلطی اور خطا سے معصوم ہے [1]

اجتہادِ نبویؐ کی مثالیں یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آپؐ نے کثرت کے ساتھ اجتہاد سے کام لیا۔ یہ بات قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپؐ نے منافقوں کو **غزوہ تبوک** میں شریک نہ ہونے کی اجازت دیدی تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر عتاب فرمایا اور یہ وحی نازل ہوئی — "اللہ نے تمھیں معاف کردیا ہے، تم نے انھیں کیوں اجازت دی؟" لہٰذا یہ عتاب اس بات کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی رائے اور اجتہاد سے انھیں اجازت دی تھی کیونکہ اگر آپ بذریعہ وحی اجازت دیتے تو آپؐ پر عتاب نازل نہ ہوتا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بدر میں آپؐ کے پاس ستر قیدی لائے گئے ان میں عباس بن المطلب اور عقیل بن طالب بھی تھے آپؐ نے ان کے بارے میں صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا — "یا رسول اللہ! وہ خاندان کے رشتہ دار افراد ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپؐ ان سے فدیہ لے لیں اس طرح کافروں کے مقابلے میں ہم طاقتور ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ اللہ انھیں اسلام کی ہدایت دے"

حضرت عمرؓ نے فرمایا — "نہیں خدا کی قسم! میری رائے ابوبکر کی رائے کے مطابق نہیں ہے میری رائے یہ ہے کہ آپؐ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کی گردنیں اڑا دیں۔ آپ میرے فلاں رشتہ دار کو میرے حوالے کردیں۔ اور حمزہؓ اور علیؓ کے حوالے ان کے بھائی کردیں تاکہ ہم ان کی گردنیں اڑا دیں۔ کیونکہ یہ لوگ کفر و شرک کے سربراہ ہیں اللہ نے آپ کو فدیہ لینے سے بے نیاز کر رکھا ہے۔" مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کیا (اور فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا) اس پر آیت نازل ہوئی۔

---

[1] ارشاد الفحول از شوکانی و اصول الفقہ از خضری

"پیغمبر کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں اچھی طرح خون ریزی نہ کرے، تم دُنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کا خواہاں ہے، اور اللہ عزت والا اور حکمت والا ہے اگر یہ بات پہلے سے اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر تمھیں بڑا عذاب ہوتا" (سورہ انفال پ۱۰)

لہٰذا جب آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ کے مطابق فدیہ لیا تو یہ فیصلہ وحی کے مطابق نہیں تھا، بلکہ آپؐ کے ذاتی اجتہاد اور رائے پر مبنی تھا۔

اسی طرح آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا —— "اگر مجھے پہلے سے وہ بات معلوم ہوتی جو بعد میں مجھے معلوم ہوئی ہے تو میں قربانی نہ لے جاتا۔" یہ عمل بھی آپؐ کا وحی کے مطابق نہ تھا۔[۱]

صحابہؓ اور دیگر علماء کا اجتہاد

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نے اجتہاد نہیں کیا۔ کیونکہ عہد نبویؐ میں بذریعۂ وحی یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے شرعی بات معلوم ہو سکتی تھی، اس لئے صحابہؓ کو خود اجتہاد کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، مگر اکثر علمائے اصول اس بات کے قائل ہیں کہ عہد نبویؐ میں بھی صحابہؓ کو اجتہاد کرنے کی اجازت تھی اور یہی صحیح مسلک ہے کیونکہ صحابہؓ نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی سے اجتہاد کیا جیسا کہ حضرت معاذؓ کی مشہور حدیث میں ذکر آیا ہے۔

یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچ چکی ہے کہ صحابہ کرامؓ ناگہانی واقعات میں اجتہاد کرتے تھے، اور بعض احکام کو دوسرے مشابہ احکام پر قیاس کر لیا کرتے تھے اس معاملہ میں وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ سمجھدار اور باخبر ہوتے تھے کیونکہ انھوں نے قرآن کریم کو نازل ہوتے ہوئے مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے وہ قرآن کریم کی تفسیر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد سے بخوبی واقف تھے وہ سب سے زیادہ نیک دل، وسیع علم، بے تکلف کامل الفطرت، نہایت سمجھدار اور صاف ترین ذہن کے مالک تھے،[۲] یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہؓ کی رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی۔ مثلاً

---

[۱] ارشاد الفحول از شوکانی و اصول الفقہ از خضری [۲] اعلام الموقعین جلد اوّل ص ۶۶

حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ ازواج مطہرات کو پردہ میں رکھا جائے۔ اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنایا جائے تو ان کی تائید میں قرآن کریم نازل ہوا۔ اس کے علاوہ جب تمام ازواج مطہرات نے آپؐ کے برخلاف اتفاق کر لیا تھا تو اس موقع پر حضرت عمرؓ نے جو الفاظ کہے تھے، وہی قرآن کریم میں منقول ہوئے انھوں نے عرض کیا تھا " اگر آپؐ انھیں طلاق دے دیں تو اللہ ان کے بدلے میں ان سے بہتر مومن بیویاں بھیجیں گے"۔ جب (رئیس المنافقین) عبداللہ بن اُبی نے وفات پائی تو آپؐ اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس موقع پر بھی حضرت عمرؓ نے آپؐ کو روکتے ہوئے کہا — " یا رسول اللہؐ! یہ منافق ہے" مگر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اس پر یہ آیت نازل ہوئی — " ان میں سے جو کوئی مر جائے تو تم اس پر کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو"۔

جب آپؐ نے حضرت سعد بن معاذؓ کو قبیلہ بنو قریظہ کے معاملہ میں پنچ بنایا۔ تو انھوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور فرمایا — " میری رائے یہ ہے کہ ان کے جنگجو افراد کو قتل کیا جائے اور ان کی اولاد کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کا مال، غنیمت میں شامل کر لیا جائے"۔ اس پر آپؐ نے فرمایا — " درحقیقت تم نے اس اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا جو سات آسمانوں کے اوپر ہے"

اسی طرح لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک ایسی عورت کے بارے میں مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آئے، جس کا مہر شادی کے وقت مقرر نہیں ہوا تھا اور اس کے پاس آنے سے پیشتر اس کا شوہر مر گیا تھا۔ اس کے بارے میں انھوں نے فرمایا — " میں اپنی رائے سے فتوےٰ دیتا ہوں اگر یہ درست ہو تو سمجھو یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہو تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے اور ایسی صورت میں اللہ اور اس کے رسول اس سے بری الذمہ ہیں۔

میری رائے میں اس کا مہر اس جیسی عورتوں کے برابر ہے، نہ کم ہوگا اور نہ زیادہ ہوگا۔ وہ میراث کی حقدار ہے اور عدت میں بیٹھے گی ، پر قبیلہ اشجع

ئے لوگ کھڑے ہو کر کہنے لگے۔

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری اس جیسی ایک عورت کے بارے میں وہی فیصلہ کیا تھا جو آپؐ نے فیصلہ کیا ہے" یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس قدر خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد وہ اس سے زیادہ خوش نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق تھی۔[1]

ان واقعات کے علاوہ بہت سے احکام میں صحابہ کرامؓ نے عہد نبویؐ ہی میں اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اجتہادی رائے کو برقرار رکھا۔ اور انھیں ملامت نہیں کی، ایسا ایک واقعہ یہ ہے جنگ احزاب کے دوسرے دن آپؐ نے یہ اعلان کرایا کہ جو کوئی مطیع و فرماں بردار ہو وہ بنو قریظہ (کے محلہ ہی) میں عصر کی نماز پڑھے" اس پر بعض حضرات نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر راستہ ہی میں نماز عصر پڑھ لی اور کہنے لگے، آپؐ کا منشا یہ تھا کہ لوگ جلدی سے روانہ ہو جائیں۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز عصر میں تاخیر کی جائے، مگر دوسرے لوگوں نے اس کا دوسرا مطلب سمجھا اور انھوں نے بنو قریظہ میں جا کر رات کے وقت نماز پڑھی، اس واقعہ میں پہلے لوگوں نے اصل مفہوم پر غور کیا اور دوسرے لوگوں نے ظاہری الفاظ کی پابندی کی۔ جب فریقین کا معاملہ آپؐ کے سامنے پیش ہوا تو آپؐ کسی پر ناراض نہیں ہوئے اور نہ کسی کے ساتھ سختی کی۔

حضرت علیؓ کے پاس جب وہ یمن میں تھے۔ تین آدمی آئے جو ایک لڑکے کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے، ہر ایک یہ کہتا تھا کہ وہ اس کا بیٹا ہے، اس پر حضرت علیؓ نے قرعہ اندازی کی، اور جس کا قرعہ نکلا۔ لڑکے کو اس کے حوالے کر دیا اور اس سے کہا۔ کہ وہ ان آدمیوں کو دیت کا دو تہائی حصہ دے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ کی اطلاع ملی تو آپؐ ہنسنے لگے،

دو صحابی سفر میں نکلے اتنے میں نماز کا وقت آگیا ان کے پاس پانی نہیں تھا دونوں نے نماز پڑھ لی، اس کے بعد نماز کے وقت کے اندر انھیں پانی مل گیا تو

---

[1] حصہ اول اعلام الموقعین ص ۶۷ - ۶۸

ایک نے نماز لوٹالی اور دوسرے نے نہیں لوٹائی اس پر آپؐ نے دونوں کی تائید کی۔ جس نے نماز نہیں لوٹائی تھی اس سے آپؐ نے فرمایا "تم نے سنت کے مطابق کیا اور تمہاری نماز ہوگئی" دوسرے سے آپؐ نے فرمایا "تمھیں دوہرا ثواب ملے گا"[1]

ایک دفعہ آپؐ نے حضرت عمرو بن العاصؓ اور عقبہ بن عامر الجہنیؓ کو دو آدمیوں کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے پنچ بنایا اور ان دونوں سے کہا اگر تم دونوں صحیح کرو تو تم دونوں کے لئے دسؔ نیکیاں ہیں اور اگر غلطی کرو تو تمھارے لئے صرف ایک نیکی ہے"

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ صحابہ کرام نے عہد رسالتؐ میں اجتہاد نہیں کیا تھا۔ تاہم اس بارے میں تمام علمائے اصول کا اتفاق رائے ہے کہ عہد رسالتؐ کے بعد صحابہ کرامؓ اجتہاد کیا کرتے تھے۔ اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی میں اجتہاد کرنے کی پوری صلاحیتیں پائی جائیں، خواہ وہ صحابہ کرامؓ ہوں، یا ان کے بعد کے علماء ہوں، تو اسے اجتہاد کرنا چاہیئے کیونکہ وحی کے منقطع ہونے کے بعد استنباط احکام کا واحد ذریعہ اجتہاد ہی رہ گیا ہے۔ اب ہم صحابہ کرامؓ کے ان اجتہادات کی مثالیں پیش کر رہے ہیں جس سے ان کی اعلیٰ مجتہدانہ قابلیت کا پتہ چل سکتا ہے۔

(الف) **کلالہ** کے لفظ کی تشریح میں حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے فرمایا۔ "میں اس کے بارے میں جو کچھ کہوں گا وہ میری ذاتی رائے ہے کہ اگر صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر اور شیطان پر ہے۔ میری رائے میں **کلالہ** سے مراد وہ وارث ہے جو اولاد اور والد کے علاوہ ہو"

(ب) حضرت عکرمہ فرماتے ہیں "مجھے حضرت ابن عباسؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس بھیجا تاکہ میں دریافت کروں کہ "اگر وارثوں میں صرف والدین اور شوہر ہوں تو انھیں کیا حصہ ملے گا؟" اس پر انھوں نے فرمایا "شوہر کو نصف حصہ ملے گا اور باقی ماندہ نصف حصہ کا تہائی ماں کو اور باقی دو تہائی باپ کو ملے گا۔" اس لئے انھوں نے پوچھا "کیا آپؓ کا یہ فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہے یا آپ اپنی رائے سے کہتے ہیں" حضرت زید بن ثابتؓ

نے فرمایا :۔ "یہ مسئلہ میں اپنی رائے سے بیان کر رہا ہوں ، میں نے ماں کو باپ پر ترجیح نہیں دی ہے "

(ج) وبرۃ الصلتی فرماتے ہیں :۔ "مجھے خالد بن الولیدؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا جب میں وہاں پہونچا تو حضرت علیؓ ، طلحہؓ ، زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان کے پاس تھے ۔ میں نے کہا :۔ حضرت خالد بن الولیدؓ آپؓ کو سلام کہتے ہیں ، اور عرض کرتے ہیں کہ لوگ شراب نوشی میں لطف لینے لگ گئے ہیں اور وہ اس کی سزا کو حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں ، لہذا آپؓ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا :۔ "تمہارے سامنے یہ لوگ موجود ہیں " ! اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا :۔ "میری رائے یہ ہے کہ جب کوئی شراب پیتا ہے تو نشہ میں آکر بکواس کرنے لگتا ہے اور بکواس کی صورت میں وہ ہر کسی پر تہمت لگاتا ہے لہذا الزام لگانے والے پر اسّی کوڑے ہیں " تمام صحابہؓ نے حضرت علیؓ کی رائے پر اتفاق کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا :۔ "اپنے ساتھی (خالد بن الولیدؓ) کو ان لوگوں کا فیصلہ جا کر سنا دو " لہذا حضرت خالد بن ولیدؓ نے شراب نوشی پر اسّی کوڑے کی سزا دی اور یہی سزا حضرت عمرؓ بھی دیا کرتے تھے ۔

(د) ایک دادی اور ایک نانی حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے پاس میراث طلب کرنے کے لئے آئیں تو حضرت ابوبکرؓ نے نانی کو میراث دلوا دی مگر دادی کو میراث کا حق نہیں دیا ۔ اس پر انصار کا ایک شخص جسے عبدالرحمٰن بن سہل کہا جاتا تھا کہنے لگا " اے خلیفۂ رسولﷺ ! آپؓ نے اس عورت کو میراث دلوائی ہے کہ اگر وہ پہلے مر جاتی تو وہ مرد اس کا وارث نہیں بن سکتا تھا ۔ اس پر آپؓ نے میراث کا یہ حصہ دونوں کے درمیان بحصۂ مساوی تقسیم کرا دیا ۔

(ہ) ایک مرد نے اپنی بیوی سے کہا :۔ " تو مجھ پر حرام ہے " حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ یہ الفاظ قسم کی نوعیت کے ہیں اور مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ نے بھی انہی کی تائید کی مگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ رائے تھی کہ ان الفاظ سے ایک طلاق ہو جاتی ہے ، اور حضرت علیؓ اور زید بن ثابتؓ یہ فرماتے تھے کہ اس سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اس طرح ہر ایک صحابی آزادانہ طریقے سے اپنی اجتہادی رائے سے کام لیتا تھا ۔

مجتہدین کی کثرت

مذکورہ بالا مثالوں اور واقعات سے بلا شک و شبہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اجتہاد کا حکم دیا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معاملات میں جہاں نص شرعی نہیں ہوتی تھی، صحابہؓ کے اجتہاد کی حمایت کی، بلکہ خود بھی اجتہاد فرماتے تھے۔ اور صحابہؓ کو بھی اجتہاد کرنے کا حکم دیتے تھے، لہٰذا جلیل القدر صحابہؓ نے خود عہد رسالتؐ میں اور اس کے بعد اجتہاد سے کام لیا اور انھوں نے اجتہاد اور قیاس کا نہایت عمدہ نمونہ پیش کر کے علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا۔ اور ان کے لئے اجتہاد کی راہ ہموار کی جس پر بعد کے علماء کرام گامزن رہے اور ان کے نقش قدم پر چلتے رہے، انھیں غور و فکر کی آزادی حاصل تھی اور وہ صرف ان اعلیٰ اصول و مقاصد کے پابند تھے جو مذہب اسلام نے مساوات و انصاف اور فلاح عام کے لئے مقرر کئے تھے۔ اس طرح وہ حق و صداقت کے دوش بدوش چلتے تھے اور جہاں کہیں حق و صداقت کا پتہ چلتا تھا وہاں سر تسلیم خم کرتے تھے۔ اس تحقیق و فکر کی آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی ممالک میں مجتہد علماء کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، مصر و شام، بخارا سمرقند، بغداد اور اندلس میں ایسے مجتہد علمائے کرام پیدا ہو گئے کہ مشہور فقہی کتب ان کے افکار و خیالات کی ترجمانی کرنے لگیں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں مندرجہ ذیل علمائے کرام کے اسمائے گرامی گونجنے لگے:۔ حسن بصریؒ، سعید بن المسیبؒ، ابن جبیرؒ ابو ثورؒ، مجاہد۔ قتادہؒ، سفیان الثوریؒ، طاوسؒ، ابن سیرینؒ، شعبیؒ، اوزاعیؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، ابن شبرمہؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، لیث بن سعدؒ، امام احمد بن حنبلؒ، ابن جریر الطبریؒ، داؤد الظاہریؒ، ابن حزمؒ

ان لوگوں نے ہمارے لئے شرعی احکام و قوانین کا قابل فخر ذخیرہ چھوڑا ہے، اگر ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلیں اور اسلامی شریعت کے قصر معلیٰ میں اپنی طرف سے چند اینٹوں کا اضافہ کریں اور اسلامی شریعت کو اچھے انداز میں اس طرح پیش کریں کہ طالبان حق آسانی کے ساتھ اس کی طرف رجوع کر سکیں تو یقینی طور پر ہم اسلامی شریعت کی پوشیدہ دولت اور اس کی مخفی طاقت کو آشکارا کر سکیں گے۔ اور اس کا حسن و جمال اصل حالت میں منظر عام پر آسکے گا۔ اس صورت میں مغربی قوانین کے دلدادہ ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور

اس کا لوہا مانیں گے۔

اجتہاد کا حکم

ہر زمانے میں اجتہاد کرنا فرض کفایہ ہے لہٰذا علمار محققین کی یہ رائے ہے کہ کوئی زمانہ ایسے مجتہد سے خالی نہیں ہونا چاہیئے جو شریعتِ خداوندی کو جاری کرے اور شرعی احکام کی عوام میں توضیح و تشریح کرسکے بلکہ ہر ملک میں ایسا مجتہد ضرور ہونا چاہیئے جو لوگوں کی شرعی ضروریات کی تکمیل کرسکے [۱]

علمار کے لئے اجتہادی صورت کی تین حالتیں ہیں۔

(۱) پہلی حالت میں اجتہاد فرض عین ہے وہ حالت یہ ہے کہ تن تنہا ایک مجتہد ہو جس سے ایسا مسئلہ دریافت کیا جائے جو واقع ہو چکا ہو اور اگر وہ فوری طور پر اس کا جواب نہ دے تو موقع ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں اس پر یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ غور دخوض کرکے فوراً اس کا جواب دے اس طرح کسی عالم پر بذات خود کوئی ناگہانی واقعہ پیش آئے تو اسے خود اجتہاد کرکے شرعی حکم معلوم کرنا چاہیے۔ اس صورت میں کسی کی تقلید کرنا جائز نہیں ہوگا خواہ وقت کی گنجائش کیوں نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بصیرت کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ غور و فکر کریں اور عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

" اے اہل بصیرت عبرت حاصل کرو۔" اور یہ بھی ارشاد ہے —" کیا وہ قرآن کریم پر غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں" مزید ارشاد ہے —" اگر تمہارا کسی بات پر اختلاف ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو" یہ خطابات عوام کے لئے نہیں ہیں، بلکہ ان علمار سے خطاب کیا گیا ہے جو اجتہاد کرنے پر قدرت رکھتے ہیں لہٰذا ان علمار میں سے اگر کوئی تقلید کرے تو در اصل وہ اس حکم کی نافرمانی کرتا ہے جس میں انھیں غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے ایسے مسائل میں اجتہاد کیا اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے اجتہاد پر قائم رہے اور اپنے اجتہاد کے مطابق حکم دیتے رہے اور دوسروں کی تقلید انھوں نے گوارا نہیں کی، البتہ ایک معمولی اور جاہل انسان تقلید کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اجتہادی صلاحیت موجود نہیں ہوتی ہے مگر جس میں اجتہادی

[۱] ارشاد الفحول ص ۲۲۲ مطبوعہ مصر

صلاحیت موجود ہو تو حقیقت کی تلاش خود کرنی چاہیئے۔

(۲) دوسری حالت میں اجتہاد فرض کفایہ ہے، وہ حالت یہ ہے کہ کوئی مسئلہ ایک سے زیادہ مجتہدوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ تو اگر ان میں سے کسی ایک نے فتویٰ دے دیا تو باقی مجتہدین کے ذمے سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی نے بھی اس مسئلہ کا جواب نہیں دیا تو سب کے سب گناہ گار ہوں گے۔

(۳) تیسری حالت یہ ہے کہ کسی واقعے کے رونما ہونے سے پیشتر اس مسئلہ کا جواب سوچا جائے تو اس قسم کا اجتہاد مستحب ہے، خواہ مجتہد سے قبل از وقوع مسئلہ دریافت کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی مخصوص مجتہد سے واقعہ رونما ہونے کے بعد ناگہانی اور فوری مسئلہ دریافت کیا جائے تو اس کے لئے اجتہاد فرض عین ہے۔ لیکن اگر ایک سے زیادہ مجتہد ہوں اور کسی مخصوص عالم سے فتویٰ نہ طلب کیا جائے تو اس موقع پر اجتہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔ یعنی اگر کسی ایک نے اجتہاد کر کے جواب دے دیا تو فرض ساقط ہو جاتا ہے ورنہ سب کے سب گناہ گار ہوں گے، اگر قبل از وقوع مسائل کے بارے میں فتویٰ طلب کیا جائے تو اس موقع پر بذریعہ اجتہاد اس کا جواب دینا مستحب ہے۔

بہر حال اجتہاد فرض عین ہو یا فرض کفایہ، ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی مجتہد ضرور ہونا چاہیئے اسی وجہ سے حنبلی علماء نے یہ کہا ہے — "کوئی زمانہ مجتہدوں سے خالی نہیں رہنا چاہیئے" شوکانی نے اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے۔

"میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی یہاں تک کہ قیامت آئے[1]

ابن دقیق العید فرماتے ہیں — "یہ سرزمین کبھی ایسی شخصیت سے خالی نہیں ہوتی ہے جو اللہ کے احکام کو جاری کرے، لہٰذا مسلمان قوم کے لئے ہر زمانہ میں ایسے عالم کی ضرورت رہتی ہے جو قوم کو حق کے صحیح راستے پر گامزن رکھے، تاآنکہ قیامت کے لئے اللہ کا حکم آئے" ایک عالم کا قول ہے — "یہ سرزمین ہر زمانہ اور ہر وقت ایسے بندہ خدا سے خالی نہیں ہوتی ہے جو اللہ کے احکام کو نافذ کرے"[2]

---

[1] [2] ارشاد الفحول ص ۲۲۳

لہٰذا وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ مجتہدین سے خالی ہے، دعویٰ بلا دلیل ہے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کو علم دین حاصل کرنے کی بہت سہولتیں حاصل تھیں، مگر متاخرین کے لئے اس میں بہت سی دقتیں ہیں، یہ خیال بھی کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے، چنانچہ علامہ شوکانی نے اس خیال کی تردید میں کیا اچھی بات کہی ہے،

"اس شخص پر جو معمولی سمجھ دار ہو یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ متاخرین کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسی سہولتیں مہیا کردی ہیں جو پہلے لوگوں کو حاصل نہیں تھیں، کیونکہ اب قرآن کریم کی تفاسیر بھی اس کثرت سے مدوّن ہو گئی ہیں کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے، علاوہ ازیں سنتِ نبویؐ کی تدوین بھی ہوگئی ہے بلکہ راویوں کی جرح و تعدیل اور احادیث کی صحت و ترجیح کے بارے میں محدثین مجتہدین کی ضرورت سے زیادہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں جبکہ گذشتہ زمانے میں صرف ایک حدیث کیلئے بزرگان سلف کو ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف کوچ کرنا پڑتا تھا (اور اس میں بہت دشواریاں پیش آتی تھیں) مگر متأخرین کو متقدمین سے زیادہ سہولتیں حاصل ہیں، لہٰذا موجودہ زمانے میں اجتہاد کی مخالفت کوئی عقل مند اور سمجھ دار انسان نہیں کر سکتا۔

فصل دوم

تقلید

تقلید کی تعریف یہ ہے کہ دلیل کے بغیر کسی قول کو تسلیم کیا جائے اور دوسرے کے مسلک کو اس کی دلیل معلوم کئے بغیر اختیار کیا جائے، اس موقع پر ہم عقائد میں تقلید کے حکم پر بحث نہیں کریں گے کیونکہ یہ علم عقائد و توحید کا موضوع ہے، بلکہ یہاں پر ہم اس تقلید کے موضوع پر بحث کریں گے جو فقہی مسائل میں اختیار کی جاتی ہے،

علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ جس شخص میں اجتہاد کرنے کی صلاحیت ہو، اسے کسی دوسرے کی تقلید کرنے کی اجازت نہیں ہے بشرطیکہ اسے اجتہاد کرنے اور غور و فکر کرنے کے لئے کافی وقت مل سکے اور کوئی ناگہانی موقع نہ ہو لیکن اگر وقت میں گنجائش نہ ہو اور ناگہانی واقعہ رونما ہو جائے تو ایک عاجز انسان کی طرح فوری ضرورت کے لئے کسی کی تقلید کی جا سکتی ہے اسی طرح عوام اور وہ لوگ جو اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، مجتہدین کرام سے مسائل دریافت کر کے ان کی اتباع اور تقلید کر سکتے ہیں

علمائے اصول کے اس فیصلہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تقلید کو صرف عجز اور ضرورت کے وقت جائز سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ اسی طرح کھلا رہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ اور متقدمین کے دور میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا

ہماری موجودہ حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم اجتہاد کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں یا ہمیں تقلید کی ضرورت ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں خدا کے فضل سے شرعی علوم کے ماہرین خصوصی علماء موجود ہیں اور ان علوم سے متعلقہ علوم کے خصوصی ماہرین بھی موجود ہیں بلکہ علم و ثقافت کی جو سہولتیں آج کل ہمیں میسر ہیں وہ کسی زمانے میں میسر نہیں

ہوئی تھیں۔

تقلید کی مذمت کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ حنبلی علماء نے اس کی تین صورتیں بیان کی ہیں :- [1]

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ عام طور پر تقلید کے ذریعے فتویٰ نہیں دیا جاسکتا ہے، کیونکہ تقلید علم نہیں ہے اور علم کے بغیر فتویٰ دینا حرام ہے۔ بقول علامہ ابن القیمؒ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ تقلید علم نہیں ہے اور مقلد کو عالم نہیں کہا جاسکتا، اکثر شافعی علماء کا بھی مسلک ہے،

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اگر فتویٰ کا تعلق اس عالم کی اپنی ذات سے ہو تو وہ اپنی ذات کے لئے دوسرے عالم کی تقلید کر سکتا ہے، لیکن دوسروں کو فتویٰ دینے کے لئے کسی عالم کی تقلید جائز نہیں ہے،

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اگر مجتہد عالم موجود نہ ہو اور کوئی مسئلہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو دوسرے عالم کی تقلید کرنا جائز ہے،

اہل علم کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ شریعت کے فروعی مسائل میں تقلید کرنا جائز نہیں ہے، قرافی فرماتے ہیں — امام مالکؒ اور جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ اجتہاد کرنا واجب اور تقلید ناروا ہے بلکہ علامہ ابن حزمؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تقلید کے خلاف علماء کا اجماع ہے [2]

شوکانی فرماتے ہیں " اگر تقلید کی ممانعت پر اجماع نہیں ہے تو جمہور علماء کا یہ مسلک ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے (اندھادھند) تقلید کرنے والوں (کافروں) کی قرآن کریم میں مذمت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے — " یا ہم نے انھیں (کافروں کو) اس سے پہلے کوئی کتاب دیدی ہے جس کی وہ پابندی کر رہے ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں — " ہم نے اپنے آباء و اجداد کو اسی حالت پر پایا ہے لہٰذا ہم ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں — " دوسری جگہ ارشاد ہے،

---

[1] حصہ اوّل اعلام الموقعین ص ۳۷ [2] ارشاد الفحول ص ۲۳۶ اس موضوع پر شوکانی کا ایک خاص رسالہ ہے جس کا نام " القول المفید فی حکم التقلید " ہے

" انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو دیوتا بنا رکھا ہے،
مشہور مجتہدین کرام نے تقلید کرنے والوں کی ملامت کی ہے اور مقلدوں سے بیزاری کا اعلان کیا ہے، یہاں تک کہ چاروں اماموں نے بھی دلیل وحجت کے بغیر ان کی تقلید و اتباع کرنے کی مذمت کی ہے چنانچہ امام ابوحنیفہؒ جب فتوی دیتے تھے تو فرمایا کرتے تھے" یہ ابوحنیفہ کی رائے ہے اور ہم اپنی پوری کوشش صرف کرنے کے بعد اسے پیش کرسکے ہیں اور جو ہمارے پاس اس سے بہتر چیز لاسکے تو وہ صحیح حکم پر عمل کرنے کا زیادہ حقدار ہے"
امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے ـــــ" میں بشر ہوں، صحیح بات بھی کہتا ہوں اور غلطی بھی کرسکتا ہوں لہٰذا میری رائے پر غور کرو اگر وہ کتاب وسنت کے موافق ہو تو اس پر عمل کرو اور اگر ان کے موافق نہ ہو تو اسے چھوڑ دو" بلکہ جب کبھی آپؒ کوئی مسئلہ استنباط کرتے تھے تو اپنے ساتھیوں سے فرمایا کرتے تھے ـــــ" اس پر خوب غور کرو کیونکہ اس کا تعلق دین سے ہے اور صاحب روضۂ مبارک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ ہر شخص کے کلام پر اعتراض ہو سکتا ہے اور اس کی تردید کی جاسکتی ہے"
امام شافعیؒ اپنے شاگرد ربیع سے فرمایا کرتے تھے ـــــ" اے ابواسحاق! میری ہر بات میں تقلید نہ کرو اور بذات خود بھی اس پر غور کیا کرو کیونکہ اس کا تعلق دین سے ہے" آپؒ نے مزید فرمایا ـــــ" وہ شخص جو دلیل کے بغیر علم حاصل کرے وہ ایسے شخص کے مانند ہے جو رات کے وقت ایندھن چُنے اور ایندھن کا گٹھا اُٹھا کرلے جائے اور ممکن ہے کہ اسے خبر نہ ہو اور اس میں ایک سانپ بھی موجود ہو، جو اسے ڈس لے"
مزنی نے اپنی فقہ کی مختصر کتاب میں یہ تحریر فرمایا ہے ـــــ" میں نے اس کتاب کو امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق مختصر کرکے لکھا ہے اور ان کے قریبی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے گویا انھوں نے اپنی اور دوسروں کی تقلید کرنے سے اس لئے منع فرمایا تھا کہ دینی مسائل پر خوب غور کیا جائے۔ اور پوری احتیاط مدنظر رکھی جائے"
امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے ـــــ" تم اپنے مذہبی معاملات پر خوب غور کیا کرو کیونکہ غیر معصوم شخص کی تقلید کرنا مذموم ہے اس سے بصیرت اندھی ہوجاتی ہے" انھوں نے ابوداؤد سے یہ فرمایا ـــــ" نہ میری تقلید کرو اور نہ امام مالکؒ، ثوری، اور اوزاعی کی تقلید کرو اور جہاں سے انھوں نے علم حاصل کیا ہے وہاں سے تم بھی

علم حاصل کرو" ان کا یہ قول بھی تھا ۔۔۔ "آدمی کی یہ ناسمجھی ہے کہ وہ اپنے مذہب میں بھی لوگوں کی تقلید کرے" [۱] بلکہ علمار بالعموم تقلید کو تعصب یا بے وقوفی کی نشانی سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام طحاوی اور علی بن الحسین نے جو مصر میں ۲۹۳ھ میں قاضی ہوگئے تھے ایک دفعہ یہ کہا تھا ۔۔۔ "تقلید وہی کرتا ہے جو متعصب ہو یا بے وقوف ہو" یہ الفاظ اس قدر لوگوں کے ورد زبان ہوگئے تھے کہ وہ مصر میں ضرب المثل بن گئے تھے۔ ابن حزم فرماتے تھے ۔۔۔ "جو شخص کسی کی تقلید یا اتباع کرے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، سفیان، اوزاعی، احمد بن حنبلؒ اور داؤد رضی اللہ عنہم، دنیا اور آخرت میں ان سے بری الذمہ ہیں"

علامہ ابن القیم نے بعض علمائے سلف سے یہ قول نقل کیا ہے :-

"لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ مقلد کا شمار اہل علم میں نہیں ہے، علم یہ ہے کہ اصل حقیقت کو اس کی دلیل کے ذریعے معلوم کیا جائے"

ان تمام اقوال کے ذریعے تقلید اور مقلدین کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اجتہاد اسلامی شریعت کا عظیم مقصد ہے اور ایسا اہم فریضہ ہے کہ جب تک اس کو ادا نہ کیا جائے اس وقت تک علمار اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

فصل سوم

موجودہ علماء اور اسلامی حکومتوں کے فرائض

گذشتہ مباحث کے ذریعے اجتہاد اور تقلید کی اصل حقیقت واضح ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی زمانہ اجتہاد سے خالی نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ خود صاحب شریعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ، تابعینؒ اور بعد کے تمام ائمہ، حکام، قضاۃ اور علماء اجتہاد کرتے چلے آئے ہیں۔

اب میرا خطاب اسلامی ممالک کے تمام علماء سے یہ ہے ــــ "آپ اپنی اسلامی شریعت کی خلوص دل سے حمایت کیجئے اور نور علم وعرفان سے معمور قلوب اور محققانہ بصیرت کو شریعت کے لئے وقف کر دیجئے اور اپنے ان بزرگان سلف کی پیروی کیجئے۔ جنہیں یقین کامل تھا کہ یہ شریعت قیامت تک کے لئے ہے اور اس کی بقا و زیست کا دارو مدار اس شرعی اجتہاد پر ہے جس کے ذریعے شریعت کے اصول و قواعد کو جاری کیا جا سکتا ہے، اور یہ مت کہیئے ــــ "چونکہ ہمارے اندر اپنے اسلاف جیسی اجتہادی قابلیت نہیں ہے، اس لئے ہمارے لئے ان کے مسلک کی پیروی کرنا ہی کافی ہے" کیونکہ تمہارے سامنے واضح دلائل موجود ہیں، اور کتاب وسنت ہمیں دعوت غور و فکر و اجتہاد دے رہی ہیں، اس کے علاوہ تمہارے علماء کے اجتہاد و فکر کی تاریخ تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم ان سے علم و فہم و نظر میں کم تر نہیں ہو، تمہارے اندر بھی ایسے اکابر علماء موجود ہیں۔ جو شریعت کے اصول و فروع سے بخوبی واقف ہیں اور وہ علوم عربیہ کے بہت بڑے ماہر بھی ہیں بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ تم ان سے زیادہ غور و فکر اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہو، کیونکہ ہمارے علمائے سلف کو اس قدر زیادہ احادیث کا علم نہیں ہو سکا تھا،

جس قدر احادیث کا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اور وہ لوگ ان قرآنی علوم سے بھی واقف نہیں تھے جو بعد میں مدوّن ہوئے۔

ہمارے سامنے گوناگوں کتب تفاسیر ہیں، ان میں آیات احکام کی تفاسیر بھی شامل ہیں ہمارے پاس وہ کتب حدیث ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے ہمارے پاس ایسی تالیفات بھی ہیں جن میں صحیح اور ضعیف احادیث کو اچھی طرح چھانٹ دیا گیا ہے اور ان میں راویان احادیث کی اچھی طرح جرح و تعدیل کی گئی ہے۔ ہمارے پاس ائمہ مجتہدین کی کتب فقہ ہیں جو ہمیں شرعی احکام و مسائل کا مقابلہ کرنے اور ترجیح دینے میں مدد دے سکتی ہیں، اس کے علاوہ ہمارے پاس وہ قانون داں حضرات ہیں جن کی پختہ جدید معلومات کی بدولت نئے مجتہدین کے ذہن کھل سکتے ہیں، بلکہ میں آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ ہمارے اکابر علماء کے لئے اجتہاد نہ کرنے میں اب کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔ جبکہ امام غزالی اور علامہ ابن القیم نے باب اجتہاد کے دونوں کواڑ کھول دیئے ہیں یعنی انھوں نے مخصوص اور جزئی اجتہاد کی اجازت بھی دے دی ہے،

ایسی صورت میں کیا ہمارے ماہر علماء کے لئے یہ بات دشوار ہے کہ وہ احوال شخصیہ یا فرائض کے مسائل کے ماہر خصوصی بن جائیں یا ان میں سے کوئی معاملات یا فوجداری قوانین کا ماہر ہو جائے، ان میں سے کوئی چیز مشکل اور دشوار نہیں ہے بشرطیکہ وہ خوف و ہراس کو دل سے نکال دیں اور اپنے اندر اخلاقی جرأت پیدا کریں اور یہ سمجھ لیں کہ اجتہاد میں غلطی کرنا کوئی عیب یا گناہ نہیں ہے، اور مجتہد ہر حالت میں ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔

بین الاسلامی ادارہ

اسلامی حکومتوں اور بالخصوص مصری حکومت کی ذمہ داری بھی علماء کی ذمہ داری سے کم نہیں ہے، ان حکومتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اصلاح پسندوں کے اس جلیل القدر مقصد کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹائیں جس کی وہ عرصۂ دراز سے تمنا کرتے چلے آئے ہیں، اور وہ مقصد یہ ہے کہ ایک مستقل بین الاسلامی موتمر علماء کی بنیاد ڈالی جائے جس کے ارکان کا انتخاب تمام اسلامی فرقوں اور تمام ممالک کے علماء میں سے کیا جائے اور اس میں وہ قانون داں

حضرات بھی شامل کئے جائیں جو اسلامی شریعت کے ماہر ہوں، اور اس کے محاسن اور خوبیوں سے بخوبی واقف ہوں، ایسے افراد بحمد اللہ ہمارے ہاں کافی ہیں[1] اسی ادارہ میں دو کاموں کی تکمیل کی جائے۔

(۱) مختلف مکاتیب فکر کے لحاظ سے فقہ اسلامی کو مرتب کیا جائے اور ترتیب کے ساتھ مختلف دفعات میں اس کے مسائل کو جمع کیا جائے۔ نیز اس کے تمام مباحث مناسب ابواب پر مرتب ہوں، مثلاً عبادات، معاملات، احوال شخصیہ میراث، احکام جرم وسزا وغیرہ۔

(۲) نئے نئے واقعات اور معاملات کے لئے احکام وقوانین شرعی اصولوں کے مطابق وضع کئے جائے اور اس سلسلے میں فقہ اسلامی کے ائمۂ مجتہدین کے اجتہادات سے ضرور فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح ہر اسلامی ملک کو یہ سہولت حاصل رہے گی کہ جب وہ اپنے قوانین وضع کرنے کی کوشش کرے، یا ان میں کوئی تبدیلی کرنی چاہے تو وہ اس بین الاسلامی فقہی ادارہ کے مجتہدانہ احکام سے استفادہ کرے،

---

[1] اس قسم کے قانون دان حضرات (مصریین) یہ لوگ ہیں:۔ عبد السلام ذہنی، کامل مرسی، عبد الحمید بدوی، عبد الفتاح السید، عبد الرزاق السنہوری، علی بدوی وغیرہم

ماخذ وحوالہ جات

باب ششم

① اصول الفقہ .... از خضری

② ارشاد الفحول ...... مطبوعہ ۱۳۲۹ء

③ اعلام الموقعین ....

④ الانصاف .... از بطلیوسی

باب ہفتم

اسلامی شریعت

کے

تحقیقاتی مباحث

فصل اوّل

اسلامی فقہ اور قانونِ روما

(مصر کے) علمی مجلات ولے رسالوں اور ہفتہ وار اخباروں میں بہت عرصے تک اس سوال کے جواب کے بارے میں گرما گرم بحث جاری رہی [1] کہ آیا اسلامی فقہ قانونِ روما سے ماخوذ ہے یا اس سے متاثر ہے اور کیا رومی قانون فقہ اسلامی کا ماخذ تھا یا نہیں تھا؟

مجھے بھی اس بحث سے بہت دلچسپی پیدا ہوئی اور میرے دل میں اس کے بارے میں تحقیقات کرنے کا بہت شوق پیدا ہوا کیونکہ جس کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ فقہ اسلامی نے رومی قوانین سے استفادہ کیا، اس کا دعویٰ نہایت جسارت آمیز ہے تاہم اس نے صرف ایسی قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے جو یقینی دلائل کی حد تک نہیں پہونچ سکیں،

یہ دعویٰ بعض مستشرقین مثلاً گولڈزیہیر [2]، سانتلانا، شیرمان اور امیوس کے خیالات پر مبنی ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلامی فقہ رومی قوانین سے بہت متاثر ہے اور یہ قوانین فقہ اسلامی کا سرچشمہ تھے چنانچہ ان کے خیال کے مطابق بہت سے احکام یا تو براہ راست لئے گئے یا یہودیوں کی کتاب تلمود کے واسطے سے داخل ہوئے کیونکہ تلمود میں بھی ان قوانین کا بہت بڑا حصہ موجود ہے [3] وہ اپنے خیالات کی تائید میں مندرجہ ذیل تین دلائل پیش کرتے ہیں،

تین دلائل

(۱) اسلامی فقہ اور رومی قوانین کا موازنہ کرتے پر بعض قوانین میں مشابہت پائی گئی جیسا کہ معاہدات، اموال وحقوق کے مسائل ہیں بلکہ بعض قوانین کے الفاظ بھی بعینہٖ رومی قوانین سے نقل کئے گئے ہیں مثلاً یہ قانون کہ ——

---

[1] یہ مباحث الرسالۃ، مجلہ الازہر، ہدی الاسلام، المنتظم اور البلاغ میں شائع ہوئے، [2] سابق پروفیسر وائنا یونیورسٹی [3] فجر الاسلام ص ۲۹ دوسرا ایڈیشن ومجلہ القانون والاقتصاد سال اول ص ۳۳۲ - ۳۴۴

مدعی کے ذمے ثبوت لانا ہے اور جو انکار کرے اس پر حلف ہے ۔"

(۲) بعض علمی اصطلاحات ہیں دونوں میں ہم معنیٰ ہیں مثلاً فقہ کا لفظ "اسلامی قانون" کے مفہوم میں بولا جاتا ہے اور فقیہ کا لفظ عالم فقہ کے لئے مستعمل ہے، اہل روما کے ہاں بھی اسی قسم کے الفاظ ہیں، وہ Jurisprudence کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کا مفہوم بھی سمجھ، معرفت اور حکمت ہے،

(۳) جب مسلمانوں نے شام کو فتح کیا تو اس وقت قیصریہ اور بیروت میں رومن قوانین کی تعلیم دینے کے لئے کچھ مدارس قائم تھے جہاں بہت سے شامی تعلیم حاصل کرتے تھے، اس طرح وہاں رومی قوانین کے مطابق کئی عدالتیں بھی قائم تھیں جہاں انہی قوانین کے مطابق فیصلے کئے جاتے تھے۔ اور ایسی عدالتیں اسلام کے بعد بھی بہت عرصہ تک جاری رہیں، چونکہ مسلمان اس زمانے میں تہذیب و تمدن سے اس قدر زیادہ آشنا نہ تھے لہٰذا جب انھوں نے ان ممالک کو فتح کیا جو تہذیب و تمدن میں ان سے زیادہ ترقی یافتہ تھے تو انھوں نے ان کے نظام اور قوانین سے کافی فائدہ اٹھایا[1]

مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر بروکلمان اپنی کتاب "تاریخ الادب العربی" میں مذہبی اور شرعی علوم کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے :-

"اسلام، قانون و شریعت کو مذہبی علوم میں شمار کرتا ہے کیونکہ اس کے احکام قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے ماخوذ ہیں، تاہم ان دونوں ماخذوں کا مواد اس عملی زندگی کی ضروریات کے لئے ناکافی تھا جس میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا، عربوں نے جنگوں اور فتوحات کے ذریعے ان قدیم تمدن کے ممالک کو اپنے زیرنگیں کر لیا تھا جہاں کے قانون داں کسی پس و پیش کے بغیر نہایت آزادی اور جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے، لہٰذا ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے اجنبی ممالک میں ان کی قدیم روایات، رسم و رواج اور قوانین کو برقرار رکھا اس طرح اسلام میں رومی قوانین کے بعض بنیادی اصول داخل ہو گئے[2] اس قسم کے خیالات مستشرقین کی ایک جماعت نے بیان کئے ہیں اور یورپ کے بعض قانون دانوں کے دل میں بھی یہ خیال راسخ ہو گیا ہے مگر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ عجیب و غریب قیاس آرائیاں ہیں جو ابتداءً اور پہلی نظر

[1] فجر الاسلام [2] مجلۃ الازہر جلد ہفتم ص ۴۳۷

ہیں انسان کو دلچسپ معلوم ہوتی ہیں مگر غور و فکر کرنے کے بعد میدان تحقیق میں نہیں ٹھہر سکتی ہیں،

مغربی دلائل کی تردید ان کی پہلی دلیل کی تردید میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر دو قسم کے قوانین میں شاذ و نادر مشابہت پائی جائے تو اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ ایک قانون دوسرے قانون سے ماخوذ ہے، کیونکہ ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ میں بعض جزئی احکام ایسے ہیں جن کی وضاحت کتاب و سنت میں نہیں ہے ایسی صورت میں علمار کو اجتہاد کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا ایسے موقع پر مسلمان مجتہدین عدل و انصاف اور مفاد عامہ کے اصولوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں اس لئے ایسا اتفاق ہو سکتا ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف قوموں کے قانون ساز حضرات، مذکورہ بالا مشترکہ بنیاد پر ایک ہی قسم کا فیصلہ صادر کریں،

اس کے علاوہ ان کی یہ دلیل خود ان کے برخلاف لوٹتی ہے اگر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ فقہ اسلامی، رومی قوانین سے ماخوذ ہے تو اس امر کا بھی امکان ہے کہ رومی قوانین نے اسلامی فقہ کے بعض احکام اخذ کئے ہوں یا امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض اسلامی قوانین کا پیوند ان میں لگ گیا ہو، یہ امکان اس لئے بھی زیادہ قوی ہے کہ اہل مغرب کا مسلمانان اندلس سے کافی میل جول تھا اور ان کے بعض طلبار نے اہل اندلس سے مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی جن میں اسلامی قانون بھی شامل تھا لہٰذا یہ نہ خیال کیا جائے کہ چونکہ اسلامی قوانین رومی قوانین کے بعد وضع ہوئے تھے اس لئے ایسا امکان نہیں ہے کیونکہ کبھی قدیم بھی جدید سے فائدہ حاصل کرتا ہے جبکہ جدید کا مرتبہ اعلیٰ ہو، اور وہ اس سے زیادہ حق و صداقت اور انصاف کے مطالبات کو پورا کرتا ہو، اس احتمال کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ اسلام کا یہ اصول کہ "مدعی کے لئے ثبوت مہیا کرنا ہے اور جو انکار کرے اس کے ذمہ حلف کا اٹھانا ہے" دراصل حدیث نبوی ہے جو رومیوں کے ساتھ عربوں کے میل جول سے پیشتر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ورد زبان تھی مگر مستشرقین اسے رومی قوانین سے ماخوذ بتاتے ہیں (لہٰذا یہ ممکن ہے اسے بعد میں رومی قوانین میں اسلامی قوانین سے متاثر ہو کر شامل کر لیا گیا ہو)

زبردست اختلاف

یہ مستشرقین کیوں اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں جب کہ ان کے سامنے فقہ اسلام کے ایسے بکثرت مسائل موجود ہیں جن میں رومی قوانین سے کسی قسم کی مشابہت نہیں پائی جاتی ہے چنانچہ رومی قوانین کا اسلام کے نظام ازدواج و طلاق، نفقات اور میراث کے مسائل سے کیا تعلق ہے؟ اس طرح رومی قوانین میں دیت کا قانون، یا وہ قوانین کہاں ہیں جو اسلام نے اپنے مخالفوں کے لئے مقرر کئے ہیں یا ان میں وہ حقوق و فرائض کہاں ہے، جو اسلام نے خواتین کے لئے مقرر کئے ہیں ان رومی قوانین کا غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور انھیں آزاد کرنے کے احکام سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ قوانین بھی ماخوذ ہیں؟ کیا معاملات کے ان شاذ و نادر مسائل میں جو اجتہاد اور رائے پر مبنی ہیں، مشابہت ہونے سے ان کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ فقہ اسلامی رومی قوانین سے ماخوذ ہے؟

فقہ کا مفہوم

اب ان کی دوسری دلیل پر غور کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ فقہ کے مفہوم میں دونوں جگہ مشابہت پائی جاتی ہے، اس کے جواب میں پہلی بات یہ کہی جاتی ہے کہ الفاظ کے معانی کی مشابہت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اس کے علاوہ فقہ کا لفظ، جسے وہ اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں، اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے علم تشریع کا اظہار نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے معنی "سمجھنا اور جاننا" ہے بعد ازاں اس کا اطلاق احکام شرعیہ پر کیا گیا ہے کیونکہ ان کے لئے بھی فکر و فہم کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ لفظ رومیوں کے ساتھ عربوں کے میل جول سے پیشتر اپنے لفظی معنوں میں قرآن کریم میں بھی مستعمل ہوا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم	ان کے فرقہ میں سے ہر جماعت کیوں نہیں
طائفۃ لیتفقھوا فی الدین	نکلی تاکہ وہ دین کی باتوں کو سمجھ سکیں

لہٰذا مسلمان فقہ کے لفظ کو رومیوں کے مستعمل لفظ کے مقابلے میں استعمال نہیں کرتے تھے

دین کامل

ان کی تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس اعلیٰ درجے کی آسمانی شریعت نہ ہوتی جو اپنے بلند اصولوں اور منصفانہ احکام

کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہے، تو یہ ممکن تھا کہ مسلمان اپنے سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قوم سے تشریعی احکام اخذ کر لیتے مگر یہ اسلامی شریعت ایسی ہے جو ان کے لئے سرمایۂ فخر و مباہات تھی اور اس کو برقرار رکھنے اور جاری کرنے کے لئے وہ جہاد کرتے تھے لہذا یہ بات کیسے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسے چھوڑ کر دوسری قوم کے قانونی احکام کو اختیار کر لیتے، حالانکہ مسلمان شرعی احکام معلوم کرنے کے لئے ہمیشہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، اور جب انھیں وہاں کوئی شرعی حکم نہیں ملتا تھا تو اپنے مجتہدین سے دریافت کر کے ان کے اجتہاد پر عمل کرتے تھے۔ اور ان کا اجتہاد بھی شریعت کے اصول و قواعد پر مبنی ہوتا تھا اور اس میں بھی اسلامی مقاصد کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا اسے وہ شریعت کے دیگر واضح احکام پر قیاس کیا کرتے تھے، بہرحال ان کے یہ اصول و قواعد انصاف اور فلاح عام کے نقطۂ نظر سے نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔

اب ہم ڈاکٹر بروکلمان کے اس جملے پر غور کرتے ہیں "اس طرح رومی قانون کے بنیادی اصول اسلام میں داخل ہو گئے"۔ ان کی یہ رائے ناقابل تسلیم ہے، کیونکہ مسلمانوں کو ایسے بنیادی اصولوں سے فائدہ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ ان کے پاس اللہ کی کتاب موجود تھی جس میں شریعت کے تمام اعلیٰ اور عمدہ اصول اور منصفانہ قواعد سب موجود ہیں، اور یہ وہ اصول و قواعد ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے تمام بنیادی اصولوں سے بہتر ہیں۔

ہم ان کے دلائل کی تردید اور ان کے شبہات کو دور کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ ایسے دلائل بھی پیش کرتے ہیں جن سے ہماری رائے مستحکم ہوگی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ فقہ اسلامی ایک مستقل شریعت ہے اور وہ کبھی رومی قوانین سے متاثر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے دلائل مستشرقین کے لئے برعکس دعویٰ کو ثابت کریں گے اور یہ واضح ہوگا کہ رومی قوانین فقہ اسلامی کے خوشہ چیں ہیں، ہمارے دلائل یہ ہیں۔

(۱) آپ فقہ اسلامی کی تمام کتابیں مطالعہ کر جائیے بالخصوص ان کتابوں کا مطالعہ کریں جن میں مختلف مسائل پر ائمہ کرام کی بحثیں مذکور ہیں۔ اور صحابہؓ۔ تابعین اور دیگر علماء کے فتاویٰ مع دلائل و مآخذ بیان کئے گئے ہیں یا ان میں ان تمام

چیزوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن سے انھوں نے خوشہ چینی کی ہے، مگر آپ کو کہیں یہ تذکرہ نہیں ملے گا۔ کہ انہوں نے کسی رومی قانون سے استفادہ کیا تھا۔ یہ ذہن نشین رہے کہ علمار کرام اپنے مخالفین کی تردید میں بہت پیش پیش رہا کرتے تھے اگر کسی عالم نے رومی قانون سے استفادہ کیا ہوتا تو کم از کم تنقید اور اعتراض کے طور پر اس کا ذکر کیا جاتا۔

(۲) مؤرخین عرب نے ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے جو عربوں اور دیگر مسلم فوجوں نے ان اجنبی قوموں سے حاصل کیں۔ جن کے ساتھ ان کا میل جول تھا، انھوں نے کھلم کھلا ان تمام علوم کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ایران اور ہند و یونان سے حاصل کئے تھے بلکہ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ خلفاء اور امراء نے کون سے علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا۔ چنانچہ طب، فلکیات، نجوم، اور تمام علومِ فلسفہ کی کتب کے تراجم کا تذکرہ کیا گیا ہے مگر ان میں سے کسی نے اس طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے کہ مسلم علمار نے رومیوں سے ان کے قوانین کی تعلیم حاصل کی تھی یا یہودیوں سے ان کی کتاب تلمود پڑھی تھی یا نہیں؟

(۳) بعض مستشرقین نے یہ لکھا ہے "یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ امام اوزاعی کا مسلک فقہی ناپید ہوگیا، امام اوزاعی بیروت میں مقیم تھے جو شام میں رومی قوانین کا سب سے بڑا مکتب فکر تھا۔ لہٰذا اگر ہمیں امام اوزاعی کے مکتب فکر کا پتہ چلتا تو اس میں ہمیں رومی قوانین کے گہرے اثرات ملتے" [۱]

امام اوزاعیؒ

مستشرقین کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ عبدالرحمٰن اوزاعی شام کے بہت بڑے عالم تھے اہل شام ان کے مسلک پر چلتے تھے اور ان کا مکتب فکر اندلس تک بھی پہونچ گیا تھا اور وہاں کچھ عرصہ تک لوگ ان کے مسلک پر عمل بھی کرتے رہے، مگر ان کا تعلق محدثین کے مکتب فکر سے ہے اہل رائے اور اجتہاد سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ امام شافعی نے اپنی کتاب الاُم کے حصۂ ہفتم میں امام اوزاعی کے فقہی خیالات نقل کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق اہل حدیث سے تھا اور وہ قیاس کو پسند نہیں کرتے تھے [۲] لہٰذا یہ

---

[۱] فجر الاسلام ص ۲۹۱ دوسرا ایڈیشن [۲] تاریخ التشریع الاسلامی از خضری ص ۲۰۹

بات کیسے سمجھ میں آسکتی ہے کہ امام اوزاعی کے مسلک پر رومی قوانین کا اثر ہو سکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ محدثین، فقہاء سے بھی زیادہ نصوص شرعیہ کے پابند ہوتے تھے وہ قیاس کے اصولوں کے مطابق بھی عمل کرنے سے گھبراتے تھے، ایسی حالت میں رومی قوانین کو کیسے اختیار کر سکتے تھے جیسا کہ مستشرقین خیال کرتے ہیں چونکہ ان لوگوں کے پاس یقینی علم نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ محض قیاس آرائی کرتے ہیں جس سے حق وصداقت آشکارا نہیں ہوسکتی۔

(۴) فقہ اسلامی کے مشہور و معروف بنیادی اصول ہیں جن کی طرف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرمائی تھی، جیساکہ حضرت معاذؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ ان کا پہلا بنیادی سرچشمہ کتاب و سنت ہیں، اگر ان دونوں میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو اس وقت اپنی رائے سے اجتہاد کیا جاتا ہے۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں بھی یہی طریقہ رہا۔ وہ اس طریقے پر گامزن رہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمادیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا اس میں بھی انھوں نے اسلامی قوانین واحکام کے بنیادی اصول مقرر فرمادیئے تھے جن میں سب سے مقدم کتاب وسنت ہیں اس کے بعد اگر کوئی حکم کتاب وسنت میں نہ ملے تو شرعی احکام کو سمجھنے اور مشابہ احکام پر قیاس کرنے کی تلقین کی گئی ہے،

یہی طریقہ دوسری اور تیسری صدی کے مجتہدین کرام کا تھا۔ وہ بھی انہی چار اصولوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو کتاب وسنت قیاس اور اجماع ہیں۔ اجماع کوئی نئی چیز نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے بھی کتاب وسنت یا قیاس کی سند کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان تمام اختلافی مباحث اور مناظروں سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انہی چاروں اصول کے پابند تھے، استحسان اور مصالح مرسلہ کے قواعد بھی انہی اصول میں شامل ہیں۔ لہٰذا کسی تاریخی واقعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے۔ کہ کسی مسلمان عالم نے رومیوں کے ماحول میں اس طرح تعلیم وتربیت حاصل کی ہو جس کی بدولت اس کے لئے رومی یا دیگر اجنبی قوانین سے استفادہ کرنا آسان ہوگیا ہو، یا وہ رومیوں کی کتابیں پڑھتا ہو اور وہ رومی عالموں اور قانون دانوں سے میل جول رکھتا ہو

بلکہ امام اوزاعی کے سوا باقی تمام فقہاء کرام رومی علاقوں اور رومی ماحول سے بہت دور رہے، خود امام اوزاعی کے متعلق یہ ثابت ہوچکا ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کے علاوہ اور کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی مقنن شرعی قوانین بنانے میں رومی یا کسی دوسرے اجنبی قوانین کی مدد نہیں لیتے تھے۔

(۵) اگر ہم فقہ اسلامی کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں بعض احکام میں مختلف رائیں ملتی ہیں، لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ہر ایک کے دلائل یا تو کتاب و سنت اور اجماع پر مبنی ہیں یا قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ اور شرعی قواعد و مقاصد میں سے کسی ایک سے اس کا تعلق ہوتا ہے، مذکورہ بالا اصولوں کے علاوہ اور کوئی چیز حوالہ میں نہیں پیش کی جاتی تھی، لہٰذا یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی فقہاء رومی قوانین کو اپنی فقہ میں داخل کرلیں، اور پھر سب متفقہ طور پر اسے چھپاتے رہیں اور ان کا انکار کرتے رہیں،

رومی اور اسلامی قوانین میں فرق

(۶) دونوں قوانین اپنے بنیادی اصول اور احکام میں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی قوانین رومی قوانین سے بالکل جداگانہ ہیں۔

اسلامی شریعت میں ایسے قواعد و قوانین پائے جاتے ہیں جن کا رومی قوانین میں نام ونشان تک بھی نہیں ملتا ہے مثلاً شفعہ، وقف اہلی، تعزیر کے ذریعے احکام سزا، رضاعی رشتے سے شادی کی ممانعت کے قوانین کا رومی قوانین میں کوئی پتہ نہیں ہے جس طرح کہ متبنیٰ بنانے، عورت کی سرپرستی، پدری اختیارات اور شوہر کی بالادستی کے قوانین کا فقہ اسلامی میں کوئی وجود نہیں ہے، بعض قانونی نظام دونوں میں مشترک ہیں مگر ان کے قواعد مختلف ہیں جیسا کہ میراث کا نظام ہے کیونکہ رومی قانون میں عورت کا مرد کے برابر حصہ ہے مگر اسلامی شریعت میں اخیافی بہن بھائیوں کے علاوہ عورت کا مرد کے نصف حصہ کے برابر حصہ ہے، اسی طرح نظام طلاق ہے چنانچہ رومی قانون کے مطابق طلاق دینے کے اختیارات شوہر اور بیوی دونوں کو حاصل ہیں مگر اسلام میں یہ اختیار صرف مرد کو حاصل ہے (لہ حاشیہ صفحہ ۵۲۵) اور بیوی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے،

رسی طرح رومی قانون کے مطابق ازدواجی نظام فردی ہے اور مسلمانوں کے نزدیک وہ متعدد ہے[۱]

اسی طرح شریعت اسلامیہ میں معاملات میں سادگی کو مدنظر رکھا گیا ہے اور معاملات طے کرنے میں انصاف کی روح اور طرفین کی نیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے لہٰذا معاملات طے کرنے کے لئے رسمی کارروائی کی شرط نہیں رکھی گئی ہے اور نہ ملکیت کو منتقل کرنے کے لئے خاص ومنع کی ضرورت ہے بلکہ ظاہری اور باضابطہ کارروائی کے بغیر محض طرفین کی رضامندی کافی ہے اگر رومی قوانین کے رو سے اس قسم کے معاملات کو طے کرنے لئے رسمی کارروائی کرنی پڑتی ہے، اور مخصوص قسم کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں البتہ کچھ معاملات اس ضابطہ کی کارروائی سے مستثنیٰ ہیں تاہم اگر مخصوص رسمی کارروائی نہ کی جائے تو کسی معاملہ میں محض طرفین کی رضامندی کافی نہیں ہوگی۔ اس طرح انتقال ملکیت کے لئے بھی محض طرفین کی رضامندی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے بھی ضابطہ کے مطابق کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ دونوں قسم کے قوانین کی یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کا مغربی علمار نے بھی اعتراف کیا ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی قوانین کی نشوونما ایسے خاص ماحول میں ہوئی تھی جو رومی قوانین کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔

رومی قوانین کے چار دور

(۷) رومی قوانین ان قواعد و احکام کا مجموعہ ہے جس پر رومی قوم نے اپنی ابتدائی نشوونما سے لے کر شہنشاہ جستنیان کی وفات تک مختلف زمانوں میں عمل کیا۔ گبن کے قول کے مطابق اس کے چار دور ہیں:-

دور اول ۷۵۴ قبل مسیح سے لے کر جب کہ شہر روما کی بنیاد قائم ہو گئی تھی

(بقیہ ۱) اصل قاعدہ یہی ہے لیکن کبھی طلاق کا اختیار عورت کو بھی تفویض کر دیا جاتا ہے اور کبھی قاضئ عدالت کے ذریعے طلاق واقع ہو جاتی ہے: جبکہ شوہر میں کوئی عیب ہو، یا وہ نقصان پہونچاتا ہو، یا شوہر دیوالیہ ہو کر نان نفقہ کے قابل نہ رہے۔

(۲) مقالہ استاذ علی بدوی مجلہ ہدی الاسلام شمارہ ۳۸ سال سوم و مقالہ استاذ موصوف مجلہ القانون والاقتصاد سال اول ص ۷۳۴ - ۷۳۵

بارہ ۱۲ تختیوں کے قانون کی تدوین پر ختم ہوتا ہے،

دورِ دوم شہنشاہ سیورون کے عہد تک ختم ہوتا ہے، دور سوم، شہنشاہ سیورون کے عہد سے لیکر شہنشاہ اسکندر سیفو تک ہے اور دور چہارم شہنشاہ اسکندر سیفر کے عہد سے لے کر شہنشا جستنیان کی وفات یعنی ۵۶۵ء تک ہے۔

دورِ زوال میں فقہ اسلامی کا ارتقار وہ مورخین جنہوں نے رومی قانون کے ارتقار کی تاریخ ہے، یہ بتاتے ہیں کہ شہنشاہ جتنیان کی وفات کے بعد اس قانون میں زوال آگیا اور کا چراغ بجھ گیا، اس کے پچاس برس بعد اسلام کا ظہور ہوا، لہذا اس تاریخ کے بعد یہ قانون خود اہل یورپ کے لئے بھی گوشۂ گمنامی میں پوشیدہ ہوگیا اور وہ صرف کلیساؤں کے تنگ دائرہ میں محدود ہو کر رہ گیا[1] بعد میں اس کا دوبارہ ظہور گیارھویں صدی عیسوی کے کے آخر میں ہوا[2] جبکہ اٹالیہ کی جامعۂ بولونیا اس کی تشریح و تعلیم کی طرف متوجہ ہوئی اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قانون چھٹی صدی عیسوی کے آخر سے لیکر گیارھویں صدی عیسوی تک گمنام اور نامعلوم رہا، اگر یہ صحیح ہے تو مسلم فقہار کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ رومی قوانین سے واقف ہوتے اور اس سے استفادہ کرتے جبکہ فقہ اسلامی کی ابتدائی نشوونما، ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی اور آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی میں وہ نشوونما پاکر مکمل ہو گئی تھی اور اپنے اوجِ کمال پر پہونچ چکی تھی یہاں تک کہ ائمۂ اربعہ کی فقہ کے مطابق اس وقت ضخیم فقہ کی کتابیں لکھی جاچکی تھیں، اس طرح فقہ اسلامی اس وقت اپنی منزل مقصود تک پہونچ گئی تھی جبکہ رومی قانون اپنے خواب غفلت سے بیدار بھی نہیں ہوا تھا بلکہ بدستور سویا ہوا تھا

پاپائے روم اسلامی مدارس میں بعض تاریخی معلومات بھی یہ ثابت کرتی ہیں کہ رومی قوانین اسلامی قوانین سے ماخوذ ہیں چنانچہ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہربرٹ فرانسیسی جو پوپ سلفستر دوم کے نام سے مشہور تھا اور ۱۰۰۳ء تک پاپائے اعظم کے مسند پر سرفراز تھا، پوپ بننے سے پہلے اپنی

[1] مجلۃ الازہر جلد ۸ ص ۳۵۰، ۳۵۲ [2] کتاب مبادیٔ القانون الرومانی

علمی برادری کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اندلس گیا تھا انھوں نے اندلس کے مدارس میں تعلیم حاصل کی، جس میں فقہ اسلامی کی تعلیم بھی شامل تھی، تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو اسلامی قوانین انھیں ملک کے لئے مناسب اور مفید معلوم ہوئے وہ انھوں نے رومی قوانین میں شامل کئے کیونکہ ان کے ملکی قوانین بہت خراب تھے لیکن غالباً انھوں نے اس کی تصریح اس وجہ سے نہیں کی کہ عیسائی ہر اس چیز سے نفرت کرتے تھے جس کا اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تھا۔

ہمارے اس بیان کی تائید مغربی مورخین کی ان تحریروں سے ہوتی ہے کہ سلفسر ودم وہ شخص تھا جس نے یورپ کے قوانین کی ترمیم و تنسیخ کی اور اسی کے زمانے سے قانونی ارتقار کی تحریک شروع ہوئی۔ جیسا کہ پروفیسر محمد علی بدوی نے اپنی کتاب "رومی قانون کے مبادیات" میں بیان کیا ہے، انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ قانونی ارتقار کی تحریک اطالیہ کی جامعہ بولونیا سے شروع ہوئی جو یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے وہاں یہ قانونی تحریک گیارھویں صدی عیسوی کے آخر سے لیکر سولھویں صدی عیسوی تک جاری رہی [۱]

اسلامی پیوند

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ھربرٹ نے اندلس میں مسلمانوں سے تعلیم حاصل کرنے کے ضمن میں فقہ اسلامی کی تعلیم بھی حاصل کی اور وہاں سے واپس آنے پر اس نے مغربی قوانین کی ترمیم و تنسیخ کی جن میں رومی قانون بھی شامل تھا۔ اس نے ان میں فقہ اسلامی کے بہت سے قوانین شامل کئے، رومی قانون کو زندہ کرنے کی تحریک اور اس کے بارے میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں غور و تحقیق بھی گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوئی۔ اگر یہ صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہربرٹ اس صدی کے چوتھائی حصے کے آخر تک زندہ رہا تو ہم نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ رومی قانون جس طرح جسٹنیان کے عہد میں تھا اسی طرح اصلی حالت میں وہ گیارھویں صدی کے شروع میں رہا اس کے بعد اس قانون میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور اس میں اسلامی قوانین کا پیوند لگایا گیا۔ ایسی صورت میں مستشرقین کے دعوی کی عمارت بالکل منہدم ہو جاتی ہے اور اس

[۱] اخبار البلاغ ۱۷ جون ۱۹۳۵ء

کے لئے کوئی صحیح بنیاد باقی نہیں رہتی اس کے بجائے صحیح علمی استدلال سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رومی قانون ہی اسلامی قانون سے متاثر ہے اور یہی تحقیق انصاف پسند محققین کے نزدیک اس وقت تک قابل تسلیم ہونی چاہیئے، جب تک کہ کوئی خالص علمی اور یقینی دلیل نہ ملے جو اس کی قطعی تردید کر سکے،

تاریخی ثبوت

ہماری یہ تحقیق دو قسم کے تاریخی ذرائع سے صحیح ثابت ہوتی ہے ان میں سے ایک مشرقی ہے اور دوسرا مغربی ذریعہ ہے [1]

(الف) مشرقی ذریعۂ معلومات یہ ہے کہ ماوراء النہر (ترکستان) کے ایک بڑے عالم مفضل الاسفر نکانی نے اپنے "مجموعۂ رسائل فی شوارد المسائل" میں یہ تحریر کیا ہے ـــ" ابو الولید عبد اللہ نے ہدایہ کی شرح النہایۃ کے حواشی میں یہ نقل کیا ہے کہ یورپ کے وہ طلبار جو اندلس کے شہر غرناطہ میں تحصیل علم کے لئے جاتے تھے، فقہ اسلامی کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لئے بہت سرگرمی کی اظہار کرتے تھے، کیونکہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں ان کے ملکی قوانین بہت خراب تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اسلامی قوانین ان کے ممالک میں رائج ہوں اس مقصد کے لئے انھوں نے کامل فقہ اسلامی کو مدون کر لیا تھا۔ اور اپنے ملک کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلی کر لی تھی"

(ب) اس کا مغربی ثبوت جرمن مؤرخ موسیم کی تحریر سے ملتا ہے چنانچہ وہ اپنی "تاریخ کلیسا" میں دسویں صدی ہجری کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔

" ہاربرٹ مذکور اپنی تعلیم میں اندلس کے عربوں کی کتابوں اور ان کے مدارس کا مرہون منت ہے، کیونکہ وہ علم حاصل کرنے کے لئے ہسپانیہ گیا تھا اور وہاں قرطبہ اور اشبیلیہ میں عرب علمار کا شاگرد رہا، اس کے اس علمی سفر نے یورپ کے طلبار میں علم کا بہت شوق پیدا کیا اور اس زمانے سے ان میں یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ ہسپانیہ میں مقیم عرب علماء سے استفادہ کریں یا ان عرب علمار سے تعلیم حاصل کریں جو اطالیہ کے گرد و نواح میں رہتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے عربوں کی بہت سی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کر لیا لہٰذا ہسپانیہ کے عرب علمار

---

[1] مجلہ الازہر جلد ہشتم ص ۲۶۴ ـ ۲۶۵

دسویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے زمانے میں یورپ کی علمی ضیا پاشیوں کا سرچشمہ تھے، ان علوم وفنون میں جو اس وقت یورپ میں رائج تھے علم قانون بہت اہم تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس وقت جو دیوانی یا فوجداری قوانین فقہ اسلامی سے اخذ کئے یہ وہی قوانین تھے جنہیں انھوں نے جدید رومی قوانین کے نام سے موسوم کیا تھا“

تاہم یہ امر باعث مسرت ہے کہ لاہامی میں اگست ۱۹۳۷ء میں جو کانفرنس بین الاقوامی تقابلی قانون کی منعقد ہوئی تھی اس میں صحیح حقیقت آشکارا ہوگئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسلامی شریعت رومی قانون سے متاثر نہیں ہے بلکہ وہ بذات خود ایک مستقل شریعت ہے[1]

تقابلی قانون کے مشہور فرانسیسی ماہر ادوار میر کا پہلے یہ خیال تھا کہ رومی قانون سے اسلامی شریعت بہت متاثر ہے مگر جب انھوں نے بہت غور و فکر کیا اور اسلام کا بہت مطالعہ کیا نیز انھوں نے علمائے اسلام سے بھی تبادلہ خیالات کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلامی شریعت اس سے بالکل الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، اور ایک مستقل شریعت ہے، اور یہی وہ حق و صداقت ہے جسے ہم نے ابھی دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے،

---

[1] ملاحظہ ہو جامعۂ ازہر کے نمائندگان کی وہ تقریریں جو لاہائی کانفرنس میں کی گئیں اور جن کا خلاصہ اخبار الاھرام کے شمارہ ۲۶ نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

فصل دوم

کامل اور لازوال شریعت

اسلامی شریعت سب سے زیادہ انصاف پسند اور مستحکم شریعت ہے اور چونکہ وہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، اس لئے صدیوں گزرنے پر بھی یہ ہمیشہ باقی رہی۔ بلکہ جب تک دنیا باقی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے اور نہ یہ منسوخ ہو سکتی ہے یہ سراپا رحمت و نعمت ہے اسی کی بنیاد فلاح عام پر قائم ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا اور آخرت میں کامیاب رہے، یہ ہدایتِ الٰہی کے نور کا ایک شعلہ ہے اور اسی کے نورِ وحی سے منور ہے یہ ایسا آئینہ ہے جس میں رسالت اور نبوت کے تمام جلووں کی عکاسی ہوتی ہے یہ مجتہدین علمائے کرام کی اجتہاد پسند طبائع کی جولاں گاہ بھی ہے اور اللہ کے ان مخلص بندوں کے آزاد خیالات کا میدان عمل بھی ہے، جو چراغ ہدایت لے کر صحیح راستہ معلوم کرتے ہیں، یہ لوگ کتاب وسنت کی مدد سے مفاد عامہ کی راہیں تلاش کر رہے ہیں تاکہ انہیں ایسے صحیح قانون کا پتہ چلے۔ جس کے ذریعے افراد اور قوموں کی تمام ضروریات پوری ہوتی رہیں، خواہ ان کا تعلق عبادات اور معاملات سے ہو یا دیوانی، تجارتی فوجداری سیاسی اور سماجی احکام سے ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بندے کے خالق سے تعلقات اور افراد کے اپنے خاندان اور معاشرہ سے تعلقات کا اچھی طرح تعین کر دیا گیا ہے اسی طرح اس میں سماج کے افراد کے ساتھ تعلقات کو کو متعین کر کے قوموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد بھی قائم کی گئی ہے۔

حق وانصاف پر بنیاد

ان تمام احکام وقوانین کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں عدل ومساوات برقرار رکھی جائے اس

لئے اسلام میں عربی، عجمی، کالے گورے، بادشاہ اور رعایا، کمزور اور طاقت ور کا کوئی فرق نہیں ہے، اس کا مقصد دنیا میں حق و انصاف کا قیام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:۔

"اے ایمان والو! اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور انصاف کے گواہ بنو کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں انصاف کرنے سے نہ روکے، انصاف کرو کیونکہ یہی پرہیزگاری کے قریب تر ہے۔"

حضرت خولہ بنت قیس فرماتی ہیں :- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبیلہ بنو ساعدہ کے ایک شخص کو ایک وسق کھجوریں ادا کرنی تھیں، لہٰذا وہ آکر تقاضا کرنے لگا۔ آپؐ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ وہ کھجوریں ادا کردے، چنانچہ اس انصاری نے مقررہ مقدار سے کم کھجوریں دینی چاہیں تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اس پر اس نے کہا :- کیا تم رسول اللہؐ کی چیز کو لوٹاتے ہو!"۔ اس شخص نے کہا۔ "ہاں، رسول اللہؐ سے زیادہ اور کس سے انصاف کی توقع کی جائے"، یہ سُن کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپؐ فرمانے لگے" وہ سچ کہتا ہے مجھ سے بڑھ کر کون عدل و انصاف کر سکتا ہے، بلکہ اللہ اس قوم کو پاکیزہ نہیں بناتا ہے جو طاقتور فرد سے اسے تکلیف دیئے بغیر کمزور فرد کا حق نہ دلا سکے[1] النہایۃ میں یہ الفاظ ہیں :- وہ قوم پاکیزہ نہیں ہو سکتی جو طاقتور سے کمزور کا حق نہ لے سکے۔"

دوسری حدیث ہے :- انصاف کرنے والے، اللہ کے ہاں، اس خدائے رحمان کے دائیں طرف، جس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں، نورانی منبر پر سرفراز ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے احکام میں اہل و عیال کے ساتھ نیز اپنے فرائض منصبی میں عدل و انصاف اختیار کرتے ہیں"[2] ایک مشہور حدیث ہے :- "تم میرے سامنے اپنے مقدمے پیش کرتے ہو، اور بہت ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے سے زیادہ مجھ پر اپنے دلائل کو ثابت کر سکے اور شاید میں جیسا سنوں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں، لہٰذا اگر میں اس کو اس کے بھائی کا کچھ حق (اس کے دلائل سے

---

[1] الفروق از قرافی، جلد ۴ ص ۲۳۸ - مفتاح السنۃ ص ۴ ۱۳ مطبوعہ ۱۳۴۷ھ [2] الطرق الحکمیہ ص ۲۶۱

متاثر ہو کر) دیدوں تو اسے چاہیئے کہ وہ اسے نہ لے کیونکہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں" [1]

ذیل کی آیت میں جو میزان کا لفظ ہے اس کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے — "درحقیقت ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) کو بھی نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف کو قائم کر سکیں"

یہ اسلامی تشریع کا دستور ہے، اس کا آغاز و انجام صرف انصاف پہ ہے اس کی راہ حق و صداقت کی ہے جس کی رہنمائی سرورِ کائنات اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور آپ کے خلفاء راشدین بھی اسی راہ پر گامزن رہے جیساکہ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک مکتوب مبارک میں یہ الفاظ مذکور ہیں:—

"تم اپنے ذاتی امور اور اپنی محفل عدل و انصاف میں لوگوں کے ساتھ مساوات اختیار کرو، تاکہ کمزور تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہو اور شریف کو تمہارے ظلم کا اندیشہ نہ ہو"۔ [2] ایسی صورت میں جبکہ اسلامی شریعت میں عدل و انصاف کا اس قدر اہتمام ہو اور یہاں حق و صداقت کی اس قدر پابندی کی جاتی ہو، بلکہ اس میں ایسے ترقی یافتہ اور اعلیٰ اصول و قواعد بھی ہوں کہ کتاب و سنت کے واضح احکام نہ ہونے کی صورت میں ان سے کام لیا جاسکتا ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے مسلم حکام اپنے قوانین کو چھوڑ کر اجنبی قوانین کی تلاش کرتے ہیں یہاں تک کہ موجودہ دور میں وہ شریعت کے مخالف قوانین کو اختیار کرنے کی جرآت کرنے لگے ہیں،

ہمارے خیال میں ان کے بے بنیاد شبہات اور اعتراضات دو ہیں جو حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔

شبہات کا ازالہ

پہلا شبہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت ناقص ہے اس میں نہ تو عوام کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ قوموں کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے یہ زمانے کے انقلاب کا ساتھ نہیں دے سکتی اور

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۰ [2] مفتاح السنۃ ص ۱۳۰ منقول از سنن دار قطنی

نہ گوناگوں مسائل اور اہم معاملات کا حل پیش کرتی ہے،

ان کا یہ شبہ، بہت بڑی گمراہی اور غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے حکام کے لئے ہر معاملہ میں انصاف کرنا ضروری قرار دیا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ شریعت کے اصول و قواعد بھی بیان کر دیئے گئے ہوں تو بقول علامہ ابن القیم جو حق و انصاف کا حکم ہوگا، وہی خدا کا حکم ہے، بلکہ جن دلائل و اصول کے مطابق حق و انصاف کی حمایت کی جائے وہی اسلامی شریعت کے دلائل و اصول سمجھے جائیں گے خواہ انھیں کسی قانون اور کسی شریعت کے ذریعے ثابت کیا جائے اس کا یہ مطلب ہے کہ حق و انصاف کے تمام صحیح قوانین شریعت کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا شبہ کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے وہ مباحث کافی ہیں جو ہم اس کتاب میں بیان کر چکے ہیں، ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی شریعت کے اصول کتنے وسیع اور اعلیٰ ہیں کہ علماء کرام قانون سازی کے لئے کتاب و سنت، اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، استصحاب اور سد ذرائع میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کر سکتے ہیں علاوہ ازیں اسلامی قوانین کی وسعت کا اندازہ کتب فقہ میں مجتہدین کرام کی بحثوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے اور پھر اس پر بھی غور کیا جائے کہ اگر کوئی حل ہمیں شریعت میں نہ مل سکے تو ہمیں تقلید کو چھوڑ کر اجتہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دراصل شریعت میں کوئی خامی نہیں ہے اگر کوئی کمی ہے تو ہم میں ہے اور اس میں ان علماء کرام کی کوتاہی ہے جو اجتہاد کرنے کے قابل تھے مگر انھوں نے اس فریضہ جہاد کو ادا نہیں کیا۔

ملزم کے احکام

سابق مجتہدین نے دیوانی، فوجداری اور عام معاملات کے مسائل و احکام میں جو بحثیں کی ہیں وہ اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے کافی ہیں، ان مجتہدین کرام نے جرائم کے الزام میں قید کرنے اور زد و کوب کرنے کی اجازت دی ہے تاہم ان جرائم میں انھوں نے مدعی علیہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں کیونکہ ملزم یا تو بظاہر بے گناہ ہوگا اور اس الزام سے بالاتر ہوگا، یا وہ بدکار ہوگا اور اس پر جرم کا الزام لگایا جا سکتا ہے یا اس کے حالات نامعلوم ہوں گے۔

اگر وہ بے گناہ ہو اور قرائن سے اس کی بریت ثابت ہوتی ہو تو باتفاق رائے اس

کو سزا دینا جائز نہیں ہے، اگر وہ مجہول الحال ہو یعنی یہ نہ معلوم ہو کہ وہ نیک ہے یا بدکار ہے تو عام علماء کی یہ رائے ہے کہ اسے اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک کہ اصل حقیقت کا انکشاف نہ ہو جائے، اسے قاضی یا حاکم قید کر سکتا ہے مگر کچھ علما کا یہ قول ہے کہ الزام جرم میں صرف جنگی افسر کسی کو قید کر سکتا ہے اور قاضی نہیں کر سکتا ہے اس طرح قید کی مدت میں بھی اختلاف ہے، بعض کا قول ہے کہ ایک مہینے تک ملزم کو حوالات میں رکھا جا سکتا ہے اور بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ اسے حاکم کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے۔

اگر ملزم برے کاموں میں مشہور ہو تو نامعلوم شخص کی بہ نسبت اس کو قید کرنا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے بلکہ اس قسم کے ملزموں کو زدوکوب بھی کیا جا سکتا ہے، بعض علماء نے قاضی اور حاکم دونوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اسے زدوکوب کر سکتے ہیں [۱] یہ رائے امام مالک اور امام احمد کے ساتھیوں کی ہے جن میں مصر کے مشہور قاضی اشہب بن عبدالعزیز بھی شامل ہیں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ملزم کو قید و ضرب کی آزمائش میں ڈالا جا سکتا ہے مگر صرف کوڑے سے مارا جائے۔

بعض علما کا یہ قول ہے کہ اسے صرف حاکم ہی زدوکوب کر سکتا ہے قاضی کو اس کی اجازت نہیں ہے، یہ امام شافعی اور امام احمد کے بعض ساتھیوں کا قول ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جائز ضرب صرف حدود و تعزیرات کی ضرب ہے اور وہ بھی اس وقت عمل میں لائی جاتی ہے جب کہ ان کے اسباب ثابت ہو جائیں [۲] بعض علماء ملزم

---

[۱] الطرق الحکمیہ ص ۱۰۷ میں یہ مذکور ہے ـــــ "ملزم کو اسی وقت زدوکوب کیا جائے جبکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس مال ہے اور اسے اس نے چھپا رکھا ہے مگر اس کا منکر ہے، یہ زدوکوبی اس سے اقرار کرانے کے لئے ہوتی ہے اس کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اہل خیبر سے چاندی سونے کے مال پر صلح کی تو آپؐ نے حیی بن اخطب کے چچا سے دریافت کیا "حیی کا خزانہ کہاں ہے؟" اس نے کہا۔ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اخراجات کی کثرت نے ختم کر دیا ہے"۔ آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا "ذرا اس کی خبر لینا" لہٰذا جب حضرت زبیرؓ نے اسے سزا دی تو اس نے بتایا کہ ایک ویرانے میں بیل کی کھال میں کچھ زیورات مدفون ہیں [۲] الطرق الحکمیہ ص ۱۰۱ - ۱۰۲

کو مارنے کے قائل نہیں ہیں۔

(یہ مسئلہ نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے) اسی طرح کی کتب فقہ میں اجتہادی مسائل ہیں، یہاں تک کہ عبادات میں بھی فقہائے کرام کی اختلافی بحثیں مذکور ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلامی شریعت بہت وسیع ہے اور اس کے اجتہادی مسائل میں اختلاف رائے کی پوری آزادی حاصل ہے،

یہ وہ آزاد شریعت ہے جس کے آغوش تربیت میں آزادی رائے پروان چڑھی، اور جس کے زیر سایہ بڑے بڑے مجتہدین کرام پیدا ہوئے مگر آج اس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ناقص ہے حالانکہ اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ مسلم حکام ہر زمانے اور ہر مقام کے مناسب حال، احکام وقوانین وضع کر سکیں،

تعزیرات کے قوانین

اسلامی شریعت کے ناقص ہونے کا شبہ اس سے بھی دور ہو سکتا ہے کہ اسلام میں تعزیر اور سزا کا باب بہت وسیع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق گناہوں کی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم ایسی ہے جس میں حد شرعی لازم ہے مگر کفارہ نہیں ہے، جیسے زنا، چوری، شراب نوشی، حد تہمت، دوسری قسم وہ ہے جس میں کفارہ ہے مگر کوئی حد شرعی واجب نہیں ہے، جیسے احرام کی حالت میں یا رمضان شریف کے روزے میں دن کے وقت بیوی سے مجامعت کی جائے۔ تیسری قسم ایسی ہے جس میں نہ کفارہ ہے اور نہ حد شرعی واجب ہے، جیسا کہ کسی اجنبی عورت کی طرف دیکھا جائے۔

پہلی قسم میں چونکہ حد شرعی واجب ہے اس لئے اس میں کوئی تعزیر نہیں ہے دوسری قسم میں فقہاء کرام کے دو مختلف اقوال ہیں، تیسری قسم میں تعزیر ضروری ہے لیکن علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ تعزیر حد شرعی کی طرح ایسی واجب ہے کہ حاکم اسے معاف نہیں کر سکتا۔ یا حاکم وقت کو اختیار ہے کہ وہ اسے سزا دے یا نہ دے؟ نیز سزا کی مقدار کا تعین بھی اسی کی رائے پر موقوف ہے یا نہیں؟ اس بارے میں بھی دو رائیں ہیں، دوسری رائے امام شافعی کی ہے اور پہلی رائے جمہور علماء کی ہے[1] (یعنی تعزیر کا اختیار اور اس کی مقدار کا تعین صرف حاکم کو ہے

---

[1] القیاس از ابن القیم ص ۱۵۴ - ۱۵۵

تعزیرات کا دار و مدار جرم کی نوعیت اور مجرم کی حالت پر ہے کبھی اس کے لئے محض زبانی زجر و توبیخ ہی کافی ہوتی ہے، کبھی قید کرنے یا مارنے یا جلاوطن کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی تعزیراً کسی کو قتل بھی کیا جاتا ہے، بہرحال تعزیر کی کیفیت اور مقدار کے بارے میں فقہاء کرام کے چار اقوال ہیں (جس کا ذکر اسلامی شریعت کے محاسن وخصوصیات کے باب میں بھی کیا جاچکا ہے)

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ تعزیرات کا معاملہ حاکم کی رائے پر موقوف ہونا چاہیے، تاکہ وہ مصلحت وقت اور جرم کی نوعیت کے مطابق اس کا اندازہ لگائے، یہ رائے رکھنے والے اسے قتل کی اجازت بھی دیتے ہیں بشرطیکہ فتنہ و فساد کسی کے قتل کرنے سے دور ہوتا ہو، جیساکہ جاسوس کو قتل کر دیا جائے بشرطیکہ اس کے قتل کرنے میں عام مصلحت مضمر ہو یا اگر کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں تفریق پیدا کر رہا ہو یا کتاب و سنت کے علاوہ کسی اور چیز کی دعوت دے رہا ہو، تو اسے بھی قتل کیا جاسکتا ہے جیساکہ حدیث شریف میں مذکور ہے —— "جب تمہارا معاملہ (حکومت) کسی ایک شخص کے ذریعے درست ہو اور اس وقت کوئی شخص آکر تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرے تو تلوار سے اس کی گردن اڑادو خواہ وہ کوئی شخص ہو" ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ — ایک آدمی شراب نوشی سے باز نہیں آتا ہے" آپ نے فرمایا —— "جو اس سے باز نہ آئے، اسے قتل کردو" اس حدیث میں باز نہ آنے کی صورت میں آپ نے اسے تعزیراً قتل کرنے کا حکم دیا ہے، یہ حد شرعی نہیں ہے اسی مفہوم میں آپ کا یہ قولِ مبارک ہے:-

"جو شراب پیئے تو اسے کوڑے مارو، اگر دوبارہ پیئے تو اس وقت بھی اسے کوڑے مارو، اور اگر تیسری یا چوتھی مرتبہ پھر اس جرم کا ارتکاب کرے تو اسے قتل کردو" اس حدیث میں آپ نے کثرت شراب نوشی پر قتل کا حکم دیا ہے اور اگر حد شرعی کوئی ہوتی تو آپ پہلی مرتبہ اس کا حکم دیتے،

حضرت امام ابوحنیفہ نے بھی عام مصلحت کے لئے تعزیراً قتل کرنے کا حکم دیا مثلاً اس شخص کو قتل کیا جائے جو بکثرت اغلام بازی کرتا ہو۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ دیگر ائمہ کرام کی بہ نسبت تعزیراً قتل کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے،

تعزیرات کی دوسری صورتیں بھی ہیں جو جرم کی نوعیت اور مجرم کی حالت کو مدنظر رکھ کر جاری کی جاتی ہیں۔ آپؐ نے بعض لوگوں کو قطع تعلق کی سزا دی تھی اور کچھ لوگوں کو جلاوطن کیا تھا۔ جیسا کہ آپؐ نے مدینہ منورہ سے مخنثوں کو جلاوطن کردیا تھا۔ اور آپؐ کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی کچھ لوگوں کو جلاوطن کیا تھا مثلاً حضرت عمرؓ نے نصر بن حجاج کو جلاوطن کردیا تھا۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ تعزیر، حد شرعی کی کمترین مقدار سے آگے نہ بڑھے، مثلاً چالیس یا اسی کوڑے سے زیادہ سزا نہ دی جائے، یہ امام شافعیؒ، امام احمد اور امام ابوحنیفہ کے اکثر ساتھیوں کا قول ہے،

(۳) تیسری رائے یہ ہے کہ کسی جرم و گناہ کی تعزیر حد شرعی سے آگے نہ بڑھے مثلاً بدنظری اور اختلاط نسواں کی سزا حد زنا سے زیادہ نہ ہو اور نہ غیر محفوظ چیز کی چوری حد قطع کے برابر ہو، اور نہ تہمت کے بغیر کسی کو گالی دینے کی سزا حد تہمت کے برابر ہو، یہ رائے امام شافعی اور احمد بن حنبل کے کچھ ساتھیوں کی ہے،

(۴) چوتھی رائے یہ ہے کہ تعزیر میں دس کوڑوں سے زیادہ سزا نہیں دینی چاہیے یہ امام احمد بن حنبل وغیرہ کا ایک قول بیان کیا جاتا ہے، [۱] اسی طرح امام مالک، امام احمد اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق تعزیر میں مالی سزا بھی شامل ہے۔ اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے مثلاً ایک حدیث میں یہ مذکور ہے کہ آپؐ نے اس چور سے جس کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا تھا دوگنا تاوان وصول کیا اور یہ بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے شراب کے مٹکے اور دوسرے برتن توڑ ڈالے تھے اور آپؐ نے زکوٰۃ نہ دینے والوں سے آدھا مال لینے کا حکم دیا تھا۔ [۲]

لہٰذا فقہائے کرام کے مذکورہ بالا خیالات سے جو تعزیرات اور دیگر احکام قوانین کے سلسلے میں ظاہر کئے گئے ہیں آپ کیا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ اگر کوئی شخص منصف مزاج ہو تو وہ یہی کہے گا کہ اسلامی شریعت مکمل اور وسیع ہے اس لئے اسے چھوڑ کر دوسرے قوانین کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،

---

[۱] الطرق الحکمیہ ص ۱۵ - ۱۷

[۲] الطرق الحکمیہ ص ۲۲۴ - ۲۲۵، و ص ۲۲۵ — ۲۲۶

اسی طرح ان جاہلوں کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت دورِ حاضر میں حاکموں کی معاون نہیں بن سکتی اور بالخصوص اس کے فوجداری قوانین ان کے موافق نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے قانون سازوں کے لئے یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ فقہائے اسلام کی مختلف آراء میں سے کسی رائے کو اختیار کریں، بلکہ انھیں یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ تعزیرات کے لئے نئے قوانین بنائیں بشرطیکہ ان میں شریعت کے اصول و مقاصد کا لحاظ رکھا گیا ہو، ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ شریعت کی بنیاد پر نیا فوجداری قانون یا کوئی اور جدید قانون وضع کیا جائے۔

شرعی حدود کی سختی

دوسرا شبہ یہ ہے کہ شرعی حدود کے قوانین بہت سخت اور بے رحمانہ ہیں بلکہ بعض انتہا پسندوں نے نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ وحشیانہ قوانین ہیں اور تہذیب و تمدن کی صحیح روح کے خلاف ہیں کیونکہ شریعت میں شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ کو ایک سو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، نیز شراب نوش اور تہمت لگانے والے کو اسّی کوڑے مارے جاتے ہیں،

اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ہم یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ تمام مذاہب اور الہامی شریعتوں نیز انسانی قوانین کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کی حفاظت کی جائے۔ نفس، عقل، مال، نسل اور دین انہی چیزوں میں افراط و تفریط کرنے سے جھگڑے، مظالم اور خون خرابے برپا ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں رہتی ہے بلکہ فتنہ و فساد رونما ہو جاتا ہے۔

زنا کاری کے نقصانات

مگر انسانی قوانین اور بالخصوص مغربی قوانین صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں اس لئے وہ ان چیزوں کی اس طرح حفاظت نہیں کر سکے ہیں کہ وہ فتنہ و فساد کی بیخ کنی کر سکیں کیونکہ ان قوانین نے خاص حالات کے سوا زنا کو حرام نہیں ٹھہرایا ہے اور اکثر حالات میں بصورت رضامندی اس کی اجازت دی گئی ہے اس کے لئے دلیل

یہ پیش کی گئی ہے کہ شخصی آزادی کی حفاظت کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ناجائز تعلقات کے ذریعے لاوارث بچوں کی کثرت ہوگئی ہے جو باپ کی تربیت اور اس کی شفقت سے محروم ہیں، اس کے علاوہ زناکاری کی بدولت ایسے پوشیدہ امراض پھیل گئے ہیں جو صحت اور تندرستی کو تباہ وبرباد کر رہے ہیں، اور شادی نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی خواتین نہایت بدبختی اور تنگدستی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں، گو بعض حالات میں زنا کی ممانعت کی گئی ہے مگر ان حالات میں بھی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ بہت ہلکی ہیں، لہٰذا ان قوانین کے ذریعے بدکاری کا انسداد نہیں ہوسکا۔ بلکہ روز بروز اس کا شر و فساد بڑھتا ہی جا رہا ہے،۔ان قوانین کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح شخصی آزادی اس صورت میں دی جا سکتی ہے جبکہ اس کی بدولت خود اس کی ذات کو یا دوسروں کو نقصان نہ پہونچے مگر تجربہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زناکاری خود زانیوں کے لئے، اخلاق اور حفظان صحت کے اصولوں کے رو سے سخت مضر ہے، بلکہ یہ ضرر جانبین سے منتقل ہو کر ان کے خاندان میں بھی سرایت کر جاتا ہے اس سے دونوں کی عزت وآبرو خراب ہوتی ہے اور اگر پاکیزہ فطرت انسانی مسخ نہ ہو جائے تو اس کا نقصان قتل وخونریزی سے کسی طرح کم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مختلف اقوام کے افراد بالخصوص مشرقی لوگوں میں ابھی تک یہ جذبۂ غیرت موجود ہے، کہ وہ اپنی عزت وآبرو کو بچانے کی خاطر ایسے بدکار لوگوں سے انتقام لیتے ہیں چنانچہ زناکاری کی وجہ سے قتل کی واردات میں بھی اضافہ ہوگیا ہے،

نشہ کے نقصانات

مغربی قوانین نے نشہ پیدا کرنے والی چیزوں کے استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اس میں بھی ان کی دلیل شخصی آزادی کی حفاظت ہے، مگر انھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ آزادی قوم کے لئے مہلک ہے کیونکہ اکثر ڈاکٹروں نے یہ ثابت کیا ہے کہ نشہ کی چیزیں جسم اور اس کے عصبی نظام کے لئے مضر ہیں بلکہ ان سے معدہ جگر اور قلب کی بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں[1]

[1] مشہور مصری ڈاکٹر محمد فخر الدین السبکی نے مجلہ نور الاسلام کے شمارہ ۷ کے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ نشہ بازی کی کثرت سے شرائین بہت سخت ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے (باقی صفحہ[illegible])

نشہ بازی سے بہت سا مال ضائع ہوتا ہے اور عقل و خرد الگ خراب ہوتی ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس کا نتیجہ بعض اوقات بہت خراب نکلتا ہے کیونکہ نشہ باز بالعموم اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ بیٹھتا ہے اپنے گھر کو ویران کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی آبرو کو بھی خراب کر کے قتل کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے چنانچہ ہم نے اخباروں میں یہ پڑھا ہے کہ ایک عادی شراب نوش مرد کو اس کی بیوی چھوڑ کر چلی گئی تو وہ ایک دفعہ مدہوشی کی حالت میں اپنی چھوٹی بیٹی کی عزت پر حملہ کر بیٹھا۔ اور پھر اس نے اپنے گیارہ سالہ لڑکے کی عزت بھی خراب کی [1]

یہ دونوں جرائم انسانی فطرت میں راسخ ہو چکے ہیں کیونکہ ان کا محرک شہوت پرستی ہے مگر یہ دونوں جرائم ایسی برائیوں کا منبع ہیں جو قوموں کی ہڈیوں کو بوسیدہ کر دیتی ہیں اور معاشرہ کو ایسی مکروہ سماجی امراض و آلام میں مبتلا کر دیتی ہیں جس سے اس کی بقاء زیست خطرہ میں پڑ جاتی ہے

ہلکی سزا کے نتائج ایسی حالت میں کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ قید یا جرمانے کی سزا سے اس قسم کی سماجی برائیاں دور ہو سکیں گی اور اور اس کے برے اثرات اور ناخوشگوار انجام کا انسداد ہو سکے گا۔ ہرگز نہیں ان میں سے کسی ایسی چیز سے ان جرائم کی بیخ کنی نہیں ہو سکتی لہٰذا ان کے انسداد کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ایسے مجرموں کو سخت قسم کی جسمانی سزا دی جائے کیونکہ اس قسم کی سخت سزائیں مجرموں کے لئے بہت مؤثر ہوتی ہیں اور دوسروں کو بھی جرائم سے باز رکھتی ہیں اور ان کی اصلاح کرتی ہیں۔

(بقیہ ۵۴۰) جسم کے مختلف اعضاء متاثر ہوتے ہیں، بالخصوص دل پر بہت برا اثر پڑتا ہے نیز الکحل کے اثرات کی وجہ سے شراب جگر کو بھی نقصان پہونچاتی ہے اور اس کی وجہ سے جگر اپنا فعل اچھی طرح نہیں انجام دے سکتا اس طرح گردوں میں بھی سوزش پیدا ہو جاتی ہے

[1] شراب نوشی کی مضرتوں کو دور کرنے کے لئے یورپ اور امریکہ میں انسداد مسکرات کی انجمنیں قائم ہیں، جو اپنی حکومتوں سے شراب نوشی پر بندش لگانے کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں اور اس مقصد کے لئے بین الاقوامی کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے پہلے شراب نوشی کی بندش کا قانون منظور کیا تھا۔ پھر اسے منسوخ کر دیا۔

چوری کی سزا

چوری ہی ایسا مکروہ جرم ہے جس کی تمام مذاہب و قوانین نے مذمت کی ہے اور اس کے مجرم کو سزا دی جاتی ہے مگر مغربی قوانین میں اس کی سزا قید اور جرمانے ہیں اور اسلامی شریعت میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس صورت میں بھی شریعت کا حکم قابل اتباع ہے۔ اور یہی حکم اس اس جرم کے انسداد کے لئے زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ چور پوشیدہ طور پر چوری کرتا ہے اور صاحب مال کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کو نقصان پہونچاتا ہے، لہٰذا وہ ظلم و تعدی میں بزدلی اور فریب دہی میں کمینگی کا ثبوت دیتا ہے وہ اس سے اس کی جان و آبرو کے بعد اس کی عزیز ترین متاع کو چھین لیتا ہے اور کبھی وہ چوری کے ساتھ ساتھ قتل کے جرم کا مرتکب بھی ہوتا ہے بلکہ وہ چوری کی تکمیل کے لئے' اس کے نتائج بد سے بچنے کے لئے اکثر اہل خانہ کو قتل کرنے پر مجبور ہوتا ہے، ایسی صورت میں وہ اندھا دھند قتل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پنگھوڑے میں لیٹے ہوئے بچے اور قریب مرگ بوڑھے کو بستر میں لیٹے ہوئے بھی مار ڈالتا ہے،

لہٰذا اگر چور کی سزا کو صرف قید اور جرمانے تک محدود رکھا جائے تو کیا اس سے جرم کا انسداد ہو سکے گا؟ حالانکہ یہ وہ جرم ہے جو سماج کے لئے ناسور ہے مگر ایسی ہلکی سزا ان مجرموں کے لئے کچھ بھی مؤثر نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے ذریعے جان و مال کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چوریاں کم نہیں ہو رہی ہیں، بلکہ ان کا سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے، کیونکہ ان کی سزائیں عبرت انگیز نہیں ہیں اور اسی وجہ سے دور حاضر کے چوروں نے اپنے آپ کو منظم کر رکھا ہے، اور اپنے مسلح گروہ بنا لئے ہیں، جیسا کہ حکومت کے مقابلے میں کوئی متوازی حکومت بن جائے، اسی لئے وہ کسی کی جان و مال کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں، جیسا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

حجاز میں عملی نمونہ

اگر ایسے مجرموں کے لئے جو فتنہ و فساد پھیلا رہے ہوں اور جنہوں نے سماج کے امن و سکون کو حرام کر رکھا ہو سخت جسمانی سزائیں مقرر ہوتیں تو برائی کا قلع قمع ہو جاتا اور جرائم کی تعداد میں بھی کمی

آجاتی اور معاشرہ اس قسم کے مجرموں کی دست درازیوں سے محفوظ ہوجاتا۔
جیساکہ اس شرعی سزا کے عمدہ اثرات ہم سعودی مملکت حجاز میں مشاہدہ کر رہے ہیں
اس سے پیشتر حجاز میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ وہاں کے کسی مسافر یا مقیم باشندہ
کی جان و مال محفوظ نہ تھی مگر ۱۳۵۵ھ میں مصر کا جو اعزازی وفد وہاں گیا تھا۔
اس کی رپورٹ سے یہ چلتا ہے کہ حدود شرعیہ کے نفاذ سے ملک میں امن و امان
قائم ہوگیا ہے۔ اور فتنہ وفساد کی بیخ کنی ہو گئی ہے، لہٰذا شرعی احکام کے
نافذ ہونے سے عمدہ نتائج اور اچھے ثمرات برآمد ہونے کی امید ہے،

مصری وفد نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا ہے :" ہم سرزمین حجاز کے
امن و امان کی حالت سے پوری طور پر مطمئن ہیں، وہاں ہر جگہ امن و امان کا
دور دورہ ہے بالخصوص وہ راستے جو مکہ معظمہ، عرفات اور مدینہ منورہ کی
طرف جاتے ہیں، نہایت پر امن ہیں حالانکہ ان کے چاروں طرف جنگ جو قبائل
بسے ہوئے ہیں۔ اس سے پیشتر یہ لوگ حاجیان حرم کو لوٹ لیا کرتے تھے اور
ان پر دست درازی کرتے تھے بلکہ ان حاجیوں پر غیر شرعی ٹیکس بھی لگے ہوئے
تھے۔ مگر اب بالکل امن و امان ہے اور اس کا سہرا سعودی حکومت کی بیدارمغزی
کے سر ہے، اور اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ حکومت مجرموں کو سخت سزائیں
دیتی ہے۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹ دیتی ہے اور رہزنوں کے ہاتھ پاؤں مخالف
سمت سے کاٹتی ہے۔ تاہم یہ امر باعث مسرت ہے کہ حکومت کو صرف ایک
مرتبہ سزا دینی پڑتی ہے اس کے بعد پھر اس جرم کا اعادہ نہیں ہوتا"۔

اس موقع پر ہم مصر کے سابق وزیر انصاف محمد صبری اعلم کی تقریر
کا اقتباس بھی نقل کرتے ہیں انھوں نے ۱۳۶۸ھ میں فریضۂ حج ادا کرنے
کے بعد مکۂ معظمہ کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا[1]

"حقیقت یہ ہے کہ امن و امان کی وہ نعمت جو سرزمین حجاز میں ہر جگہ
نظر آرہی ہے ہمیں دوچند معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس ملک کی حکومت اللہ کے مقرر کردہ
شرعی حدود اور ان اسلامی احکام کو نافذ کرنے کی پابند ہوگئی ہے۔ جو امن و امان

[1] یہ تقریر مکہ معظمہ کے اخبار "ام القریٰ" میں شائع ہوئی اور اخبار المصری نے اپنے شمارہ ۱۰ محرم
(باقی صفحہ ۵۴۴)

اور سلامتی کو بحال کرنے کے ضامن وکفیل ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ جس طرح اس ملک کی حکومت کو یہ موقع ملا ہے اس طرح دوسری اسلامی حکومتوں کو بھی یہ توفیق عطا ہوگی کہ وہ اسلامی شریعت کے ان احکام کو نافذ کریں۔ جس کے آگے اور پیچھے باطل، قدم نہیں رکھ سکتا۔"

اسلام نے صرف ایسے بڑے بڑے جرائم کے لئے سزائیں مقرر کی ہیں جن سے اجتماعی نظام کے رشتے ٹوٹتے ہوں، اور قوموں کی تباہی کا اندیشہ ہو ایسی سزائیں (شرعی حدود) صرف پانچ قسم کے مجرموں کے لئے مقرر ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہوں اور زمین پر فتنہ وفساد برپا کرتے ہو ایسے لوگ راہزن کہلاتے ہیں۔

(۲) وہ لوگ جو کسی کو ناحق قتل کریں۔

(۳) وہ لوگ جو شریف اور پاک دامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں۔

(۴) وہ مرد وعورت جو زنا کرے۔

(۵) وہ مرد وعورت جو چوری کرے۔

ان پانچ چیزوں پر مرتد کا اضافہ کیا جاتا ہے (جس کی سزا قتل ہے)

ان کے علاوہ جس قدر جرائم ہیں ان کی سزا شریعت نے مقرر نہیں کی ہے بلکہ حکام علماء اور مجتہدین کرام کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جرم کی نوعیت مجرم کی حالت اور ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے وقت اور زمانہ کے مطابق مناسب سزائیں تجویز کریں۔

شرعی حدود کے مصالح

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ ہے کہ اس نے مذکورہ بالا پانچ جرائم کے لئے سزائیں مقرر کر دی ہیں۔ کیونکہ اگر یہ معاملہ لوگوں کی عقلوں پر چھوڑ دیا جاتا تو اس میں زبردست اختلاف برپا ہوتا۔ اور حالات سنگین ہو جاتے لہٰذا احکم الحاکمین خدا نے اپنی رحمت کاملہ سے لوگوں کو اس مصیبت سے بچا لیا۔ اور ہر ایسے جرم کے لئے

(بقیہ صفحہ ۵۴۳) ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۹۴۰ء میں نقل کیا۔

مناسب سزائیں مقرر کردیں لے جو قتل، قطع اور کوڑے مارنے پر مشتمل ہیں۔

بقول ابن القیم قتل، سب سے بڑے جرم کی سزا ہے، جس سے عظیم ترین فتنہ وفساد برپا ہوتا ہو، جیسا کہ کسی کو ناحق مار ڈالا جائے یا کوئی دین کی مخالفت کرکے اس سے مرتد ہو جائے کیونکہ مرتد کا مسلمانوں کے معاشرہ میں موجود رہنا ہر وقت ان کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے، اور اگر وہ اپنے ارتداد پر قائم رہے گا تو اس کا وجود خطرناک ثابت ہوگا اسی طرح کسی کی عزت وآبرو پر ڈاکہ ڈالنے پر شادی شدہ زانی کے لئے بھی قتل کی سزا مقرر کی گئی، کیونکہ زانی کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔

(۱) اگر وہ شادی شدہ ہو تو وہ بدکاری کے مواقع سے محفوظ ہے اس لئے اب حرام کاری کے لئے اس کا کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے، لہٰذا اگر شادی کے بعد بھی وہ بدکاری کرے تو اس کی سزا سنگساری ہے تاکہ وہ مرجائے کیونکہ دوسروں کی بیویوں کی عزت خراب کرنے کے بڑے نقصانات ہیں، اس سے نہ صرف نسب اور خاندان میں گڑبڑ پیدا ہونے کا خطرہ ہے، بلکہ یہ عام فتنہ وفساد کا سبب بھی ہے،

(۲) دوسری حالت یہ ہے کہ زانی کنوارا ہو تو وہ شادی شدہ کی طرح عفت و عصمت کی خوبیوں سے ناواقف ہوتا ہے اس لئے اگر وہ یہ غلطی کر بیٹھے تو کسی حد تک معذور ہے لہٰذا اس کی جان بخشی کی گئی مگر اس کے لئے ۱۰۰ سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی تاکہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرے اور دوسروں کو بھی عبرت ہو،

شریعت نے چور کے لئے یہ سزا مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے یہ کوڑے مارنے کی سزا سے زیادہ سخت ہے، مگر قتل کی سزا سے ہلکی سزا ہے، یہ سزا اس لئے رکھی گئی ہے کہ چونکہ اس نے اپنے ہاتھ کے ذریعے عوام کو نقصان پہونچایا ہے اور ان کا مال چھینا ہے، اس لئے اس عضو کو اس سے جدا کر دیا گیا ہے،

چونکہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کے جرائم چور کے جرائم سے زیادہ سخت ہیں، اس لئے ہاتھ کے علاوہ ان کے مخالف سمت کے ہاتھوں کو بھی کاٹا جاتا ہے، تاکہ عوام ان ان کے شر وفساد سے محفوظ رہیں، اور وہ بھی بالکل ناکارہ نہ ہو جائیں،

کوڑے مارنے کی سزا تہمت لگا کر کسی کی آبرو خراب کرنے والے کے لئے ہے

لے القیاس فی الشرع الاسلامی از ابن تیمیہ وابن القیم ص ۱۵۰ مطبعہ سلفیہ ۱۳۴۶ھ

اور کنواری عورت کی زناکاری پر بھی ایسی سزا مقرر کی گئی ہے۔ بعض ائمہ کرام نے ایسے لوگوں کے لئے جلاوطنی کی سزا بھی تجویز کی ہے تاکہ اپنے دوستوں اور گھر والوں سے الگ رہ کر وہ پردیس کی تکالیف برداشت کریں اور اس سے عبرت حاصل کرکے دوبارہ ایسے جرم کا ارتکاب نہ کریں کوڑوں کی سزا ان لوگوں کے لئے بھی مقرر ہے جو نشہ استعمال کرکے اپنی عقل وخرد کو کھو بیٹھیں تاہم شریعت نے اس جرم کی سزا سابقہ جرائم سے کم رکھی ہے بلکہ ابتداء میں اس کی سزا یہ تھی کہ مے نوش کو ہاتھوں جوتیوں اور کھجور کی شاخوں سے مارا جاتا تھا اور چالیس کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی مگر جب لوگوں نے اس سزا کو بہت ہلکا سمجھا اور مسلسل مے نوشی کرتے رہے تو حضرت عمر فاروق رضی نے ان پر سختی کی اور ان کی سزا اسی کوڑے مقرر کی جس کی پابندی (اجماع صحابہؓ کی وجہ سے) ہمارے لئے بھی ہے، حضرت عمرؓ نے اس جرم میں لوگوں کو جلاوطن بھی کیا اور ان کا سر منڈایا یہ ان کا اجتہاد تھا جو اب بھی بوقت ضرورت استعمال کیا جا سکتا ہے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا، کہ اگر چوتھی مرتبہ کوئی شراب نوشی کرے تو اسے قتل کر دیا جائے تاہم یہ سزا حاکم وقت کی مصلحت بینی اور اجتہاد پر موقوف ہے تاکہ وہ حالات کے مطابق سزا دے [۱]

جسمانی سزا کا اعادہ

مغربی ممالک اور ان کے مقلد ممالک کے قانون دانوں نے جسمانی سزا کو منسوخ کر رکھا ہے، تاہم موجودہ دور میں، اہل قانون کا پھر اس طرف رجحان ہو گیا ہے کہ جسمانی سزا کو بحال کر دیا جائے بلکہ بعض موقعوں پر بھی ان کے ہاں جسمانی سزا رائج ہے مثلاً اگر کوئی قیدی جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اسے کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ اگر سپاہی فوجی قانون کی خلاف ورزی کرے، تو اسے بھی جسمانی سزا دی جاتی ہے۔

وہ مغربی ماہرین قوانین، جو جسمانی سزا کے حامی ہیں ان میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں، لامبروزو، لاکسانی، پول کیش، یہ لوگ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ جسمانی سزا میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جس سے سزا کا

---

[۱] القیاس فی الشرع الاسلامی ۱۵۱ - ۱۵۲، ۱۶۷

مقصد حاصل ہو سکے، ایسی سزا مجرم کے لئے بہت مؤثر ہوتی ہے اور اسے جرم سے باز رکھتی ہے بلکہ جو مجرم نہیں ہیں وہ بھی عبرت حاصل کرتا ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ سزا جرم کی نوعیت کے مناسب ہو[1]

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگرچہ اسلامی شریعت میں جسمانی سزا مقرر ہے اور بعض بڑے جرائم کی سزا بھی بہت سخت ہے جیسا کہ زناکاری کی سزا ہے، تاہم ایسی سزا کو نافذ کرنے میں بڑی احتیاط مدنظر رکھی گئی ہے، اس وجہ سے اس کے ثبوت و تحقیقات کے شرائط بہت سخت ہیں مثلاً زناکاری کو ثابت کرنے کے لئے چار گواہوں کی شہادت لی جاتی ہے، کیونکہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ بندوں کی پردہ پوشی کی جائے اور حتی الامکان ان کے ساتھ نرمی کی جائے، اسی طرح اگر مجرم خود زناکاری کا اقرار کرے تو چار مرتبہ سے کم پر اس کا اقرار نہیں تسلیم کیا جاتا ہے تاکہ اس کے جرم پر پردہ پڑا رہے اور اس کے جرم کو ظاہر نہ کیا جائے، بلکہ قرآن کریم میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ جو کوئی فحش اور بدکاری کی خبروں کی اشاعت کرنے کو پسند کرے تو اس کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے[2]

شریعت نے ایک اور آسانی یہ فراہم کی ہے کہ محض شک وشبہ پر شرعی حدود ساقط ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ یہ اسلامی فقہ کا ایک قاعدہ بن گیا ہے جو حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے ثابت ہے جسے ترمذی اور حاکم نے ذکر کیا ہے:-

"جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے، تم مسلمانوں سے شرعی حدود کو دور رکھو اور اگر کسی مسلمان کے لئے نکلنے کی راہ پاؤ تو اس کے لئے راہ کھول دو کیونکہ حاکم اگر کسی کو معاف کرنے میں غلطی کرے، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے"[3]

ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت بیان کی ہے "جہاں تک تم سے ممکن ہو، شرعی حدود کو نافذ نہ کرو"

---

[1] مجلۃ الازھر جلد ۱۸ ص ۵۶۱ - ۵۶۳

[2] القیاس ص ۱۰۹

[3] جلد اوّل الاشباہ والنظائر ص ۱۹۱

اس قدر تفصیلات کے بعد غالباً ایک منصف انسان اس بات کا قائل ہوگا کہ شریعت میں جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ افراد و جماعت اور قوموں کی فلاح و بہبود پر مبنی ہیں اور ان میں جو حکمت و مصلحت مضمر ہے، وہ ہم نے تفصیل کے ساتھ بیان کردی ہے بلکہ ہم نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ صرف الٰہی شرعی حدود کے ذریعے اصل جرائم کا انسداد ہوسکتا ہے۔ موجودہ قوانین کے ذریعے ان کا انسداد ممکن نہیں ہے، بہرحال ان قوانین سے شریعت کا کمال، اس کی وسعت اور منصفانہ احکام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ شریعت ایسے اصول و قواعد پر مبنی ہے جن سے اجتہادی احکام پرورش پا کر ہر قوم کے لئے ہر زمانے میں ایسے مناسب قوانین ماخذ بن سکتے ہیں جن سے قوموں کی ضرورتیں پوری ہوسکیں،

فصل سوم

موجودہ قوانین کے ماخذ اور اصول

موجودہ دور کے ممالک میں دو قسم کے قانونی نظاموں سے کوئی ایک نظام قانون رائج ہے یہ دو قانونی نظام یہ ہیں:-

(۱) رومی قوانین سے ماخوذ قوانین (۲) قدیم انگریزی قوانین۔

پہلی قسم کا قانونی نظام اپنے اصول و مبادیات کے لحاظ سے یورپ، جنوبی امریکہ اور وسطی امریکہ، اور دوسرے ممالک میں رائج ہے، مصر میں بھی اس کے دیوانی اور فوجداری قوانین نافذ ہیں، دوسری قسم کا قانونی نظام انگلستان کے قدیم عدالتی احکام سے ماخوذ ہے یہ نظام برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا (ایک ریاست کو چھوڑ کر) اور نیوزی لینڈ میں رائج ہے

پروفیسر لامبیر کا یہ خیال ہے کہ موجودہ دور کے اہل علم کا یہ فرض ہے کہ ان دونوں قانونی نظاموں کو قریب تر لانے کی کوشش کریں تاکہ ایسے قواعد کا استنباط ہو سکے جو دونوں میں مشترک ہوں اور اسی طرح یہ مشترکہ قواعد ان بین الاقوامی قانون کی بنیاد بن سکیں جس کی دعوت عہد حاضر کے مشہور قانون داں دے رہے ہیں،

تیسرا نظام قانون

ہماری رائے میں ان دونوں قانونی نظاموں سے پہلے ایک تیسرے نظامِ قانون کا تذکرہ بھی آنا چاہیے، وہ اسلامی شریعت کا قانونی نظام ہے جس کے بارے میں اکثر منصف حضرات نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس میں قانون کے اعلیٰ اور ترقی یافتہ اصول و قواعد موجود ہیں چنانچہ پروفیسر لامبیر

لہ یہ فصل فرانسیسی پروفیسر لامبیر کے اس لیکچر سے ماخوذ ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۳۶ء میں مصر کے لا کالج میں دیا تھا، وہ فرانس کے شہر لیون میں تقابلی قانون کے پروفیسر ہیں،

کے ایک شاگرد بیان کرتے ہیں کہ پروفیسر لامبیر پہلے مغربی عالم ہیں جنھوں نے اسلامی شریعت کی قدر وقیمت کو پہچانا بلکہ انھوں نے اس کا گہرا مطالعہ کرنے اور اکابر علماء سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد مغربی علماء کو اس بات کا قائل کرایا کہ اسلام ایک مستقل اور خود مختار نظام قانون ہے اور یہ خیال غلط ہے کہ رومی قوانین کے اس پر گہرے اثرات ہیں، انھوں نے اسلامی شریعت کو موجودہ دور کے اصولوں کے مطابق صحیح معیار سے پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے [1]

پروفیسر موصوف جب ۱۹۳۷ء میں مصر آئے تھے تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ جامعہ مصریہ میں تقابلی قانون کا ایک اعلیٰ ادارہ قائم کیا جائے جس کا اہم مقصد یہ ہو کہ عام تقابلی قانون کے ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے اسلامی شریعت پر تحقیقات کی جائے، چنانچہ مصر کے لا کالج نے ایسے ادارہ کے قیام کی تجاویز کا ایک خلاصہ تیار کیا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا، کہ یہ ادارہ تین مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم کیا جائے گا۔

(۱) بین الاقوامی مشترکہ قوانین کے اصول ومبادیات کو ترقی دینا۔

(۲) اسلامی قانون اور دنیا کے دیگر قوانین کو قریب تر لانا اور اسلامی شریعت کا عام تقابلی قانون کے ماخذ کی حیثیت سے مطالعہ کرنا اور صحیح مطالعہ کے بعد عالمی تہذیب وترقی میں اسلامی شریعت کے اثرات کو متعین کرنا۔

(۳) مذکورہ بالا دونوں مقاصد کی تکمیل کے لیے نوجوانوں کو تیار کرنا تاکہ وہ اس قسم کی تالیفات شائع کرسکیں

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ نہایت عمدہ اغراض ومقاصد ہیں اور یہ وہی اغراض ومقاصد ہیں جن کی طرف ہم ہر اسلامی اور مشرقی ادارہ کو دعوت دے رہے ہیں مگر یہ تجویز ابھی تک جامۂ عمل نہیں پہن سکی، ممکن ہے آگے چل کر ہمارے ارباب اقتدار اس کو عملی جامہ پہنا سکیں، کیونکہ اس صورت میں اسلامی شریعت کے محاسن اپنے اصلی روپ میں نظر آئیں گے۔ اور اس کے ترقی پسندانہ احکام وقوانین کے اثرات واضح ہوسکیں گے

[1] الاھرام ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

فصل چہارم

اسلامی تشریع اور تقابلی قانون

موجودہ علمِ قانون اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اس کی مختلف انواع و فروع قائم ہو گئی ہیں، اور ان کی بدولت اس کی علمی تحقیقات میں نیا زاویۂ نگاہ پیدا ہو گیا ہے اس لئے اب کی علمی تحقیقات کے دو اہم طریقے مشہور ہیں پہلا طریقہ تاریخی حیثیت سے مطالعہ کا ہے اور دوسرا طریقہ تقابلی بحث کا ہے،

تاریخی مطالعہ مصری پروفیسر علی بدوی، نے مجلہ قانون و اقتصاد (مصر) میں ایک مقالہ شائع کرایا ہے [۱] جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"گذشتہ زمانے میں قانون کی تشریح کا ہر قوم میں یہ طریقہ تھا کہ اس قانونی نظام کا مطالعہ کیا جاتا تھا جس میں احکام بیان کئے جاتے تھے اس کے بعد انھیں مختلف انفرادی حالات پر منطبق کیا جاتا تھا، بعد میں علمائے قانون کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ ایک طرف سے ان قانونی نظاموں کے تاریخی ادوار کا مطالعہ کیا جاتے اور ان کی نشوونما اور ارتقار کے حالات کو معلوم کیا جائے۔ تو دوسری طرف سے دوسری قوموں کے چلتے نظام ہائے قوانین کا مطالعہ بھی کیا جائے، اس طرح ان کی علمی جدوجہد کا دائرہ وسیع ہوتا گیا لہٰذا اب ان قوانین کی مستقل حیثیت نہیں رہی بلکہ وہ ایسے وسیع قانونی سلسلے کی کڑی بن گئے ہیں، جس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اور جس کے ماضی کا حال سے بہت گہرا تعلق ہے، بلکہ اب ہر ملکی قانون عالمگیر انسانیت کے قوانین کا ایک حصہ بن گیا ہے،

[۱] مجلۂ قانون و اقتصاد سال اوّل صفحات ۷۳۱ - ۷۳۳

تقابلی بحث و مطالعہ

جس طرح قانون کا تاریخی مطالعہ ہمیں یہ واضح کرتا ہے کہ مختلف زمانوں میں قوانین کی نشو و نما مشابہ اور یکساں تھی اس طرح قانون کا تقابلی مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ قوموں کے مختلف ادوار میں قانونی نظام کس حد تک مشابہ اور ملتے جلتے تھے لہٰذا اگر دورِ جدید کے اصولوں کے مطابق ایسا تقابلی مطالعہ شروع کیا جائے تو موجودہ قوموں میں کچھ مشابہ قوانین ملیں گے اور کچھ مخالف قوانین ہوں گے، اس مطالعہ سے یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ کس قوم کے قوانین میں خرابی اور کمی پائی جاتی ہے اور وہ قوانین کس حد تک موجودہ تمدن و تہذیب کے ارتقائی منازل میں ساتھ دے سکتے ہیں اور عالمگیر قوانین کے دائرہ میں وہ کیا معاونت کر سکتے ہیں؟

بہرحال ہم اس تاریخی اور تقابلی مطالعہ کے ذریعے اقوام عالم کے موجودہ قوانین کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں، اور جن قوموں کے ناقص قانونی نظام میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے اس طرح دورِ جدید کے قانون کا اپنا اصلی مقصد پورا ہو سکتا ہے، جو یہ ہے کہ موجودہ دور کے قوانین کو یکساں کر دیا جائے یا کم از کم انھیں ایک دوسرے کے بہت قریب لایا جائے، اور یہی وہ معراجِ کمال ہے جہاں قانون کو ترقی کر کے پہونچنا چاہئیے، موجودہ علم قانون کے بارے میں یہ ایک مشہور اور ممتاز مصری قانون داں کی رائے ہے، بہرحال مغرب کے علمائے قانون نے تقابلی قانون کی طرف بہت توجہ مبذول کر رکھی ہے، اس مقصد کے لئے وہ بین الاقوامی کانفرنسیں بھی منعقد کرتے ہیں اور اس کے مخصوص ادارے بھی قائم ہیں، جس میں فرانس کے شہر لیون میں تقابلی قانون کا ادارہ سب سے زیادہ مشہور ہے،

فرانسیسی پروفیسر لامبیر نے مصر میں ماہ مارچ و اپریل ۱۹۳۷ء میں تقابلی قانون پر کئی لیکچر دیئے تھے ان میں انھوں نے بتایا تھا کہ اس علم کے دو شعبے ہیں:-

(۱) تقابلی قانون کی تاریخ (۲) جدید قانون کا تقابلی مطالعہ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مستقبل کے لئے قانون کے فن کو اس طریقے ترقی دی جائے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں،

مسلمانوں کا تقابلی قانون

یہ وہ باتیں ہیں جو موجودہ دور کے علمائے قانون پروفیسر لامبیر وغیرہ بیان کرتے ہیں لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا

جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلامی فقہاء ان سے پیشتر اس قسم کی تحقیقات کر چکے ہیں، ان کی کتب فقہ میں مختلف علماء کی بحثیں اور مناظرے ہیں جس میں انھوں نے مختلف مکاتیب فقہ کا موازنہ کیا ہے اور ایک مسلک کو دوسرے مسلک پر ترجیح دی ہے، لہٰذا اس قسم کے بعض مسائل و مباحث کو تقابلی قانون کے موضوع میں شامل کیا جا سکتا ہے، گو ہمارے فقہاء اس جدید نام اور اس کی قانونی اصطلاحوں سے ناواقف تھے،

تاہم ان کے مباحث اس جدید علم کے بعض مقاصد کو پورا کرتے ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہماری فقہ اسلامی کی تاریخ، ایک حد تک تقابلی قانون کے پہلے شعبہ یعنی اس کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور مجتہدین کرام کے اختلافی دلائل اور جوابات اور پھر ان پر ترجیحی محاکمے، تقابلی قانون کے دوسرے شعبہ میں شامل ہو سکتے ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے پیشتر کہ یورپ اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہو، مسلم علماء کی قانونی فراست اور بصیرت مکمل ہو چکی تھی، اور وہ قانونی نکات پر خوب بحثیں کیا کرتے تھے، اور یہ سب کچھ اسلامی شریعت کے زبردست قانونی نکات کی بدولت عمل میں آیا۔

گزشتہ سالوں سے بعض اعلیٰ علمی ادارے اور بالخصوص جامعۂ ازہر کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں فقہ اسلامی کی تاریخ اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ شامل کر دیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ ہر حیثیت سے ان دو مضامین پر انتہائی توجہ مبذول کی جائے گی، تاکہ فکر پختہ ہو اور طلباء کی فقہی صلاحیتیں اجاگر ہو جائیں، اور ایسے علماء پیدا ہوں جو اپنے آپ کو علمی تحقیقات اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر سکیں، ہمیں اس بات کی بھی توقع ہے کہ جامعۂ ازہر اور مصر کے لاء کالج کا تعلیمی معیار بتدریج اس طرح بلند ہوگا کہ ان اداروں کے طلباء اسلامی فقہ کے احکام کا دیگر مذاہب و قوانین کے احکام کے ساتھ دقیق اور تفصیلی تقابل اور موازنہ کر سکیں،

فصل پنجم

اسلامی شریعت اور جامعہ ازہر کے فرائض

مصر اور تمام عالم اسلامی، جامعہ ازہر کے علماء اور طلباء سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اسلامی علوم کے، اور جلیل القدر عالم بنیں تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائیں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے فرائض بجالا سکیں، انہی کی کوششوں سے مسلمان اسلام کے ان احکام پر عمل کرنے کے قابل بن سکیں گے جن کے ذریعے انھیں دنیا اور آخرت کی سعادت و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے،

لہٰذا جامعہ ازہر کا سب سے پہلا اور ضروری کام یہ ہے کہ وہ اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا جدید معیار پر مفصل نصاب تیار کرے جس میں فقہ اسلامی بھی شامل ہو اور دوسرے علوم صرف اس اہم مقصد کے لئے ممد و معاون ہوں،

میرے خیال میں جامعہ ازہر کے اساتذہ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ جب وہ اسلامی علوم کی تعلیم دیں، اور مجتہدین کرام کے اجتہادات کی وضاحت کریں تو یہ سمجھ کر ان کی وضاحت کریں کہ وہ آزادانہ خیالات ہیں جن پر آزادی کے ساتھ بحث کی جاسکتی ہے تاکہ اگر ان میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو وہ دور ہو سکے، اس طرح ان کے وہ احکام ہمارے نئے حالات اور دور جدید کے تقاضوں کو پورا کر سکیں کیونکہ اس دور میں ایسے معاملات رونما ہو گئے ہیں جو اس سے پہلے نہیں تھے، تاہم اسلامی فقہ میں جو عمدہ اور منصفانہ اصول بیان کئے گئے ہیں وہ آج کل بھی اسی طرح قابل عمل بن سکتے ہیں جس طرح پہلے زمانے میں مستحسن سمجھے جاتے تھے، مگر اب ماحول کے اختلاف اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے پسندیدہ نہیں رہے ہیں، بلکہ چند ایسے احکام بھی ہیں کہ اگر مذہبی اور سیاسی تعصب نہ ہوتا تو گذشتہ عہد میں بھی انھیں موجودہ دور کی طرح مستحسن نہ خیال کیا جاتا بہرحال ان

اجتہادی احکام میں ہمیں اس قسم کی آزادی اب بھی حاصل ہے جن کے لئے کوئی واضح نص شرعی نہ ہو،
اس قسم کے مسائل داحکام میں اجتہاد کرنے اور ترجیح دینے کا حق ان اکابر علمائے ازہر کو حاصل ہے جو شریعت کے اصول وقواعد سے خوب واقف ہوں اور عرصۂ دراز تک شرعی احکام اور اس کے فروعی مسائل کا مطالعہ کرتے رہے ہوں، اس فرض کو ان کے علاوہ اور کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے بلکہ میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ علمائے ازہر میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن میں اجتہادی صلاحتیں پائی جاتی ہیں مگر ان میں دلیرانہ اقدام کی کمی ہے، اور ان میں اخلاقی جرأت نہیں ہے اگر یہ باتیں ان میں موجود ہوتیں تو ان کے ہاتھوں اسلام کا سنہری دور پھر لوٹ سکتا تھا اور اسلامی قوانین میں از سر نو زندگی کی ایسی روح دوڑ سکتی تھی کہ اس کی روشنی کے سامنے مغربی قوانین کی آب وتاب ماند پڑجاتی اور موجودہ دور میں تمام بناوٹی قوانین پر اسے برتری حاصل ہوجاتی،

علمار کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو عمدہ ترتیب اور جدید انداز سے پیش کریں تاکہ وہ شخص جو اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہے اسے اچھی طرح سمجھ سکے۔ اگر ہم انھیں زوردار اور خوب صورت انداز میں پیش کریں، اور انھیں اچھی طرح مختلف ابواب میں مرتب کرکے شائع کریں تو ہم اسلامی حکومتوں اور بالخصوص مصری حکومت سے یہ مطالبہ منوا سکتے ہیں کہ وہ فقہ اسلامی کو اپنی قانون سازی کا ذریعہ بنائیں اور اسے اپنے احکام وقوانین کی بنیاد قرار دیں،

ابنِ تیمیہ و ابنِ قیّم

اس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان فرزندانِ ازہر کو، جو اپنی تعلیم سے فارغ ہوچکے ہوں اور ان طلبار کو جو درجہ تخصص میں تعلیم پا رہے ہوں نیز قانون کے ان فارغ التحصیل طلبار کو جو اسلامی شریعت سے واقف ہونا چاہتے ہوں، یہ مشورہ دوں گا کہ وہ امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتب وتصانیف کا بغور مطالعہ کریں بالخصوص مندرجہ ذیل کتب ان کے گہرے مطالعہ کی مستحق ہیں،

(۱) اعلام الموقعین (۲) الطرق الحکمیۃ (۳) زاد المعاد
(۴) السیاسۃ الشرعیہ (۵) فتاویٰ ابن تیمیہ (۶) القیاس فی الشرع الاسلامی

ان کتابوں پر مندرجہ ذیل کتب کا اضافہ کیا جائے :۔ بدایۃ المجتہد از ابن رشد
کتاب الفروق از قرافی مالکی ، الاشباہ والنظائر از ابن نجیم الحنفی ، صحاح ستہ کی
شرح ، نیل الاوطار ، سبل السلام ۔ تفسیر آیات الاحکام ۔

اگر ان تصانیف کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو توقع ہے کہ کچھ لوگ درجۂ اجتہاد
تک پہونچ جائیں ،

ہم نے امام ابن تیمیہ ، ابن القیمؒ اور کتب آیات الاحکام و احادیث کے مطالعہ
کرنے کی اس لئے سفارش کی ہے کہ ان میں تین خوبیاں پائی جاتی ہیں ،

(۱) ان میں سنت نبویؐ ، صحابہؓ ، تابعین ، اور مجتہدین کرام کا مسلک مع دلائل
بیان کیا گیا ہے ، اور ان پر موزوں تنقید کی گئی ہے ،

(۲) ان کتابوں کے مباحث اس مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب سے خالی ہیں جو
دیگر کتب فقہ میں پایا جاتا ہے ، جبکہ وہ اپنے مخالفین کے خیالات کو بیان کرتے ہیں ،

(۳) ان کتابوں کے طریقۂ بحث نے سلف صالحین یعنی صحابہؓ اور تابعین کے اس طریقہ
کو زندہ کر دیا ہے جس میں حق و صداقت کے لئے خلوص کا جذبہ بدرجہ اتم ہوتا تھا ، ان میں
صحابہؓ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ وہ شریعت کے مقاصد اور اس کے احکام کو
سب لوگوں سے زیادہ سمجھتے تھے اب میں پورے زور کے ساتھ انھیں ان تین امور
کی طرف متوجہ کرتا ہوں ،

(۱) وہ فقہ اسلامی کی ایسی کتب کا مطالعہ کریں جو مذہبی تعصب سے خالی ہوں
(۲) اجتہادی احکام میں مجتہدین اور علمائے کرام کے خیالات کو تنقید و تنسیخ
کے قابل سمجھا جائے ، اور اگر ان کی غلطی ثابت ہو جائے یا وہ حالات کے غیر مناسب
ہوں تو ان کی تردید کی جائے ،

(۳) فقہ اسلامی کے اہم مسائل و احکام کو جدید انداز میں پیش کیا جائے یعنی
ان کے مضامین کو ترتیب کے ساتھ جداگانہ ابواب میں اس طرح پیش کیا جائے
کہ موجودہ نسل ان کتابوں کا دل چسپی کے ساتھ مطالعہ کر سکے ، اور اسلامی شریعت
کے محاسن اور اس کے منصفانہ اصول و احکام سے واقف ہو سکے ۔

اسلامیات کے تین شعبے

ہم جامعہ ازہر کے ارباب اقتدار کی توجہ اس طرف

مبذول کراتے ہیں کہ وہ اسلامی شریعت کی تعلیم کا ایک خصوصی درجہ قائم جس کے تین شعبے ہوں۔

پہلے شعبہ میں عبادات، شرعی حدود، تعزیرات اور جرم و سزا کے قوانین کا خصوصی مطالعہ کرایا جائے درجۂ خصوصی کے دوسرے شعبے میں معاملات، وقف، دعویٰ اور احکامِ عدالت میں خصوصی تحقیقات کرائی جائے۔

تیسرے شعبے میں شخصی قوانین، میراث اور فقہ کے دیگر ابواب و مباحث میں خصوصی مہارت پیدا کرائی جائے۔

ہر ایک شعبے میں مکمل تحقیقاتی کام ہونا چاہیئے، اور طلبار کو اصولِ فقہ آیات و احادیثِ احکام، تاریخِ فقہ کے ساتھ ساتھ تمام علمار اور مجتہدین کرام کے مسلک سے مکمل واقفیت حاصل ہو، نیز وہ موجودہ قانون کے مبادیات اور اسلوب بحث سے بخوبی واقف ہوں، تاکہ ان میں شرعی اور قانونی دونوں قسم کی قابلیت پیدا ہو، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ خصوصی درجہ میں آنے سے پہلے طلبار کو فقہ کے تمام ابواب و مباحث سے عام واقفیت حاصل ہو ہیں نے اسلامی فقہ کے تین مختلف شعبے اس لئے تجویز کئے ہیں کہ فقہ اسلامی کے عام شعبوں پر عبور حاصل کرنا ایک شخص کے لئے تقریباً ناممکن ہے لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ایک خاص شعبہ میں مہارت پیدا کی جائے کیوں کہ محقق علمار نے جزئی اور مخصوص اجتہاد کی اجازت دے رکھی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، بلکہ سلف صالحین کا نمونہ ہمارے لئے قابل عمل ہو سکتا ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ میں سے بعض مخصوص فن کے ماہر ہوتے تھے، مثلاً حضرت زید بن ثابت انصاریؓ تمام صحابہؓ میں میراث کے سب سے بڑے عالم تھے، اور حضرت معاذ بن جبلؓ حلال و حرام کے مسائل کے ماہر خصوصی تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے[1]

---

[1] نیل الاوطار

"میری امت میں (حضرت) ابو بکرؓ سب سے زیادہ رحمدل ہیں اور (حضرت) عمرؓ اللہ کے دین میں بہت سخت ہیں، اور (حضرت) عثمانؓ سب سے زیادہ باحیا ہیں اور (حضرت) معاذ بن جبلؓ حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم ہیں، اور خدائے عزوجل کی کتاب کے سب سے بڑے قاری (حضرت) اُبی بن کعبؓ ہیں اور فرائض کے سب سے بڑے عالم (حضرت) زید بن ثابتؓ ہیں۔ ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اس امت (اسلامیہ) کا امین (حضرت) ابو عبیدہ بن الجراح ہیں۔"

مصر کے قانون کالج کے ارباب اقتدار سے بھی یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنے فارغ التحصیل طلبار کے لئے اسلامی شریعت کی خصوصی تعلیم کا ایک مخصوص شعبہ قائم کریں جس میں اصول فقہ، تاریخ فقہ، آیات و احادیث احکام کی تعلیم کے علاوہ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کی تعلیم کا بندوبست بھی ہو، تاکہ وہ اسلامی شریعت کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہو کر اس کا موازنہ انسانی قوانین سے کر سکیں اس طرح جدید علم قانون کے مقابلے میں انھیں فقہ اسلامی کے اعلیٰ مقام کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

فصل ششم

جدید قوانین کی ناکامی

موجودہ دور میں جدید قانون کو وضع کرنے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا قانون عدل والنصاف کا ضامن ہے اور اس کے ذریعے افراد اور اقوام کو فلاح وکامرانی حاصل ہو سکتی ہے وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے قوانین تہذیب وترقی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور ان کے اصول واغراض میں مندرجہ ذیل مقاصد شامل ہیں۔

(۱) افراد اور جماعتوں میں عدل ومساوات کو برقرار رکھا جائے۔

(۲) عام مفاد کو پیش نظر رکھا جائے اور خرابیوں کو دور کیا جائے۔

(۳) قوم کے مطالبات اور اس کی ضروریات کی تکمیل کی جائے اور اس کے رجحانات اور زمانے کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جائے۔

(۴) قانون آسان اور سہل ہو اور آسانی کے ساتھ نافذ ہو سکے،

اگر انصاف وتدبیر کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اسلامی اصول وقواعد کی چھان بین کی جائے نیز اسلامی مجتہدین کے ان احکام کو ملاحظہ کیا جائے جو انھوں نے اپنے زمانے کے لئے وضع کئے تھے، تو کسی کے دل میں یہ شک وشبہ باقی نہیں رہے گا کہ مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل اسلامی شریعت نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کرتی رہی ہے بلکہ وہ ان مقاصد کے اعلیٰ مقام پر پہونچی ہوئی ہے،

اگر کسی کو بعض فروعی مسائل میں کوئی خامی نظر آتی ہے تو وہ اسلام کی بنیادی خامی نہیں ہے، بلکہ وہ درحقیقت ان مسلم علمار کا قصور ہے جو اجتہاد کے فرائض انجام نہیں دے سکے اور اس وجہ سے ان کے بعض فروعی مسائل زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں

کرتے، اور ان میں نئے حالات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، البتہ شرعی حدود کی سختی کے بارے میں جو اعتراض کیا جاتا ہے اسے ہم نے اسی باب کی فصل دوم میں دلائل کے ساتھ رد کر دیا ہے،

جدید قوانین کی خامیاں

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ جدید قوانین کے اکثر اصول و مبادیات نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں اور انھیں نہایت محنت سے وضع کیا گیا ہے اور اس کے بعض احکام میں انصاف کی تکمیل کا جذبہ کارفرما ہے تاہم یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ جدید قوانین ان برائیوں اور جرائم کا خاتمہ نہیں کر سکے ہیں، جو اقوام عالم کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں، اور جن کی بدولت بہت سے سماجی اور اخلاقی امراض پیدا ہو گئے ہیں، مثلاً موجودہ قانون نے اکثر حالات میں سود کو جائز کر رکھا ہے حالانکہ اس کے ذریعے طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے، بلکہ سود خوری دلوں سے رحم و شفقت کا جذبہ نکال دیتی ہے اور قوم کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے برسرپیکار رکھتی ہے،

انہی قوانین کے ذریعے عوام کا مال ناجائز طریقے سے کھایا جاتا ہے، بلکہ کمزوروں اور مفلسوں کے برخلاف سرمایہ داروں کا پلّہ بھاری کر دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف طبقات میں بہت فرق پیدا ہو گیا ہے اور ان میں بغض و عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے،

موجودہ دور میں یہ حال ہو گیا ہے کہ اب عصمت اور آبرو بھی محفوظ نہیں رہی ہے بلکہ شرافت کو حقیر سمجھا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لاوارث اور ناجائز بچوں کی کثرت ہو گئی ہے، اور دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو سماج کو ان بدکاریوں اور جوئے بازی کی لعنت سے نجات دے سکے،

مذکورہ بالا برائیوں کے جواز میں یہ لوگ شخصی آزادی کے احترام کی دلیل پیش کرتے ہیں، مگر وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ اسلام نے آزادی کی اس شرط پر حمایت کی ہے کہ اس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ اور اس سے افراد و معاشرہ کو کوئی نقصان نہ پہونچے یہی وہ صحیح آزادی ہے جو قابل احترام ہو سکتی ہے،

بہرحال یہ وہ جرائم ہیں جن کی خرابیاں ان کے مجرموں تک محدود نہیں ہے

بلکہ ان کے بدلے اثرات کی زد میں ان کا خاندان، معاشرہ، اور پوری قوم آجاتی ہے،
اسی وجہ سے اسلام نے ان برائیوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور جو قوم اس کے احکام پر عمل کرتی ہے اس کی سماجی زندگی بہتر اور ترقی یافتہ ہو جاتی ہے اور ان کے اندر سے تمام برائیوں اور خرابیوں کے ذرائع کا قلع قمع ہو جاتا ہے، اور ان کے بجائے عزت و شرافت اور خودداری کے اوصاف پروان چڑھتے ہیں، جو اس "بہترین اُمت" کے شایان شان ہیں، جو دنیا کی رہنمائی کے لئے پیدا ہوئی ہے

سبق پھر پڑھ شجاعت کا، عدالت کا، صداقت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

فصل ہفتم

اسلام کے بارے میں اہلِ قانون کی رائے

مغربی علماء اور مستشرقین نے مشرقی علوم و فنون کی طرف کافی توجہ دی ہے بعض مستشرقین نے عربی اور مشرقی زبانوں پر تحقیقات کی ہے، یعنی ان کے اصول و مشتقات اور الفاظ کی نشو و نما کو اچھی طرح بیان کیا ہے اور کچھ لوگ ادبی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، اور انھوں نے عربی کی اہم علمی اور ادبی کتب تصحیح و تحقیق کے ساتھ شائع کی ہیں اور ان پر حواشی بھی لکھے تاکہ وہ کتابیں اچھی طرح سمجھی جاسکیں اور ان کے مشکل الفاظ و معانی کی تشریح ہو سکے،

بعض مستشرقین علوم قرآن، تفسیر اور حدیث میں علمی تحقیقات کر رہے ہیں کچھ حضرات نے فقہ اسلامی کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے دقیق مباحث اور مسائل کو معلوم کیا ہے بلکہ انھوں نے اس کے وسیع سمندر میں غوطہ زنی کرنے کے بعد یہ پتہ چلایا ہے کہ اس کے اندر بہت وسیع ذخیرہ اور نفیس خزانہ موجود ہے، لہٰذا جب انھوں نے اپنے وطن کے اہلِ قانون کو اس قانونی سرمایہ کی طرف متوجہ کیا تو وہ بھی اس کی زبردست طاقت اور تہذیب و اصلاح میں اس کے گہرے اثرات کے معترف ہوگئے، اسی طرح مصر اور مشرقی ممالک کے اہلِ قانون بھی اس کی پوشیدہ قوتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے اہلِ وطن کو دعوت دے رہے ہیں، کہ وہ اسلامی شریعت کو اپنے قانون کی بنیاد قرار دیں،

لہٰذا ہم انصاف پسند مغربی اور مشرقی اہلِ قانون کے ان خیالات کو پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے اسلامی شریعت کے بارے میں ظاہر کئے ہیں، تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اب بھی حق کے حامی موجود ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ موجودہ دور میں شریعت کو قانون سازی کا منبع اور ماخذ قرار دیا جائے۔

(۱) فرانسیسی پروفیسر لامبیر کی رائے پروفیسر موصوف کا خیال ہے — "جو کتابیں اسلامی شریعت کے بارے میں لکھی گئی ہیں، وہ غیر فانی خزانہ اور لازوال سرچشمہ ہیں اور موجودہ دور میں علمی تحقیقات کے لئے اہلِ مصر کے علماء کا سب سے بڑا سہارا ہیں جن کی بدولت وہ مصر اور بلادِ عرب کی ان علمی روایات کو زندہ کرسکتے ہیں جنہیں ان کی غفلت اور بے توجہی سے زمانے نے پوشیدہ کر دیا ہے۔"

وہ اپنے مصری تلامذہ کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ اسلامی شریعت میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے علمی مقالات پیش کریں۔[۱] پروفیسر موصوف یہ بات بھی زور دے کر بیان کرتے تھے کہ قرونِ وسطیٰ میں اسلامی شریعت سے مسیحی تمدن نے مدد حاصل کی تھی اور اس کے تمام اصولوں کو اخذ کیا تھا، لہٰذا موجودہ تہذیب و تمدن کی نشوونما میں یونانی اور رومی تمدن کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت اور اس کے تمدن نے بھی بہت اہم حصہ لیا ہے۔[۲]

(۲) پروفیسر لیوی اوکان کی رائے پروفیسر لیوی اوکان، پیرس کے قانونی کالج کے استاد ہیں، جب ڈاکٹر محمد صادق فہمی نے فرانسیسی زبان میں اثبات کے موضوع پر تحقیقات کا ایک مقالہ پیش کیا اور اس میں اسلامی علماء اور بالخصوص علامہ ابن القیم کے خیالات کا اظہار کیا تو پروفیسر موصوف نے اس کتاب پر اظہارِ رائے فرماتے ہوئے یہ تحریر کیا۔

"ڈاکٹر صادق کی کتاب اس لائق ہے کہ اسے موجودہ دور کے اعلیٰ قانونی مجموعوں میں شامل کیا جائے۔ جیسا کہ سالی وغیرہ اکابر علمائے قوانین کے مجموعات ہیں کیونکہ اس میں معاملات میں اسلامی شریعت کو موجودہ قانون کا زندہ ماخذ قرار دیا گیا ہے۔"

(۳) ڈاکٹر انتریکو انسابا تو فرماتے ہیں — "اسلامی شریعت کو اپنے بہت سے مسائل میں مغربی قوانین پر فوقیت حاصل ہے بلکہ وہ دنیا کو سب سے زیادہ مستحکم اور پائیدار قانون عطا کرتی ہے۔"[۳]

(۴) پروفیسر بیوار کا زیلی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اسلامی شریعت کے اصول و مبادیات کو

---

[۱] مجلۃ الازہر جلد ۸ ص ۳۲ و جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۵ھ۔

اختیار کیا جائے ۵؎

(۵) ایک مشہور عالم قانون کا قول ہے :- "اسلامی شریعت بحر ناپیدا کنار ہے"

(۶) علامہ فارس الخوری مشرق کے بہت بڑے عیسائی لیڈر ہیں ، دمشق میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد مبارک کی یادگار میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا تو اس میں انھوں نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا :-

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا کی سب سے بڑی شخصیت ہیں ، زمانہ ان کا کوئی ہمسر پیدا نہیں کر سکا ، انھوں نے جو مذہب پیش کیا ، وہ مذاہب عالم میں سب سے زیادہ مکمل ہے یہ پاکیزہ شریعت چار ہزار سے زیادہ علمی سماجی اور قانونی مسائل کا مجموعہ ہے لہٰذا انصاف پسند قانون دانوں کو ان کی اس شریعت کے محاسن کا اعتراف کرنا پڑا جس کی بنیاد اللہ کے نام پر رکھی گئی تھی ، یہ شریعت ترقی یافتہ نظام اور علمی حقائق کے عین مطابق ہے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کی تم یادگار منا رہے ہو ، دنیا کی عظیم ترین شخصیت تھی ، انھوں نے بکھرے ہوئے عربوں کو متفق کیا اور انھیں ایک متحد قوم بنایا جس نے تمام دنیا کو فتح کر لیا ۔ انھوں نے ایسے عظیم ترین مذہب کی بنیاد ڈالی جس نے لوگوں کے حقوق و فرائض اور اصول معاملات کو دنیا کے بہترین اور مکمل ترین نظام کی بنیادوں پر قائم کیا ۔

(۷) مشہور مستشرق سانتیلانا نے اپنی ایک تالیف میں تحریر کیا ہے ،

" اگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلامی فقہ تمام انسانیت کے لئے کافی ہے ، تو کم از کم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ فقہ اسلامی مسلمانوں کے دیوانی قوانین کے لئے بہت کافی ہے "

(۸) مجلۃ الاحکام الشرعیہ کے شارح سلیم باز جو لبنان کے عیسائی عالم ہیں یوں فرماتے ہیں :-

" میرا یہ عقیدہ ہے کہ اسلامی فقہ کے ذریعے انسان کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی ہیں خواہ وہ کاروباری معاہدات اور معاملات ہوں یا دوسرے مقدمات ہوں سب کا حل اس میں موجود ہے ، فقہ اسلامی کی کتب کا وسیع ذخیرہ نہ صرف مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے کتب خانوں میں پایا جاتا ہے ، بلکہ ہالینڈ کے شہر لیڈن ، روم ، برلن ، پیرس ،

۵؎ مجلہ ہدی الاسلام ۲۰ ، محرم ۱۳۸۵ھ

برٹش میوزیم نیز ویٹیکین محل میں بھی پاپائے اعظم کے کتب خانے میں فقہ اسلامی کی کتابوں کا یہ وسیع ذخیرہ موجود ہے، ان کتب خانوں میں جو کتابیں ہیں وہ ہزاروں علمائے اسلام کی محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں، کتابوں کا یہ وسیع ذخیرہ اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ اسلامی شریعت میں انسان کی تمام ضروریات اور مسائل واحکام کا حل موجود ہے اور ہر معاملے میں کسی نہ کسی فقیہ اور عالم کا قول ان کتابوں میں مل سکتا ہے۔

(۹) جرمن کے مشہور قانون دان جوزف کوصلر نے جب ڈاکٹر محمود فتحی مرحوم کا ایک علمی مقالہ ملاحظہ کیا تو وہ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:۔

" جرمن علماء کو اس بات پر فخر تھا کہ انھوں نے ان دیوانی قوانین میں بعض نئے نظریات کا اضافہ کیا ہے جو ۱۸۷۰ء میں وضع ہوئے تھے، مگر جب ڈاکٹر فتحی کی کتاب شائع ہوئی جس میں انھوں نے فقہ اسلامی کے اصول بیان کئے ہیں۔ تو اس سلسلے میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ ایسے جدید نظریات پر مسلم علماء آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں بحث کر چکے ہیں لہٰذا ان نظریات کی اوّلیت کا سہرا ان مسلمان علماء کے سر ہے جو جرمنوں سے دس صدی پیشتر ان سے واقف تھے"

(۱۰) وائنا یونیورسٹی کے قانونی کالج کے پرنسپل پروفیسر شپرل (Sperl) نے ۱۹۲۷ء کی موتمر قوانین میں یہ الفاظ کہے:۔

" عالم انسانیت کو یہ فخر حاصل ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی شخصیت اس سے منسوب ہے، انھوں نے امی ہونے کے باوجود ایسی شریعت تیرہ سو سال پہلے پیش کی کہ اگر ہم اہل مغرب دو ہزار سال کے بعد بھی اس کی اونچی چوٹی پر پہونچ جائیں تو ہم اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھیں گے"

(۱۱) پروفیسر ومبری نے ایک ترک ادیب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا:۔

" تمھاری فقہ اسلامی اس قدر وسیع ہے کہ مجھے تعجب ہوتا ہے جب میں خیال کرتا ہوں کہ تم نے کیوں اپنے ملک اور زمانے کے موافق احکام اور قانونی نظام، فقہ اسلامی سے اخذ نہیں کئے؟"

(۱۲) امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہوکنگ اپنی کتاب

"روح السیاسۃ العالیہ" میں تحریر فرماتے ہیں [1]

"میں اپنے آپ کو حق وصداقت پر محسوس کرتا ہوں جب میں یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ اسلامی شریعت میں وہ تمام اصول ومبادیات موجود ہیں، جو ترقی کے لئے ضروری ہیں"

(۳) جب مصر میں شخصی احوال کے قوانین کی کمیٹی نے قانون میراث تیار کر لیا تو اس موقع پر مصر کے سابق وزیر انصاف محمد صبری ابوعلم نے تقریر کرتے ہوئے یہ کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ ہماری شریعت کی گہرائیوں میں حکمت کے خزانے اور احکام کے جواہرات پوشیدہ ہیں اس کے لئے صرف اس بات کی ضرورت کہ عقل بصیرت اور محفوظ رکھنے والے دل ودماغ ہوں، اس کے بعد ایک ماہر شخص صبر واستقلال کے ساتھ اس کے گہرے سمندر میں غوطہ زنی کر کے ان گوہر آبدار کو پوشیدہ مقامات سے نکال سکتا ہے، اور جس طرح ایک چابکدست صناع نہایت محنت وجانفشانی سے قیمتی موتیوں کا ایسا ہار تیار کر لیتا ہے جو دیکھنے والوں کو دلکش معلوم ہو اسی طرح ایک ماہر علم شریعت ان قابل قدر مسائل واحکام کو جمع وترتیب دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، بہرحال فقہ اسلامی میں وہ احکام وقوانین موجود ہیں جو ہر زمانے کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں"

(۴) ڈاکٹر عبدالرزاق السنہوری سابق پرنسپل قانونی کالج مصر اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں — "ہمیں چاہیئے کہ ہم جدید انداز کے مطابق اسلامی شریعت کے بارے میں تحقیقات کریں اور اس کا مغربی قوانین سے موازنہ کریں، میں آپ سے یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کو اسلامی شریعت میں ایسے اصول ونظریات ملیں گے جو اپنی وضع وترتیب میں مغربی قوانین کے جدید ترین اصول اور نظریات سے کسی طرح کم ترقی یافتہ نہیں ہیں"

(۵) مصر کی مخلوط اپیل کورٹ کے سابق مشیر قانونی ڈاکٹر عبدالسلام ذہنی جو مصر کے مشہور قانون داں اور اسلامی شریعت کے زبردست ماہر ہیں یہ فرماتے ہیں،

[1] مجلۃ الازہر جلد ۱۳ حصہ نہم صفحات ۷ — ۱۲

قانون معاملات

معاملات میں علمائے شریعت کی بحثیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں ہے، تاہم ان کے یہ مباحث علمی اور عملی حیثیت سے معاملات پر قیمتی معلومات کا خزانہ ہے اور ہمارے آباء واجداد کی اہل عرب کے لئے سب سے بڑی میراث ہے[۱]

ڈاکٹر موصوف نے مجلہ ازہر میں اپنے ایک مضمون میں بھی یوں ارشاد فرمایا ہے[۲]

"مناسب یہ تھا کہ قومی عدالتوں کو اس طریقے پر قائم کیا جائے جو اسلامی شریعت میں مقرر ہے اور قوم بھی اس سے مانوس تھی مگر قومی نعرے، مصری قومیت اور عربوں کے ذوق سلیم کے برخلاف کام ہوا۔" اس قسم کے خیالات ڈاکٹر موصوف نے مخلوط عدالتوں کے قیام کے سلسلے میں بھی ظاہر کئے تھے،[۳]

آپ نے مجلہ ازہر حصہ ہفتم سال ۱۷ میں نہایت ہی منصفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے :-

"اسلامی شریعت میں معاملات کے بارے پر نہایت مہذب اور دقیق اصول موجود ہیں، معاملات پر اس کے احکام اس قدر زوردار اور اعلیٰ درجے کے ہیں کہ وہ علم قانون کے سنگ بنیاد کی حیثیت سے جدید قوانین کے معیار پر پورے اترتے ہیں، اس طرح وہ تقابلی قانون کے علم کے مطابق بھی ہیں۔" آگے چل کر انھوں نے فرمایا۔

"اسلامی شریعت کے دیوانی معاملات کے قوانین کو اختیار کرنے سے مصر کے قومی رجحانات کا تحفظ ہوتا ہے نیز مشرقی اور عربی قومیت اور اس کی شریعت کو برتری حاصل ہوتی ہے، اس طرح ہم ان اعلیٰ قومی روایات کو زندہ کرسکیں گے جو ناحق دفن کر دی گئی تھیں۔"

(۶) مصر کے سابق پرنسپل قانونی کالج، پروفیسر علی بدوی اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان "جدید قانون میں اسلامی شریعت کا مقام" ہے

---

[۱] ، [۲] مجلہ الازہر جلد ۸ ص ۳۲ ، جلد ۱۷ ص ۸۹

[۳] ان کے مکمل خیالات مجلہ ازہر جلد ۱۷ ص ۸۸ - ۸۹ میں ملاحظہ فرمائے جائیں

یوں تحریر فرماتے ہیں [1]

فوجداری قوانین اسلام کے ابتدائی دور میں ہماری شریعت ایسے مستحکم قواعد اور قانونی نظام سے مالا مال تھی کہ جس کی بدولت عرصہ دراز تک افراد کے تعلقات اور ان کا طرز عمل منظم اور درست رہا، اس عرصہ میں اسلامی فقہ، علمی تحقیق و تدقیق اور دقیق طرز بحث کی بدولت معراج کمال تک پہونچ گئی تھی تاہم اسلامی فقہ کی خود مختاری اور اس کی برتری صرف دیوانی قوانین اور شخصی حالات کے احکام تک محدود نہ تھی، بلکہ فوجداری قوانین میں بھی اس کی برتری اور فوقیت کا اظہار ہوتا ہے، کیونکہ شریعت اسلامیہ نے ان جرائم کے مسائل کا وہ مؤثر حل پیش کیا ہے جن کے بارے میں ابھی تک اہل قانون میں اختلاف موجود ہے، نیز ہمارے شرعی حدود کے احکام کو آسانی کے ساتھ موجودہ قانون کے اصولوں سے منطبق کیا جا سکتا ہے، بلکہ اسلامی شریعت نے جرم و سزا کے اصول کا جو نظام پیش کیا ہے اس کا دائرہ عمل اور فکری معیار جدید ترین اصول و نظام سے کسی طرح کم تر نہیں ہے۔ رومی فوجداری قوانین میں تو اس جیسا نظام بالکل موجود ہی نہیں تھا

نظام احتساب و تعزیر (فوجداری قوانین کو مؤثر بنانے کے لئے) اسلامی شریعت میں نظام احتساب قائم کیا گیا تھا، اسلام کے قدیم زمانے میں یہ ایک سماجی محکمہ تھا جس طرح کہ موجودہ زمانے میں پولیس کا محکمہ ہے اسی طرح مسلمانوں میں تعزیرات کے ذریعے سزا دینے کا انتظام بھی تھا۔ اس کے مطابق سزا کی نوعیت اور مقدار کے تعین کو قاضی کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ ہر جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات، نفسیات اور رجحانات پر غور کر کے سزا تجویز کرتا تھا۔ یہی وہ نظام ہے جو قدیم زمانے میں اسلامی شریعت کی امتیازی خصوصیت رہا۔ اور اب اسی کی حمایت دور جدید کے قانون داں بھی کر رہے ہیں تاکہ سزا کا اصل مقصد پورا ہو سکے۔

بین الاقوامی کانفرنس کی رائے تقابلی قانون کی کانفرنس لاہائی میں اگست کے شروع میں ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس کی

[1] مجلہ القانون والاقتصاد سال اول ص ۲۱۳ و مابعد

ایک قرارداد میں اسلامی شریعت کی پائیداری، اور اس کے اعلیٰ مقام کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں دنیا کے تمام ماہرینِ قانون جمع ہوئے تھے، اس قرارداد کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت ایک زندہ قانونی نظام ہے جو ترقی کرنے اور جدید تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، بلکہ یہ اس قابل ہے کہ اسے تقابلی قانون کے ماخذوں میں ممتاز مقام دیا جائے۔ [1]

یوں اسلامی شریعت نے مقابلے میں فتح حاصل کی اور اس نے یہ زبردست کامیابی حاصل کی کہ اس کی لازوال روایات کا مشرق و مغرب کے تمام ماہرین قانون نے اعتراف کیا۔

---

[1] لاہائی کی مذکورہ بالا کانفرنس میں جامعہ ازہر کے نمائندے نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کانفرنس نے یہ منظور کرلیا ہے کہ اسلامی شریعت میں ایسے کافی عناصر موجود ہیں جو اسے زمانے کی ضروریات اور تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ترقی کرنے کے قابل بناتے ہیں۔" ملاحظہ ہو اخبار الاہرام ۲۷ نومبر ۱۹۳۷ء

ماخذ باب ہفتم

ماخذ فصل اوّل

فجر الاسلام .... از احمد امینی

تاریخ التشریع الاسلامی ......

تاریخ الادب العربی از جرمن مستشرق

بروکلمان .... (ترجمہ مجلہ الازہر)

کتاب الام ... از امام شافعی حصہ ہفتم

مجموعۃ الرسائل ...... از سمرقندی

(جو ماوراء النہر کے عالم تھے) ...

تاریخ الکنیۃ از جرمن مورخ موسیہم

مجلۃ الازہر ہدی الاسلام ۔ الرسالۃ

مجلۃ القانون والاقتصاد ......

تقابلی قانون کی کانفرنس منعقدہ لاہائی ۱۹۳۷ء

میں الازہر کے نمائندوں کی رپورٹ کا خلاصہ

بعض کتب فقہ اسلامی ......

ماخذ فصل دوم

مفتاح السنہ وکتاب الترغیب والترہیب

الفروق از ...... قرافی

الطرق الحکمیہ ....

النہایۃ فی غریب الحدیث

القیاس فی الشرع الاسلامی ۔

از ابن تیمیہ و ابن القیم .....

الاشباہ والنظائر مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

حجاز کے مصری وفد ۱۳۵۵ھ کی رپورٹ

باب پنجم کتاب ہذا ....

ماخذ فصل سوم

پروفیسر لامبیر فرانسیسی کے لیکچر جو انہوں نے مصر

کے قانون کالج میں ۱۹۳۷ء میں دیئے ...

ماخذ فصل چہارم

پروفیسر مذکور کے محاضرات

تاریخ التشریع الاسلامی وبعض کتب فقہ

مجلہ القانون والاقتصاد سال اوّل ...

ماخذ فصل پنجم

اعلام الموقعین ، زاد المعاد ، الطرق الحکمیہ

بدایۃ المجتہد ... از ابن رشد

الاشباہ والنظائر ۔ الفروق از قرافی

نیل الاوطار ....

سبیل السلام

ماخذ فصل ششم

باب ہفتم فصل دوم کتاب ہذا ۔

ماخذ فصل ہفتم

مجلہ الازہر و ہدی الاسلام ..

مجلہ القانون والاقتصاد ...

لاہائی کانفرنس میں ازہر کے نمائندوں

کی تقریروں کا خلاصہ ....

خاتمۂ کتاب

ہم نے اس کتاب میں جو مباحث پیش کئے ہیں، ان سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اسلامی شریعت عمدہ قوانین و احکام سے مالا مال ہے اس میں نہایت اعلیٰ درجے کے احکام وقوانین موجود ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مسلم علمار کو اجتہاد کی آزادی حاصل ہے، لہٰذا ان اصولوں اور اجتہاد کی آزادی کی بدولت اس میں ترقی کرنے اور زندہ رہنے کی پوری صلاحیت ہے، لہٰذا یہ شریعت ہر زمانہ اور ہر مقام کی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے، بشرطیکہ ہم اس کے اصولوں کی حفاظت کریں اور اس کی ہدایات سے فائدہ اٹھائیں،

لہٰذا میں مسلم قوموں سے بالعموم مصری قوم اور اسلام حکومتوں سے بالخصوص یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی قانون سازی میں اسلامی شریعت کی طرف رجوع کریں اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہماری ان تجاویز پر عمل کیا جائے جو بحث اجتہاد کے آخر میں ہم نے پیش کی ہے۔

ان مسلم قوموں کے علمائے کرام اور با اثر حضرات کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت اور اپنی مجالس قانون کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ قانون سازی کے موقع پر اسلامی شریعت کی طرف رجوع کریں ورنہ سب کے سب خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے وہ نہ صرف اپنے لئے قصوروار ہوں گے بلکہ آنے والی نسلوں کی حق تلفی بھی کریں گے حالانکہ انھیں اسلامی شریعت پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ وہ شریعت ان میں خودداری، مردانگی اور شرافت کے اوصاف پیدا کرسکے اور ان کی اخلاقی، سماجی اور اقتصادی زندگی کو مستحکم

بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے قرآن کریم کا یہ واضح حکم موجود ہے) "نہیں تمہارے پروردگار کی قسم ! وہ مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلافات میں راے پیغمبر) تمہیں اپنا حکم نہ بنائیں اور جو تم فیصلہ کرو اس کے بارے میں اپنے دل میں تنگی نہ پائیں بلکہ اسے اچھی طرح تسلیم کرلیں "

دوسری آیت میں یہ مذکور ہے — " نہ کسی مومن مرد، اور نہ کسی مومنہ عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں، تو انہیں اس بات کا کوئی اختیار حاصل رہے "

اے خدا ہم تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ تو ہمارے عزائم کو بیدار کر اور یہ ہمت عطا کر کہ ہم اسلام کی شان وشوکت اور اس کے احکام وہدایات کو زندہ کریں لہٰذا ہمارے ان کاموں میں ہماری صحیح رہنمائی کر۔

اے اللہ! ہمارا یہ عمل خلوص پر مبنی ہو، اور تو ہماری دعا کو قبول کر کیونکہ تو ہی اسے سننے والا اور جاننے والا ہے، اور ہماری خطاؤں کو معاف کر کیونکہ تو ہی بخشنے والا اور کرم کرنے والا ہے ،

وَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَالْمُهْتَدِيْنَ بِهَدْيِهٖ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ اَللّٰهُمَّ اٰمِيْن

حسن احمد الخطیب